مجاہدِ اعظم

حصۂ اوّل

تحقیقاتِ صحیح و سوانحِ مستند حضرت سید الشہدا امام ثقلین امام حسینؑ

اور

مکمل حالات و اسبابِ واقعۂ ہائلہ کربلا

مُصنّفہ

مؤرخِ نامور و محقق بے بدل

حضرت مولوی سیّد شاکر حسین صاحب نقوی امروہوی

ناشرین

شاہ است حسین بادشاہ است حسین
سر داد نداد دست در دست یزید

۸۶

دیباچہ

دین است حسین دین پناہ است حسین
حقا کہ بنائے لا الہ است حسین

حسینٌ منی وانا من الحسینؑ

الحمد للہ رب العالمین والصلوٰۃ والسلام علیٰ خیر خلقہ محمد خاتم النبیین وآلہ الطیبین المعصومین سیما علی سید الشہداء الاولین والآخرین وعلی اقربائہ والصادقین الذین بذلوا مہجہم معہ اجمعین

صحرائے کربلا کا پُر از کرب و بلا واقعہ اور سامعہ پاش و جگر خراش سانحہ تاریخ عالم کا وہ زریں اور شاندار کارنامہ ہے جس نے اپنی عدیم المثال نوعیت سے نہ صرف اسلام بلکہ تمام دنیا کی تاریخ میں نہایت ہی ممتاز اور قابل صد رشک درجہ حاصل کیا ہے اور کرۂ ارض کی کوئی قوم احقاق حق اور ابطال باطل کی ایسی تابناک مثال اور استقلال و شجاعت و صبر و استقامت کی ایسی حیرت انگیز نظیر پیش نہیں کر سکتی یہی وہ واقعہ عظمیٰ ہے جس نے انسانی اخلاق انسانی تہذیب اور انسانی روحانیت پر اپنا وہ پائیدار اثر ڈالا کہ ذریت آدم ہمیشہ اس کی رہین منت رہے گی اور یہی وہ شہادت کبریٰ ہے جس کے احیائے ملت اور ابقائے روحانیت کے بار احسان سے گردن اسلام قیامت تک سُبک دوش حاصل نہیں کر سکتی شہدائے کربلا کا سردار امت محمدیہ کا وہ نوح ہے جس نے کشتی اسلام کی اس وقت ناخدائی کی جب طوفان استبداد کے تھپیڑے اس کو گرداب ہلاکت کے کنارہ پر پہونچا چکے تھے اور ہوائے فسق و ارتداد کے تند و تیز جھونکے اس سفینہ کو ڈگمگا رہے تھے اور قریب تھا کہ یہ کشتی تباہ و پاش پاش ہو جائے اس کشتی کا بچانا کوئی آسان کام نہ تھا کوئی سہل مہم نہ تھی اس فلک نجات کی حفاظت بڑی بھاری قربانیاں چاہتی تھی بڑے بڑے فدیوں کی ضرورت تھی قدم کے ڈگمگا دینے والے مصائب کا تحمل درکار تھا لیکن اس کشتی کا ناخدا ان تمام نوائب و شدائد کی دھمکی سے ذرا نہ جھجکا ہجوم مظالم کی دعوت کو بڑی خوشی سے لبیک کہا اور تمام آنے والی مصیبتوں کا تہ دل سے خیر مقدم کیا اور باوجود ایسے درد انگیز صدمات و صعوبات کے جن کے تصور سے ہی رونگٹے کھڑے ہوتے ہیں اور جو انسانی طاقت برداشت سے کہیں بالاتر ہیں

آخر دم تک ثابت قدمی کے جادۂ مستقیم سے ایک اِنچ نہ سرکا اگر تمام دنیا کے پُر درد واقعات اور پُرسوز حادثات کو فراہم کر کے کربلا کے سانحۂ ہوش ربا سے موازنہ کیا جائے تو اس کے مقابلہ میں سب ہیچ و لاشے نظر آئیں گے، درسطحِ ارض کی کسی قوم اور کسی ملک کی تاریخ ایسے حوصلہ شکن انبوہ مصائب اور ایسی تحیر افزا قوتِ ارادی اور ہمتِ مردانہ کی نظیر پیش نہ کر سکے گی لیکن ہادیٔ اسلام علیہ التحیۃ والسلام کے فرزند اور ملتِ بیضائے اسلام کے محسن و مربی کا یہ شاندار کارنامہ اور تمام شہادتوں کی سرتاج شہادت کیا ایک ملکی و سیاسی جھگڑا یا اتفاقی حادثہ تھا نہیں ایسا نہیں ہمارے شہیدِ اعظم کا نقطۂ خیال اور مطمحِ نظر ایسا بلند اور ارفع تھا جہاں تک رسائی کسی دوسرے انسان کا طائرِ وہم و خیال اپنی قوت و بلند پروازی میں نہیں پاتا اس شہادتِ عظمیٰ کی بنیاد صداقت حقانیت کی صیانت، حفاظت تھی اس کی تہ میں احیائے شریعت و حمایتِ ملت کا راز مضمر تھا درحقیقت یہی اس شہادت کا فلسفہ ہے اور یہی علتِ غائی۔

دنیا جب سے آباد ہوئی ہے اور جب تک قائم رہے گی واقعات و حادثات کا سلسلہ بھی لگاتار جاری رہے گا۔ کارکنانِ قضا و قدر ایک پل کے لئے اپنے فرائض سے غافل نہیں واقعات کے اس دائمی اور درد تسلسل میں کوئی حادثہ اتفاقاً وقوع میں آئے یا ارادۃً اپنے پیچھے ضرور کوئی نہ کوئی نتیجہ چھوڑ جاتا ہے لیکن وہ واقعہ جس قدر عظیم الشان ہوتا ہے اسی کی مناسبت سے اس کے عواقب و نتائج بھی بلند پایہ ہوتے ہیں کربلا کا واقعہ جس قدر دنیا کی تاریخ میں ایک جداگانہ نوعیت رکھتا ہے اسی قدر اس کے مقاصد و اغراض بھی دور رس اور مصالحِ عظیمہ پر مبنی ہیں صرف رونا اور رلانا ہی اس شہادتِ کبریٰ کا مقصدِ اصلی نہیں بلکہ ہمارے مقتول فی سبیل اللہ کا مدعائے حقیقی اس سے کہیں ارفع و اعلیٰ تھا جس کو ہم سمجھے ہوئے ہیں ہادیٔ اسلام کے فرزند نے اپنے جدِ بزرگوار کے دین کی حفاظت اپنے دوست اپنے رشتہ دار اپنی اولاد کٹوا کر اپنا خون بہا کر اپنا مال لٹا کر دل ہلا دینے والی مصیبتیں اٹھا کر کی ہے اس حفاظت کا مقصد صرف علم بلکہ عمل ہے یاد رکھنا چاہئے کہ جن کی غلامی کا مستحق صرف وہی ہو سکتا ہے جو ان کے نانا کا غلام ہو اور ان کے نانا کا غلام وہی ہو سکتا ہے جو خدا کا عبدِ مطیع ہو اور خدا کا عبدِ مطیع وہی ہو سکتا ہے جو اس کے اوامر و نواہی پر خلوص نیت سے عمل کرے ورنہ دعوئے غلامیٔ حسین کسراب بقیعۃ یحسبہ الظمآن ماء سے زیادہ وقعت نہیں رکھتا۔ ہمارا شہیدِ اعظم

عیسائیوں کا سا شہید نہیں ہے جس نے اپنے نام پر بپتسمہ لینے والوں کے گناہوں کا بار اپنی گردن پر لے کر ان کو طلیع العذار کر دیا اسلام کی شان اس سے کہیں بالاتر ہے اسلام کا قانون الٰہی بہانگ پکار کر منادی کر رہا ہے۔ "مَنْ یَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّۃٍ خَیْرًا یَّرَہٗ وَمَنْ یَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّۃٍ شَرًّا یَّرَہٗ" (ترجمہ) جو شخص ایک ذرہ کی برابر نیکی کریگا اس کی جزا ملیگی اور جو ایک ذرہ کی برابر بدی کریگا سزا بھگتے گا۔

اس لئے ہمارا فرض ہے کہ تاریخ اسلام کے اس سب سے عظیم واقعہ کو جو ہر پہلو سے ہمارے لئے سبق آموز ہے رطب و یابس کو چھانٹ کر اپنا دستور العمل بنائیں اس شہادت کے واقعات کو سطحی نظر سے نہ دیکھیں بلکہ اس کے اسباب و نتائج کے فلسفہ کو سمجھنے کے لئے ان کی تہ تک پہنچنے کی کوشش کریں ہر پہلو پر نظر غائر ڈالیں۔ اسلام کے تمدنی، مذہبی، اور اخلاقی مکارم کا اظہار ہوا ہے ان پر عمل پیرا ہونا اپنی زندگی کا نصب العین سمجھ لیں کیونکہ ہادی اسلام کی تبلیغ رسالت اور ہمارے مجاہد اعظم کی سب سے بڑی قربانی اور شہادت کا روح رواں صرف حسن عمل ہے اور یہ نہیں تو کچھ بھی نہیں افسوس ہے کہ اس زمانہ میں مذہبی خیال روز بروز بلند ہوتا جاتا ہے دنیا خدا پرستی چھوڑ کر خود پرستی کی طرف جھکتی جاتی ہے بد تہذیبی بد اخلاقی یوماً فیوماً رو بہ ترقی ہے وضع قطع لباس خورد و نوش نشست برخاست ہر بات میں یورپ کا تتبع عین فرض ہے ماکولات و مشروبات حلت و حرمت کا کوئی تعلق نہیں طہارت کے اصول بالائے طاق حلال و حرام طاہر و غیر طاہر کا خیال وسوسہ لاحاصل سمجھ کر بالفقط لباس و غذا میں ملکی موسم آب و ہوا سوسائٹی اور حیثیت کا لحاظ عقت ربود خلاصہ یہ کہ الناس علی دین ملوکھم (فیشن) سوسائٹی کا موٹو قرار پاتا جاتا ہے کہ فلسفہ اخلاق یہ رہ گیا ہے کہ

مے مدہ مے لفشاں دستہ بزن پائے بکوب — در خرابات نہ انہ بہر نماز آمدہ

روزہ کو قواعد حفظان صحت مانع نماز کو جدید روحانیت بیکار اور غیر ضروری بتانے پر آمادہ زکوٰۃ علم اقتصادی کے خلاف حج ایک غیر مفید اور پر صعوبت سفر خلاصہ یہ کہ جملہ اوامر و نواہی سمٹ کر غالب کے دو مصرعوں

"لاتقربوا الصلوٰۃ" ز نہیم بہ خاطر است — وز امر یاد ماندہ "کلوا واشربوا" مرا

یورپ کا فلسفہ خود یورپ کے لئے کوئی معیار قائم نہ کر سکا تو ہمارے لئے کیا کرے گا ہمارا معیار وحی ہے۔

ہونا چاہیے جو ہمارے لئے قانون الٰہی ہے یعنے قرآن مجید احکام قرآنی کے ساتھ سید المرسلین دائمہ معصومین کا ہر قول اور ہر فعل ہمارے لئے مشعل ہدایت ہے اگر ہم اس روشنی کے مینارہ سے ہٹ کر جادہ پیما ہوں گے تو اندھوں کی طرح قدم قدم پر ٹھوکریں کھائیں گے فی وادیہیمون کا ارشاد ہم پر صادق آئے گا اور ہماری حالت اس زاغ آشیاں گم کردہ کی سی ہوجائے گی جس کو گھر پہونچنے سے پہلے آندھی نے آلیا اور وہ پریشان ہوکر بے مقصد منتہا اپنی قوتِ پرواز کو بیکار صرف کرتا پھرتا ہو مختصر یہ کہ جس طرح ہادی اسلام کے ہر قول اور ہر فعل کا اتباع ہمارا ایمان ہے اسی طرح ان ذواتِ مقدسہ کی محبت بھی فرض ہے جن سے آنحضرت صلے اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کو روحانی وجسمانی خاص تعلق تھا۔ حسین آپ کے لاڈلے نواسے تھے جن کے حق میں حسینؑ منی وانا من الحسینؑ فرمایا کرتے تھے۔ تو کیا حسین کی محبت ہم پر فرض نہیں اور کیا ان کے مصائب پر جو صرف احیائے اسلام کے لئے اختیار کئے گئے اثر پذیر ہونا اسلامی شعار کا ایک لازمی جزو نہیں سمجھا جائے گا۔ اسی وجہ سے حسینی شہادت کا سننا یا سنانا باعث اجر جزیل خیال کیا جاتا ہے کہ یہ ذکر جذبات تاسی وتولا کو ہیجان میں لانے والا ہے لیکن اس قدر افسوس اور تعجب کا مقام ہے کہ اس عدیم المثال سلسلہ مصائب اور تمام شہادتوں کی سرتاج شہادت کے سارے واقعات ابتدا سے انتہا تک اس قدر مختلف ومتضاد ہیں اور ان میں رطب ویابس کا اس قدر ہجوم نظر آتا ہے کہ ایک جویائے تحقیق کا دماغ اس کے تصور سے ہی چکرانے لگتا ہے اور وہ نہیں سمجھ سکتا۔ کہ کس عالم کے قول کو کس عالم کے قول پر ترجیح دے اور کون سے مورخ کو کاذب اور کون سے کو صادق سمجھے اس میں ذرا بھی شک وشبہ نہیں کہ ان تمام مختلف بیانات وواقعات کی تصحیح اور روایات وموضوعات کی تنقید کوئی آسان کام نہیں یہ ایک نہایت دشوار اور کٹھن مرحلہ ہے کیونکہ فریقین کی تمام کتب تاریخ کی فراہمی ان کی بالاستیعاب ورق گردانی اختلافی روایات کے ضروری نوٹ ان کی محققانہ چھان بین ہر واقعہ کی تحقیق وتنقیح ہر روایت کو اصول درایت کی کسوٹی پر کسنا ہر روایت کی تائید یا تردید تاریخی شہادتوں سے کرنا راویوں کے ثقہ وغیر ثقہ ہونے کی جرح وتعدیل اور اس جانکاہی ودماغ سوزی کے بعد قابل اطمینان نتیجہ پر پہونچنا نہایت ہی دشوار وقت طلب وقت طلب فرصت طلب اور محنت طلب کام ہے اور ایک شخص واحد اس عظیم الشان کام

کے حوصلہ شکن مشکلات سے عہدہ برآ نہیں ہو سکتا۔ جس گروہ میں اصول دین اور عقائد خمسہ میں بھی
عدم تقلید اور دلائل عقلی سے تنقید کا حکم دیا گیا کس قدر مقام حیرت ہے کہ اسی طبقہ کے افراد ان روایات
کی جرح و تعدیل پر جن کا سننا سنانا داخل عبادت سمجھتے ہوں بھولے سے بھی توجہ نہ کریں ذاکر ممبر یا
کرسی پر بیٹھ کر جو کچھ بیان کر دے اس کے رطب و یابس صحیح و غلط مقبول و موضوع بلا امتیاز کئے
بغیر سر تسلیم خم کر دیں حتیٰ کہ ساقط الاعتبار اور بے سر و پا روایات کو بھی جو سراسر بہتان و افترا
منافی شان اہلبیت اور باعث توہین خاندان رسالت ہوں رنگ آمیزی اور جدت طرازی کے
ساتھ بیان کرنے سے نہ جھجکیں اور ذاکرین و سامعین کے ذہن میں یہ خیال راسخ ہو جائے کہ ابکاو
بکا کے لئے جو کچھ بھی کیا جائے جو کچھ کہا جائے جو کچھ بھی سنا جائے سب کا سب جائز ہے بہ کثرت ایسے
ہی حضرات ہیں جن کا مبلغ علم صرف مرثیے غیر مستند اور معمولی کتابیں یا ذاکرین کا زبانی بیان ہے
وہ ہر واقعہ کو خواہ وہ من گھڑت ہی کیوں نہ ہو صحیح باور کرنے پر مجبور ہیں۔ میں نہ کوئی مجتہد ہوں
نہ عالم البتہ مجھ کو تاریخ سے فطری شغف ہے پچاس سال سے تمام دنیا کی ہسٹری (محیط التواریخ) لکھ رہا ہوں
جس کی ضخامت پچیس جلدوں سے زیادہ ہو چکی ہے اس وجہ سے مجھ کو اس فن میں کسی قدر تبصرہ حاصل ہو گیا
ہے یہ جلد بھی اسی بسیط تاریخ کا ایک حصہ تھی میری عمر اسی سال کے قریب پہونچ چکی واقعات کا سلسلہ
نامتناہی اور اس کا دامن قیامت کے دامن سے ملا ہوا ہے ہر چوبیس گھنٹہ میں کہ آفتاب عالمتاب اپنا دورہ
پورا کرے یا زمین اپنے محور پر گردش کر جائے دنیا کے ہر حصہ میں بیشمار حادثات رونما ہو جاتے ہیں میں ایشیا
یورپ افریقہ امریکہ کے جن تاریخوں کو مکمل کر چکا تھا ان کی جغرافیائی اور سیاسی حالت کو پچھلی جنگ عظیم
نے درہم برہم کر دیا اور اس کے بعد نئے نظام کو موجودہ جنگ عظیم الٹ پلٹ دیگی اس لئے میں اب اس کی تکمیل
سے قاصر ہوں اس لئے اس جلد کے متعلق میرے فرزند دلبند قرۃ العین سید طاہر حسین سلمہ۔ ایم اے۔ منشی فاضل
ادیب فاضل پروفیسر مہاراجہ کالج جے پور نے اصرار کیا کہ محیط التواریخ کے سلسلہ سے اس کو الگ کر کے شائع کر دیا جائے
اونہیں کی تحریک سے میں نے اس کے دو حصے کر دئے حصہ اول جو بطور مقدمہ ہے اس میں مختلف عنوانوں سے
اسباب و نتائج پر نقد و تبصرہ ماقل و ماول پر ضروری بحث واقعات کی صحت و عدم صحت پر تنقید وغیرہ درج

ہے دوسرے حصہ میں مفصل واقعات ان میں ضروری مقامات پر مورخانہ تنقید و بحث کی گئی ہے یہ کتاب دوسری کتب مقاتل کی طرح بکاوا بکا یا مجالس میں پڑھنے کے لئے نہیں لکھی گئی۔ بلکہ جو کچھ لکھا ہے وہ حتی الوسع تاریخی اصول پر ہے۔ بعض جگہ میں حق بات کہنے سے نہیں رکا حق بات کہی ہے اور اس کا کڑوا ہونا ہزاروں برس سے مسلم فریقین کے علمائے معتبر کی مستند کتابیں میری اس کتاب کا ماخذ ہیں جہاں ضروری سمجھا ہے آزادانہ جرح و تعدیل بھی کی ہے تاہم میں اپنی تحقیق و تفتیش کی صحت و صداقت کا حتماً دعویٰ نہیں کرتا ممکن ہے کہ میرا خیال ہے غلط ہو مجھے جہاں تک ہو سکا ان لوگوں کی نسبت بھی جنکو بعض مسلمان نصرت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں مکروہ الفاظ سے پرہیز کیا ہے کیونکہ یہ بات تہذیب و متانت کے خلاف ہے اب میں نہایت ادب کے ساتھ ناظرین کرام سے مستدعی ہوں کہ اگر کہیں غلطی ہو تو میری عدم قابلیت اور ایک بڑے کام کی طرف مصروفیت کو پیش نگاہ رکھ کر معذور سمجھیں اپنے صرف دینی خدمت سمجھ کر اس کام کو جیسا بھی ہو سکا انجام دیا ہے۔ یہ کتاب شہادت حسینؑ کو پورے تیرہ سو سال گذر جانے کی یادگار کے طور پر ناظرین کی خدمت میں پیش کی جاتی ہے میں ایک ایسا روسیاہ اور ننگ بنی نوع بندہ ہوں کہ ساری عمر ہزلیات و معاصی میں برباد کر کے گناہوں کے پشتارہ کو اس قدر گرانبار کر لیا ہے کہ اس کے وزن کو ہمالیہ جیسا پہاڑ بھی نہ اٹھا سکے میں نہیں جانتا کہ میرا کیا انجام ہوگا۔ اور اس ملک الملوک کے دربار میں جہاں ننگ و بادشاہ و گدا سب برابر ہیں مجھ جیسے عبد ذلیل کی روبکاری کس حیثیت سے ہوگی ہاں اسی غفار و ستار کی ذات پاک پر بھروسہ ہے جس نے "سبقت رحمتی علی غضبی" فرمایا ہے کیا عجب ہے کہ یہی چند ورق میرے لئے ذریعہ نجات ہو جائیں اور ارحم الراحمین بطفیل شفیع المذنبین و اہلبیت طاہرین اور بتصدق شہدائے کربلا میری اس سعی کو مشکور فرما کر اس گرفت سے جسکا میں مستحق ہوں معاف فرمادے۔

یارب بہ رسالت رسول الثقلین — یارب بہ غزا کنندہ بدر و حنین
عصیان مرا دو حصہ کن در عرصات — نیمے بہ حسنؑ بہ بخش و نیمے بہ حسینؑ

جے پور — خادم قوم و ملت
محرم سنہ ۱۳۶۱ھ — سید شاکر حسینؑ نقوی الامروہوی

مقدمہ

دنیا کا ہر واقعہ اور ہر حادثہ اہل بصیرت کے لئے ایک یاد اور غور کرنے والوں کیلئے ایک پیغام چھوڑ جاتا ہے اور اس پیغام کو اسکی کیفیات کے ساتھ یاد رکھنے کا نام تاریخ ہے پھر اس کو ضبط تحریر کر کے آئندہ آنیوالی نسلوں کے لئے محفوظ کرنا کس قدر ضروری ہے اس کا اندازہ اس واقعہ کی اہمیت کے ساتھ تعلق رکھتا ہے۔

عام طور پر ہر واقعہ کسی نہ کسی عنوان سے ضرور یاد رکھا جاتا ہے اور ہر حادثے میں ظالم اور مظلوم کے تصادم کو مورخ کا قلم آہستہ وار دکھانیکی کوشش بھی کرتا ہے مگر حادثے کے بعد ہی ایک خاص صورت پیدا ہونی لازمی ہے یعنی اگر مظلوم کا گروہ کامیاب ہو جائے تو پھر اس ظلم کا کفارہ ہو کر آہستہ آہستہ وہ واقعہ خود بھول جاتا ہے اور اگر ظالم سرفراز ہو تو اس کے حامی ہر ترکیب سے اس واقعہ اور اس کے حالات کو چھپانے کی کوشش کرتے ہیں اگر نہ چھپا سکیں تو اس میں اس قدر اختلاف شامل کرتے رہتے ہیں کہ برسوں میں گتھلیاں اور گتھلیوں میں بیرپل اسکی اہمیت کم بلکہ کمتر ہو جائے اور رفتہ رفتہ بجائے درس عمل کے وہ ایک من گھڑت افسانہ سا معلوم ہونے لگے دو سننے اور سمجھنے سے گئے یا بالاتر ہو جائے۔

اسی اصول کی روشنی میں اگر واقعہ کربلا کو جانچا جائے تو معلوم ہو جائیگا کہ تمام دنیا کی تاریخ ایسا ایک واقعہ بھی نہیں دکھا سکتی۔ ویسے تو ہر جگہ آہستہ آہستہ ظلم کا پیالہ لبریز ہو کر ضرور چھلکا ہے اور صدیوں صاحبان ہمت و جرأت کو ظلم کی تصویر کی نقاب کشائی میں لگے ہیں۔ مگر اللہ رے حسین ع کی جرأت کہ چند گھنٹوں میں وہ کام کر کے دکھا دیا کہ قومیں مل کر بھی سیکڑوں برس میں شاید اتنا کام نہ کر سکیں زیادہ نہیں دن کے ایک مختصر سے حصہ میں اپنے خون سے اپنے عزیزوں اور حبیبوں کے رنگین لہو سے ظلم کی تصویر میں ایسا گہرا رنگ بھر دیا کہ کوسوں دور سے۔ صدیوں کی منزلوں سے ظلم اور ظالم کی صورت ہر متنفس عریاں دیکھ لیتا ہے۔ اور وہ فقط اس لئے کہ حسین ع کو اپنے نانا اور ان کے لائے ہوئے دین سے محبت نہیں بلکہ عشق تھا۔ اور اس عشق کا کیا کہنا۔ ؎

صدق خلیل بھی ہے عشق۔ صبر حسین بھی ہے عشق ✦ معرکۂ وجود میں بدر و حنین بھی ہے عشق

غرضکہ بالکل یہی کیفیت اس واقعہ کے بعد بھی گذری۔ اگرچہ ظالم اور ظلم واقعہ کربلا کے بعد پریشان اور سرگرداں ضرور ہو گئے۔ اور اپنی آخری تمنا بھی پوری نہ کر سکے۔ مگر حسین ع اور حسین ع والوں کے حالات پر ہر وقت پردے ڈالنے کی کوشش میں لگے رہے۔ حسین ع کا نام لینا جرم قرار دیا گیا ان شیروں کی آخری آرامگاہ کی زیارت سیاسی عتاب کی وجہ قرار پائی۔ اس تصادم کو بیان کرنے کی کسی کو مجال نہ تھی مگر جسم مقید ہو سکتے ہیں۔ دل اور دماغ قید اور مجبور نہیں کئے جا سکتے دبستان کے جب دو آدمی بھی سر جوڑ کر بیٹھتے تو حسین کے زریں کارنامے دہرائے جاتے اور ظالموں کے لئے نفرین کے

الفاظ دل کی زبان سے نکلتے۔ آخر انقلاب آیا اور بنی امیہ کا تخت اور تختہ دونوں کو الٹ دیا گیا۔

بنی امیہ کے بعد بنی عباس نے چابکدستی سے بساط سیاست پر قبضہ جمالیا۔ بنی عباس چونکہ انقلاب کرنے والوں میں پیش پیش تھے اور اس واقعہ کی عظمت اور اہمیت کا خوب اندازہ کر چکے تھے۔ اس لئے آئینہ میں ان کو اپنے شیش محل کی بھی شکست نظر آرہی تھی لہٰذا انہوں نے قوت کے قلم سے ایسی کتابیں لکھوائیں جس میں حق ہیں اور حق کوش اس طرح کھو جائے کہ جادہ حق کو ڈھونڈنے سے بھی نہ پاسکے۔

ادھر سلطنتی مورخ یہ کام کر رہے تھے اور دوسری طرف دردمند زبانی روایتیں بیان کرتے رہتے تھے اور سننے والے دوسروں کو سناتے چلے جاتے تھے۔ اور ہر سنانے والا اپنے الفاظ میں مصوری کرتا چلا گیا۔ اور رفتہ رفتہ واقعات کچھ ایسے صورت اختیار کرنے لگے کہ ایک دوسرے سے بیگانہ معلوم ہوتے تھے۔

آخر یہ دور بھی اپنے کیفر کردار کو پہنچا۔ ظالم اور مظلوم دونوں ظاہری نگاہوں سے چھپ گئے اور کچھ آزادی کے سانس انسانوں نے لئے اور دل کھول کر ذکر حسین کیا گیا۔ لکھا گیا اور پڑھا جانے لگا۔ چونکہ مدتوں کی قید و بندش کے بعد ایسا موقعہ ملا تھا۔ ہر دردمند واقعات کربلا بیان کرنے میں بے دردی تک جا پہنچے اور جس ممکن اور غیر ممکن طریقے سے ہو سکا ذکر حسین کو جاری کرنے لگے اس دوڑ میں اصلی مقصد بھی ہاتھ سے نکل گیا۔ اور نکلا جا رہا ہے۔

آج ہی دیکھئے اور غور کیجئے۔ اس موجودہ دنیا کا کون انسان ہوگا جو حسین کے نام سے ناآشنا ہو۔ اول تو سال بھر کسی نہ کسی تقریب سے یہ نام کانوں تک پہنچتا رہتا ہے ورنہ محرم کا چاند دکھائی دیتے ہی زمین و آسمان سے حسین حسین کی آواز بلند ہو جاتی ہے۔ امام باڑوں کے در و دیوار علموں کے پھریرے۔ تعزیوں کے جلوس۔ تعزیت کی مجلسیں اور جلسے ہزاروں پوسٹر۔ لاکھوں اشتہار اور رسالے۔ ذاکرین کی پکار۔ واعظین کے پر عظمت بیان میں حسین اور حسین کے دل ہلانے والے کارنامے سنائی دیتے ہیں۔

مگر کتنے انسان ہیں جو اس قدر پر ہیبت درس عبرت سے کچھ سبق حاصل کرتے ہیں۔ ان سب واقعات اور حسین ع کی زریں قربانیوں کے نقشے کھینچتے ہیں اور اپنا مستقل اثر کئے بغیر چلے جاتے ہیں۔ محرم گذر جاتا ہے مجلسیں ختم ہو جاتی ہیں۔ رسالے پڑھ کر زیب الماری کر دئے جاتے ہیں۔ کان سنتے ہیں۔ آنکھیں پڑھتی ہیں۔ دل اور دماغ کانپ جاتے ہیں مگر جھوٹا سچا نہیں بن سکتا۔ ظالم اپنے ظلم سے باز نہیں آتا خائن امانت داری نہیں سیکھتا۔ رشوت لینے والا توبہ نہیں کرتا خلق خدا کے حقوق غصب کرنیوالا برابر غصب کئے جاتا ہے آخر یہ دل اور دماغ پتھر کے بن گئے ہیں۔ کیا حسین ؑ کے دامن سے وابستگی کا اعلان کرنے والے اس قدر بے حس ہو گئے۔ آیئے آپ اس کو سوچئے۔ اس مصیبت پر غور کیجئے اور اس آگ کو خاک میں ملنے سے بچائیے۔

غور فرمائیے کہ اسلام دین فطرت ہے۔ ہر بچہ خواہ کسی مذہب و ملت کا ہو۔ کسی رنگ کا ہو۔ وہ دین فطرت پر پیدا

ہوتا ہے۔ یعنی اس میں دینِ فطرت سمجھنے اور اس پر چلنے کی قابلیت اور اہلیت ضرور ہوتی ہے اور دینِ فطرت دوسرے لفظوں میں دینِ اسلام ہے۔ جس کی پیشانی پر قدرت نے لکھ دیا ہے کہ اس چند روزہ دنیا میں جیو اور جینے دو اس دین کو انسانوں اور انسانیت کے سرتاج ہمارے پیارے رسول لائے جن کو خدا نے انسانوں کے لئے رحمت بنا کر بھیجا۔ بلکہ دونوں جہان کیلئے رحمۃ للعالمین بنا کر بھیجا۔ اور انہوں نے اس دنیا میں ۶۳ سال زندگی گذار کر بتلا دیا کہ ایک مسلمان کو کس طرح جینا چاہیئے اور کس طرح مرنا چاہیئے۔

انہوں نے انسانوں کو پھول بنا دیا۔ جس کو ہر ایک اپنے پاس رکھ کر خوش ہوتا ہے انہوں نے خونخوار انسان کو رحیم اور کریم بنا دیا۔ انہوں نے امیر اور غریب کا فرق مٹا دیا۔ رسول اللہ نے بتا دیا اور کر کے دکھا دیا کہ انسان فقط خدا کے سامنے جھک سکتا ہے۔ اور اسی خدا کے بتائے ہوئے قانون پر چل کر انسانوں سے محبت کرتا ہے۔ اپنے غریب بھائیوں کو اپنی نعمتوں میں شریک کر لیتا ہے اور انہیں غریب بھائیوں کے سامنے عذر بھی کرتا ہے کہ مجھ سے حق خدمت ادا نہیں ہو سکا۔ ایسے مفصل اور مکمل قانون کا نام دین رکھا۔ اسلام رکھا۔ اسی دین کو اللہ نے اپنی مخلوق کے لئے پسند کر لیا اے کاش کہ اس دین پر دنیا چلتی اور اپنے چلن کے نمونے سے اوروں کو بھی گرویدہ کر لیتی اور یہ دنیا ایک امن کا گہوارہ ہو جاتی۔

مگر افسوس رسول اللہ کے بعد تھوڑے ہی دن گذرے تھے کہ حالت بدلنی شروع ہوئی اور اس ہرے بھرے گلزار کا مالی اور رکھوالا ایک ایسا شخص بن بیٹھا جو کسی طرح بھی اس لائق نہ تھا جس نے اپنی فوجوں کی طاقت اپنے خزانوں کے توڑوں سے۔ انسانوں کو دبانا۔ اور خریدنا شروع کر دیا۔

جمہور سے اخلاقی جراتیں چھین لیں۔ نیکیاں برباد ہو گئیں۔ فسق و فجور حرامکاری کا بازار گرم ہو گیا عدل کی جگہ ظلم نے سنبھال لی حق دبنے لگا۔ باطل ابھر کر مسند رسول پر ہو بیٹھا۔

زر بھی تھا ہاتھ میں ظالم کے مال و زر بھی تھا + سلک مروارید میں لپٹا ہوا خنجر بھی تھا

سب حق پرست سہم گئے۔ ڈر گئے۔ ظالم کے سامنے جھکنے لگے اور غضب پر غضب یہ تھا کہ یزید اپنے آپ کو رسولؐ کا حقیقی جانشین بھی منواتا تھا اور کمزور دل انسان جبراً و قہراً مان رہے تھے۔

ہاں مگر بے خوف تھا اک راکبِ دوشِ نبی   دستِ فاسق پر نہ کی بیعت کیا مرنا قبول

جان دے کر سلطنت کے بت کی پوجا روک دی   قوم میں بدعت جو ہوتی ہونے کو برپا روک دی

آج سے پورے تیرہ سو برس پہلے زمین کربلا پر ایک خونی ڈرامہ کھیلا گیا۔ جس میں رسول کے جان و جگر حسین نے سب سے بڑا خسارہ اٹھا لیا۔ پیارے بیٹے۔ جانثار عزیز۔ وفادار دوست اپنی آنکھوں کے سامنے شہید کرا دیئے۔ اپنا سر نثار کر دیا اپنا گھر لٹوا دیا۔ رسول اللہ کی پیاری نواسیاں قید کرا دیں دنیا کے سامنے ایک عظیم الشان سبق رکھ دیا کہ کامل انسان کبھی حق

سے نہیں گذرتا۔ جان سے گذر سکتا ہے اس کی زبان جھوٹ سے آلودہ نہیں ہو سکتی۔ بلکہ ظالم کی تلوار سے ٹکڑے ٹکڑے ہو سکتی ہے اس کے ہاتھ ظالموں کے شریک کار نہیں ہو سکتے۔ بلکہ میدان جنگ میں حق پر کٹ کر پامال ہو سکتے ہیں اس کے قدم ناحق کیطرف نہیں بڑھ سکتے۔ اس کا سر کسی ظالم کے سامنے جھک نہیں سکتا۔ بلکہ اللہ کے سجدے میں کٹ کر نیزے پر بلند ہو سکتا ہے۔ حسین کی بیمثال اور بینظیر قربانی ہم کو پکار رہی ہے کہ جاگو جاگو میرے بھولے ہوئے بھائیو جاگو اور اپنے ظاہر و باطن کا جائزہ لو اور حسین نے جو حق و صداقت، جانبازی اور جاں نثاری کا موجیں لیتا ہوا سمندر چھوڑا ہے اس میں سے دو دو گھونٹ پی کر حق کے متوالے بن جاؤ۔ آئیے آئیے میدان میں آئیے۔ ہے کوئی جو اپنے آپ کو مسلمان کہتا ہے نہیں بلکہ انسان کہلاتا ہے اور آج اپنے ضمیر سے عہد کرے کہ حق پر قائم ہو جائے۔ اسکا سر فقط خدا کے سامنے جھکے۔ اس کی آنکھوں میں عفت کا سرمہ رہے۔ اس کے قلب سے غیر خدا کا خوف نکل جائے اسکی زبان فقط سچائی کی شمشیر برہنہ بن کر چمکے۔ اس کا پیٹ، سود۔ رشوت۔ غصب کے مال۔ حرام اور نجس اور ناپاک چیزوں کے لئے بند ہو جائے۔ اس کا وجود ہر انسان کے لئے محبت اور شفقت کا گہوارہ بن جائے۔ اور اس مقدس عہد کے لئے جان ہتھیلی پر رکھدے کسی نے کیا خوب کہا ہے

حسین کا سر ہے آسمان پر کبھی رہا تھا سر سنان پر ✦ تو کم سے کم سر بکف تو ہو جا اگر ہے ہونا بلند تجھ کو

مگر یہ سب کچھ اسیوقت ہو سکتا ہے جبکہ واقعات کربلا صحیح تاریخ کے لباس میں ہر شخص کیسامنے پیش کئے جا سکیں ورنہ موجودہ ذکر حسینؑ میں تو عجیب و غریب بے ربطی سی پیدا ہو رہی ہے ایک فریق تعزیہ۔ باجہ۔ اور مختلف کھیل کود کے سامان مہیا کر کے ایک تہوار کی رسم ادا کرتا ہے اور خاموش ہو جاتا ہے مگر اس میں ان کا قصور بہت تھوڑا ہے کیونکہ یہ یادگار ہے اس ظالمانہ دور کی جبکہ واقعہ کربلا اپنے پورے اثرات کیساتھ بیان کرنا جرم تھا۔ اسلئے دور بیں حضرات نے ان رسموں کے پردے ڈال کر عوام کے دلوں میں دماغوں میں حسین کا نام نقش کرنا چاہا اور کر دیا اب یہ ہمارا فرض ہے کہ تصویر کے اس رخ کو بھی اور اپنی گفتار، رفتار اور کردار کے ذریعہ اپنے بھولے بھٹکے بھائیوں کو اپنے ساتھ لے کر چلیں اسکے علاوہ دوسرا فریق مجلس ماتم جلوس۔ نذر نیاز کے ساتھ غم حسین کو تازہ ضرور کرتا ہے مگر اسکی اصلی غرض و غایت سے بے نیاز ہو کر وہ ان تمام رسموں اور اخراجات کو سوداگرانہ صواب کے شیشے میں جمع کرتا رہتا ہے اس کے ذمہ دار ہمارے واعظین۔ ذاکرین ہماری کتابیں۔ مرثیے جنہوں نے روایتی ترکیب سے تاریخی حیثیت حاصل کر لی اور ان پر کسی قسم کی نکتہ چینی گناہ اور بداعتمادی کے مترادف ہو چکی ہے

مجھے ذاتی طور پر علم ہے کہ ہمارے ملک میں ہزاروں دل ایسے موجود ہیں جو حسین پر نہیں بلکہ ذکر حسین کے اس طور پر بے اثر کر دینے پر تڑپتے ہیں انکی آنکھیں حسین سے زیادہ قربانی حسین کو افسانہ اور قصہ کہانی بنتے دیکھکر روتی ہیں کبھی کبھی دبے سروں میں آواز بھی اٹھتی ہے مگر تقدس کی دھونس ان کو دبا دیتی ہے۔

ہزار اور صد ہزار آفریں مولینا شاکر حسین صاحب پر جنہوں نے اس موضوع پر شمشیر قلم سے ایسی کتاب لکھدی کہ جو کچھ ہمارا دل چاہتا تھا اس سے ہزار درجہ زیادہ لکھدیا اس ابر گوہر بار میں تاریخ کی چمک۔ تحقیق کی دمک ہے۔ حسین کی اس عظیم الشان

قربانی کی ہر گرہ کو اس خوش اسلوبی سے کھولا ہے اور ہر واقعہ بلکہ حسینی کارنامے کی ہر شاخ کو ایسی دماغ سوزی اور چھان بین سے صاف کیا ہے کہ نکتہ نکتہ صاف نظر آتا ہے تمام موضوع اور غیر ثقہ روایتیں مجروح حدیثیں۔ حقیقت واقعات کو تحقیق کے اصول پر کستا ہے راویوں پر سیر حاصل بحث کر کے اصلی واقعات کو بالکل پاک کر دیا ہے۔

کتاب کی سیر کرنے سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مولینا موصوف نے باوجود پیرانہ سالی اور اپنے ضعف و نقاہت کے حبیب ابن مظاہر کی طرح جوانوں کو پیچھے بٹھا دیا اور تاریخ کے بحر ناپیدا کنار سمندر میں غوطہ لگا کر تمام و شہوار اور گوہر شب چراغ چن چن کر باہر نکال لائے ہیں اور ساتھ ساتھ مولینا کی بزرگانہ تنقید اور ہدایتیں قومی درد کا نشان دے رہی ہیں حقیقت یہ ہے کہ مجاہد عالم عوام سے زیادہ خواص کے دستور العمل بننے کے قابل کتاب ہے کاش ہر واعظ اور ذاکر اس کتاب کو پڑھے۔ سوچ سمجھے اور غور کرے مگر نیک نیتی سے غور کرے کیونکہ تاجرانہ ذکر بیان کرنیوالوں کیلئے یہ حجاب ہے ان کو اس کتاب کا ایک ایک لفظ کھلیگا۔ خیر مضائقہ نہیں۔ انشاء اللہ یہ عظیم المرتبت کتاب اپنا اثر کئے بغیر نہ رہیگی اور رہنما دلوں اور دماغوں میں ضرور انقلاب عظیم پیدا کرے گی پڑھنے والے اوروں کو پڑھوائینگے۔ سنائیں گے اور پھر اپنی زندگی کے ہر پہلو پر خود تنقید کریں گے فلسفۂ شہادت اور ذکر شہادت کو نکھرا ہوا دیکھ کر اپنی زندگی کو بدلنے کی کوشش کریں گے انشاء اللہ۔

اس عظیم الشان کتاب کے لکھتے وقت۔ روایتوں اور کتابوں کو چھانتے ہوئے اور چھپوانے کی تگ و دو میں اور آجکل کی غیر متعلق رسموں پر اصلاحی اشارے اور ہدایتیں لکھوانے میں جو محنت اور جانکاہی مولینا کے قرۃ العین پروفیسر سید طاہر حسین صاحب ایم۔ اے نے فرمائی ہے اسکی تعریف نہیں ہوسکتی اگر اس کتاب کے درخشاں نتائج میں ان کو برابر کا شریک کہا جائے تو کچھ بیجا نہ ہوگا خدا کرے کہ وہ اس کا دوسرا حصہ بہت جلد زیور طباعت سے آراستہ فرمادیں کیونکہ اس کتاب کو پڑھکر انسان کا دل اور دماغ بالکل پاک و صاف ہوکر کربلا اور کربلا والوں کے صحیح حالات کا اسقدر منتظر ہو جاتا ہے کہ بیچین سا معلوم ہونے لگتا ہے چونکہ اس احقر کی نظر سے دوسرے حصہ کا مسودہ گذرا ہے میں فخریہ عرض کرسکتا ہوں کہ فضائل حسین میں اسقدر صاف۔ صحیح اور دلچسپ دل ہلادینے والی کوئی کتاب نہیں لکھی گئی بالکل ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ناظر کتاب خود حسینی قافلہ کے ساتھ ساتھ اپنے آقا کی رکاب تھامے چل رہا ہے اور ہر واقعہ اپنی آنکھوں سے دیکھ رہا ہے ہر بات اپنے کانوں سے سُن رہا ہے حیران ہوں کہ اس دوسرے حصہ میں مولینا کے قلم میں یہ زور اور یہ رنگینی کہاں سے آگئی یہ کچھ اُدھر کا ہی فیضان معلوم ہوتا ہے۔ خدا کرے کہ دوسرا حصہ بہت جلد پردۂ شہود پر آجائے

آخر میں پھر دعا مانگتا ہوں کہ یا اللہ مولینا موصوف جو درویشانہ انداز میں علم کا چراغ روشن کئے بیٹھے ہیں ان کو اپنے اور فقط اپنے حبیب کے صدقے میں اس سے زیادہ ملک و ملت کی خدمت کی ہمت عطا فرما۔ اور قوم کو اس گراں بہا جوہر سے اپنے اپنے دیئے روشن کرنے کی توفیق دے۔ آمین

دعا کا محتاج

طاہر نبیرۂ حضرت آزاد

یکم مئی سنہ ۴۲ء

فہرست مندرجات

باسمہ سبحانہ

الحمد للہ علی نوالہ والصلوٰۃ والسلام علی خواص رجالہ السنۃ اقوالہ و
مصادر فواضلہ ومفاتیح افضالہ واعلی امثالہ علل الوجود واسرار السجود محمد وآلہ

امابعد کثرت مشاغل شرعیہ اور عدیم الفرصتی کے باوجود میں نے اس کتاب لاجواب مجاہد اعظم
جلد اول مصنفہ بدر سماء الفضل والافادہ نجم فلک الشرف والسعادہ مرز الشرف والفخار حلیف العز والوقار اسوۃ
الاماجد الکرام وصفوۃ الاطائب العظام المتمسک بالثقلین جناب المولوی شاکر حسین صاحب لازال فی درع
الامان من مکارہ الزمان کو مختلف مقامات سے مطالعہ کیا خاص کر عناوین فلسفہ شہادت، تنقید واقعات
تاریخ اصلاح رسوم تعزیہ داری کے متعلق جن براہین قاطعہ اور دلائل ساطعہ سے اسمیں احقاق حق وابطال
باطل کیا گیا ہے وہ عین ہدایت پر مبنی ہے، فلما طالعتہ وجدتہ یاضح حکمۃ ورضوان سیفا قاطعا لا
لسنۃ الزیغ والطغیان وبرہانا ناطقا لاہل البرہان ونورا لامعا لاہل القسط والایمان وشہابا
ثاقبا للشیاطین الانس والجان تنتعش بفہم براہینہ القلوب والابدان وتزداد بذلک معاینۃ الروح
فی عالم الامکان فیزداد ثقۃ فی الدین والاتقان لاہل التقوی والایمان لانہ قد احتوی علی امثلۃ رائقۃ
ومطالب فائقۃ بالبراہین القاطعۃ والحجج الساطعۃ فانہ ایدہ اللہ وابدع اتعب نفسہ
فی مرضاۃ ربہ طلبا لمراضیہ جعل اللہ مستقبل امرہ خیرا من ماضیہ وکانی لا اراہ الا مجاہدا
ھمہ رونق صلاح الناس فی ادیانہم ونجاحہم فی ابدانہم شکر اللہ مساعیہ الجمیلۃ واجزل
علیہ من مواہبہ الجلیلۃ فجزاہ اللہ عن حمایۃ الحق حق الجزاء ووقاہ عن شر الاعداء
انما دعاہ الی ذلک بالخصوص ما لہ من قوۃ الایمان والخلوص فی تمسک الحق بالنصوص
فعلی قاطبۃ المومنین ان یعاونوہ علی ترویج کتابہ ونشر دانہ ولی التوفیق وھو خیر رفیق

نمقہ خادم الشریعۃ المطہرہ
علی الحائری اعلی اللہ مقامہ

مہر

دار الشریعۃ - سادات گنج
لاہور

نقل تقریظ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

شہادت کیا شئے ہے

اصطلاح میں شہادت اس قربانی کو کہتے ہیں جو مذہبی یا ملکی یا معاشرتی امور کی حفاظت و حمایت میں ظاہر ہو۔ یعنی اگر کوئی شخص مذہب یا ملک یا مال یا آبرو کی حفاظت میں جان دیدے تو اُسے شہید کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ ممکن ہے کہ دوسرے مذاہب و ملل میں بھی شہادت کے لفظ کا کوئی مفہوم باقاعدہ موجود ہو۔ لیکن اسلام نے شہادت کے مفہوم کو نہایت ہی عظیم الشان پیرایہ میں بیان کیا ہے۔

اسلام نے دنیا میں سب سے زیادہ زبردست زلزلہ خیز اور ولولہ انگیز جو چیز پیدا کی وہ شہادت کا عقیدہ تھا، جو شخص اسلام کے آگے سر جھکاتا تھا۔ اپنے وجود کو شہادت کی قربان گاہ میں فنا کر دینے کا متمنی اور طلبگار نظر آتا تھا مسلمانوں کو یقین ہو گیا تھا کہ ایک وجود کی فنا دوسرے وجود کے بقا کے لئے لازمی ہے۔ جب تک ہم اپنے اجسام کو اسلام پر نثار نہ کر دیں گے، جسد اسلام مستحکم کائنات نہیں بن سکتا۔ لہٰذا اُن کے جوانوں پر ہی منحصر نہیں، بلکہ بوڑھوں، بچوں، اور عورتوں تک میں شوق شہادت کا جذبہ موجیں مارتا نظر آتا تھا۔ گو عام جذبۂ شہادت میں مذہب اسلام کا ہر متنفس یکساں حصہ لینا اپنا فرض سمجھتا تھا۔ لیکن یہ ذوق شہادت جس گھرانے کا عطیہ تھا۔ خدائے تعالےٰ نے اسی خاندان کو مکمل ترین نمونہ بنا کر دکھا دیا۔ جس سے شہادت کی اصلی شان نظر آگئی

مگر ہم پہلے یہ بتانا چاہتے ہیں کہ اس کائنات ہستی میں، ایک شئے کا وجود، دوسری شے کی شہادت، فنا ات ہوتا ہے جنس انسان سے قطع نظر کرکے عناصر اربعہ کے اجزا کو علیحدہ علیحدہ دیکھئے کہ جب تک ایک وجود فنا نہیں ہوتا۔ دوسرا وجود ہستی پذیر نہیں ہوسکتا۔ ایک بھاپ کو لیجئے۔ جس کے بل پر دنیا کے کارخانے چل رہے ہیں۔ ریلیں دوڑتی پھرتی ہیں، جہاز سمندر میں رواں اور دواں نظر آتے ہیں یہ کیا ہے، اور کیونکر پیدا ہوتی ہے؟ سب جانتے ہیں کہ پانی کی شہادت اور قربانی سے (جو آگ کی تپش سے ہوتی ہے) بھاپ کا طلسمی جسم تیار ہوتا ہے یعنی پانی آتشی حرارت کے خنجر سے ذبح ہوکر جسم کو چھوڑتا اور بھاپ کی شکل اختیار کرلیتا ہے۔ دانہ خاک میں ملتا ہے اپنا نام و نشاں مٹاتا ہے۔ تو درخت اور غلہ۔ پھل اور پھول کا وجود ظاہر ہوتا ہے۔ روئی اپنے وجود کو قربان کرتی ہے۔ تو سوت تیار ہوتا ہے۔ اور آدمی کی تن پوشی کے قابل بنتا ہے۔ ورنہ سب برہنہ ہی پھرتے۔ کھانے میں صرف دانے کی مثال پر موقوف نہیں۔ دانہ کے بعد شہادت اور قربانی کا سلسلہ دور تک چلا جاتا ہے۔ دانوں کی شہادت سے آٹا ظاہر ہوتا ہے۔ آٹے کی شہادت سے روٹی نمودار ہوتی ہے۔ روٹی کی شہادت سے پرورش کا ظہور ہوتا ہے۔ تیل نہ جلے تو روشنی کہاں سے پیدا ہو۔ بتی آتشی آرہ سر پر نہ چلوائے۔ تو سب اندھیرے میں ٹکراتے پھرتیں۔ باغ میں جائیے۔ نہر کا پانی درختوں میں آکر جذب و فنا ہو رہا ہوگا۔ باغ کی شادابی اسی شہادت پر منحصر ہے، پانی قربان نہ ہو تو درخت جل کر رہ جائیں۔ المختصر اسی شہادت کی بنیاد پر عالم ہستی کا سب کارخانہ قائم ہے۔

اب یہاں نہایت باریک اور نازک سوال پیدا ہوتا ہے کہ جب شہادت کارخانۂ عالم میں ایسی ضروری اور مفید شے ہے۔ تو اس کے میسر ہونے پر ماتم کیوں کیا جاتا ہے۔ غم و افسوس کا اس سے کیا تعلق، آہ و بکا کو اس سے کیا سروکار، مگر یہ کچھ ایسی پیچیدہ بات نہیں جس کا سمجھنا مشکل ہو۔ جو چیز شہید ہو رہی ہے اس کو تو اپنی موت کا کچھ افسوس و غم نہیں ہوتا۔ نہایت بے پروائی اور اطمینان سے اپنی ہستی مٹانے کو آمادہ ہو جاتی ہے۔ لیکن غیروں کے دل پر اس کی چوٹ

لگنا مقتضائے فطرت ہے، بشرطیکہ ان دلوں میں انسانی حس اور دردشناسی کا مادہ بھی ہو۔ یہ تو بہت بڑی خود غرضی ہے کہ جس چیز نے ہمارے فائدے کے لئے اپنی جان دیدی ہے اس کا رنج بھی نہ کریں۔ جو بتی پہلے جل چکی ہے۔ اس کا سرا جلد ہی آگ پکڑ لیتا ہے۔ لیکن نئی بتی کو جس نے پہلے آگ کی شکل نہ دیکھی ہو مشکل سے روشن کیا جاتا ہے۔ اسی طرح جن دلوں میں قدرت نے محبت و ہمدردی ودیعت فرمائی ہے، وہ تو عالم کی تمام شہادتوں سے درد محسوس کرتے اور اثر پذیر ہوتے ہیں لیکن جو ازل سے سنگین سرشت پیدا ہوئے ہیں وہ اس بھید کو سمجھنا تو کجا۔ سمجھنا چاہتے ہی نہیں۔

"اسلام میں شہادت کی ابتدا"

اور حسینی شہادت کی خصوصیات

یہ معلوم کرنے کے بعد کہ شہادت کیا چیز ہے، اور دنیا میں اس کے بل پر صدہا کام چلتے ہیں۔ اب یہ جاننا چاہیے، کہ اسلام میں شہادت کا دور کب شروع ہوا۔ اور کون کون بزرگ سب سے پہلے شہادت کے وارث قرار پائے، جناب ختمی مآب صلعم کو سب سے اول بدر کا معرکہ پیش آیا، اس لڑائی میں جو مسلمان شہید ہوئے، ان کا رتبہ بعد کی لڑائیوں کے شہداء سے زیادہ مانا جاتا ہے، بلکہ جو لوگ زندہ بچے وہ بھی شرکت بدر کا فخر شہدا کی طرح کرتے تھے۔ اور مسلمان اُن کے اعزاز کو تسلیم کرکے ان کی عظمت و بزرگی کو دوسرے مجاہدین پر فوق دیتے تھے اسی طرح شہادت کا سلسلہ بدر سے اُحد اور اس کے بعد دوسرے معرکوں کے سبب بڑھتا گیا۔ یہاں تک، کہ مسلمانوں میں آج تک دین کی حفاظت وحمایت میں جان دینا شہادت خیال کیا جاتا ہے۔

لڑائیوں سے قطع نظر کرکے اسلام میں سب سے پہلے حضرت عمر فاروق ہیں۔ جو ایک مجوسی غلام کے ہاتھ سے مسجد میں قتل ہوئے۔ آپ کے بعد تیسرے خلیفہ حضرت عثمان غنی کو مسلمان

کے ایک گروہ نے ہی قتل کر دیا۔ اِن واقعات نے یہ راستہ کھول دیا کہ خود مسلمان اپنے ہم مذہبوں کو شہید کرنے لگے۔ حالانکہ اس سے پہلے صرف مشرکین کے ہاتھ سے یہ درجۂ عالی حاصل ہوا کرتا تھا۔ جناب امیر کی شہادت بھی ایک مسلمان کے ہاتھ سے ہوئی اور اس کے بعد حضرت امام حسنؑ کو بھی مسلمانوں نے ہی زہر دیکر شہید کر ڈالا۔ پھر امام حسینؑ کو کربلا میں بلا کر مسلمانوں نے ہی بھوکا پیاسا ذبح کیا۔ یہی وہ شہادت ہے جو اسلام میں سب شہادتوں سے زیادہ مشہور، زیادہ پُر درد، زیادہ درجہ والی، زیادہ ہر دلعزیز اور نہایت ہی مہتم بالشان مانی جاتی ہے۔ بلکہ تسلسل واقعات کے لحاظ سے اس کی نظیر تمام دنیا میں نہیں ملتی۔

حسینی شہادت کو اتنی اہمیت کیوں دی جاتی ہے، حالانکہ اِس سے پہلے اور اس کے بعد سینکڑوں مسلمان نہایت بیکسی اور بے بسی کی حالت میں شہید کیے گئے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ جو حالات و واقعات حضرت سید الشہداء کو پیش آئے۔ ان کا نہ گذشتہ تاریخوں میں ذکر پایا جاتا ہے نہ بعد کے تذکروں میں، خواہ وہ کسی ملک اور کسی قوم کے ہوں۔ اس قسم اور اس طرز کا کوئی واقعہ موجود نہیں ہے۔

شہادت حسینی میں حسب ذیل خصوصیات ہیں جو اور کہیں نہیں پائی جاتیں۔

(۱) آپ اُس زمانہ میں تھے، جب کہ اسلام کا نشو و نما تازہ ہی تھا۔ ہر فرد کے دل میں اپنے مذہب کی محبت ہر چیز سے زیادہ تھی۔ خصوصاً اپنے پیغمبر کی الفت میں ہر مسلمان کا یہ عالم تھا کہ وہ دل و جان سے آنحضرت پر نثار تھا اور آپ سے تعلق کی ادنیٰ سے ادنیٰ چیز مسلمانوں میں بڑے ادب و احترام کی مستحق مانی جاتی تھی۔ ایسی حالت میں اور ایسے زمانہ میں خاص رسول اللہ کے نواسے اور نواسیوں پر انتہا سے زیادہ دردناک ظلم و ستم کس قدر عجیب اور موجب حیرت تھا۔ حضرت سید الشہداء کے قلب مبارک پر جو صدمہ ان لوگوں کی بے وفائی اور جفا شعاری سے گذرا وہ ہزار تیر و سنان سے بڑھ کر تھا۔ کل کی بات ہے کہ جو لوگ فرزند رسول ہونے کی حیثیت سے اپنی آنکھیں میرے قدموں کے نیچے بچھاتے تھے آج وہی مسلمان ہیں کہ میرے سینہ

پر پاؤں رکھ کر گلا کاٹنے کو تیار ہیں۔

(۲) اہل و عیال کی معیت بھی ایک ایسی خصوصیت ہے جس کی نظیر تاریخ میں کم ملے گی۔ ممکن ہے کہ کسی مقتول کے ساتھ اس کے خاندان والے بھی ہوں، مگر جو حالت آپ کو بال بچوں کے ہمراہ ہونے سے پیش آئی، وہ اور کسی کو ہرگز ہرگز پیش نہ آئی ہوگی۔ مختلف سن و سال کی عورتیں ننھے ننھے بچے ساتھ ہیں۔ ایک بیمار بھی جس کو ہر قوم اور ہر مذہب نے قابل رحم سمجھا ہے۔ تین روز تک بھوک اور پیاس سے تڑپے۔ اس صورت انگیز مصیبت کی سختی ناقابل برداشت تھی۔ لیکن آپ نے بڑے ضبط و استقلال سے اس کو بھی جھیلا۔

(۳) بھوک اور پیاس میں بہت آدمی جان بحق تسلیم ہوئے ہوں گے۔ الا جو کیفیت حضرت اور آپ کے خاندان کی تھی وہ کسی کو پیش نہیں آئی۔ تقریباً پورے دو دن اور دو رات بھوکا پیاسا رہنا۔ گرمی کا موسم، عرب کی گرمی، چاروں طرف سے دشمنوں کا نرغہ، بچوں کی زبانیں پیاس کے مارے نکلی پڑتی تھیں، دریا آنکھوں کے سامنے لہرا رہا تھا، حضرت یہ ہولناک مناظر دیکھ رہے تھے اور راضی برضا تھے۔ ایسی دردناک تکالیف کو برداشت کرنا اور جادۂ حق سے قدم نہ ہٹانا اس شہادت کی اعلیٰ خصوصیت ہے۔

(۴) سارا کنبہ آنکھوں کے سامنے کٹ گیا، سوائے ایک فرزند بیمار کے کوئی باقی نہ رہا۔ اس پر بھی قول حق کی حمایت کرنا اور اپنا سر دینے کو بخوشی تیار ہو جانا مخصوص شہادت کا ثبوت ہے۔

(۵) اپنے اصول اور اپنے اشغال کو آخر دم تک جاری رکھنا اور ہجوم مصائب سے حواس باختہ نہ ہونا یہ امام کا ہی کام ہے، اس سے بڑھ کر اور کیا ہوگا کہ سر کٹتے کٹتے نماز پڑھی۔ اور فریضۂ عبادت کو ناغہ نہ کیا، کیا کسی قوم کی تاریخ ان خصوصیات کے ساتھ۔ شہادت کی کوئی نظیر پیش کر سکتی ہے نہیں کر سکتی اور یقیناً نہیں کر سکتی، یہی خصوصیات ہیں جنہوں نے شہادت حسینی کو نہ صرف اسلام۔ بلکہ تمام اقوام عالم کی تاریخ میں ایک خاص امتیازی درجہ کا مستحق قرار دیا ہے۔

ابتلا اور اُس کی حکمت

اگر ہم دنیا کے ان مذاہب کی تاریخوں کو دیکھیں جنہیں آسمانی مذہب کہا جاتا ہے۔ اور جو یہ دعوی کرتے ہیں کہ انہیں الہامی کتابیں دی گئی ہیں تو ہمیں معلوم ہو جائے گا کہ ایسے مذہب و ادیان کے ان لوگوں کی لائف جو ان کے اعلےٰ لیڈر رہبر یا بانی تھے۔ پُر درد واقعات اور پُر خوف حادثات سے مملو ہے۔ اگرچہ یہ لوگ خدائے قدیر کی طرف سے دنیا اور انسانی جماعتوں کے واسطے بھیجے گئے تھے۔ اور اس کی لاانتہا برکتیں اور عنایتیں ہر وقت ان کے شامل حال تھیں۔ اور انہیں وہ اطمینان حاصل تھا جو ان کے درجۂ رفیع کے لائق اور ڈیوٹی (فرض منصبی) کے لئے ضروری تھا۔ مگر باوجود ان عنایتوں اور مہربانیوں کے اظہار حق اور اعلان کلمۃ اللہ میں ان بزرگوں اور بانیان ادیان نے غیروں یا اپنوں کے ہاتھ سے جو جو تکلیفیں اور مصیبتیں اٹھائیں۔ ان کا احصاء و شمار دشوار ہے۔

حضرت آدم کی بعثت سے ان آسمانی مذاہب کا سلسلہ شروع ہوا۔ ایک طرف سے ہمارے ابوالآبا حضرت آدم ہمارے واسطے قانون الٰہی ساتھ لائے۔ دوسری جانب سے مذہبی رہبروں کے واسطے آزمائشی سلسلوں اور امتحانی مصیبتوں کا آغاز ہوا۔ گویا مذہب کے ساتھ ہی ساتھ آزمائش بھی شروع ہوئی۔ یہ امر ضروری تھا کہ انسان بالخصوص مذہب کے بانی اور دوسرے سچے پیرو اور صادق ریفارمر (مصلح) آزمائش میں مبتلا کئے جائیں۔ کیونکہ سونا جب تک کٹھالی اور آگ میں نہ ڈالا جائے۔ اس وقت تک اس کے جرم سے وہ ارضی ذرّے اور کدورت آمیز جوہر جو زمین ہی سے اس کے ساتھ چلے آتے ہیں دور نہیں ہو سکتے۔ سونا اگرچہ آگ میں ڈالے جانے سے پہلے بھی سونا ہی تھا۔ مگر آگ کی قوت سے مقابلہ کر کے اس نے ثابت کر دیا۔ کہ وہ ہر ایک آزمائش میں کامل ہے۔ اشیاء اور طاقتوں کی اصلی کیفیت اور حقیقت اسی وقت کھلتی ہے جب کہ وہ آزمائش میں پوری اتریں۔

حضرت آدم صفی اللہ کے بعد جس قدر انبیا مذاہب حقہ کے بانی تھے ۔ اس دنیا میں مبعوث ہوئے۔ ان کو ایسی ہی [redacted] کو سب سے اول ایسی جماعت سے مقابلہ کرنا پڑا۔ جو ان کے مواعظ اور اصلاحات کی بالکل مخالف اور سد راہ تھی ۔ یہ ایک عجیب بات ہے کہ اس مخالف جماعت میں ایسے لوگ بھی شامل تھے جو بانیان مذاہب کی تلقین و تعلیم کی خوبیوں کو اچھی طرح سمجھتے تھے ۔ انہیں کماحقہ آگاہی بھی کہ یہ لوگ حق پر ہیں لیکن ان کے خبث نفس نے نہ چھوڑا ۔ کہ سیدھے راستہ پر چلیں ۔

یہ بات مان لی گئی ہے کہ انسانی طبیعتیں اُن امور کی طرف جو جسم اور نفس سے متعلق ہوں بآسانی سے رجوع لاتی ہیں اور جو امور معاد یا تزکیہ نفس سے علاقہ رکھتے ہوں ان کو کسی قدر دقت سے قبول کرتی ہیں ۔ یہی وجہ ہے کہ جماعت حقہ اور بانیان مذاہب کی ہمیشہ بڑے زور سے مخالفتیں ہوتی رہیں اور ان بزرگان دین کو ایسی ایسی مصیبتیں اور تکلیفیں دی گئیں ۔ جن کا برداشت کرنا انہیں کا کام تھا ۔ یہ ابتلا اور آزمائش ابتداء سے ہی ان بزرگوں کے شامل حال رہی ۔ حضرت آدم سے حضرت عیسےٰ تک عموماً یہ مصیبتیں صرف انبیا کے حصہ میں آتی رہیں اور ان سختیوں کا جھیلنا فقط اُن ہی کا حوصلہ تھا ۔ ان کے تابعین اس بار عظیم کو اُٹھانے کے لائق نہ تھے ۔

اگر ہم انبیائے سابقین کی مخالف جماعت کو دیکھیں تو معلوم ہو جائے گا کہ ان کے دشمن وہ لوگ رہے جو ابتداہی سے معاند اور سرکش تھے ۔ ایسے لوگ بہت ہی کم بلکہ نہیں نکلیں گے ۔ جو ان کو تسلیم بھی کرتے ہوں اور ان کے مخالف اور ایذا رساں بھی ہوں ۔ ابراہیم علیہ السلام کے مخالف وہی تھے جو ان کے کسی اصول و عظمت کو نہیں مانتے تھے ۔ موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ جو جماعت مخالفت کرتی تھی وہ ہر بات میں ان کے مخالف تھی ۔ عیسیٰ علیہ السلام کے مخالف یہود تھے ۔ وہ حضرت کو مسیح موعود نہیں سمجھتے تھے ایسے لوگوں کی مخالفت اور معاندت جو کسی شخص کو حق پر نہ سمجھتے ہوں بمقابلہ اس مخالفت اور کج روی کے جو کسی شخص کو عین حق پر جان کر کی جائے قابل

افسوس اور لائق تعجب نہیں ہوتی۔ ہاں اگر کوئی شخص جان بوجھ کر کوئی نامحمود حرکت کرے تو وہ واقعی نہایت مذموم ہوتی ہے ناواقفیت کی حالت میں مخالفوں کی نسبت تو ہم کہہ سکتے ہیں کہ اُن کو ان مراتب علیا کا علم نہ تھا۔ لیکن جو لوگ دیدہ و دانستہ اندھے بہرے بن جائیں ان پر جس قدر تاسف کیا جائے کم ہے۔

انبیائے سابقین اور خاتم النبیین کی ابتلا میں خاص امتیاز

ابتلا کی رہیں اور آزمائش کے طریقے جو پہلے انبیاء کے لئے مخصوص تھے۔ وہ حضرت مسیح تک ہی محدود رہے۔ حضرت خاتم المرسلین کی بعثت سے مذہبی دنیا کی مصیبتوں اور آزمائشوں کی طرز و روش بدل گئی۔ سید الانبیاء خود بھی اس قدر مصیبتوں اور آزمائشوں میں مبتلا کئے گئے کہ آپ خود فرماتے تھے "ما اوذی نبی مثلی قط" تاہم مشیت ایزدی میں بعض ایسی بھی مصیبتیں مقدر ہو چکی تھیں جو انبیائے سابق کے مصائب سے بالاتر اور زیادہ ہولناک ہیں چونکہ خاتم الانبیاء پر سلسلۂ نبوت ختم کر دیا گیا تھا اس لئے اعلےٰ درجہ کی مصیبتوں اور بلاؤں کا سلسلہ بھی اسی زمانۂ نبوت میں ختم ہونا چاہیئے تھا، اس عطائے ربانی کے یا تو خود حضرت ہی مستحق ہو سکتے ہیں۔ یا آپ کی طرف سے ایسا شخص جو آپ ہی کا آئینہ کمالات اور آپ ہی کا گوشت و پوست ہو، نبی آخرالزماں جو سلسلۂ انبیا اور سلسلہ ہدایت کو مکمل اور متمم کر کے ختم کرنے کے لئے۔ دنیا میں مبعوث ہوا تھا۔ اُس کے واسطے یہ امر نہایت ہی ضروری تھا کہ وہ تمام انبیا کی صفات و فضائل سے ممتاز ہو، اور ان کی تمام بلاؤں اور آزمائشوں میں مبتلا کیا جائے بلکہ اس کے منصب اور درجہ کو دیکھتے ہوئے اس کی مصیبت اور آزمائش کا طریقہ بھی دوسرے انبیا سے افضل اور نرالا ہو۔ تمام انبیائے سلف طرح طرح کی مصیبتوں اور آزمائشوں میں مبتلا ہوتے رہے اور مخالفین کے ہاتھ سے ستائے گئے۔ بعض کو درجۂ شہادت بھی ملا۔ لیکن سردار انبیا کو بظاہر درجہ شہادت بذات خود حاصل نہیں ہوا۔ اس درجۂ عظمےٰ اور شہادت کبریٰ کا قدرت نے جناب ختمی مآب کے فرزند سید الشہدا کے نام نامی پر قرعہ ڈالا۔ گویا یہ رتبہ

دراصل حق نبوت تھا چونکہ اس آزمائش اور امتحان کی نوعیت گذشتہ طریقوں سے بالکل الگ تھی۔ اس لئے قادر ذوالجلال نے بظاہر اپنے سب سے پچھلے عہد رسالت کو ستائیس امور کے اسی کے فرزند کو اس کا قائم مقام قرار دیا۔ یہ وجہ تھی کہ یہ مصیبت و آزمائش حسین کے حصہ میں آئی۔

یہ بات قیاسی نہیں۔ بلکہ حدیث اور اقوال بزرگان اسلام سے ثابت ہے کہ سید المرسلین کو رتبۂ شہادت دیا جانا ضروری تھا لیکن ان کی عوض حسینؓ کو خاص کیا گیا۔ اس تخصیص میں ایک عجیب نکتہ یہ بھی تھا کہ نبوت محمدیہ کا علوئے شان دوسرے انبیاء پر اسی صورت میں ثابت ہو سکتا ہے جب کہ نبوت کے بعض درجے اور خصوصیتیں آنحضرتؐ کے تابعین پر بھی ختم ہوں گویا اُن لوگوں کو اُن امور میں جو طبقۂ انبیاء سے ہی مخصوص تھے حصہ دار ٹھہرایا جائے۔ اللہ تعالےٰ نے اس تخصیص سے دنیا کو یہ دکھایا ہے کہ خاتم النبیین کے فضائل میں سے ایک یہ بھی ہے کہ اس کی نسل اور اس کی امت میں ایسے لوگ پیدا کئے گئے کہ استقامت توکل۔ صبر و رضا اور حق الیقین میں گذشتہ انبیاء سے کم نہیں بلکہ بڑھ کر ہیں۔

سیدالانبیا کو درجہ شہادت بذریعہ حسینؓ ملا

مندرجۂ بالا بحث سے یہ نتیجہ پیدا ہوتا ہے کہ شہادت حسین گویا عین شہادت خاتم المرسلین تھی۔ اس مضمون کو خاتم المحدثین شاہ عبد العزیز صاحب دہلوی نے اپنے مشہور رسالے سرالشہادتین میں بڑی خوبی سے ادا کیا ہے اس لئے ہم اسی کا خلاصہ درج ذیل کرتے ہیں۔

جو کمالات انبیائے سلف میں متفرق طور پر جدا جدا پائے جاتے تھے وہ سب ہمارے نبئ آخر الزماں کی ذات بابرکات میں جمع ہو گئے تھے۔ حضرت آدم اور حضرت داؤد کو خلافت، حضرت نوح کو شکر گذاری حضرت ابراہیم کو خلت، حضرت یوسف کو حسن و صدق، حضرت موسیٰ کو شرف ہم کلامی حضرت سلیمان کو ملک، حضرت ایوب کو صبر، حضرت عیسےٰ کو احیائے موتےٰ حضرت یحییٰ کو زہد۔ علیٰ ہذالقیاس دوسرے انبیاء کو خاص خاص اوصاف مرحمت فرمائے۔

لیکن خاتم الانبیا ءجامع کمالاتِ جملہ انبیا تھے۔ بلکہ آپ میں بہت سے کمال ایسے تھے۔ جنہیں آپ ہی کا حصہ سمجھنا چاہیئے۔ مثلاً انوار و لایات کثرتِ معجزات، شفاعتِ کبریٰ۔ جہاد مع الکفار، قربِ اتم۔ محبوبیتِ مطلق۔ علم وسیع، عرفانِ کامل۔ انفصالِ قضایا وغیرہ وغیرہ۔ لیکن آپ میں ایک کمال جو اپنی نوعیت میں سب سے بڑھ کر ہے باقی رہ گیا تھا۔ یعنے شہادت۔ اس کمال کی تکمیل آپ کے ذات خاص میں نہونے کی بابت سرِّ خفی یہ تھا کہ اگر آپ کسی جہاد میں علانیہ مشرکین کے ہاتھ سے شہید ہوتے، تو شوکتِ اسلام ٹوٹ جاتی اور عوام کی نظر میں آپ کا قیام کیا ہوا دین بے وقعت ہو جاتا۔ اور اگر آپ کی شہادت خفیہ طور پر ہوتی تو اس حالت میں نہ تو اس کا اعلان ہی ہوتا۔ نہ وہ پوری شہادت سمجھی جاتی، کیونکہ شہادتِ کامل اس کا نام ہے کہ غربت اور مسافرت میں واقع ہو۔ لاش میدان میں پڑی رہے، اس کے گرد اور بہت سے عزیز۔ بھائی۔ بیٹے۔ یار دوست مارے جائیں، مال لوٹا جائے بیبیاں اور یتیم بچے اسیر ہوں۔ اور یہ ساری مصیبتیں راہِ خدا اور خوشنودیِ خدا کے لئے برداشت کی جائیں۔ کوئی دنیاوی اور نفسانی غرض شامل نہ ہو۔

چونکہ اس قسم کی مظلومیت اور مغلوبیت آپ کی خلافتِ کبریٰ کی شان سے خلاف تھی۔ مشیتِ ایزدی کا اقتضا یہ ہوا کہ یہ سب سے بڑا کمال آپ کی ذات میں ایامِ خلافت زمانۂ حیاتِ خاتم الانبیاء اور غلبۂ اسلام کے بعد ملحق کیا جائے۔ اور اس کی تکمیل اس شخص کے ذریعہ سے ہو جو آپ کا سب سے زیادہ عزیز، سب سے زیادہ قریب اور سب سے زیادہ محبوب ہو۔ تاکہ اس کا حال آپکے حال میں اور اس کا کمال آپ کے کمال میں شامل ہو جائے اس کے بعد تسلطِ اسلام و اشاعتِ ملتِ حق سبحانہ تعالیٰ کا حکم جاری ہوا۔ اور اس معاملۂ خاص میں حسنین علیہما السلام کو اپنے نانا کا نائب اور قائم مقام مقرر فرمایا کیونکہ یہ شہزادے انتہائی خصوصیت کی وجہ سے آنحضرتؐ کے کمالات کے گویا آئینہ تھے۔

شہادت کی دو قسمیں ہیں۔ ایک سِرّی جو پوشیدہ طور پر وقوع میں آئے۔ دوسری

جہری۔ جو علے الاعلان اور کھلم کھلا واقع ہوا شہادت سِرّی۔ سبط اکبر حضرت امام حسنؑ سے مخصوص ہوئی۔ آپ کی شہادت مخفی رہی، وحیٔ الٰہی میں بھی اس کا ذکر کم ہوا۔ خود حضرتؐ نے بھی اس کا تذکرہ کم فرمایا۔ یہاں تک کہ خود آپ کی زوجہ کے ہاتھوں سے یہ حرکت واقع ہوئی حالانکہ بیوی کے تعلقات دوستی پر مبنی ہیں نہ کہ دشمنی پر۔ یہ سب اس لئے ہوا کہ اس شہادت کی بنا خفا اور پوشیدگی پر تھی۔ شہادت کی دوسری قسم سبط اصغر امام حسینؑ سے مختص کی گئی۔ چونکہ اس کی بنا شہرت اور اعلان پر تھی۔ اس لئے بار بار جبرئیل اور دوسرے ملائکہ نے آنحضرتؐ سے ذکر کیا۔ بلکہ مقام شہادت، اس کا نام اور وقت شہادت سب ظاہر کیا گیا۔ مشہد حسینؑ کی خاک رسول اللہ کو دی گئی۔ جناب امیر نے سفر صفین میں برملا اس کا ذکر فرمایا۔ جب واقعہ شہادت ہوچکا۔ تو صرف واقعات کی شہرت پر ہی اس کا اکتفا نہ ہوا بلکہ سماوی وارضی حادثات سے اس اعلان کی تائید کی گئی۔ مثلاً خاک کا خون ہو جانا۔ آسمان سے خون برسنا۔ فرشتوں اور جنوں کا نوحہ وزاری کرنا۔ ہاتف غیبی کا مرثیہ پڑھنا۔ طیور و وحوش کا آپکی نعش مطہر کی حفاظت کرنا، آپ کے حرم کا دشمنوں کی حراست میں دمشق تک شہر بشہر ہوکر جانا۔ آپ کے قاتلوں کا رسوائے عام ذلیل وخوار اور عبرت ناظرین بن کر مرنا وغیرذالک۔ بلکہ اس رنج والم اور حزن وبکا کی دوامی شہرت وعظمت واقعات میں گریہ وزاری کا حیرت انگیز اثر تمام اسلامی دنیا میں ہرسال عزاداری۔ وقتاً فوقتاً معجزات وکرامات کا ظہور یہ سب اسی شہادت جہری وظاہری کے نتیجے ہیں۔ گویا اس طرح اس شہادت کا شہرہ زمین وآسمان جن وانسان ناطق وصامت میں ہوکر جناب ختمی مآب کے کمال شہادت کی تکمیل ہوگئی۔

اب رہا یہ امر کہ ان دونوں نواسوں کی شہادت کو خاص رسول اللہ کی شہادت کیسے مان لیا جائے، اس کی یہ صورت ہے کہ آنحضرتؐ نے ان دونوں شہزادوں کو بارہا اپنا بیٹا۔ اپنا گوشت و پوست اپنا جزو بدن فرمایا ہے۔ امام احمد ابن حنبل نے مسند میں، طبرانی نے معجم کبیر میں دارقطنی نے افراد میں۔ حاکم بیہقی اور ابن عساکر نے جناب امیر سے اور طبرانی نے سلمان فارسی سے روایت کی ہے کہ

رسولخدا نے دونوں نواسوں کی نسبت بارہا فرمایا ہے ۔ کہ یہ میرے بیٹے ہیں ۔ حضرات حسنین کا پرتو جمال محمدی ہونا دو دلیلوں سے ثابت ہے ۔ اول سیادتِ مطلقہ ۔ چنانچہ نسائی رویانی اور ضیا مقدسی نے حذیفہ سے ابو یعلی نے ابو سعید سے ابن ماجہ نے ابن عمر سے ابن عدی نے ابن مسعود سے ۔ ابو نعیم نے جناب امیر سے طبرانی نے حضرت عمر فاروق سے ، جابر ۔ براء ۔ اسامہ بن زید ، مالک بن حویرث اور دیلمی نے انس سے ، ابن عساکر نے ام المومنین حضرت عائشہ ، عبداللہ ابن عباس ، عبداللہ ابن عمر اور ابو رمثہ سے روایت کی ہے کہ آنحضرتؐ نے فرمایا کہ حسنؑ اور حسینؑ سردار جوانان بہشت ہیں ۔ آئینہ کمال محمدی ہونے کا ہی یہ نتیجہ ہے کہ دونوں صاحبزادوں کی محبت بعینہ محبت رسول اللہ اور ان کی عداوت حقیقتاً عداوت رسول ہے ۔ جیسا کہ ابن عساکر وغیرہ نے ابن عباس سے روایت کی ہے کہ آنحضرت نے فرمایا جسنے ان دونوں سے محبت کی اس نے مجھ سے محبت کی اور جس نے ان دونوں سے عداوت کی اس نے مجھ سے عداوت کی ۔

دوسرے مشابہت جسمانی ۔ کیونکہ دونوں صاحبزادے صورت ظاہری کے لحاظ سے بھی ۔ گویا آنحضرت کی تصویر تھے ۔ چنانچہ بخاری نے انس سے روایت کی ہے ۔ کہ لَمْ یَکُنْ احد اشبہ بالنبیؐ صلعم من الحسن ابن علی وَ قَالَ فی الحسین ایضاً کانَ اَشبہم برسول اللہ " کوئی شخص صورت و شکل میں حسن بن علی سے زیادہ آنحضرت سے مشابہ نہ تھا ۔ اور امام حسینؑ کی نسبت کہا ہے کہ وہ سب سے زیادہ رسول اللہ سے مشابہ تھے ۔ اس حدیث کو ترمذی نے مفصل اور واضح لکھا ہے ، وہ کہتے ہیں کہ سر سے سینہ تک تو امام حسن ، اور سینہ سے قدم تک امام حسینؑ رسول خدا سے زیادہ مشابہ تھے ۔ گویا جس طرح حسنین اخلاق میں مشابہ رسول اللہ تھے ۔ ویسے ہی صورت میں بھی اشبہ تھے ۔ چونکہ پیغمبر خدا کے کمالات صوری و معنوی کا آئینہ خدائے تعالےٰ نے دونوں نواسوں کو بنایا تھا ۔ اس لئے ان کی عزت رسول اللہ کی عزت ان کی توہین رسول اللہ کی توہین ، ان کی شہادت رسول اللہ کی شہادت تھی ۔ ان دونوں کی شہادت سری و جہری ہے ۔ جناب خاتم الانبیا صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کی کمال شہادت کا دونوں قسموں سے تکملہ ہو گیا

اور نبوت کے کل مدارج طے اور مکمل ہو گئے، گویا اس شہادت کو سبب تکمیل نبوت وسیلہ نجات امت اور ذریعہ حصول شفاعت کہنا چاہیئے)

شہادتِ حسینی سے ذبیحہ اسمٰعیلی کی تکمیل ہوئی۔

ظاہر ہے کہ سرخیل انبیاء صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کے آباؤ اجداد کا سلسلۂ نسب حضرت اسمٰعیل ذبیح اللہ سے جا ملتا ہے۔ حضرت اسمٰعیل کو خدائے پاک کی طرف سے ذبح کئے جانے کا حکم دیا گیا تھا جس کی تعمیل پر حضرت ابراہیم خلیل اللہ تیار ہو کر اپنے فرزند اسمٰعیل کے ذبح کرنے پر آمادہ ہوئے تھے۔ مگر خداوند کریم نے اپنی حکمت کاملہ سے حضرت اسمٰعیل کو بچا کر دنیا پر یہ ظاہر کرنا چاہا کہ اس حکم ربی کی تکمیل اسی نبی کی مقدس نسل سے اس بزرگ سے جس پر منصب نبوت کا خاتمہ ہو گیا کرائی جائے گی وہ بار ربی جو اسمٰعیل کی گردن پر رکھا گیا تھا، اس کا اٹھانے والا۔ خاتم الانبیاء کا بیٹا حسینؑ، قرار پایا یہ وہ امانت تھی جو پشتوں سے اسی خاندان میں چلی آتی تھی یہ وہ بار تھا۔ جس کو ہر ایک نے ایک دوسرے کے کندھے پر رکھا اور جس کو کوئی نہ اٹھا سکا۔ حتیٰ کہ امین تک پہنچا یا گیا جس نے اس اسمٰعیلی امانت کو اٹھانے کے لئے بڑی خوشی سے گردن تسلیم خم کردی۔

معنوی طور پر گویا اس واقعہ عظمیٰ اور شہادت کبریٰ کی پیشین گوئی حضرت اسمٰعیل کے زمانہ سے چلی آتی تھی، حضرت اسمٰعیل اور ابراہیم پر ظاہر کر دیا گیا تھا کہ تمہاری ہی نسل سے تمہارے ہی خون سے تمہاری ہی اصلاب سے ایک ایسا صابر اور ثابت قدم پیدا ہو گا جو اسمٰعیل کی قربانی اور ذبیحہ کو پورا کرے گا وہ حکم جو ابراہیم کو دیا گیا ہے۔ اس کی تعمیل محمدؐ سے کرائی جائے گی۔ وہ آزمائش جو اسمٰعیل سے شروع کی گئی اس کی تکمیل علیؑ کے خاندان میں ہوگی وہ وعدہ جو اسمٰعیل سے لیا گیا اس کو وہ شخص پورا کریگا جس کی رگوں میں ابراہیمی خون اور جس کی پیشانی میں اسمٰعیلی نور جوش مارتا اور چمکتا ہو گا اور حسینؑ کے مؤثر نام سے پکارا جائے گا۔ بی بی ہاجرہ کی مقدس نسل سے وعدہ لیا گیا اور بی بی فاطمہ کی پاک ذرّیت نے اس کو پورا کیا۔ دسویں محرم ۶۱ھ

کو حسین نے میدان کربلا میں اس بھاری امانت اور نہ ٹلنے والے وعدہ کی تکمیل حضور خداوندی میں اپنے دادا حضرت اسمٰعیل کو سبک دوش کر دیا اور اس ناتکمل قربانی کی جو حضرت اسمٰعیل سے شروع ہوئی تھی حسینؑ کی مکمل شہادت سے تکمیل اور فدیناہ بذبح عظیم کی شان پوری ہو گئی۔ (یادگار حسین از خان بہادر مرزا سلطان احمد خاں)

شہادت حسینی کا دوسرے شہدائے مذاہب سے مقابلہ

اہل کتاب کے دو بڑے فرقے یہودی اور عیسائی ہیں یہودیوں کی کتاب توریت کوئی ایسا مہتم بالشان واقعہ پیش نہیں کرتی جس کو ہم واقعہ کربلا سے نسبت دے سکیں اگرچہ اس میں اکثر انبیا کی شہادتوں کا ذکر ہے۔ لیکن اگر کسی بڑے سے بڑے واقعہ کو بھی دیکھا جائے تو اس کی دردانگیز نوعیت حادثہ کربلا کے سامنے ہیچ نظر آتی ہے۔ اور اگر شہدائے مسیحیت کو دیکھا جائے تو عیسائیوں میں ایک خون کی بڑی پکار ہے اور یہ کہا جاتا ہے کہ اس خون نے تمام جہان کے گناہ دھو ڈالے۔ اور یہ خون تمام گناہوں کا کفارہ ہو گیا۔ اس سے واقعۂ صلیب حضرت عیسےٰ کا مراد ہے۔ ہم سب سے پہلے اسی شہید اول کے حالات پر نظر ڈالتے ہیں۔ اول تو بقول پیروان مسیح یہ موت ہی لعنت کی موت ہے۔ لہذا جو موت خود میت کے لئے باعث وبال ہو۔ وہ دوسروں کو کیا فائدہ بخش ہو سکتی ہے۔ اور جب ہم اس خون کے تفصیلی حالات پر غور کرتے ہیں تو یہ اور بھی خفیف اور سبک معلوم ہوتی ہے۔ انجیل متی باب ۲۶ ورس ۳۹ میں لکھا ہے کہ "سو منہ کے بل گر کر یہ دعا مانگی اے میرے باپ اگر ہو سکے تو یہ پیالہ مجھ سے ٹل جائے"۔ پھر ورس ۴۲ میں ہے "پھر دوبارہ اس نے جا کر یہ دعا مانگی۔ اے میرے باپ! اگر یہ میرے پئے بغیر نہیں ٹل سکتا تو تیری مرضی پوری ہو"۔ پھر ورس ۴۴ میں ہے کہ پھر وہی بات پھر کہہ کر تیسری بار دعا مانگی"۔ اور باب ۲۷ ورس ۲۸۔ ۲۹۔ ۳۰۔ ۳۱ میں ہے "اس کے کپڑے اتار کر قرمزی چوغہ پہنایا اور کانٹوں کا تاج بنا کر اس کے سر پر رکھا اور ایک سرکنڈا اس کے داہنے ہاتھ میں دیا۔ اور اس کے آگے گھٹنے ٹیک کر اسے ٹھٹھوں

میں ازانے لگے کہ اے یہودیوں کے بادشاہ سلام۔ اور اس پر تھوکا اور وہی سرکنڈا لے کر اُس کے سر پر مارنے لگے۔ اور جب اس کا تماشا کر چکے تو چوغے کو اتار کر پھر اسی کے کپڑے اسے پہنائے اور صلیب دینے کو لے گئے"۔ آگے چل کر درس ۳۵ اور ۳۶ میں بیان کیا ہے "دوپہر سے لے کر تیسرے پہر تک تمام ملک میں اندھیرا چھایا رہا۔ تیسرے پہر کے قریب یسوع نے بڑی آواز سے چلا کر کہا ایلی ایلی لما شبقتنی یعنی اے میرے خدا اے میرے خدا تو نے مجھے کیوں چھوڑ دیا۔ اور درس ۵۰ میں ہے "پھر یسوع نے بڑی آواز سے چلایا اور جان دی"۔ ایسا ہی انجیل مرقس باب ۱۴ درس ۳۳۔۳۴۔۳۵ اور ۳۶ میں ہے "پطرس یعقوب اور یوحنا کو اپنے ساتھ لے کر نہایت حیران اور بے قرار ہونے لگا اور ان سے کہا میری جان نہایت غمگین ہے۔ یہاں تک کہ مرنے کی نوبت پہنچ گئی ہے۔ تم یہاں ٹھہرو اور جاگتے رہو اور وہ تھوڑا آگے بڑھا۔ اور زمین پر گر کر دعا مانگنے لگا کہ اگر ہو سکے تو یہ گھڑی مجھ سے ٹل جائے۔ اور کہا اے باپ تجھ سے سب کچھ ہو سکتا ہے۔ اس پیالے کو میرے پاس سے ہٹالے"۔ پھر آگے درس ۳۹ میں ہے "پھر وہ چلا گیا اور وہی بات کہہ کر دعا مانگی"۔ آگے چل کر یسوع کی ٹھٹھیک اور صلیب دئے جانے کے متعلق واقعات وہی ہیں جو انجیل متی سے نقل کئے گئے۔ ایسا ہی انجیل لوقا باب ۲۲ درس ۴۱ و ۴۲ میں دعا مانگنے کا حال درج ہے۔ صرف صلیب پر جزع وفزع کرنا نہیں لکھا۔ انجیل یوحنا باب ۱۷ میں حضرت مسیح کی کسی قدر طویل دعا ہے۔ البتہ پیالۂ مرگ ٹل جانے کی درخواست نہیں ہے۔ نہ صلیب پر بے قراری دکھلائی گئی ہے۔ بہرحال اناجیل اربعہ کے بیانات ہم کو بتاتے ہیں کہ ان کے شہید اعظم نے گواہی آنے والی حالت کے متعلق پیشینگوئی بھی کی۔ اور اس کے خیر مقدم کا تہیہ بھی کیا۔ تاہم حضرت مسیح کے ذہن میں کوئی ایسی وجہ نہ تھی جس کے لئے انہوں نے پیشتر سے یہ ارادہ مصمم کر لیا ہو کہ ہم جان دیں گے لیکن پیچھے نہ ہٹیں گے۔ موت کے آثار دیکھ کر یسوع میں افسردگی پیدا ہوئی بلکہ جاں کنی کی سی حالت پیدا ہو گئی۔ اور انہوں نے اس مصیبت کے ٹل جانے کے واسطے مکرر سہ کرر دعا مانگی۔ عین مصلوبیت کی اذیت نے بھی

نول ستی و مرقس اس درجہ لغزش پیدا کر دی کہ جزع و فزع شروع کر دیا۔ ان بیانات سے مسیحیت کے شہید اعظم کے درجہ استقلال کا قابل تعریف اندازہ نہیں ہوتا۔ اور ان سے یہ بھی پایا جاتا ہے کہ انہوں نے خود شہادت کا ارادہ نہیں کیا تھا۔ بلکہ شہادت ان کی طرف دوڑائی گئی تھی۔

یہ ہے مسیحیوں کے مایۂ ناز شہید کی کیفیت جس کی تمام دنیا میں پکار ہے، اور سارے جہان میں اس کے خون کا پرچار کیا جاتا ہے۔ اور تمام عیسائی دنیا اس کو ذریعۂ نجات جانتی ہے۔ تاریخ یہود بھی کسی زبردست اور موثر شہید کے کارنامے پیش کرنے سے خالی ہے۔ زردشتیوں نے بھی شہادت کے اعلےٰ مفہوم کو کبھی نہیں دکھایا اور نہ کسی نے خود کو مذہب پر قربان کیا۔ بودھ دھرم کا ترجمہ ہی موجودات کی بے حقیقتی کا حقیقی اعتقاد ہے۔ اس لئے اس کے پیرو کسی اصول پر قربان ہونے کی شہیدانہ منزلت کیا سمجھ سکتے ہیں۔ آریوں کے وید بھی نمونۂ شہادت پیش کرنے سے قاصر ہیں۔ اور رامائن اور مہابھارت کا عظیم الشان معرکہ بھی کسی مظلوم قتیل کے اہم واقعہ کو بتانے سے عاجز ہے۔ اگر مفہوم شہادت کو اس کے اصلی معنوں میں بتاتا ہے تو وہ اسلام ہی ہے۔ اسلام نے نہ صرف لفظوں میں مفہوم شہادت کو بیان کیا۔ بلکہ ایک مکمل اور اصل نمونہ بھی پیش کر دیا ہے۔ شہادت عظمےٰ کا وہ نمونہ حسینؑ اور دوسرے شہدائے کربلا ہیں۔ سید الشہداء کا استقلال، صبر، رحمدلی، ایثار، ہمدردیِ خلائق، توجہ الی اللہ حمایتِ حق، شجاعت، عزتِ نفس، اور بہادرانہ کارنامے ایسے ہیں جن کو سن کر مخالف سے مخالف بھی، انگشتِ حیرت دانتوں کے نیچے رکھ لیتا ہے جس کے سننے سے سنگدل بھی موم ہو جاتے ہیں جس کے ذکر سے دشمن بھی متاثر ہوئے بغیر نہ رہے۔ اور جس پر تاریخ اسلام جس قدر فخر کرے تھوڑا ہے۔ ایک انصاف پسند عیسائی۔ موسیو ماربین لکھتا ہے "حسین سے پہلے بھی بہت سے روسائے روحانی اور ارباب دیانات بحالتِ بیکسی قتل کیے گئے حضرت یحییٰ کا قصہ تاریخی واقعات میں ایک بڑا سانحہ ہے۔ اسی طرح جو سلوک یہود نے حضرت

مسیح سے کیا۔ اس زمانہ تک اس کی نظیر واقع نہیں ہوئی تھی لیکن حسینؓ کے واقعہ نے تمام واقعات پر فوقیت حاصل کرلی۔ تاریخ سے ایسا معلوم نہیں ہوتا کہ روحانیین اور ارباب دیانات میں سے کسی شخص نے بھی اپنے خیالات عالیہ کی وجہ سے اپنی ذات کو اپنے علم وارادہ سے قتل کرادیا ہو حسین کا واقعہ ایسا عالمانہ اور حکیمانہ تھا کہ دنیا کی تاریخ میں اس کی نظیر نہیں ہے

ہم اس کو تسلیم کرتے ہیں کہ یہودیوں اور عیسائیوں کی تاریخ متعدد خونیں اور ہولناک واقعات سے بھری ہوئی ہے۔ یہودیوں نے شاہ بابل ایران۔ روم اور مصر کے ہاتھوں سے ناقابل برداشت مصائب اوٹھائے۔ کئی بار بیت المقدس میں قتل عام ہوا۔ اور لاکھوں یہودی تلوار کے گھاٹ اتارے گئے۔ عیسائیوں نے بھی ان پر بے حد مظالم کئے۔ جن کا سلسلہ ابھی تک ختم نہیں ہوا۔ عیسائیوں نے بھی آغاز مسیحیت میں دوسری قوموں خصوصاً رومیوں کے ہاتھ سے بے انتہا مصیبتیں اٹھائیں جن میں بعض ایسے درد انگیز ہیں کہ ان کو پڑھ کر رونگٹے کھڑے ہوتے ہیں اور ان کے شہدائے ملت کی بھی ایک طولانی فہرست ہے بایں ہمہ اگر شہدائے ملل ماضیہ کے دردناک واقعات کو تاریخ میں تلاش کیا جائے۔ تو اس میں بالکل مبالغہ نہیں کہ ان کا کوئی شہید، نوعیت مصائب اور ہجوم شدائد کے لحاظ سے اسلام کے شہید اعظم کا مقابلہ نہیں کرسکتا۔ تمام اولیاء مذاہب کی تکلیفیں حسین کے انبوہ مصائب کے سامنے لاشئے معلوم ہوتی ہیں یسعیاہ (ذکریا) کا چیرنے والا تنہا آرہ ان بے شمار حربوں کے سامنے جن پر ہمارے شہید کا خون ہے کیا کوئی حقیقت رکھتا ہے؟ یا یسوع (عیسےٰ) کی صلیب رسیدہ جسم کی چند کیلیں حسین کے جسم میں چبھنے والے بے شمار تیروں اور نیزوں کے سامنے کیا بے حقیقت نہیں ہیں؟

یہ امر مسلمہ ہے کہ طبقۂ انبیا کے شدائد و مصائب کا درجہ نوع انسان کے دوسرے افراد سے کہیں زیادہ عظیم اور صعوبت انگیز ہے، حضرت آدم نے ایک عزیز بیٹے کی جدائی کا صدمہ اٹھایا۔ حضرت نوح نے قوم کے ہاتھوں بے انتہا تکلیفیں اٹھائیں، حضرت ابراہیم

کو آتشِ نمرود کا مقابلہ کرنا پڑا۔ حضرت اسمٰعیلؑ کی قربانی کے حکم سے آزمائش کی گئی۔ حضرت یعقوبؑ کو فراقِ یوسفؑ کا جانکاہ رنج سہنا پڑا۔ حضرت یوسفؑ بھائیوں کی عنایت سے کنوئیں میں ڈالے گئے، غلام ہو کر بکے۔ اور بارہ برس زندانِ مصر میں قید رہے۔ حضرت موسیٰؑ نے قوم کی نافرمانیوں سے اذیتیں اٹھائیں، حضرت ایوبؑ نے نقصانِ مال و متاع مرگِ اعزا اور عوارضِ جسمانی سے بڑی بڑی تکلیفیں جھیلیں۔ حضرت زکریاؑ ایک درخت کے جوف میں آرہ سے چیرے گئے۔ حضرت یحییٰؑ ایک زنِ زانیہ کی فرمائش سے بے گناہ شہید ہوئے۔ حضرت عیسیٰؑ کو یہودیوں نے براہِ حسد سولی پر آویزاں کیا۔ ان کے علاوہ اور بھی انبیاءؑ طرح طرح کی مصیبتوں میں مبتلا ہوئے بعض کو درجۂ شہادت حاصل ہوا لیکن کیا کوئی شخص انبیاء کرام علےٰ نبینا وعلیہم السلام کی طولانی فہرست میں جن کے اسماء گرامی کی تعداد ایک لاکھ سے زیادہ ہی ہے۔ مصائبِ حسینیؑ جیسے مصیبت اور شہادتِ حسینیؑ جیسی شہادت پیش کر سکتا ہے۔ اور جب انبیاءؑ کے مقدس طبقہ میں ہی اس کی نظیر نہیں ملتی۔ تو دوسرے رؤسائے روحانیین میں اس کی مثال تلاش کرنا عبث ہے۔

حسین علیہ السلام کے مصائب کا موازنہ دنیا کی کسی مصیبت سے نہیں ہو سکتا۔ اگرچہ ہر قوم کے مصلحین و مجدّدِ دین کو اُن کے مخالفوں نے طرح طرح کی تکلیفیں دیں لیکن جیسا کہ اوپر لکھا گیا انبیاء علیہم السلام کے مصائب کا پیمانہ سب سے بڑا ہوا ہے۔ تاہم تمام دنیا کے انبیاء و رسل کے واقعاتِ شدائد کو دیکھتے ہوئے ہم یہ کہنے پر مجبور ہیں کہ کسی نبی یا رسول نے حسینؑ سے بڑھ کر رضائے الٰہی کے لئے مصائب کا مقابلہ نہیں کیا۔ کیونکہ انبیائے سلف نے اپنے مخالفوں کے ہاتھوں جو آلام و صدمات برداشت کئے۔ وہ صرف ان کی ذات تک محدود تھے۔ یہاں تو صرف نہ اپنی ذات بلکہ سارے خاندان کی تباہی و بربادی قتل و اسیری کو گوارا فرمایا گیا۔ اس کے علاوہ ایک بات اور بھی قابلِ غور ہے کہ انبیاء علیہم السلام کے صبر و رضا کا جو امتحان لیا گیا وہ اُن بلاؤں کا دفاع نہیں کر سکتے تھے۔ اِس لئے اُن کو

سوائے صبر کے چارہ نہ تھا۔

اس کے خلاف حسین علیہ السلام پر جن مصائب کا ہجوم بیک وقت ہوا۔ ان کے مقابلہ میں کوئی مصیبت پیش نہیں کی جا سکتی۔ پھر یہ کہ ان کا دفاع آپ کے اختیار میں تھا۔ اگر آپ بیعت یزید منظور فرماتے۔ تو ساری مصیبتوں کا خاتمہ تھا۔ یا اگر چاہتے تو مقابلہ کے لئے لشکر فراہم کر سکتے تھے۔

اس کے علاوہ انبیا کی مصیبتیں تنہا تھیں۔ یہاں مصائب و شدائد کی یورش پر ہر مصیبت کے بعد دوسری مصیبت پہلے سے بھی زیادہ شدید اور روح فرسا۔ ہر لحظہ شدائد کی سختی بڑھتی جاتی تھی۔ مصیبتوں کے بادل مہیب اور بھیانک صورت کے ساتھ پے در پے امڈے چلے آتے ہیں۔ لیکن حسینؑ جادۂ صبر و رضا پر پہاڑ کی طرح قائم ہیں۔ اور ان کے پائے ثبات کو ذرا بھی لغزش نہیں ہوتی۔ شہید دنیا میں ہزاروں ہوگئے اور ہزاروں ہوں گے۔ مگر اس شان کا شہید نہ اب تک ہوا۔ نہ آئندہ ہوگا۔ کسی نے سچ کہا ہے اور اس میں بالکل مبالغہ نہیں۔ کہ:۔

ازہیچ ہمیبرے کہ نیاید ایں کار
واللہ کہ اے حسینؑ کارے کردی

واقعہ کربلا کا دوسرے وقائع عظیمہ سے تقابل و موازنہ

واقعہ ہائلہ کربلا دنیا کے ان معدودے چند واقعات میں شمار ہونے کے قابل ہے۔ جو خود ظہور پذیر ہوتے وقت عملی طور پر کچھ عرصہ نہیں لگاتے، مگر تہذیب و تمدن عالم کی تاریخ پر ایک زبردست اور پائدار اثر کا نقش علی الحجر باقی چھوڑ جاتے ہیں تصوف کا ایک

مسئلہ ہے: "قال را بگذار و مرد حال شو"

لیکن "مرد حال" ہونا کوئی سہل امر نہیں۔ بلکہ مردانگی و ہمت کا کام ہے اور یہ مردانگی اور ہمت جیسی سانحہ کربلا میں ظاہر ہوئی ہے۔ اس کی نظیر آغاز آفرینش عالم سے تا ایں دم نہیں مل سکی۔ اگر امر حق کی پیروی کے تمام واقعات کا سرتاج کسی واقعہ کو قرار دیا جا سکتا ہے۔ تو وہ کربلا کا ہولناک، روح فرسا اور ہوش رُبا حادثہ ہے جس کا نمونہ کسی ملک کسی قوم کسی مذہب اور کسی زمانہ کی تاریخ نہیں دکھا سکتی۔

نوع انسان کے مصائب کا آغاز حضرت آدم و حوا کی مصیبت سے سمجھا جاتا ہے جو ان پر جنت سے نکالے جانے کے بعد نازل ہوئی۔ حضرت آدم کے فرزندوں میں ہی پہلی خوں ریزی واقع ہوئی جب کہ قابیل نے اپنے بھائی ہابیل کو والدین کی محبت کے رشک سے مار ڈالا۔ ان دونوں ابتدائی واقعات کے بعد مصیبتوں اور خوں ریزیوں کا سلسلہ ازدیاد نسل آدم کے ساتھ جاری رہا۔ اور ہمیشہ ترقی پاتا رہا۔ اس اثناء میں ہزاروں معرکہ ہائے جنگ ہوئے۔ جن میں سے بعض بعض میں کئی کئی روز تلوار چلی۔ اور لاکھوں کا کھیت پڑا۔ بعض میں برسوں تک خوں ریزی کا سلسلہ جاری رہا۔ خون کے نالے بہہ گئے۔ ایسی تباہی و بربادی پھیلی کہ میدان جنگ کی سرزمین پر برسوں تک گھاس بھی نہ اُگ سکی۔ لاکھوں آدمیوں کے شہر تاراج ہو کر پھر آباد نہ ہونے پائے۔ ملکوں کی جغرافیائی صورت بدل گئی قوموں کی جداگانہ مستقل حیثیت قائم نہ رہ سکی۔ خاندانوں کی صدہا سالہ حکومت غارت ہو گئی۔ علوم و فنون کو سخت صدمہ پہنچا۔ صنعت و حرفت پر زوال آیا۔ ایسے افسوسناک اور پُر درد واقعات سے تمام تاریخیں بھری پڑی ہیں۔

اگلے واقعات و حادثات سے قطع نظر کر کے صرف پچھلی عالم آشوب جنگ کو ہی دیکھو۔ جس نے تمام کرۂ ارض پر تہلکہ ڈال دیا۔ کئی ملکوں اور قوموں کو تباہ کر ڈالا۔ دنیا کی متعدد قوموں نے اس عالمگیر جنگ کے جہاں سوز شعلوں میں اپنی لاتعداد دولت اور بے شمار نوجوانوں کو جھونک دیا توپوں کی گرج سے زمین و آسمان دہل گئے۔ تلواروں کی چمک نے برق و صاعقہ

کو شہر دیا۔ اتنا بڑا کشت و خون۔ مصارف کا اتنا بارِ گراں۔ جانوں کا اتنا خوفناک نقصان فوجوں اور لشکروں کا اتنا عظیم اجتماع اس سے پہلے کبھی نہ ہوا تھا۔ کروڑوں بچے یتیم، لاکھوں عورتیں بیوہ ہزاروں کے گھر تباہ ہوگئے۔ پدموں روپیہ دھواں ہوکر اڑ گیا۔ دنیا کے تین بڑے تاجدار بے تخت و تاج ہوگئے اور ان کے ساتھ کئی بادشاہوں کو اپنی اپنی حکومتوں اور سلطنتوں سے دست بردار ہونا پڑا۔ روس جیسی عظیم الشان سلطنت جو ایک ثلث ایشیا اور نصف یورپ پر قابض تھی پاش پاش ہوگئی۔ جرمنی کا، جو دنیا میں سب سے بڑی فوجی طاقت رکھتا تھا، شیرازہ بکھر گیا۔ آسٹریا کی سلطنت جو یورپ میں سب سے پرانی اور موثر و مقتدر تھی۔ ٹکڑے ٹکڑے ہوگئی۔ سلطنت عثمانیہ جس سے کسی زمانہ میں تمام یورپ کانپتا تھا۔ اپنے بہترین صوبے ہاتھ سے کھو بیٹھی۔ زمین۔ پانی۔ ہوا تینوں کرۂ نار بن گئے۔ اس جنگ کی بے پناہ آگ نے صرف یورپ کو ہی جلا کر بھسم نہیں کیا بلکہ اس کے شعلوں نے مغربی یورپ کے میدان سے جاپان سے امریکہ تک تمام دنیا میں آگ لگا دی اور خدا کی مخلوق کو ایک عجیب مصیبت میں مبتلا کر دیا۔ ملکوں کے کاروبار بند ہوگئے۔ تجارت کی کساد بازاری نے گرانی اور قحط کو ایسی ہیبت ناک صورت سے نمایاں کیا کہ کہن سال دنیا نے، ایسی تباہی و بربادی کبھی نہیں دیکھی تھی۔ قصہ کوتاہ اس لڑائی نے تمام کرہ زمین کے نظامِ سیاسی حربی۔ جغرافیائی اور تمدنی میں انقلاب عظیم پیدا کر دیا۔

ایسی ایسی ہولناک اور عالمگیر مصیبتوں کے مقابلہ میں کربلا کی خوں ریزی بظاہر کچھ حقیقت نہیں رکھتی کیونکہ اس میں ایک طرف صرف بہتر یا بیاسی اور دوسری طرف۔ بائیس یا تیس ہزار آدمی تھے۔ کل مقتولین کی تعداد چند ہزار سے تجاوز نہیں ہوئی، لڑائی بھی فقط تین پہر رہی۔ کوئی شہر یا دار العلوم صنعت و حرفت کا مرکز یا کاروبارِ تجارت کا وسا ور برباد نہیں کیا گیا۔ مگر باوجود اس قلتِ نقصان کے معرکہ مذکور کو دنیا کے معرکہ ہائے جنگ میں ایک غیر معمولی اہمیت نصیب ہوئی۔ اور نہ صرف مسلمان بلکہ غیر اقوام کے مورخ بھی۔ تمدن عالم کی تاریخ میں اس کو بہت بڑی وقعت

دیتے ہیں اور یہ اہمیت و وقعت صرف اس امر پر مبنی ہے کہ اس معرکہ میں گو مخاصمین کی تعداد بہت قلیل اور ایک فریق کی طاقت محض برائے نام تھی لیکن جس بات پر ٹکرار تھی اس سے بڑھ کر وقیع سبب آجتک دنیا میں کسی لڑائی کا نہیں ہوا۔ یعنے ظاہر میں تو یزید اور امام حسین میں مقابلہ تھا۔ مگر درحقیقت مقابلہ حق و باطل ایمانداری و بے دینی۔ عقبےٰ اور دنیا۔ راستی و دروغ۔ صحت و غلطی، تقویٰ و رندی، روشنی و تاریکی، صدق و کذب کے درمیان آکر پڑا تھا کیونکہ یزید منہیات و معصیات پر دلیر اور فرائض دین سے لاپرواہ تھا اور اپنی بیعت سے بالواسطہ اُن ہی ناگوار باتوں کو رواج دینا چاہتا تھا۔ حضرت امام حسین حمیت دینی اور حمایت مذہبی مذہبی کی وجہ سے ان باتوں کو گوارا نہ فرماسکتے تھے۔ اس لئے آپ نے اپنی جان دینا قبول کیا اور ایک بدراہ اور گمراہ کی اطاعت منظور نہ فرمائی اور ان مصائب کے پیش آنے پر بھی جس کا برداشت کرنا انسانی طاقت سے بالاتر تھا۔ آپ کے ثباتِ قدم اور استقلالِ مزاج میں لغزش نہ آئی اور جو جسمانی و روحانی تکلیفیں حضرت آدم سے لے کر اس وقت تک کسی فرد بشر کو نہ پہنچی تھیں وہ نہیں آپنے کمال مردانگی سے اٹھایا اور جو فرائض حقوق اللہ اور حقوق العباد کے متعلق آپ کے ذمہ تھے۔ ان کو ایسی خوبی سے ادا کیا کہ دنیا ہمیشہ حیرت کی نگاہوں سے دیکھے گی اور صبر و استقلال کا وہ شاندار نمونہ دکھایا جس سے بڑھ کر ظہور تو کیا۔ خیال میں آنا بھی دشوار ہے۔

کیا دنیا کا کوئی مذہب حمایتِ حق اور مدافعتِ باطل کا ایسا عظیم الشان واقعہ اپنی تاریخ میں دکھا سکتا ہے اور کیا صبر و استقلال کی یہ زبردست مثال کسی دوسری قوم کے بزرگوں میں مل سکتی ہے۔ نہیں۔ ہرگز نہیں۔ واقعۂ ہائلہ کربلا۔ درحقیقت روشنی کا ایک مرتفع مینار ہے جس پر تمام ساکنانِ عالم کی نگاہ پڑتی ہے اور جو تیرہ سو برس کے اندر لاکھوں کروڑوں انسانی زندگیوں کے جہازوں کو آشوب دہر کی خطرناک چٹانوں اور حرص و ہوا کے تباہ کن گردابوں سے بچا چکا ہے، مبارک تھی وہ زندگی جس نے ایسی شاندار مثال قائم کر کے انسانی نسلوں

کی ہدایت کے لئے ۔ ایک قیامت تک روشن رہنے والی شمع۔ راہ بن گئی۔ اور بدنصیب ہیں وہ لوگ جو ہمدردی قومی اور حق پرستی کی ایسے اعلیٰ نمونہ سے صحیح طور پر متاثر نہیں ہوتے

سانحہ عاشورہ حمایت صداقت کا بہترین اور عدیم النظیر کارنامہ ہے

دنیا چار برس (۱۹۱۴ء سے ۱۹۱۸ء تک) ایک عالمگیر اور جہاں سوز جنگ سے گھبرا اٹھی اور اس قدر خوف زدہ ہوئی کہ موجودہ جنگ کو ٹالنے کی کوشش حد سے تجاوز کر گئی تھی اور اس وقت اس کے ہیبت ناک نتائج سے تمام اقوام عالم کے افق پر خوف و پریشانی کے سیاہ بادل چھائے ہوئے ہیں مگر بغور دیکھو تو نظر آئے گا کہ کائنات کا ذرہ ذرہ ایک مسلسل اور غیر منقطع سلسلۂ جنگ میں مبتلا ہے، صبح و شام، دن اور رات۔ چاندنی اور اندھیرا۔ بہار و خزاں جاڑا اور گرمی یہ کیا ہیں۔ اس رزم گاہ عالم کے نبرد آزما حریف ہیں ہوا اور مٹی۔ آگ اور پانی دریا اور پہاڑ۔ زمین و آسمان کیا ہیں، عناصر کے باہمی جنگ کے مظاہر ہیں۔ بلکہ یہ ساری کائنات ان ہی عناصر کی فتح و شکست کے نتائج ہیں۔ جمادات اور نباتات، نباتات اور حیوانات حیوانات اور انسان۔ غور کرو کیا انہیں موت و حیات کی کشمکش کیلئے ایک دائمی جنگ برپا نہیں ہے۔ آگے بڑھو۔ اشرف المخلوقات کی دنیا میں آؤ یہاں قوت قوت سے، جماعت جماعت سے، قوم قوم کی دست و گریباں ہے۔ غرض کائنات سرتاسر جنگ صلح اور شکست ہے۔

لیکن سب سے زیادہ تعجب خیز سب سے زیادہ حیرت انگیز اور سب سے زیادہ تحیر افزا وہ جنگ و صلح ہے جو اس عالم مادی سے ماوراء روحانیات کے عالم میں برپا ہے۔ صدق و کذب حق و باطل۔ صواب و خطا۔ میں جب سے دنیا قائم ہے ایک غیر فانی نزاع بھی قائم ہے۔ مگر یہ تعجب یہ حیرت یہ استعجاب اُس وقت اور زیادہ ہو جاتا ہے۔ جب کمزوری قوت سے شخص جماعت سے۔ جماعت قوم سے اور قوم دنیا سے لڑنے کو آمادہ ہو جاتی ہے۔ ذرہ پہاڑ کو، قطرہ سمندر کو، اور ایک بے سامان شخص باساز و سامان شہنشاہ کو اعلان جنگ دیتا ہے اور صرف حق اور صداقت کی قوت کو اپنے دست و بازو کا سہارا جانتا ہے کہن سال دنیا کی سوانح عمری کا جتنا تحریری سرمایہ

اس وقت موجود ہے اس کے اکثر اوراق اُن ہی خونیں داستانوں سے رنگین ہیں۔ اس وقت کرۂ ارض کی ہر قوم سراپا آواز ہے۔ کہ اس ضخیم کتاب میں میری زندگی کا باب نکال کر پڑھو۔ مگر واقعات کی ندرت جواب دیتی ہے کہ میری پوری اور مکمل شان دنیا کی صرف آخری قوم میں نظر آئے گی۔

اس قوم کی تاریخ میں وہ شہدائے ملت بھی شامل ہیں جنہوں نے میدانِ حق میں لڑکر جانیں دیں۔ وہ بھی ہیں جن کی گردنیں تلواروں کا امتحان گاہ بنیں وہ بھی ہیں جو سولی پر لٹکائے گئے۔ وہ بھی ہیں جن کی زبانیں حق گوئی کے جرم میں تالو سے کھینچ لی گئیں۔ وہ بھی ہیں جن کا ایک ایک عضو کاٹ کر الگ کر دیا گیا۔ پر اُن میں امن پسند۔ تیغ زنوں کی بھی کمی نہیں جن کے جھونپڑوں سے نکلی ہوئی ناتوان آواز برق وصاعقہ بن کر محلوں اور ایوانوں کو ہلا آئی جن کے ہاتھوں کی ایک کمزور جنبش نے قبائے حکومت کے تار الگ الگ کر دئے۔ جن کے چشم و ابرو کے اک اشارہ نے جاہ وجلالِ سلاطین کے اوراق کو پارہ پارہ کر ڈالا۔

محض حق اور صداقت کی حمایت میں ایک کمزور اور معمولی قوت کے تارک الدنیا شخص کا ایک عظیم الشان سلطان کی طاقت سے مقابلہ حوصلہ اور دل گردے کا کام ہے۔ اور دنیا کی تاریخ میں واقعۂ کربلا سے بڑھ کر اس کی شاندار و تابناک مثال نہیں مل سکتی۔ غور کرو۔ ایک طرف یزید جس کی قلمرو کی حدیں دریائے جیحوں سے دریائے نیل تک اور ہندوستان سے بحر اسود تک پھیلی ہوئی ہیں اور دنیا کی سب سے بڑی سلطنت کا تاجدار ہے اپنے ٹڈی دل فوج کے ساتھ آمادۂ خوں ریزی ہے اور دوسری طرف پیغمبر اسلام کا نواسہ۔ حق۔ صداقت، اولوالعزمی۔ استقلال، عزت نفس اور حمایت اسلام کے لاؤ لشکر کے ساتھ شخصیت و استبداد زندقہ والحاد کے خلاف صف آرا ہے وہ فاسق و فاجر ثانی فرعون یعنی خلافت سنوائے پر تلا ہوا ہے مگر بانیِ اسلام کا فرزند۔ اسلام کی عزت وحرمت برقرار رکھنے کا عہد واثق کر چکا ہے جسے ہم جانتے ہیں کہ شخصیت کی فتح اسلام کی شکست۔ اور یزید باطل پرست کی دست جس پر

بیعت اسلام سے روگردانی کا اقرار ہے۔ اس لئے جہاں تک ممکن ہوا۔ آپ نے پوری طاقت سے غدوئے دین اسلام کا مقابلہ کیا۔ کوئی منظر اس سے زیادہ سبق آموز و عبرت خیز نہیں ہوسکتا کہ ۷۲، یا ۷۴ حق پرستوں کا ایک مختصر سا قافلہ محض حقانیِ حق اور ابطالِ باطل کی غرض سے میدان میں نکلتا ہے اور بانیِ اسلام کا لاڈلہ نواسہ اپنے نانا کے امتیوں کو خدا سے غداری اور بدعہدی کرنے سے باز رکھنے میں کامیاب نہیں ہوتا، اس کے رفقاء اور اعزاء ایک ایک کرکے اس کے سامنے شہید کئے جاتے ہیں اور وہ خود برچھیوں تیروں اور تلواروں سے چور ہو کر گرتا ہے تو اس کا اسی حالت میں بھی، اگر کسی کے آگے سر جھکتا ہے تو خدا ہی کے آگے جھکتا ہے اس کا ضمیر و ایمان اگر سجدہ کرتا ہے تو معبودِ حقیقی کے حضور میں کرتا ہے۔ اور یزیدی لشکر کی کثرت اس کی شقاوت و سفاہت اور بے نظیر ظلم آرائی اُسے جادۂ مستقیم سے منہ نہیں ہٹا سکتی گویا وہ حق اور صداقت کی حمایت کا ایک پہاڑ ہے جسے مصائب و شدائد کا طوفان اپنی جگہ سے جنبش نہیں دے سکتا اور استقلال اور ثابت قدمی کا ایک ستون ہے جس کی بنیادیں صدمات و آفات کے کسی سیلاب سے متزلزل نہیں ہوسکتیں۔ کیا عزم و استقلال تسلیم و رضا حمایتِ دینی اور غیرتِ ایمانی کا یہ حیرت انگیز واقعہ جس کی برداشت انسانی طاقت سے باہر ہے اپنی نظیر آپ نہیں ہے۔

"واللہ کہ اے حسین کارے کردی"

شمس العلماء خواجہ الطاف حسین حالی پانی پتی نے جناب سید الشہداء اور آپکے ہمراہیوں کے کیرکٹر کی جو تصویر دلکش الفاظ میں کھینچی ہے وہ ہر مسلمان کے نہاں خانۂ دل میں رہنی چاہیئے۔ فرماتے ہیں۔

"فضائل اخلاق کا نمونہ اس سے اعلیٰ اور اشرف کیا ہو سکتا ہے کہ مسلمانوں کے نبی کا نواسہ جس کے آگے ہر مسلمان کا سر جھکنا چاہیئے تھا۔ اور جس کو ان سے بے انتہا امیدیں ہونی چاہیئے تھیں، وہ چند عزیزوں اور دوستوں کے سوا ہر مسلمان کو اپنے خون کا پیاسا دیکھتا ہے۔

ریگستان عرب کی لو اور گرمی ہے۔ عورتیں صغیر سن بچے اور سارا کنبہ ہمراہ ہے۔ مدینہ سے کوفہ تک مہینوں کی راہ طے کرنی ہے جو اعوان و انصار بن کر ساتھ چلے تھے۔ ان میں سے چند کے سوا سب ساتھ چھوڑ کر چل دئے۔ جن لوگوں نے متواتر خط اور پیغام بھیج کر اور خدا اور رسول کو درمیان دے کر نصرت و یاری کے وعدوں پر بلایا تھا۔ وہ ان کو یک قلم منحرف اور برگشتہ پاتا ہے اور تمام امیدیں مبدل بہ یاس ہو جاتی ہیں۔ بایں ہمہ وہ راضی برضا ہے۔ ہر حال میں خدا کا شکر کرتا ہے اور اپنے ارادہ پر ثابت قدم ہے جس شخص کو وہ ملک، قوم اور دین کے حق میں ایک مرض مہلک سمجھ کر اس کی بیعت سے انکار کر چکا ہے باوجود ان تمام شدائد کے اپنے انکار پر اسی طرح قائم ہے۔ دشمنوں نے کھانا پانی بند کر رکھا ہے۔ دریائے فرات آنکھوں کے سامنے بہہ رہا ہے۔ دشمنوں کے گھوڑے گدھے اور اونٹ تک سیراب ہوتے ہیں مگر اس کا سارا کنبہ تین روز سے پیاسا ہے۔ اس کے ننھے ننھے بچے پانی کی ایک بوند کو ترستے ہیں۔ اور یہ سب کچھ اس لئے ہے کہ وہ ایک نالائق آدمی کے ہاتھ پر بیعت نہیں کرتا۔ اپنے ارادہ پر اسی طرح ثابت قدم ہے کسی سختی اور کسی مصیبت سے اس کے استقلال میں فرق نہیں آتا۔ اس کے یار و مددگار کل [illegible] اور وہ بہتر ہیں اور ایک ٹڈی دل سے مقابلہ ہے۔ لڑنے میں اپنا اور اپنے سب عزیزوں اور دوستوں کا خاتمہ نظر آتا ہے خیموں اور اسباب کا لٹنا، پسماندوں [illegible] ہونا [illegible] یہ سب آفتیں گویا نگاہوں کے سامنے ہیں۔ وہ ان [illegible] اور بہتر سمجھتا ہے۔ بہ نسبت اس کے کہ ایک نالائق آدمی کے ہاتھ پر بیعت کرے اور اس کی حکومت کو تسلیم کرلے وہ اپنے بھائی بھتیجے، بھانجوں کو [illegible] مسلح اور آراستہ کر کے ایک ایک کو ہزاروں کے ساتھ لڑنے کے لئے بھیج رہا ہے [illegible] کے بازو تلواروں سے کٹتے ان کے کلیجے برچھیوں سے چھدتے دیکھتا۔ ایک ایک کی لاش کاندھے پر رکھ کر لاتا ہے اور اپنے [illegible] زمین میں دفن کرتا ہے [illegible] ایک قیامت برپا ہے۔ بی بی بیٹی، اور بہنوں کی دلخراش [illegible]

ہیں۔ چھ مہینہ کا شیر خوار بچہ ایک بے رحم کا تیر کھا کر۔ گود میں مرغ بسمل کی طرح تڑپ رہا ہے۔ اس کے حلق سے خون کا فوارہ جاری ہے۔ سب چھوٹے بڑے کام آ چکے۔ اور بچہ بھی کوئی دم کا مہمان ہے۔ اب سب کے بعد اپنی باری نظر آتی ہے۔ اور پھر اہل بیت کے جہاز کا خدا کے سوا کوئی ناخدا نظر نہیں آتا۔ ان سب بلاؤں کا سامنا ہے اور مصائب و آفات کی گھنگور گھٹا چاروں طرف چھائی ہوئی ہے مگر ان میں سے کوئی چیز اس کے عزم و استقلال میں تزلزل پیدا نہیں کر سکتی۔ وہ کوہ راسخ کی طرح اپنے ارادہ پر ثابت قدم ہے اور اپنے قول سے ٹل نہیں سکتا

"وہ بے رحم قوم جو نانا کا کلمہ پڑھتی ہے اور نواسے کی خون کی پیاسی ہے۔ جو چند نفوس کے مقابلہ کے لئے ایک ٹڈی دل لشکر ساتھ لے کر آئے ہیں اور تمام طاقت اس بات میں صرف کر رہے ہیں کہ جو ایذا اور تکلیفیں آدم سے تا ایں دم کسی ذی روح کو نہ دی تھیں۔ وہ اپنے نبی کے دل بند دل اور جگر کے ٹکڑوں پر ختم کی جائیں جو حرص و طمع کے نشہ میں ایمان۔ رحم انصاف، آدمیت ہمدردی اور تمام انسانی فضائل سے دست بردار ہو کر خدا کا گھر ڈھانے یعنی خاندان نبوت کو صفحہ ہستی سے مٹا دینے پر تیار اور کمر بستہ ہیں نہ وہ ان کو بد دعا دیتا ہے نہ ان کی شکایت کرتا ہے نہ ان پر غصہ ہوتا ہے۔ بلکہ نہایت ٹھنڈے دل کے ساتھ اپنے حقوق جن کے ماننے کا وہ دعوے کرتے ہیں، ان کو جتاتا ہے، اور ان کے وہ فرائض جو خاندان نبوت کے ساتھ ان کو بجا لانے چاہئیں انہیں یاد دلاتا ہے۔

"چھوٹے سے بڑے تک ہر شخص کے دل میں یہ امنگ ہے کہ سب سے پہلے اپنی جان خاندان پر نثار کروں۔ باپ کی یہ خواہش ہے کہ تلواروں کی آنچ میں۔ بھائی بھتیجے۔ بھانجوں سے پہلے اپنے جگر بند کو جھونک دوں۔ بھائی۔ بھائیوں اور بھتیجوں سے پہلے مرنے کو تیار۔ اور میدان جنگ کا خواستگار ہے۔ بھانجوں کی یہ تمنا ہے کہ ماموں اور ماموں کی اولاد پر سب سے پہلے ہم قربان ہوں بھتیجے کی یہ آرزو ہے کہ چچا کا فدیہ سب سے پہلے میں ہوں۔ بہن کا یہ ارمان ہے کہ اپنے بچوں کو بھائی اور بھتیجوں پر قربان کر دے۔ بھائی اس فکر میں گھلا جاتا ہے۔ کہ

اگر بھانجے میری رفاقت میں مارے گئے تو بہن کو کیا منہ دکھاؤں گا۔

"چچا کو خود بھی تین دن سے پیاس ہے، بے قرار ہے" اپنی پیاس کی کچھ پروا نہیں کرتا مگر پیاسی بھتیجی کی بے قراری کسی طرح نہیں دیکھ سکتا۔ وہ مشکیزہ گلے میں ڈال اور جان ہتھیلی پر رکھ کر دشمنوں کی صفیں چیرتا ہوا۔ دریا میں گھوڑا جا ڈالتا ہے۔ دریا کا سرد اور شیریں پانی لہریں مار رہا ہے۔ پیاس کے مارے دم آنکھوں میں ہے۔ دل قابو سے باہر ہوا جاتا ہے دو چلو میں پیاس بجھتی ہے مگر غیرت اور حمیت اجازت نہیں دیتی کہ ننھے ننھے بچوں کی پیاس بجھنے سے پہلے اپنی پیاس بجھائے وہ مشکیزہ بھر کر اسی طرح دریا سے پیاسا پھرتا ہے تاکہ جلدی جا کر بچوں کے حلق میں پانی پہنچائے۔ مگر دشمنوں نے گھیر کر دونوں بازو کاٹ ڈالے۔ اس پر بھی اس کو اپنے بازوؤں کا کچھ خیال نہیں۔ اگر ہے تو مشکیزہ کی فکر ہے۔ کہ مبادا پانی ضائع ہو جائے۔ اور بچے پیاسے رہ جائیں وہ سب حربے اپنے اوپر لیتا ہے مگر مشک پر آنچ نہیں آنے دیتا۔ جب تک کہ زخموں سے چور ہو کر گھوڑے سے نہیں گرتا۔

"بیبیاں خاوندوں کو اور مائیں ... کو قتل اور زخمی ہوتے دیکھتی ہیں۔ مگر کوئی زبان سے اُف نہیں کرتی اور منہ سے سانس نہیں لیتی، صرف اس خیال سے کہ حسب مُربی اور سرپرست کی رفاقت میں وہ کام آئے ہیں اس کے دل پر میل نہ آئے اور وہ اپنے دل میں ہم سے محجوب نہ ہو۔ سب اس کی اور اس کی اولاد کی خیر مناتے ہیں اور اپنے بچھڑے ہوؤں کو کوئی یاد نہیں کرتی۔

"ایک خدا کا بندہ جو دشمنوں کی فوج کے ساتھ نبی کے نواسے سے لڑنے کو آیا ہے۔ باوجودیکہ دشمنوں کا ساتھ دینے میں اس کو ہر طرح دولت اور جاہ و منصب کی توقع ہے۔ اور ان کا ساتھ چھوڑنے میں جان و مال اور خاندان کی تباہی کا یقین واثق ہے جس قوم میں وہ گھرا ہوا ہے وہاں کوئی ترغیب یا تقریب ایسی نہیں ہے۔ جو اس کا دل ظلم و بیدردی اور بے دینی اور حب جاہ و ثروت سے ہٹا کر رحم و ہمدردی اور دینداری کی طرف مائل کر سکے۔ اس کو ہر

طرف سے یہی آواز آتی ہو کہ جلد از جلد قلیل جمعیت پر فتح حاصل کیجئے۔ مردوں کے سر اتارئے عورتوں اور بچوں کو اسیر کرکے لے چلئے اور حاکم سے جل کر اپنی خدمات کا صلہ لیجئے۔ دوسری طرف کوئی ظاہری سامان ایسا نظر نہیں آتا جس کے لالچ میں وہ ان فائدوں سے قطع نظر کرکے اپنی فوج کا ساتھ چھوڑ دے بلکہ خلاف اس کے طرح طرح کی بلاؤں اور آفتوں کا سامنا نظر آ رہا ہے باایں ہمہ وہ تمام دنیوی منفعتوں اور امیدوں پر خاک ڈال کر ظالموں سے کنارہ کرتا ہے۔ حق کی نصرت پر اپنی جان دینے کو فوز عظیم جانتا ہے اور سب سے پہلے خاندانِ نبوت پر اپنی جان فدا کرتا ہے۔

"چند وفادار رفیق اور دوست جو فرزند نبی کے ہمراہ ہیں اور جو ایک ٹڈی دل کے مقابلہ میں اس قدر قلیل ہیں کہ انگلیوں پر گنے جا سکیں۔ وہ ایک عالم کو اپنے سردار سے برگشتہ اور منحرف پاتے ہیں۔ خود اس کے ساتھیوں اور رفیقوں کو اشارہ رہا ہے اس کا ساتھ چھوڑ چھوڑ کر اور آنکھیں چرا چرا کر جاتے دیکھ چکے ہیں اپنے لیے اس کا ساتھ دینے میں کوئی نفع عاجل اور دنیا کی کوئی بھلائی نہیں سوجھتی بلکہ ہر وقت موت کا سامنا ہے۔ اس کی رفاقت کی بدولت بھوک اور پیاس میں تین دن سے جان لبوں پر آ رہی ہے کوئی رشتہ ہے نہ قرابت ہے۔ جو اس کی رفاقت چھوڑنے سے مانع ہو مگر وفاداری کا طوق ان کی گردن میں اور دوستی و اخلاص کی زنجیر ان کے پاؤں میں پڑی ہے کوئی خوف اور کوئی طمع ان کے اس تعلق کو قطع نہیں کر سکتی، ہر وقت یہی آرزو ہے کہ کب اذنِ جنگ ملے اور کب خاندانِ نبوت پر اپنی جانیں قربان کریں اور کب اس فرض سے سبک دوش ہوں۔

"غور کیجئے ان خاصان خدا کے جذبات وفاداری کی کیا کیفیت تھی اور وہ سب ایک اصول کے لئے قربان ہونے آئے تھے۔ اور حق و صداقت کی حمایت کا حق ادا کر گئے۔ یوں تو اسلام اپنے ہر ایک فرزند سے حق اور صداقت کی نظیر پیش کر سکتا ہے، حمایت صداقت کی ایسی شاندار مثال قائم کرنا۔ صرف حسینؑ کا ہی کام تھا حسینؑ نے اسی جذبہ سے متاثر ہو کر ناقابل شکست

مصائب کو جھیلنا گوارا فرمایا۔ اور تعلیم اسلام کو اپنے خون سے عملی رنگ میں دنیا کے روبرو پیش کیا حسینؓ اگر باطل سے دب جاتے تو یہ اسلام کی شکست تھی۔ اس لئے وہ خود ہدفِ مصائب بنے اور اپنے قتل سے نہ صرف اسلام کی آبرو رکھ لی بلکہ اسلام کی فتح کا اعلان کر دیا۔ جب تک دنیا قائم ہے۔ اسلام فرزندِ بانیٔ اسلام کا مرہونِ احسان اور یہ واقعہ مسلمانوں کے لئے درسِ عبرت و موعظت بنا رہے گا اور ان کو یاد دلاتا رہے گا کہ مسلمانوں کو حق اور صداقت کی حمایت اس طرح کرنی چاہئے۔" (مقدمہ دیوان حالی مطبوعہ نامی پریس)

"حسینؓ کی شہادت نے اسلام کو ہلاکت سے بچا لیا"

جس وقت سے سلطنت بنی امیہ کی بنیاد پڑی اور بنی ہاشم کے رقیب اسلامی خلافت پر قابض ہو کر اہل اسلام کی قسمتوں کے مالک ہوئے بمصداق "الناس علیٰ دینِ ملوکھم" مسلمانوں کا عام رجحان ان ہی کی اطاعت اور ان ہی کے اقوال و افعال کی تقلید پر مائل ہوئے لگا ان کی اوضاع و اطوار خواہ موافق شرع ہوں یا نہوں۔ تحسن سمجھے جانے لگے۔ اسلامی سادگی جو خلفائے راشدین کے عہد میں شعارِ خلافت رہی۔ اب موقوف ہو کر سلطنت کے ٹھاٹھ اور امارت کے کرّ و فر قیصر و خاقان کی درباری شان و شوکت کو شرمانے لگے گورنروں اور عاملوں نے ہر طرح کی بے اعتدالیاں اختیار کریں عام مساوات کا اصول رُوند ڈالا گیا۔ تمام بڑے بڑے ملکی اور فوجی عہدوں پر وہ لوگ جو نہ صرف دشمن خاندان رسالت بلکہ اعلیٰ درجہ کے بدافعال بھی تھے۔ مامور کئے جاتے تھے۔ بنی ہاشم خصوصاً بنی فاطمہ کی عداوت وخصومت اس درجہ بڑھ گئی تھی کہ علیٰ رؤس الاشہاد ممبروں پر جنابِ امیر جنابِ سیدہ اور آپ کی اولاد امجاد پر سب وشتم کیا جاتا تھا۔ خطبوں میں فضائلِ اہل بیت۔ بصورت رذائل اور رذائل بنی امیہ بصورتِ فضائل بیان کئے جاتے تھے۔ بچوں کی درس گاہوں میں یہ ہی تعلیم دی جاتی تھی وہ اسی حالت میں نشو و نما پاتے جوان ہوتے اور بوڑھے ہو کر مر جاتے۔

یہ حالت ملک شام تک ہی محدود نہ تھی۔ بلکہ تمام اسلامی ملکوں میں یہ تمام۔ آلِ بنی امیہ کا غلبہ اور تسلط تھا۔ یہی بدعنوانیاں اور بے اعتدالیاں اشاعت پذیر ہو کر پھیلنے لگا تھا۔ ان سب باتوں کا لازمی نتیجہ یہ تھا کہ دینِ برحق کا صاف اور نورانی مطلع بدعتوں اور گوناگوں خرابیوں کے ابرِ غلیظ سے تیرہ و تار ہو جائے۔ مسلمانوں کے عقائد و اعمال بگڑ جائیں۔ خاندانِ نبوت ۔۔ علماء (جو بنی امیہ کی نظروں میں پیاسی تھی) دلوں میں جاگزیں ہو۔ حق و باطل کی تمیز جاتی رہے۔ یہ وہ زمانہ تھا کہ اسلام کی اصلی صورت مسخ ہونے کے قریب پہونچ چکی تھی۔ اور افسوس ہے کہ آخر کار اجماعِ امت ایک ایسے شخص کی خلافت پر ہوا جو باعثِ ننگ و عارِ اسلام تھا اور جس کا دستِ تسلط اسلام کے استیصال کے واسطے ایک کاری حربہ تھا۔

یزید کی تختِ نشینی کا ہد اسلام کے لئے زہرِ قاتل سے کم نہ تھی۔ اس کے تمام اعمال و افعال علانیہ خلافِ شرعِ محمدی تھے۔ وہ بظاہر کلمہ گو مسلمان مگر حقیقتہً کافروں سے زیادہ دشمنِ اسلام تھا۔ خاندانِ نبوت کی بربادی۔ خانۂ کعبہ کی توہین مسجدِ نبوی کی بے حرمتی اور شعائرِ اسلام کی کھلم کھلا گستاخانہ مخالفت اس کے کفرِ صریح کی بیّن دلیلیں ہیں۔ یزید نے بااختیار ہو کر صرف اتنے ہی فسق و فجور پر اکتفا نہ کیا۔ بلکہ دینِ اسلام کو ملیامیٹ کر ڈالنے کے ڈھنگ ڈالے۔ علانیہ شراب خواری، زنا کاری۔ قمار بازی کو جائز ماں بہن۔ بیٹی کو مباح اور دوسرے منہیاتِ شرعی کو جاری کر دیا۔ ایسے ناپاک وجود کی نحوست کچھ عجب نہ تھا کہ دینِ اسلام کی متزلزل دیوار کے ئے بھونچال کا اثر دکھاتی۔ اسلام کا شیرازۂ بستہ درہم و برہم ہو جاتا کیونکہ تختِ حکومت ہنوز تختِ خلافت اور امیر المومنین ہنوز نائبِ رسول سمجھا جاتا تھا۔ دینی اور دنیاوی اقتدار دونوں توام اور لازم و ملزوم خیال کئے جاتے تھے۔ مذہبِ اسلام اگرچہ دنیا کے وسیع حصہ پر پھیل چکا تھا۔ تاہم اس کی بنیاد قائم ہوئے۔ ابھی نصف صدی سے کچھ ہی مدت زیادہ گذری تھی آثار و علامات صاف کہہ رہے تھے کہ اگر یہی لیل و نہار ہے۔ اور دنیائے اسلام کا فرماں روا جو امیر المومنین اور

خلیفۃ المسلمین کہلاتا ہے شعائر اسلام سے لاپروا اور اس کی تخریب و انہدام کے درپے رہا تو بانی اسلام اور خلفاء راشدین کی تمام کوششیں رائگان جائیں گی اور وہ زمانہ دور نہیں ہے کہ دین اسلام اولٹے پاؤں رجعتِ قہقری کرتا کرتا پھر اپنے اصلی مقام پر آجائے۔ اور دنیا بدستور سابق پھر ضلالت و گمراہی کے گڑھے میں گر جائے۔

ضرور تھا کہ: "مردے از غیب بروں آید و کارے بکند" قدرت نے اسلام کی حفاظت و صیانت کے واسطے فرزندِ بانیِ اسلام کو منتخب کیا حسین علیہ السلام پیغمبر اسلام کے نواسے ہونے کے علاوہ اپنے جدِ امجد کے وارث جائز اور حقیقی خلیفہ تھے۔ آپ کا فرض تھا کہ اپنے جدِ بزرگوار کے دین کی حمایت و حفاظت کریں خواہ کچھ بھی افتاد پڑے۔ اسی واسطے آپ نے یزید کی اطاعت کو ناجائز اور افعال کو مردود قرار دے کر بیعت سے صاف انکار کر دیا حسین کا بیعت و اطاعتِ یزید کر لینا۔ گویا اس بات کی ضمانت ہو جاتا۔ کہ بنی امیہ کے فاسق و فاجر خلفاء امتِ محمدیہ کے جائز خلیفہ اور رسول اللہ کے برحق جانشین ہیں۔ لیکن حسینؑ کے انکار اور باوجودِ مظالم انکار پر اصرار نے۔ اس مسئلہ کو بالکل صاف کر دیا۔ کہ فاسق و فاجر کسی طرح خلافت رسول للہ کا مستحق نہیں ہو سکتا۔ آپ دیکھ رہے تھے۔ کہ اب ہمارے مخالفین جو ہمارے جد اور ان کی شریعت کے بھی معاندین ہیں اپنے اصلی رنگ و روپ میں دنیا کے سامنے آگئے ہیں تو آپکی قوتِ قدسی فوراً اس نتیجہ پر پہونچ گئی۔ کہ اب وہ وقت آگیا ہے کہ ہم اسلام کا اصلی چہرہ عالم کو دکھا دیں وہ زمانہ پہنچ گیا ہے۔ جب کہ ہم اپنے عہد کو پورا کریں جو ہم نے اپنے خدا سے باندھا تھا۔ یہی وہ زمانہ ہے جس کے اہل کے لئے انَّ الْاِنْسَانَ لَفِیْ خُسْرٍ" فرمایا گیا ہے اب ضرورت داعی ہے کہ ہم کشتی اسلام کے حقیقی ناخدا بن کر اس کو بھنور سے نکالیں۔ گو طوفانِ استبداد کے تھپیڑے چاروں طرف سے اس کشتی پر پڑتے تھے ہوائے ظلم کے تیز و تند جھونکے اس سفینہ کو ڈبونا چاہتے تھے۔ قریب تھا کہ تباہ اور پاش پاش ہو جائے۔ اس اولوالعزم امام نے ان مخالف ہواؤں کی کچھ پرواہ

نہ کی اور بسم اللہ مجریہا و مرسٰہا کہتے ہوئے کشتی کو گرداب ہلاکت سے نکالنے کا عزم بالجزم کر لیا اس نے سفینۂ اسلام کو بچانے کے لئے ایک ایسی راہ اختیار کی جس کو پہلے کسی نے اختیار نہ کیا تھا جو بہ لحاظ اپنی ابتلا کے جو تجلیاں اپنے پُر منظر ہونے کے ایسی سخت اور کٹھن تھی کہ اس کے تصور سے ہی رونگٹے کھڑے ہوتے ہیں جس کے ذکر سے سنگدل سے سنگدل انسان کا دل پسیج جاتا ہے۔ اس کشتی کا بچانا آسان کام نہ تھا کوئی سہل مہم نہ تھی کوئی چرب لقمہ نہ تھا۔ اس سفینۂ نجات کی حفاظت بڑی بھاری قربانیاں چاہتی تھی، بڑے بڑے فدائیوں کی ضرورت تھی۔ کوہ شکن مصائب کا تحمل درکار تھا۔ مگر حسینؑ ایسے نہ تھے کہ ان مصائب وشدائد کے سامنے جھجکتے۔ انہوں نے بڑی خوشی سے لبیک کہا اور ان تمام آنے والی مصیبتوں کا تہِ دل سے خیر مقدم کیا۔ وہ عہدِ طفولیت سے ہی ان تمام مصائب کیلئے تیار تھے اور باوجود ایسے جانگداز شدائد کے جو اپنی نوعیت میں عدیم المثال ہیں حرف بحرف اپنی بات پر ثابت اور قائم رہے۔

آپ کی اس قربانی سے عام اسلامی دنیا پر حیرت انگیز اثر پڑا۔ حق اپنے مرکز پر قائم ہو گیا۔ دینِ محمدی کی گرتی ہوئی دیوار نہایت استحکام سے سنبھل گئی۔ حق و باطل کا امتیاز نہایت اعلان اور اشتہار کے ساتھ آشکارا ہو گیا، لوگوں پر بنی امیہ کی گمراہی اور خاندانِ رسالت کے ساتھ معاندانہ برتاؤ آفتاب نصف النہار کی طرح روشن ہو گئے۔ لوگوں کے خیالات بدل گئے۔ گویا شہادتِ حسینؑ نے اسلام کے نیم مردہ قالب میں تازہ روح پھونک دی۔ شروع اسلام میں بھی مخالفوں نے جو بظاہر پیروِ اسلام تھے۔ اسلام پر سخت حملہ کیا تھا اگر اس وقت اس خوفناک حملہ کی روک نہ کی جاتی یا اس حملہ کا روکنے والا بزدل اور کمزور طبیعت کا ہوتا۔ تو ضرور اسلام کو چشم زخم پہونچتا۔ اور لوگوں کے دلوں میں دینِ اسلام بے وقعت اور اس کی حقانیت مشکوک ہو جاتی۔ لیکن مشیت نے اس عظیم الشان کام کے لئے حسینؑ کو چُنا اور حسینؑ نے بھی اس نازک اور کٹھن ذمہ داری کو ایسا نباہا کہ اسلام تباہ ہونے سے بال بال بچ گیا۔ اگر آپ باوجود نائب رسولؐ اور محبتِ خدا ہونے کے ایک فاسق کی جو اپنے ناپاک حرکات کے باوجود بھی امیر المومنینؑ

اور خلیفۃ المسلمین کے لقب سے پکارا جاتا تھا۔ بیعت کر کے اس کو امیر المومنین تسلیم کر لیتے۔ تو تمام مسلمان یزید کے ہر فعل کو جو سراسر فسق و فجور کفر و ارتداد پر مبنی تھا فعلِ خلیفۂ رسول سمجھ کر ضلالت گمراہی کے گڑھے میں سرنگوں گر جاتے۔ آپ کا بیعتِ فاسق نہ کرنا۔ اور درد انگیز مصائب اٹھا شہید ہو جانا فی الحقیقت کالبدِ اسلام کے لئے نئی رُوح تھا جس سے تمام مسلمانوں کو یزید کا خلیفہ ناجائز اور اس کی اطاعت کا حرام ہونا ثابت ہو گیا۔

ہادی اسلام کی وفات کے بعد اسلامی حکومت میں جو انقلاب رونما ہوئے ان کے اعادہ کی ضرورت نہیں۔ بہرحال قوم کی سیاسی غلطی کہو یا مسلمانوں کی سادہ لوحی چالیس برس کے عرصہ میں کسی نہ کسی طرح اسلامی حکومت پر اسی قبیلہ بنی امیّہ کا قبضہ ہو گیا جس کی قوت کم کرنے۔ اور جس کا اقتدار توڑنے میں پیغمبر اسلام نے پوری سیاست اور تدبر سے کام لیا تھا کیونکہ وہ خدا کا برگزیدہ پیغمبر اور فطرت انسانی کا مطالعہ کرنے والا مدبر خوب جانتا تھا کہ یہ قبیلہ کبھی اسلام کا دوست نہیں ہو سکتا۔ اس طرف ہادی اسلام کا محبوب نواسہ جس کے ناز نانا نے زندگی بھر اٹھائے تھے۔ مدینہ میں گوشہ نشینی کی زندگی بسر کر رہا تھا مسلمانوں کو خاموشی کے ساتھ فلسفۂ اسلامی کا درس دے رہا تھا اس کی زبانِ فیض ترجمان سے علم و حکمت کے دریا موجزن ہو کر تشنہ کاموں کو سیراب کر رہے تھے۔ وہ اپنے نانا محمد مصطفٰےؐ اپنے باپ علی مرتضٰیؑ اور اپنے بھائی حسنؑ مجتبٰے کے اصول پر غریبوں کی دستگیری، رانڈوں کی خبرگیری اور یتیموں کی سرپرستی سے مدینہ کو جنتِ ارضی بنائے ہوئے تھا۔ ادھر حکومتِ اسلامی کے پایہ تخت دمشق میں ابو سفیان کا پوتا۔ معاویہ کا بیٹا۔ بنی امیّہ کا نوجوان سردار یزید پیغمبر اسلام کی نیابت کو کھیل بنائے ہوئے منصبِ خلافت کو تختِ سلطنت سے بدل کر اسلام کے قانون کو بنی امیہ کی ذہنیت میں تبدیل کرنے کا قومی فرض ادا کر رہا تھا۔ چونکہ رسول اللہ کی وفات کے بعد پہلے ہی جانشینِ رسول اللہ کے زمانہ سے صوبۂ شام کی گورنری یزید کے چچا اور باپ کو سپرد کر دی گئی تھی۔ شام کے رہنے والے جو نئے نئے مسلمان ہوئے تھے اور جن کو سوائے بنی امیہ کے اور

کسی سے سابقہ ہی نہیں پڑا تھا۔ ان کا ہموار کر لینا، نبی امیہ کو کچھ دشوار کام نہ تھا۔ ان کو بآسانی یہ ذہن نشین کرا دیا گیا تھا کہ ہم لوگ ہی سب سے زیادہ قریبی رسول اللہ کے رشتہ دار، وارث و جانشین اور اسلام کے حقیقی نمائندہ ہیں۔ ہماری زبان اسلام کی زبان اور ہمارا ہی قانون اسلام کا قانون ہے۔ خلیفۂ رسول کے خطاب سے اس دعوی کی سند بھی دیدی تھی۔ اس لئے یزید جب تخت حکومت پر بیٹھا تو شام کی زمین اس کے ظلم و بدعت کی تخم ریزی کے لئے مل گئی۔ وہ اہل شام کی طرف سے مطمئن تھا مگر اس کے تخت پر قدم رکھتے ہی عراق و حجاز میں بے چینی کے آثار پیدا ہوئے اور دیندار مسلمانوں نے رنج و افسوس سے دیکھا کہ شراب پانی کی طرح حلال ہو گئی ہے۔ فسق و فجور اور حرام کاری اربابِ حکومت کا دلچسپ مشغلہ ہو رہا ہے۔ ماں اور بہن کا امتیاز اٹھ گیا۔ بندروں کو عالموں کے کپڑے پہنا کر ان کا مذاق اڑایا جاتا ہے۔ غریب اور مزدور مسلمان فاقہ کشی میں مبتلا ہیں اور بنی امیہ کے ایک ایک فرد کا دسترخوان ان کے ہوا خواہوں، اربابِ نشاط، مسخروں اور سرمایہ داروں کے لئے وسیع ہو رہا ہے۔ برسرِ منبر اہلبیت رسول کے متعلق گستاخیاں اور بے ادبیاں برتی جاتی ہیں۔ اسلامی اخلاق کا یہ انقلاب شام تک ہی محدود نہ تھا۔ بلکہ گورنران صوبہ جات کی بدولت جو بالعموم خاندان بنی امیہ کے افراد یا ان ہی کے زلہ خوار اور ابن الوقت تھے اس انقلاب کی وبا ہر شہر اور ہر قریہ میں زور و شور سے پھیل گئی تھی اور پھیلتی جاتی تھی۔ ظاہر ہے کہ جو اربابِ حکومت کا مذہب اور ارکانِ سلطنت کی معاشرت ہوتی ہے رفتہ رفتہ رعایا بھی وہی طریقہ اختیار کر لیتی ہے جس کے ثبوت کی کوئی ضرورت نہیں۔ آج ہم اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں کہ ہندوستانی معاشرت کس قدر انگریزی معاشرت سے بدل گئی ہے اور یہ انقلاب کس حیرت انگیز سُرعت کے ساتھ ترقی پذیر ہو رہا ہے۔ مدینہ کی کچی دیواروں کی مسجد جس کو رسول اللہ اور اصحابِ رسول اللہ نے اپنے ہاتھوں سے تعمیر کیا تھا۔ رسول کا محل اور اس کا فرش۔ رسول کا تخت تھا۔ نہ کوئی حاجب تھا نہ دربان۔ یہی رسول اللہ کا دربار تھا اب اس کو

رسالت مجھو۔ یا او شاہت! اس کے خلاف یزید کے محلات اور اس کا دربار۔ شاہان روم و فارس کے محلات اور درباروں کا نمونہ بنا ہوا تھا۔ سر بفلک اور عالی شان عمارتیں۔ جواہر نگار تخت طلائی نقرئی کرسیاں۔ قاقم و سنجاب کا فرش حریر و دیبا کے پردے، زرّیں کمر اور خوب صورت غلام، حاجب، چوبدار، خواجہ سرا۔ عیش بیگی وغیرہ سب تھے۔ خلاصہ یہ کہ شان و شوکت اور کر و فر کا کوئی دقیقہ باقی نہ رہا تھا۔ اور بیت المال اسلامی خزانہ کا روپیہ جو رعایا کا خون تھا یزید اور اس کے عمال کی عیش پرستی کے لئے پانی کی طرح بہایا جا رہا تھا۔ اور قریب قریب یہی شان اس کے صوبہ داروں کی تھی۔ رسول کی آنکھیں دیکھے ہوئے مسلمان اپنی آنکھوں سے یہ سب کچھ دیکھ رہے تھے۔ اور رسول کے ہدایات و ارشادات کو اپنے کانوں سے سننے والے بزرگوار ان ناگوار واقعات کو کانوں سے سن رہے تھے مگر کچھ لوگ ایسے تھے۔ جن میں احتجاج کی قوت باقی نہ رہی تھی بنی امیہ کی فوجی طاقت ان کو مرعوب کر چکی تھی۔ یزید کے سخت گیر گرگ بندوں کا خوف ان کو زبان ہلانے کا موقع نہیں دیتا تھا کچھ ایسے تھے۔ کہ خاموشی کو ہی مصلحت سمجھ لیا تھا بعض ایسے تھے کہ اپنی ذات کو اصلاح قوم کا ذمہ دار نہ سمجھتے تھے۔ زیادہ ایسے تھے جن کو دنیا کی دولت نے اپنی آغوش میں لے لیا تھا۔ ایک بنی ہاشم کا قبیلہ او بنی ہاشم میں حسین کی ذات ایسی تھی جس کو اسلام کا درد تھا۔ حسین اپنے نانا کے دین کے ساتھ دنیا کا اخلاق تباہ ہوتے ہوئے دیکھ رہے تھے۔ وہ ملاحظہ کر رہے تھے۔ کہ وہ اسلام جو دنیا کا اخلاق درست کرنے تہذیب پھیلانے۔ اور نوع انسانی کو امن و امان نیکی و تقویٰ کی تعلیم دینے آیا تھا اس کے پردہ میں اسی کا نام لے کر اسی کا بھیس بدل کر انسانوں کے اخلاق کو برباد اور عادات و فضائل کو وحشیانہ اور بہیمانہ بنایا جا رہا ہے۔ ایک وقت آئے گا کہ دنیا قوموں کی بدتر بداعمالیوں اور فتنہ و فساد کا ذمہ دار اسلام کو ٹھہرائے گی حسین جانتے تھے کہ مفاسد بنی امیہ نے عیش و عشرت کے ایسے خواب دکھائے ہیں اور دنیاوی آرام و آسائش کی ایسی راہ پر لگایا ہے کہ اب اسلامی فتوحات کا سیلاب رکنے والا نہیں اور مسلمان جس ملک میں جائیں گے

یہی بھیانک اور وحشت خیز صورت کا اسلام اپنے ساتھ لے جائیں گے۔ اور بنی امیہ کے پھیلائے ہوئے جرائم دوسری قوموں کی عمدہ خصائل کو بھی ہلاک کر کے۔ اسلام کو بنی آدم کی تباہی و بربادی کا ذمہ دار ٹھہرا دیں گے حسین خاموش نہیں رہ سکتے تھے حسین خاموش نہیں رہے۔ برابر مسلمانوں کو اس مسخ شدہ اسلام اور حقیقی اسلام کا فرق بتا رہے تھے وہ لیکن مسلمان اب چالیس برس پہلے کے مسلمان نہیں رہتے تھے لیکن مسلمان اب چالیس برس پہلے کے مسلمان نہیں رہے تھے، عہد رسالت اور زمانہ راشدہ خلافت کے مسلمان زیادہ تعداد میں دنیا سے رخصت ہو چکے تھے۔ اس زمانہ کے جوان بڈھے اور بچے جوان ہو رہے تھے۔ نئی نسلوں نے ہوش سنبھال کر بنی امیہ اور ان کے ہی خواہوں کو برسر اقتدار دیکھا۔ وہ بنی ہاشم اور حسین کی شخصیت کو اتنا نہیں جانتے تھے جیسا کہ ان کے بزرگ سمجھے ہوئے تھے حسین کے دل سے لگی ہوئی تھی، وہ اس فکر میں تھے کہ جس طرح ممکن ہو دنیا کے سامنے ایک وقت حقیقی اسلام کو اس طرح پیش کر دیا جائے کہ آج سے لے کر قیامت تک آنے والی نسلیں بآسانی دونوں کا فرق سمجھ لیں وہ یہ بھی جانتے تھے کہ موجودہ فضا میں ایک عالمگیر انقلاب پیدا کرنے کے لئے۔ بہت بڑی قربانی کی ضرورت ہے ایسی قربانی جس کی نظیر دنیا کی تاریخ میں نہ مل سکے۔ مدینہ کی زمین خاموش تبلیغ کے لئے کافی نہیں ہو سکتی تھی حسین وقت کے منتظر اور اس قربانی کے لئے تیار ہو رہے تھے۔ ادھر یزید اس فکر میں تھا کہ حسین سے اپنی حکومت و خلافت تسلیم کرا کے اپنے پوزیشن اور اپنے حق خلافت کے استحکام پہ نواسۂ رسول سے مہر تصدیق کرائے۔

درحقیقت واقعہ کربلا کا سب سے بڑا نتیجہ ملت محمدیہ کا احیا اور اس میں روحانیت کی البقا ہے یہ ظاہر ہے کہ شارع اسلام کی اصلی منشا تبلیغ رسالت سے توحید حقیقی، عرفان الٰہی تزکیہ نفس۔ ترقی روحانی۔ تہذیب و تمدن تکمیل اخلاق۔ ہمدردی بنی نوع اور صداقت کا تحفظ تھا۔ اور اس تاریکی اور جہالت کے زمانہ میں ان باتوں کو اچھی طرح ذہن نشین کرنے کے لئے بہ نسبت وعظ کے عمل کی زیادہ ضرورت تھی مگر عملی نمونہ بننے کے لئے سچی بہادری، اخلاقی جرأت اور مذہبی

آزادی درکار ہے۔ بانیٔ اسلام کی وفات اور خلافتِ راشدہ کے ختم ہونے پر جب دنیا پرست لوگوں کا اسلامی سلطنت پر دسترس ہوا۔ اور انہوں نے اسلام کو اپنی خودغرضی اور نفس پرستی کی ڈھال بنانا چاہا۔ ضرور تھا کہ کوئی ایسا شخص کھڑا ہو جو سچی بہادری اخلاقی جرأت اور مذہبی آزادی کا عملی نمونہ پیش کرے اور اس طرح اسلام کو ہلاکتِ ابدی سے بچا کر اس کو اس کے اصلی مرکز پر قائم کر دے چنانچہ جب یزید نے باوجود تمام کمینہ خصائص کے جو اس کی ذات میں موجود اور اصولِ اسلام کے سراسر خلاف تھے۔ اسلام کا مذہبی پیشوا بننا چاہا تو بانی اسلام کے فرزند نے۔ باوجود اس علم کے کہ بادشاہِ وقت کی مخالفت میں دنیاوی نقصان معمولی نہیں۔ بلکہ اپنی اور تمام خاندان کی تباہی ہے۔ اس کی سخت مخالفت کی اور سچی بہادری اور اخلاقی جرأت کا وہ اعلیٰ نمونہ دکھایا جس کی نظیر تاریخ عالم میں نہیں ملتی۔

اگر آپ یزید کی بیعت کر لیتے تو گویا اس کو خلیفہ رسول اور مذہبی پیشوا تسلیم کر کے اس کے احکام کے آگے سر اطاعت خم کر دیتے نتیجہ اس کا یہ ہوتا کہ اسلام شاہانِ اسلام کے ہاتھ میں ایک کھلونا ہو جاتا اور وہ جس وقت اور جس طرح چاہتے اپنی مرضی کے موافق اس کے اصول کو ڈھال لیتے اور کسی کو مجال چون وچرا باقی نہ رہتی اور یہ ایک ایسی مضرت رساں اور مکروہ نظیر قائم ہو جاتی کہ جب تک دنیا میں مذہب اسلام ہے اس کا زہریلا اثر باقی رہتا۔ اور اس کی تردید و ابطال امکانی حد سے باہر ہو جاتی مگر شہدائے کربلا نے نخل اسلام کو اپنے خون سے اس طرح سینچا کہ شخصی حکومت اور مرتدانہ قوت کے بادِ سموم کے سخت جھونکے اس کی تازگی میں خلل نہ ڈال سکے۔ اگر سیدالشہدا اپنی جان و مال و اولاد کو نذر اسلام نہ کرتے تو اسلام کبھی کا خودغرض اور دنیا پرست بادشاہوں کے ہاتھ سے غارت ہو چکا ہوتا اور اگر باقی بھی رہتا تو صرف اس مٹی کی صورت کی طرح ہوتا جس میں روح نہیں ہوتی اور اس طرح آپ کے جدّ امجد کی ساری عمر کا ریاض بدخواہان اسلام نے اسلام کے پردہ میں برباد کر دیا ہوتا۔ مگر امام حسین اور دوسرے شہدائے کربلا نے حقانیت اسلام پر اپنے پاک خون سے ایسی مہریں ثبت کر دیں جو کبھی نہ مٹ سکیں گی اور جن کو دنیا

ہمیشہ عزت وتعظیم اور اعتقاد کی نظروں سے دیکھے گی ۔

اس واقعہ نے اس بات کو بھی کہ "انجام کار راستی ہی کی فتح ہے" نہایت خوبی سے ثابت کر دیا غور کرو دنیاوی لحاظ سے ایک معمولی درجہ کا آدمی جو مع اپنے چند عزیزوں اور دوستوں کے ایک جنگ میں قتل کیا جائے۔ آج اس کے غلاموں کے قدموں پر بڑے بڑے بادشاہ اپنا سر نیاز رکھنا باعث فخر سمجھیں جس کا صرف ایک بیٹا زندہ بچے ۔ آج اس کی چونتیسویں پینتیسویں پشت میں ایک کروڑ سے زیادہ لوگ موجود ہوں جو یہ چاہتیں کہ ذرا سی اس کی گرد قدم کو اپنی آنکھوں کا سرمہ بنانے پر تیار ہوں ۔ تمام دنیا ان کے پاک نام کو عزت وتعظیم کے ساتھ لے اور اس کو دنیا کے سر برآوردہ مشاہیر میں شمار کرے اس کے مناقب ومصائب میں بے شمار کتابیں لکھی جائیں دنیا کے اکثر طبقات میں اس کی مجالس عزا سالانہ قائم ہوں اور ہر سال کروڑہا روپیہ اس کی یادگار قائم رکھنے میں صرف کیا جائے، غیر مذاہب والے بھی جو اس کے نانا کو نہیں مانتے اس کا نام ادب سے لیں اور اس کے نام پر روپیہ لٹائیں کیا کوئی کہہ سکتا ہے کہ ایسا آدمی ناکامی کے ساتھ مر گیا۔ ہرگز نہیں ۔ اس کی موت پر زندگی کو رشک ہے، اور اس کی ناکامی کی طرف فتح بحسرت نگراں ۔ یہ ساری باتیں اس لئے ہیں اور ہوتی رہیں گی کہ وہ حسن اسلام کو زوال سے بچانے والا ہے اس نے اپنی جان حیات اسلام اور تائید حق پر دی اور راستی کے راستہ باوجود نقصان عظیم اٹھانے کے ایک انچ نہ سرکا ۔ بس یہ حیات ابدی اور فتح مندی کا خلعت اس کو حق اور صداقت کی طرف سے عطا ہوا ہے ۔ جو باوجود مرور زمانہ ہمیشہ نیا ہی رہے گا ۔ بلکہ یاد چمکتا جائے گا اور کہنگی وفرسودگی سے محفوظ رہے گا ۔

اب اس کے دشمنوں کو دیکھو، یزید اس وقت دنیا کا سب سے بڑا تاجدار اور دنیا کی سب سے وسیع اور عظیم الشان سلطنت کا شہنشاہ تھا جس کے پاس لاانتہا خزانے اور سپاہ تھی جس کو کربلا میں بظاہر کامیابی بھی ہوئی اور جس نے بقول طبری بارہ بیٹے چھوڑے ۔ مگر آج روئے زمین پر ایک شخص ایسا نہیں ہے ۔ جو اس کی اولاد میں ہونے کا دعویٰ تو کجا ۔ اقرار بھی کرتا ہو ۔ یا اپنے کو کسی قسم کی نسبت اس سے

ساتھ دنیا پسند کرے۔

تمام دنیا اس کے نام کو ذلت وحقارت سے لیتی ہے اور وہ انسان اور انسانیت کے لئے باعث شرم اور موجب ننگ سمجھا جاتا ہے۔ یہ کیوں ؟ اس لئے کہ وہ ظالم فاسق اور حق سے روگرداں تھا۔ اس نے اپنے عزم سلطنت میں وہ کام کیا جو خود شیطان سے نہ ہوسکتا تھا۔ لہٰذا وہ اَبدی لعنت میں گرفتار ہوا۔ اور ہمیشہ کے لئے جہنم کا ایندھن بن گیا۔

خواجہ حسن نظامی دہلوی محرم نامہ میں واقعات کربلا کے بعد لکھتے ہیں "بنی امیہ کی طولانی کہانی سے تم نے سمجھ لیا ہوگا کہ یہ لوگ منافق تھے۔ خوف سے مسلمان ہوئے تھے اور لالچ سے اس پر قائم رہے ورنہ ان کے دل میں اسلام کی کچھ عظمت نہ تھی۔ جب وہ دین اور اہل دین کی قدر ہی نہ جانتے تھے تو جو بھی حرکت کرتے وہ کم تھی۔ ابولہب آنحضرت کے چچا۔ اور ابوجہل قریش کے سرداران نمائشی مسلمانوں سے بہتر تھے جنہوں نے کھلم کھلا مخالفت کی اور مشرک کہلائے۔ خوفناک یہ بنی امیہ تھے جن کی زبانوں پر کلمہ تھا۔ جن کی پیشانی سجدہ میں تھی جن کے منہ میں روزے تھے۔ مگر دل تاریک تھے۔ اور ان میں حرص دنیا اور خواہش عزت وجاہ کے سوا۔ ایمان کی اصلیت ذرّہ برابر نہ تھی پھر ایسے لوگوں سے جو گناہ نہ ہوتے زیبا تھے۔ آج وہ مٹ گئے۔ ان کے تخت اوندھے ہوگئے۔ ان کی عزت خاک میں مل گئی۔ دمشق میں یزید کی قبر میں نے دیکھی ہے لوگ اس پر پتھر مارتے ہیں۔ اور پیشاب کرتے ہیں۔ معاویہ کی قبر پر بھی گیا ہوں ایک چھوٹی سی برجی میں ویران پڑی ہے جس پر وحشت برستی ہے مگر بنی فاطمہ کی قبریں سلطنت کر رہی ہیں اور ان کے کارنامے دنیا پر چھائے ہوئے ہیں۔ محرم میں کروڑوں آدمی ان کا ذکر خیر کرتے ہیں اور کروڑوں روپیہ ان کے نام پر خیرات کیا جاتا ہے۔ بنی امیہ کا نہ کوئی نام لیوا ہے اور نہ پانی دیوا یہی قدرتی انصاف سب سے بڑی دلیل حق و باطل کے سمجھنے کی ہے (محرم نامہ صفحہ ۱۹۵)

روز عاشور بعد خاتمہ جنگ دشمن شادیانے بجاتے تھے اور فتح کی خوشی میں نعرہ ہائے مسرت بلند کر رہے تھے۔ مگر ان دشمنانِ انسانیت کو کیا خبر تھی۔ کہ ان کے طبلِ فتح کی صدا چند لمحوں میں ڈوب

جائے گی۔ اور حسینؓ کے ماتمی باجوں کا شور ابدالآباد تک قائم رہے گا۔ یہ فاتحانہ صدائیں صرف تھوڑی دیر کی ہیں۔ حسینؓ کے غم کی صدا انسانی جماعتوں میں روز بروز بلند ہوتی جائیگی۔ اس کی لہریں بجلی کی لہروں کی طرح فضائے کائنات میں پھیل جائیں گی آج دنیا کا مشکل سے کوئی گوشہ ہے جو حسینؓ کے نام سے کوئی واقف نہ ہو۔ اور اس کی عزت و ہمدردی نے اثر نے قلوب پر ایک طلسمی تسخیر کا عمل نہ کیا ہو مظلوم کی قبر اگرچہ ایک زمانہ تک سیاسی تشدد کے تابع رہی [illegible] دیکھ لاش اور سر [illegible] مگر اس مظلوم کا نام اس ریگستانی ویرانہ سے جسے کربلا کہتے ہیں بلند ہوا اور [illegible] اور روضہ بن گیا جہاں جہاں کسی نے نام لیا۔ ہمدردوں کی جماعت اس طرح اپنے وقت [illegible] توجہ اور اپنے مال کو اس کے تذکرہ کے لئے صرف کرنے لگی گویا اس کے واسطے اس سے زیادہ خوشگوار کوئی دوسرا فرض نہ تھا۔ کیا ہوا اگر حسینؓ کی قبر مطہر کے لئے مختلف روایتیں ہیں۔ کیا ہوا۔ اگر سر اور لاش کے ایک جگہ دفن ہونے کے متعلق بیانات مختلف ہیں۔ کیا ہوا۔ اگر کوئی متوکل پھر پیدا ہو جائے اور ہم کو حسینؓ کی قبر مطہر کا نشان نہ ملے حسینؓ کی قبر تو اس بلند اور مخصوص زمین میں ہے جس سے بڑھ کر مدفن تلاش کرنا بے سود ہے۔ اور وہ شرافت پسند انسانوں کا دل ہے۔

جس وقت تک دنیا میں ایک انسان بھی باقی رہے گا۔ اس وقت تک حسینؓ کا نام فخر سے لیا جائے گا اور اس کے استقلال و حمایتِ حق کی تعریف ہوگی۔ اولوالعزم شہنشاہوں تاج بخش و تاج نشان تاجداروں کا نہ کوئی نام لیتا ہے، نہ کوئی ان کا زائر ہے مگر جس مظلوم کی زیارت کرنے والوں کا سیلاب اور ان کی تعداد بارہ صدیوں سے برابر ترقی پذیر ہے اور یہ سیلاب ذرائع آمد و رفت کی سہولت کے ساتھ بڑھتا جائے گا انسانوں کی جماعتیں اس نشان کو دیکھنے جائیں گی۔ جہاں شرافت و شجاعت انسانی ہمدردی صبر و استقلال اصولِ حق کی حفاظت خدا کی لاثانی عبادت اور عزتِ نفس کی روح دفن ہے حسینؓ کی شہادت انفرادی اور قومی حیات کا مقدمہ ہے حسینؓ اس لئے شہید ہوئے کہ شرافت و انسانیت کا رتبہ بلند کریں۔ خواجہ معین الدین چشتی علیہ الرحمۃ نے خوب فرمایا ہے۔ ؎

حسینی شہادت کا فلسفہ

حسین علیہ السلام نے بیعت یزید کیوں نہ کی ناقابل برداشت مصیبتیں اُٹھائیں۔ لیکن بادشاہ وقت کی اطاعت کو منظور نہ فرمایا اپنا اپنی اولاد کا اپنے عزیزوں کا رفیقوں کا قتل اپنے گھر کی بربادی پسماندوں کی اسیری اور توہین سب قبول مگر انکار بیعت پر آخر تک وہی ثابت قدمی اور استقلال آخر اس میں کیا مصلحت اور حکمت تھی اور بیعت کرنے میں کس خرابی اور قباحت کا اندیشہ تھا یہی سب سے زیادہ اہم رمز ہے جس پر غور و خوض کرنے کی ضرورت ہے

یزید جو اس زمانہ کے مسلمانوں کے خیال میں جائز خلیفہ رسول اور جانشین ہادی اسلام تھا اور اس کو اجماع استخلاف اور تسلط فی الارض تینوں شرائط خلافت حاصل تھیں اور اس وقت جتنے قدرسیدہ رسول زندہ تھے اس کی بیعت کو طوعاً یا کرہاً تسلیم کر چکے تھے۔ اس کی بیعت اس وجہ سے حرام تھی کہ وہ علانیہ فسق و فجور کا عادی تھا۔ جب خلیفہ وقت جانشینی رسول کا ادعا بھی کرے اور اس کے ساتھ ہی شراب خوار ہو زناکار ہو تارک الصلوٰۃ ہو تارک الصوم ہو۔ خدا و رسول سے استہزا کرنے والا ہو۔ احکام شریعت کا مٹانے والا ہو تو اُمت محمدیہ کا کیا حشر ہوتا۔ پھر حسینؑ کی بیعت جن کا گوشت پوست رسول اللہ کا گوشت پوست تھا جن کی پاک ہستی اسوۂ محمدیہ کا مکمل ترین نمونہ تھی۔ یزید کے خلیفہ واجب الاتباع ہونے پر مہر تصدیق ثبت کر دیتی۔ گویا آپ اس کو خلیفہ برحق تسلیم کر کے اس کے رندانہ اور ملحدانہ افعال کے جواز کو منظور فرما لیتے۔ نتیجہ یہ ہوتا کہ فرزند رسول کے مسلّمہ خلیفہ کے اعمال و احکام جو سراسر خلاف شریعت بلکہ ہادم بنیاد دین و مذہب تھے سب مستحسن اور عام مسلمانوں کے لئے نظیر ہی نہیں بلکہ واجب العمل ہو جاتے اور مذہب اسلام رجعت قہقری کر کے اپنے اصلی مقام کفر و بے دینی پر آ جاتا حسینؑ سے بڑھ کر اس بیعت کے تباہ کن اسلامی نتائج کا سمجھنے والا کون ہو سکتا تھا۔ آپ نے اپنے جد بزرگوار اور

پدر عالیمقدار کی اُن تھک کوششوں اور محنتوں کا ضایع و برباد ہونا گوارا نہ فرمایا تمام ناقابل برداشت مصائب منظور کئے مگر اسلام کی تباہی قبول نہ کی حسینؑ نے دل ہلا دینے والی مصیبتوں کا مقابلہ نہیں کیا اپنے اقربا اور انصار کی شہادت اپنے اہل بیت کی جانکاہ اذیتیں منظور نہیں کیں لیکن اسی لئے اور صرف اسی لئے کہ دین اسلام پر آنچ نہ آئے اسلام کی حقانیت فنا نہ ہونے پائے اور دنیا دیکھ لے اور سمجھ لے کہ فاسق و فاجر جانشین رسول نہیں ہوسکتا۔ اور ایسے شخص کی اطاعت مسلمانوں پر حرام ہے مسلمانان عالم نہ صرف اس وقت بلکہ قیامت تک درس عبرت حاصل کرلیں کہ شریعت کی حمایت اور حق وصداقت کا اعلان اس قدر ضروری اور اہم ہے کہ اس کے لئے ہر قسم کی مصیبتوں کا جھیلنا اسلام کے ہر نام لیوا کا فرض اولین ہے حسینؑ کے انکار بیعت اور اس کے نتیجہ پر شدید سے شدید مصائب کے خیر مقدم کو آخر دم تک ثابت قدم رہنا ایسی حکمت عملی تھی جس نے بنی امیہ کے طلسم کو توڑ دیا۔ یزید کے تمام منصوبے خاک میں مل گئے۔ اسلام کے نیم مردہ قالب میں نئی رُوح حلول کر گئی۔ اور اس کا وہ عظیم الشان قلعہ جو فسق وفجور اور بے دینی و زندقہ کے بھونچال سے سربسجود ہونے والا تھا۔ از سر نو ایسا مستحکم ہوگیا۔ کہ اب قیامت تک کوئی طاقت اس کو جنبش نہیں دے سکتی۔ ملت محمدیہ کا سرسبز و شاداب باغ بدعت و کفر کے بادسموم کے جھونکوں سے خشک ہو جاتا اگر حسینؑ اپنے خون سے اس کی آبیاری نہ کرتے۔ یہ سب ہادی اسلام کے فرزند کی سرفروشی اور جانبازی کا طفیل ہے جو آج دنیا میں چالیس کروڑ انسان لا الٰہ الا اللہ محمد الرسول اللہؐ کہنے والے موجود ہیں۔

اسلام کا یہ رنگیلا خلیفہ (یزید) ان تمام خصائل و رزائل کا مجموعہ تھا جو انسانیت کو حیوانیت کے درجہ تک پہنچا دیتی ہیں اس کی رندانہ عیاشی اس حد سے بھی تجاوز کر چکی تھی جسے فاجر سے فاجر بدکار سے بدکار بھی حمیت و غیرت بلکہ انسانیت کے منافی سمجھتا ہے اور اسے اس کا ضمیر ہرگز قبول نہیں کرسکتا جب کفر اس طرح عریاں ہوکر میدان میں آگیا۔ اور مسندِ خلافت سے اسلام کو

چیلنج دینے لگا تو ہادئ اسلام کے فرزند اور جانشین کے لئے دو ہی راستے تھے، ذلت کی زندگی یا عزت کی موت پہلا راستہ آپ کیلئے ناممکن تھا۔ اس لئے دوسرا راستہ اختیار فرمایا۔

عبداللہ ابن عمر اور عبداللہ ابن زبیر جو اس وقت اسلام کے نہایت مؤقر اور ممتاز افراد تھے انہیں بھی یزید کی حرکاتِ بد کی بناء پر متنفر تھا۔ اور انہوں نے امام حسینؑ کی طرح اس کی بیعت ولی عہدی سے بڑی شدت کے ساتھ انکار کیا تھا۔ مگر جب وقت آیا تو وہ اسلام کی حمایت میں ایثار و قربانی کا عملی نمونہ کچھ بھی نہ دکھا سکے۔ یہ حوصلہ صرف اسی مقدس ہستی کا تھا جس کے گھر سے اسلام کا آغاز ہوا صبر و آزمائش کے اس کٹھن کام کو اگر پایۂ تکمیل کو پہنچا سکتا تھا۔ تو گھر والا ہی جو بانی اسلام کا فرزند اور گوشت پوست تھا جس کے لئے "حُسَیْنٌ مِنِّیْ وَاَنَا مِنَ الحسین" ارشاد ہوا تھا۔ نہ کہ دوسرے گھر والے ابن زبیر نے بیعت تو نہ کی لیکن ایک جداگانہ حکومت کی بنیاد ڈال دی۔ انجام یہ ہوا کہ ان کی وجہ سے خانہ کعبہ کی بے حرمتی ہوئی اور ابن عمر نے تو آخر میں یزید کی بیعت کر ہی لی۔ صرف حسینؑ ہی ایسے تھے جنہوں نے اپنے جان و مال اپنا سب کچھ اسلام پر قربان کر دیا۔ کسی نے سچ کہا ہے ؎

سر داد و نداد دست در دست یزید
حقا کہ بنائے لا الٰہ است حسین

شہادتِ حسینی اسلام کیلئے درسِ عمل ہے

خالقِ عالم حکیمِ مطلق۔ کارسازِ حقیقی نے اپنی محبوب ترین مخلوق کی فضیلت و شرافت عظمت و جلالت رفعت و منزلت اگ سے بنی ہوئی ہستی، اور عالم بالا کے خود پسند ملائک سے منوانے کے لئے اِس عالم فانی، اور دارِ ناپائیدار کی تخلیق فرمائی، زمانہ تیز رفتاری سے منزلیں طے کرتا ہوا مقصود مستتر کے تجسس و تفحص میں ساری و جاری ہے۔ وقت کے دورِ پیہم کا سلسلہ نامعلوم قائم ہے

دن و رات گزرتے ہیں، زمانۂ قدیم کا جزو لاینفک بن کر معدوم ہو جاتے ہیں شمس و قمر کی گردشیں اپنے فرائض کی انجام دہی میں مصروف و منہمک ہیں معلوم نہیں کہ موجوداتِ عالم کو کہاں سے کہاں لئے جا رہی ہیں، اور قصۂ ماضی بن کر طاقِ نسیان کا گلدستہ بن جاتی ہیں مختصر یہ ہے کہ روزگار بے نیاز، آمد و رفت کے تسلسلِ پیہم میں مصروفِ کار ہے مگر زمانہ کے اسی دور، اور روزگار کے اسی تسلسل میں بعض معرکۃ الآرا، اور مہتم بالشان ایسے حادثات پیش آتے ہیں۔ جو فرش سے لے کر عرش تک کائناتِ عالم اور موجودات کو ان دو کالن میں اضطراب و ہیجان کا ہجوم تموّج خیز تشویش و انتشار کا سیلاب عظیم، پریشانی و آشفتگی کا طوفان بے پناہ۔ برپا کر دیتے ہیں۔ دنیا کے کاروبار میں ہل چل پیدا ہوتی ہے، نظام عالم میں انقلاب واقع ہوتا ہے۔ واقعات روزگار درہم و برہم ہو جاتے ہیں۔ جدید دستور العمل جامۂ حیات پہن کر کرۂ ارضی پر غلبہ و تسلط حاصل کر لیتا اور دورِ تازہ کی ابتدا کرتا ہے۔

حکیم مطلق کی حکمت و مصلحت ہمارے عاجز و محدود ادراکات و تفہیمات سے باہر ہے۔ اور ہم کارخانۂ تکوین میں صانعِ حقیقی کی اصلی غرض و منشا کے سمجھنے سے قاصر ہیں۔ مگر اتنا ضرور جانتے ہیں کہ جب کرۂ ارضی پر تیرگی و تاریکی مسلط ہو جاتی ہے۔ تمرد و سرکشی مناسب حدود سے متجاوز ہو کر انتہا کو پہنچ جاتے ہیں۔ جہالت و لاعلمی کو غیر معمولی فروغ ہوتا ہے، اخلاقِ حسنہ کے بجائے، بدکاری و بداعمالی نشو و نما پاجاتے ہیں۔ کفر و شرک کی تاریک گھٹائیں۔ فضائے عالم پر محیط ہو جاتی ہیں اور خدا کے نافرمان و سرکش بندے مخلوقِ خدا کو ظلم و جور اور جبر و تشدد کا تختۂ مشق بنا لیتے ہیں۔ صداقت پرست اور حقانیت نواز بندوں کے لئے مالکِ حقیقی کی زمین پر کوئی ملجا اور ماوا نہیں رہتا تو قادرِ مطلق اپنی قدرتِ کاملہ سے آنِ واحد میں روزگارِ سفلہ اور دنیائے دنی کا تختہ الٹ دیتا ہے، حق و صداقت کی غیر فانی عظمت و جلالت غالب اور مسلط ہو جاتی ہے، نفس پرستیوں اور خود غرضیوں کے شیدائیوں کو ابدی ذلت و رسوائی کا ہدف بنایا جاتا ہے اور حقائق و معارف کے جاننے والے حقانیت و حقیقت کے علم بردار

دنیاوی عیش وآرام کو صداقت کی حمایت پر نثار کرکے بندگانِ خدا کے سامنے صحیح شاہراہِ عمل پیش کر دیتے ہیں۔

کربلا کا خوں چکاں، دل فگار اور جاں سوز واقعہ مسلمانانِ عالم کے سامنے درس عبرت کے نہ رہ خونیں اوراق پیش کرتا ہے۔ اور مسلم امروزہ سے پکار پکار کر کہہ رہا ہے کہ تیری خواری و پستی، محتاجی و مفلسی کا سبب یہ ہے کہ تو محوِ تغافل ہے۔ تیرے قوائے عملیہ مضمحل و بے کار ہو رہے ہیں۔ تیری زندگی کا منشاء دنیا پرستی اور ملت فروشی ہے تو دو روزہ عیش و راحت کی خاطر احکامِ الٰہی سے روگرداں ہے، تو دنیا میں عزت و وجاہت حاصل کرنے کے لئے مذہب کی توہین و تذلیل پر کمربستہ ہے۔ تیرے اعمال و افعال شرک و بدعت کے رہینِ منت ہیں۔ تجھ کو اللہ کا ڈر نہیں بندوں کا خوف ہے۔ حالانکہ توحید کے امین جس کا تو خائن ہے۔ اسی شریعت کے پابند تھے جس سے تو روگرداں ہے۔ اسی دینِ متین کے حامل تھے جس تعمیر کو تو گرا رہا ہے۔ انہوں نے اس کی بنیادوں کو اپنے خون سے مستحکم کیا تھا۔ دین و مذہب پر آنچ آتی تھی تو تیغ بکف اللہ پر بھروسہ کرکے کھڑے ہو جاتے تھے۔ اعدائے دین کو مغلوب کرتے تھے یا اپنا خون راہِ مولا میں بہا کر درجۂ شہادت پر فائز ہوتے تھے۔

خدائے قدوس کے جلیل القدر پیغمبر کے نواسے، عزیز ترین خاندانِ امیر المومنین کے جگر پاروں اور سیدۂ عالم کے لاڈلوں نے صحرائے کربلا کی تفتیدہ ... خون اس لئے نہ بہایا تھا کہ محرم کا مہینہ آئے اور گذر جائے، یوم عاشورہ کی ... پذیر ہوں اور چلی جائیں۔ خاتم الانبیاء کے دوش اور آغوش میں بیٹھنے والے کا ... سانحہ اس لئے وقوع پذیر نہیں ہوا کہ عشرۂ محرم کی آمد آمد ہو، اور مسلمان لہو و ... سامان مہیا کرنے میں سرگرم کار ہوں۔ یا اگر سید الشہداء اور اہل بیت اطہار کے مصائب کا اثر لئے ہوئے ہیں تو صرف مجالس سوز و گداز منعقد، اور سامان عزاداری ... کریں اور رو پیٹ کر بیٹھ رہیں اے غفلت شعار اور رسم پرست ...

اولین و آخرین نے جس کے نام کے سامنے قیامت تک گردوں گردنیں جھکتی رہیں گی ۔ اپنے حلق تشنہ کو اعدائے شوم کی تیغ ناپاک سے کٹوایا ۔ اہل بیت رسالت کا خستہ و بریشان ہونا گوارا کیا اس لئے اور صرف اس لئے کہ توحید حق و صداقت کی قدر پہچان لے ۔ دین محمدی کی خدمت کرنا اور اللہ کی راہ میں سر کٹوانا سیکھ جائے ۔

حادثہ کربلا کوئی معمولی حادثہ نہ تھا ۔ مرورِ ایام کو کوئی انسانی معاملہ نہ تھا ، روزگار عالم کی آئے دن کی بات نہ تھی ۔ بلکہ گردشِ افلاک کا اہم ترین دور تھا تاریخ اسلام کا شاندار واقعہ تھا حق و باطل کی جنگ کا مرکز تھا ۔ بے دینی و ایمان ، صداقت و بطلان کا فیصلہ کن ہنگامہ تھا کار سازِ حقیقی نے مصائب و آلام کا یہ کوہ گراں اپنے برگزیدہ ترین بندہ کے سر پر کیوں رکھا ۔ بارگاہ خداوندی کے مقرب ملائکہ نے تخلیق آدم کے وقت عرض کیا تھا کیا تو زمین پر ایسا خلیفہ (انسان) پیدا کرے گا جو فساد برپا کرے اور خون بہاتا رہے اور ہم تیری حمد و ثنا کی تسبیح کرتے ہیں اور تہلیل و تقدیس میں مصروف رہتے ہیں ۔ حکیم مطلق اُن فرشتوں کو یہ بتا دینا چاہتا تھا کہ اطمینان رکھو کہ تمہارا حمد و ثنا کرنا ان انسانوں کی تسبیح کے مقابلہ میں کچھ حقیقت نہیں رکھتا ، جو ہماری خاطر اور ہماری راہ میں اپنی گردنیں قلم کراتے ہیں اور امانتِ توحید کی پاسبانی کے لئے ۔ خطرات عظیمہ کا تسلیم و رضا سے مقابلہ کرتے ہیں بلاشبہ معبودِ مطلق کے دربار میں وہی عبادت اعلیٰ قبولیت کا شرف حاصل کر لی ہے جو مصائب و آلام اور ابتلا و آزمائش سے ہم آغوش ہو ۔

اللہ تعالیٰ کی مشیت عہدِ حاضرہ کے ضعیف الاعتقاد مسلمانوں کو بھی درسِ عمل دینا چاہتی تھی کہ توحید پرستی و حق نوازی وہ گرانقدر اور عظیم الشان عمل ہے جس کی حفاظت و پاسبانی میں تمہاری دنیا و آخرت کے سردار کا عزیز ترین لختِ جگر مع بیٹوں ، بھائیوں اور بھتیجوں ، بھانجوں کے اپنا خون پانی کی طرح بہا چکا ہے کیا آج ہم اس سے سبق لے رہے ہیں ، کیا امام الشہداء کا اسوۂ حسنہ ہماری پیش نظر ہے ۔ کیا اللہ اور اس کے رسول کی خوشنودی

کے لئے ہم اپنا سر ہتھیلیوں پر لئے پھرتے ہیں۔ کیا عشرۂ محرم کے عبرت آموز ایام میں ہم اپنے سید و آقا کی صحیح یادگار زندہ کرتے ہیں نہیں بلکہ یوم عاشورہ عام مسلمانوں کی لطف و تفریح کا مخصوص تہوار ہوگیا ہے۔ خوشی و مسرت کے سب سامان فراہم کئے جاتے ہیں۔ معاذ اللہ ہندوستان کے بعض خطوں میں وہ طوفان بے تمیزی برپا ہوتا ہے کہ مسلمانوں کی غفلت و جہالت پر جس قدر ماتم کیا جائے کم ہے۔ ہم تو یہ کہیں گے کہ ایسے مسلمان بجائے کربلا کے سانحۂ جانکاہ پر آنسو بہانے کے اپنی لاعلمی و غفلت پر رویا کریں تو بہت مناسب ہے خدا ان پر رحم کرے اور صراطِ مستقیم پر چلنے کی ہدایت عطا فرمائے۔

ہر نیا سال سنتِ الٰہی کے ماتحت اُسی گزری ہوئی ہستی کا ایک رکن بنا جاتا ہے جہاں دنیائے حاصرہ کی رنگیں ہزار در ہزار محو خواب نیند میں ہیں۔ جو نقش جاتا ہے [illegible] نہیں آتا۔ اللہ اللہ! انقلاب اور کس قدر یکساں۔ ہیجان اور کس قدر پیکوں [illegible] اور کتنا پُر قرار باوجود بے شمار ازمنہ گزر جانے کے بعد اس رد و بدل میں کوئی تبدیلی نہ [illegible] آسمان موجودہ کے وہی انداز اور کائناتِ حاضرہ کے وہی مشاہدات عالم [illegible] ہے۔ عرض وجوہر کے اندر اضطراب و انقلاب نمایاں ہے، مگر ایک ہی شان کے ساتھ [illegible] امروز فردا کی بے قراریوں میں جذب ہوتی جاتی ہے، مگر ایک ہی اثر کے تحت میں کا[illegible] کا ہر ذرہ تغیر و تبدل کا محکوم ہے، مگر ایک ہی ضابطہ اور قاعدہ کے اندر [illegible] ہوتی ہے، مگر غیر متبدل قواعد کے تحت میں، موت اپنی [illegible] مگر غیر فانی ضوابط کے ساتھ حیات و ممات کی تغیر آفرینیاں [illegible] دیرینہ ہر جاوی ہیں لیکن ایک قوتِ غالب تماشا کے موافق [illegible] آرائیاں کیفیاتِ تکوین کے ہر انداز پر [illegible] کہہ سکتا ہے کہ ہماری محدود نگاہوں اور مقید نظروں کے [illegible] صف در صف گزرتے چلے جاتے ہیں [illegible]

چھوڑتے ۔ نظام ایک، قواعد یکساں، ضوابط مقررہ، اثرات غیر منقلب اس پر بھی اگر ان انقلابات روزمرہ اور ان تغیراتِ متواترہ سے ہم درسِ عبرت حاصل نہ کریں، اور قوائے عملیہ کو مجبور و معذور بنالیں تو یہ ہمارا قصور اور ہماری ہی خطا ہے۔

ہر موجودہ سال سنینِ ماضیہ کی پرہیبت سلسلہ کی ایک کڑی ہوتا ہے جنہوں نے صفحۂ ارضی کو انسانی تاراجی و تباہی کی خونی تحریروں سے معمور کیا ہے، وہ کوئی جدید حادثہ کا امین نہیں ہوتا، دنیائے مضطرب کی کتابِ اعمال میں کوئی تجدید و تحریف نہیں ہوتی۔ زمان و عہد کے اس مبین الآفتین دفتر کے اندر کوئی ترمیم و تنسیخ عمل میں نہیں آتی۔ سالِ گذشتہ میں جو واقعات رونما ہوئے۔ ان ہی کے نتائج و اثرات سے وہ بھی مملو ہوتا ہے مگر فطرت عالم کی منشاء کے موافق، ہمہ گیر حوادث و اسباب سے قطع نظر کرکے محدود صفحات ارضی میں بھی ایسے ایسے واقعات رونما ہوجاتے ہیں جو گذرنے والے سال کو صدیوں تک ممیز رکھتے ہیں اس لئے دیدۂ بینا کے لئے ان ہی واقعات کے نتائج پر غور کرنا ضروری ہے۔

اب تم اس ملت مرحومہ کی موجودہ زندگی پر نظر ڈالو جس کی تہذیب و ترقی کے افسانے تیرہ سو برس سے زبان زدِ خلائق ہیں جس کے علوم و فنون کی شمع روشن نے ظلمت کدہ ارض میں چراغاں کیا جس کی اخلاقیات و روحانیات نے دست کدۂ عالم کو شادابی کا غیر فانی چشمہ بنایا، مراقش کی سرسبز وادیوں سے بحر چین کے شاداب ساحل تک کریمیا کی تاتاری یادگاروں سے دریائے کانگو کی تاریک موجوں تک کوہ ہندو کش کی برف پوش چوٹیوں سے جاوا کی مرطوب کیاریوں تک ایک شہنشاہ کونین کے غلام ایک کتاب یزدانی کے محکوم ایک خدائے قدوس و قادر کے پرستار وحدتِ اسلامیہ کا سبق سیکھ چکے ہیں، دنیائے فانی کی ایمان فریب اداؤں پر اتحادِ اسلام کا سرمایہ قربان کرچکے اور اپنے ہاتھوں حریت شخصی آزادیٔ ملکی اور استقلالِ ملیہ کی عمارت منہدم کرتے

جاتے ہیں جس کی تعمیر میں کافی خون نیاز صرف ہو چکا تھا۔ ہمارا آخری روئے سخن اپنی قوت مرحومہ کے ان افراد کی طرف ہے۔ جو اپنی انفرادی دنیاوی ترقیوں میں اس قدر منہمک اور محو ہوگئے ہیں، کہ قومی اور ملی درد سے قطعی ناآشنا ہیں جن کی خودغرضیاں اور نفس پرستیاں چند ملازمتوں اور چند اعزازی و امتیازی نشانوں کے حصول کو حیات انسانی کا اصلی مقصد سمجھتے ہیں۔

واقعہ ہائلہ کربلا۔ کلمہ گویان محمدی کے قومی و ملی کے احساسات کے نشو و نما کے لئے ایک دعوت حق ہے جو تیرہ سو برس گزر جانے پر بھی اپنی تازگی و شدت میں اہم سے اہم تازہ واقعات سے بھرا ہوا ہے، یہ واقعہ اسلامی تاریخ کا وہ عظیم الشان اور معرکہ آرا اور ابتلا ہے جس میں اہل نیاز تکمیل نبوت کا نقش دیکھتے ہیں۔ جو حق پرستی و حق نوازی اور حق پژوہی کی مثال ہے، خاندان اہل بیت کا سراج روشن رسالت کا راکب سید الشہداء امام المومنین اپنے عیال و اطفال کے ساتھ حمایت حق اور تبلیغ صداقت کے لئے بے سروسامان نکلتا ہے، عفریت انسانیت اور طاغوت دنیا پرستی، یزید، عبداللہ شمر کی صورت میں نمودار ہوتا ہے، اور حقانیت و صداقت کے ان پیکرہائے مجسم کو اس آزمائش و ابتلا میں ڈالتا ہے جن میں کامیابی و نصرت وحدت کے پرستاروں کا شعار رہا ہے۔ آج بھی اگر اس امام حق و صداقت کی پیروی کے لئے ہر مسلمان کا قلب تیار ہو جائے۔ تو بیڑا پار ہے۔ اہل محبت اس افسانۂ عشق کی بے نیازی دیکھیں اور جوش نیاز میں عقیدتمندانہ وجد کریں کہ آقائے دو عالم کے نواسے نے کس طرح اپنی اور اپنے وابستگان معلوم و معصوم کی جانیں نثار کر کے ایثار و قربانی کی اعلےٰ ترین مثال قائم کی اور سنت اسمٰعیل کو زندہ کر کے اسلام کو زندہ کر دیا۔

حسین کی شہادت سے جس طرح روحانیت اور مذہبیت کی صیانت اور صداقت کی حفاظت ہوئی اسی طرح اخلاق حسنہ اور شمائل پاکیزہ کی اشاعت بھی۔ مذہبی حسیات سے

خالی الذہن ہو کر محض انسانیت کے پہلو کو مدِ نظر رکھتے ہوئے شہادتِ حسینی پر ایک تنقیدی نظر ڈالی جائے تو انسانیت کے بہترین جواہر تاباں اور درخشاں نظر آئیں گے۔ جن کی چمک اور تابندگی سے ہر انسان خواہ مشرقی ہو یا مغربی۔ اسود ہو یا ابیض، اقتباس نور کر سکتا ہے۔ حسینی شہادت نے جو عام احسانات نسلِ انسانی پر کئے ہیں، وہ شاہ و گدا شہری و دہقانی عرب و عجم مسلمان و ہندو و یہود و نصاریٰ۔ بدھ و مجوس۔ ملحد و زندیق۔ سب کے لئے یکساں سبق آموز ہیں، ریاضت، عبادت، مروت، غیرت، شجاعت و سخاوت، تحفظِ شریعت ہمدردی، راست بازی، عالی ہمتی۔ عزتِ نفس، خودداری، حریتِ ضمیر۔ پابندیٔ قول حمایتِ اصول ایفائے وعدہ، صبر و حلم و تسلیم و رضا۔ ثابت قدمی۔ استقلال، احقاقِ حق، ابطالِ باطل، ایثار، توکل، وغیرہ تمام اخلاقِ حسنہ کے جو حیرت انگیز کارنامے حسین سے معرکہ کربلا میں ظاہر ہوئے وہ ایسے ہیں کہ تمام انسان ان کو اپنا دستور العمل بنانے سے انسان کامل بن سکتے ہیں۔

حسین علیہ السلام کی شہادت نے جو درسِ عمل پیش کئے، ان کے علاوہ سیاسی نقطۂ نظر سے بھی اسلامی دنیا کو جو فوائد پہنچے وہ نہایت اہم اور فلسفۂ سیاست کے زریں باب ہیں یعنی مستبدانہ حکومت کی غلامی سے آزادی کا سوال جو آج ہندوستان اور تمام دنیا میں عالمگیر ہے، صرف یہی نہیں کہ حکومت کی غلامی سے ملک و قوم کو آزادی دلوانے کی بنیاد ڈالی بلکہ حکومت کے طرزِ عمل کا بھی پردہ فاش کر دیا۔ اس لئے کہ اسلامی حکومت کو اور دنیاوی سلطنتوں کے مقابلہ میں ایک امتیازِ خاص حاصل تھا، اسلامی حکومت کے تمام قواعد و ضوابط حکمِ خدا اور ارشادِ رسول کے متبع تھے۔ خلاف اس کے دوسری حکومتوں کے دستور و قوانین انسانی تخیلات کے نتیجے ہیں لہٰذا حسین کو پہلی حکومت سے بیزاری تھی، پھر اس کے طرزِ عمل اور احکامِ سیاست سے قوم و رعایا کا طبقہ حکومت کے اس قدر زیرِ اثر ہو چکا تھا کہ باوجود حکومت کی الحاد پرستی، اور کفر شعاری کے اسی کو نیابتِ رسول سمجھے ہوئے تھا شہدائے کربلا نے اپنی جانیں دے کر پہلے جس غلط فہمی کو دور

گیا، وہ یہی تھی، اور ایسی کامیابی کے ساتھ، کہ خود یزید کا خلف اکبر و ولی عہد (معاویہ ثانی) تخت شاہی سے انکار کرتے ہوئے، تمام اکابر دامرا سلطنت کے سامنے اپنے دادا، اور باپ کے مظالم کی قلعی کھول دی اور صاف کہہ دیا کہ یہ حق حسین کا تھا، اس نے دربار عام میں ممبر پر بیٹھ کر صاف اعتراف کر لیا کہ یہ حکومت نہ اتباع کے قابل ہے نہ اس کے حاکم اطاعت کے لائق۔ یہ شہادت حسینی کی روحانیت و مظلومیت کا اثر تھا کہ اس نے اپنا خاموش اور گہرا اثر ولی عہد کے قلب پر ایسا ڈالا کہ اس نے حاکم و حکومت کے اخلاقی و سیاسی عیوب کا دربار عام میں اعلان کر دیا، اس اعلانِ شاہی نے انقلاب پسندوں کے خیالات کو جو واقعہ کربلا کے بعد بھی سلطنت کے مخالفت میں پیدا ہو چکے تھے، اور قوی و مستحکم کر دیا، اس تغیر سے چند مہینوں کے بعد ہی تمام عراق و عجم، حجاز و عرب میں شورش کی آگ بھڑک اٹھی۔ بلکہ حجاز والوں نے تو شہادت حسینی کے بعد ہی سلطنت کے خلاف ہتھیار اٹھائے تھے جس کے نتیجہ پر واقعہ حرا پیش آیا۔ مدینہ میں قتل عام ہوا۔ مسجد نبوی کی توہین ہوئی۔ خانہ کعبہ پر آگ برسائی گئی، حجاز و عراق کے لئے تمام ممالکِ اسلامی کی گردنیں خم تھیں۔ یہاں کی شورشوں سے تمام بلادِ اسلامیہ کے طول و عرض میں بجلی کی طرح اثر ہوا۔ اور ہر شخص میں اپنے جائز مطالبات کا احساس پیدا ہو گیا تعلیم اخلاق کا اُس وقت تک دوسروں پر اثر نہیں ہوتا۔ جب تک معلم اخلاق اپنے ہر فعل و عمل سے ایثار و قربانی کا خود مجسمہ نہ بنے۔ دنیا میں جس قدر بھی معلم اخلاق ہوئے، انہوں نے اپنے اپنے مواعظ کو صرف زبانی تبلیغ تک محدود نہیں رکھا۔ بلکہ اپنے مسلسل اعمال و افعال سے ان کا استحسان انسانی قلوب میں راسخ کرنے کی سعی فرمائی تو کیا ہمارا یہ فرض نہیں ہے کہ ان معلمین اخلاق کے اعمال کو اسی روشنی میں دیکھیں کیا ہمارا ان تعلیمات سے اثر لے کر تاسی کی بجائے ان کی مصیبتوں پر صرف آنسو بہا دینا کافی ہے۔ شہادت حسینی کا مقصد الغائے شریعت اور تہذیب و اخلاق تھا۔ اگر اس شہادت سے اخلاقی سبق حاصل نہ کریں اس کے فلسفہ کو نہ سمجھیں تو ہم سے بڑھ کر بد قسمت اور کون ہو سکتا ہے۔

شہادت حسینی پر آنسو بہانے والوں اور سینہ کوبی کرنے والوں کو اچھی طرح سمجھ لینا چاہیئے۔ کہ کربلا کا سانحہ اپنے دامن میں ہمارے لئے موعظت وارشاد کی ایک دنیا چھپائے ہوئے ہے۔ کس قدر شرم کی بات ہے کہ ایسے اعلیٰ اخلاقی نمونے ہماری آنکھوں کے سامنے ہوں۔ اور ہم ابھی دنیا کی صف اقوام میں ہماری جگہ سب سے پیچھے رہے۔ ہمارے دلوں میں قوت۔ بازوؤں میں سکت، آوازوں میں زور نہیں، تو یہ سب اس کا نتیجہ ہے کہ ہم نے اس شہادت کے نتائج واغراض سے کوئی سبق حاصل نہیں کیا۔

حسین کی حیرت انگیز ثابت قدمی

اور

عدیم المثال استقلال

دنیا دراصل مجموعہ اضداد واختلافات کا نام ہے، اور یہ آغاز آفرینش سے تا ایندم موجودات کی ہر چیز اور ہر بات مواید ثلاثہ کی ہر چھوٹی بڑی شاخ اور عناصر اربعہ یا چہار دہ گانہ کی ہر ایک مرئی وغیر مرئی جزو میں موجود ہیں، اور خاتمہ دنیا کے وقت تک خواہ اس کا زمانہ کتنا ہی قریب وبعید اور اس کے اسباب کیسے ہی، موافق قانون قدرت یا فوق العادت ہوں برابر موجود رہیں گے، خیال اور نظر کو جہاں تک بسط دیا جائے معلوم ہوتا ہے کہ سارا نظام عالم دراصل اسی کش مکش اضداد سے وابستہ ہے، اور اس کش مکش کا رفعداد آن واحد میں اس عالم اسباب کی درہمی برہمی کا باعث ہو سکتا ہے جکیم فیثا غورس کا نظام شمسی سائنٹفک آلات اور مسلسل تحقیقات کی مدد سے اگر بالکل صحیح نہیں تو کم از کم قریں صحت ضرور ثابت ہو چکا ہے اور آج کل مہذب دنیا میں نجوم ہیئت جہاز رانی وغیرہ کا مدار علیہ ہے، اس کرۂ ارضی کو فضائے لامکاں میں بعض مخالف اور متضاد قوتوں کی کش مکش باہمی پر

قائم بناتا ہے اور زمین کے لئے وہ وقت قیامت خیز قرار دیتا ہے۔ جب کہ ایک سمت کی کشش بوجوہ چند در چند سبک ہوکر۔ ہمارا کرۂ سورج یا کسی دوسرے ستارہ سے ٹکرا جائے۔ اور پاش پاش ہو جائے۔

خیر یہ تو دور کی باتیں ہیں لیکن ہم اپنے گرد و پیش کے حالات اور روزمرہ پیش آنے والے واقعات پر بھی نظر ڈالیں تو ہمیں قدم بہ قدم اور لحظہ بہ لحظہ اسی ضد اور اختلافات سے سابقہ پڑتا ہے۔ آفتاب کا باقاعدہ طلوع، غروب لیل و نہار کی مسلسل گردش، روشنی و تاریکی کا غلبہ و خاتمہ، موسموں کا تغیر و تبدل، گرمی و سردی کی ابتدا اور اختتام بہار و خزاں کا آغاز و انجام۔ فصلوں کا کاشت و ذرد نباتات کی روئیدگی و افسردگی بارش کی کثرت و قلت، سمندر کا جزر و مد، پہاڑوں کا ارتفاع اور غاروں کا عمق۔ غنچوں کی شگفتگی اور پھولوں کی پژمردگی، پُروائی ہوا کی برودت اور پچھوائی کی یبوست۔ پیل دماں کی توانائی، مور ضعیف کی ناتوانی، اشجار بلند کی مضبوطی اور برگ و گیاہ کی نازکی قوموں کا عروج و زوال، سلطنتوں کی ترقی و تنزل، افراد کا تمول و افلاس، غرض ہر چیز میں باہم تقابل و تخالف کا رنگ دیکھئے، اور بمصداق تعرف الاشیاء باضدادہا اسی کے ذریعے سے تمام حالتوں اور صورتوں کو پہچانتے ہیں، روشنی کو ہم اس لئے روشنی کہتے ہیں کہ وہ تاریکی کی ضد ہے۔ سپیدی کا نام اس لئے سپیدی رکھتے ہیں کہ وہ سیاہی سے ممیز ہے، رات محض اپنے اندھیرے کے باعث دن سے جدا ہوتی ہے اور فصل سرما صرف بوجہ برودت موسم گرما کی حرارت سے پہچانی جاتی ہے، دوست کی محبت بدیں سبب ہمارے نزدیک قابل قدر ہے کہ وہ دشمن کی عداوت سے ایک جداگانہ حالت رکھتی ہے۔

اس سلسلہ کو جہاں تک وسعت دیجئے، اور کائنات کے سامان پر غور کیجئے۔ سب کی بنیاد اضداد پر نظر آئے گی، ہمارے جسم میں چار اخلاط اپنی اپنی جگہ حکومت کرتی، اور

ایک دوسرے کو دبانے کے درپے رہتی ہیں ان کی حرکات مخالفانہ پر ہی ہماری صحت کا دارو مدار ہے۔ اگر ان میں سے ایک باقی رقیبوں پر غلبہ پالیتی ہے تو فوراً ہماری تندرستی میں خلل آجاتا ہے۔ اور مختلف تدبیروں سے ہمیں پھر ان میں وہی سابقہ رقابت ڈلوانے کی ضرورت پڑتی ہے۔ مگر سب سے بڑھ کر ہمیں اپنے جذبات اور احساسات میں اس ضد اور اختلاف سے واسطہ پڑتا ہے اور اسی کی مدد سے ہم اپنی زندگی کا زمانہ جو بہت مختصر ہونے کے باوجود۔ اگر برسوں، مہینوں، ہفتوں، دنوں، گھنٹوں، منٹوں، لمحوں پر تقسیم کیا جائے، تو خاصہ طویل ہے۔ چلتے پھرتے اٹھتے بیٹھتے، جاگتے سوتے ہنستے، روتے گزارتے ہیں۔ کون کہہ سکتا ہے کہ اگر اس کی زندگی کی ایک حالت قائم ہو جائے تو سال بھر کیا۔ ایک مہینہ بھی زندہ رہ سکے گا اور خود اپنے ہاتھ سے اپنی زندگی تلف کرنے پر آمادہ نہ ہو جائے گا۔

جن اصحاب کو اپنے کسی دوست یا عزیز کو خودکشی کرنے سے پہلے دیکھنے اور اس کے جذبات معلوم کرنے کا اتفاق ہوا ہے، یا کسی واردات خودکشی کے حالات انہوں نے بغور پڑھے ہیں، تو معلوم ہو جائے گا کہ ایک ہی حالت کے معمول سے زیادہ قیام نے ان کے لئے زیست کو ناقابلِ برداشت بنا کر انہیں خود اپنے ہلاکت پر مجبور کر دیا۔ عموماً یہ صورت غم و غصہ اور یاس کی حالت میں جب کہ ان کا کانشنس ان سے مغلوب ہو جاتا ہے، واقع ہوتی ہے یا کسی شخص کی امید کو اس قدر شدید صدمہ پہنچتا ہے کہ ساری دنیا اس کی آنکھوں میں تاریک ہو جاتی ہے اور اپنے بڑے نقصانات عام یا خاص کوئی دل پر اپنے لئے نظر نہیں آتی۔ اس لئے کہ وہ موت کو حیات پر ترجیح دیتا اور اپنے ہاتھ سے اپنی زندگی کا خاتمہ کر لیتا ہے، مگر یہ صرف اس کی تنگ نظری اور کوتاہ بینی کا سبب ہوتا ہے۔ ورنہ دنیا کے اسباب راحت و انبساط میں کبھی کسی قسم کا فرق نہیں آتا، خودکشی کے بدقسمت مرتکبین اپنی عزیز جانیں بھی گنواتے ہیں۔ اور بہت بڑی اخلاقی کمزوری کا بھی اظہار کرتے ہیں جس کی بنا پر وہ ہرگز کسی عقلمند کی نظر میں تائید و تحسین کے مستحق نہیں ہو سکتے۔ کیونکہ ان کا یہ فعل بے انتہا دماغی اور اعصابی خرابی

برداشت کرنا اور بزدلی اور ناعاقبت اندیشی پر مبنی کہا جا سکتا ہے، ورنہ اگر وہ ذرا بھی ضبط و تحمل سے کام لیتے اور اپنے حال و مآل پر غور کرتے، تو ان کو معلوم ہو جاتا کہ زمانہ کو کسی ایک حالت پر قرار اور دنیا کی کوئی حالت پائیدار اور استوار نہیں۔ پس جس تکلیف کو وہ اس وقت اپنے لئے ناقابل برداشت سمجھتے ہیں اس کا درد و اضطراب رفتہ رفتہ کم ہی ہو جائے گا، اور جو دنیا اس وقت ان کی آنکھوں میں سیاہ ہو گئی ہے وہ تھوڑے عرصہ کے بعد اوسی حسن و دلفریبی کی شان میں سامنے آکر ان کے دل کو لبھائے گی، اس لئے ہمت مردانہ اور حوصلہ جوانانہ کے یہ معنی ہیں کہ جو مصیبت یا آفت انسان پر وارد ہو اس کا دلیری اور استقلال سے مقابلہ کیا جائے، اور بارگاہ خداوندی سے ہر وقت رحمت و برکت کی امید باندھی جائے ؎

زرنج و راحت گیتی شو خنداں مرنجاں دل ؛ کہ آئین جہاں گاہے چنیں گاہے چناں باشد

انسان براہ نادانی ہر وقت اسباب راحت و مسرت کی تلاش میں سرگرداں رہتا ہے۔ اور ہر قسم کے حزن و ملال سے اپنے آپ کو بچانا چاہتا ہے اگرا سے اس کی خبر نہیں کہ اسباب فرحت و انبساط کا پورا لطف اسے جب ہی آئے گا جب وہ احساس رنج و ملال سے پورے طور پر واقف ہو گا کیونکہ موجودات میں تمام اشیاء کی معرفت کامل ان کی اضداد سے حاصل ہوتی ہے۔ اور صرف بُروں کی بُرائی نیکیوں کی بھلائی ظاہر کر سکتی ہے۔ جو لوگ غم و غصہ کے احساس سے خود کو بچاتے ہیں وہ در اصل خوشی کے سامان کا پورا لطف اٹھانا نہیں چاہتے۔ اور ان نعمات کی بے قدری کرتے ہیں، جو قدرت نے کمال شفقت و فیاضی سے ان کو عطا کی ہیں امریکہ کے ایک مشہور و معروف کروڑپتی کو اعلیٰ سے اعلیٰ درجہ کے کھانوں اور عیش و عشرت کے تمام سامانوں پر بھی ضعف معدہ وغیرہ کی شکایت رہتی ہے جس نے اس کی نیند حرام کر دی ہے اور وہ لاکھوں روپیہ اس شخص کو دینے کے لئے تیار ہے جو اس کو چین سے سُلا سکے اسی طرح اسپانیہ کے ایک دولتمند کو صرف حرکت کی حالت میں کچھ نیند آتی ہے اور اس غرض کے

اس کی سیلون گاڑی ہر رات کو ریلوے ٹرینوں کے ساتھ لگائی جاتی ہے اور رات بھر چکر میں رہتی ہے۔ مگر ایک کاشتکار جو صبح سے شام تک اپنے کھیت پر محنت و مشقت کرتا ہے۔ وہ غروب آفتاب کے بعد گھر آ کر جوار یا باجرے کی روٹی اور باسی ساگ سے کھا کر بستر گھڑی چارپائی پر دراز ہوتا ہے اور ایسے آرام کی نیند سوتا ہے کہ راک فیلر، ونڈربلٹ اور سٹر فورڈ کو مخمل و کمخواب کے بچھونوں اور بجلی کے پنکھوں میں بھی خواب راحت کا وہ لطف حاصل نہیں ہوتا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ انہوں نے اس مزدور کی طرح پہلے محنت اٹھا کر خود کو بعد کی راحت کے لئے تیار نہیں کیا اور حصولِ آرام کے لئے تکلیف کا ضروری کفارہ نہیں دیا۔ غم و الم سے گھبرانے والوں کو سمجھ لینا چاہیئے کہ دکھ درد لازمہ انسانیت اور باعث مسرت ہے۔ اور راحت صرف محنت کے بعد مل سکتی ہے اور دنیا میں ہر چیز کی ابتدا تلخی سے ہوتی ہے۔ رات دن پر مقدم ہے، کیونکہ پہلے جہان میں تاریکی تھی۔ بچہ جس وقت شکم مادر سے باہر آتا ہے تو رونے کی آواز سے اہل دنیا کو اپنی آمد کی خوشخبری سناتا ہے، آبشار پہاڑ کے پہلوؤں سے سر ٹکرا کر ماتم کرتا ہے تو دامن کوہسار کو لالہ و گل سے بھرتا ہے انجن اپنے آہ گرم کی طاقت سے ٹرین کو کھینچ کر منزل مقصود تک لے جاتا ہے، شمع کا زار و قطار رونا بزم عشرت کو روشنی پہنچاتا ہے۔

الغرض سلسلہ کائنات میں جہاں تک غور فرمائیے "درسِ ہر گریہ آخر خندہ ایست" کی تصدیق ہو جاتی ہے اور فرحت و مسرت پر رنج و عسرت کو تقدیم و فوقیت نظر آتی ہے۔ اس لئے بس ضروری ہے کہ انسان خود کو اس کا خوگر بنائے۔ کیونکہ رنج و الم کا ورود خود آئندہ مسرت و شادمانی کا پیش خیمہ ہے اور بمصداق "فعل الحکیم لا یخلو عن الحکمۃ" ہر ایک رنج و ملال میں کوئی نہ کوئی مصلحت ضرور پوشیدہ رہتی ہے۔

البتہ تکلیف و مصیبت سے گھبرانا لازمہ فطرت انسانی ہے۔ آگ لگنے پر دھواں ضرور اٹھے گا مگر اس موقعہ پر دنیا کے نامور اور عظیم الشان اصحاب کی حالت کو پیش نظر اور اپنی مصیبت کا ان کے مصائب سے مقابلہ کر کے دیکھنا چاہیئے۔ مسلمان اس معاملہ میں جملہ اقوام

عالم سے ممتاز ہیں کربلا کے سانحہ روح فرسا میں ان کی تسلی و تشفی کے لئے ایک ایسی زبردست اور شاندار مثال موجود ہے جس کی ظہور آدم سے تا ایندم تاریخ عالم کوئی نظیر پیش نہیں کر سکتی۔

استقلال و ثابت صداقت انسان کے بہترین جوہر ہیں لیکن مصیبت کے وقت کیسا ہی جری اور مستقل مزاج شخص ہو مرعوب و خائف ہو کر اس کے پائے ثبات میں لغزش آ ہی جاتی ہے۔ البتہ حسینؑ کا اٹل انکار بیعت، ان کے فولادی عزم و استقلال کا مظاہرہ ایک معتبر بین ثبوت ہے حسینؑ کی گردن باوجود ناقابل برداشت مصیبتوں کے باطل کے سامنے نہ جھکی مصیبتیں اس وقت تک مصیبتیں ہیں جب تک انسان ان سے ڈرتا ہے کس چہرہ کا یہ حوصلہ تھا کہ شمشیر کو دم توڑتا دیکھ کر شکر کی مسرت سے سرخ ہو جائے۔ کس کی زبان کا یہ جگر تھا کہ محراب خنجر میں امت کی نجات کے لئے دعا مانگے۔ تلوار کے لئے یہ کوئی نئی بات تھی کہ کسی مظلوم کے گلے پر پھرائی جائے۔ تیروں کے لئے یہ پہلا موقعہ نہ تھا کہ کسی بے گناہ کے بدن میں پیوست ہوں۔ نیزے آج سے پہلے بھی انسانی خون سے رنگین ہو چکے تھے لیکن دنیا کے کسی ہتھیار نے اپنے مقتول کو اس قدر مستقل مزاج نہ پایا ہوگا۔ وقت تھا کہ رستم اور اسفندیار اپنی خاکی آرام گاہ سے سر نکالتے ارجن و بھیم کی راکھ کے پریشان ذروں پر روح پھونکی جاتی۔ جعفر طیار اور حیدر کرار قبروں سے نکل پڑتے۔ بنہال اور جولیس ارواح کے مؤکل سے رخصت لے کر دنیا میں آتے اور یہ سب مل کر تین دن کے بھوکے پیاسے کی مدافعانہ جنگ کا تماشہ دیکھتے۔ زخمی ہاتھوں نے کس روز اس زور کی لڑائی لڑی ہے۔ بہتر کا داغ اٹھائے دل نے کس دن یہ جرأت دکھائی تھی شجاعت اور استقلال کو نہ سہی تھا۔ اور آج حسینؑ کے ہاتھوں ان کو پروان چڑھایا جا رہا تھا حسینؑ کی پیری کی ہمت و جرأت کا شباب تھا کثرت مصائب سے جس قدر حسینؑ کی کمر جھکتی تھی ہمت و جرأت بلند ہوتی جاتی تھی۔ جب تک بدن پر سر اور تن میں روح رہی عزم میں سر مو فرق نہ آیا۔ پیرانہ سالی تین دن کی بھوک۔ عورتوں کی نالہ،

کی فریاد العطش، عزیزوں اور دوستوں کے داغ ان کے جسموں کو اپنی آنکھوں سے ٹکڑے ٹکڑے ہوتے دیکھا پھر بھی اپنی آن اپنی بات اپنی خودداری پر پہاڑ کی طرح ثابت قدم رہنا صرف حسین ہی کا کام تھا۔

حسین نے جس کٹھن اور دشوار مہم کا بیڑا اٹھایا تھا وہ انسان کی طاقت برداشت سے بالاتر تھی اور جیسا یہ کام اہم تھا انسان عادی ہی اس کی مصیبتیں سخت اور قدم کو ڈگمگا دینے والی تھیں اور جیسی یہ مصیبتیں سخت تھیں ان کے لئے مافوق العادت صبر و استقلال درکار تھا۔ اگر حسین چاہتے تو صرف ظاہراً اپنی بات پر آپ کی اور آپ کے کنبہ کی ان بلاؤں سے نجات ممکن تھی کہ یزید کے ان احکام کے آگے جو اسلام سے صریح مخالف اور منافر تھے گردن جھکا دیتے اس صورت میں یہ بھی ممکن تھا کہ یزید کے دربار میں آپ کی عزت و حرمت ہوتی۔ مگر فرزند خاتم المرسلین کی غیرت نفس نے آخر دم تک اس ذلت کو گوارا نہ کیا کہ اپنے بچاؤ کی خاطر حاکم فاسق کی اطاعت کرکے اپنے نانا کے اس دین کو جس کی حفاظت آپ کے ذمہ عائد تھی دنیا کی نظروں میں حقیر و ذلیل کر دیں آپ خوب جانتے تھے اور آپ کی آنکھوں کے سامنے وہ کشت و خون اور ہنگامہ محشر برپا ہونے والا تھا جس میں آپ کے سب عزیز و رفیق تلواروں سے کٹ کٹ کر زمین پر گر پڑیں گے، آپ کی آنکھوں کے سامنے وہ نامبارک اور منحوس سماں تھا جس میں آپ کی شہادت کے بعد مخدرات عصمت پر بلاؤں کا آسمان ٹوٹنے والا تھا۔ عورتوں کی جگر خراش صدائے فریاد صغیر سن بچوں کی بھوک اور پیاس سے بے قراری اور ان کا بار بار العطش العطش دریا کا آنکھوں کے آگے موجیں مارنا، سوائے ذات خدا کے کوئی معین و مددگار نظر نہ آنا دشمنوں کی کثرت تمازت آفتاب، لو کے جھونکے۔ پانی کی بندش۔ کیا یہ تمام اس کے لئے کافی نہ تھیں، کہ ایک انسان کو خواہ وہ اپنی بات کا کیسا ہی دھنی، اور ارادہ کا کیسا ہی راسخ اور ثابت قدم کیوں نہو۔ مرکز ثقل سے ہٹا کر اپنے وجدان و ضمیر کے مخالف عمل کرنے پر مجبور نہ کر دے۔ کیا کوئی فرد بشر ابنائے انسانی

ہستی میں ایسی صعوبتوں ایسی سختیوں، ایسی بلاؤں کو اٹھاکر وہ دائمی صداقت، روحانی سچائی، ایمانی قوت اور اسلامی جوش پر ثابت اور قائم رہ سکتا ہے، کیا دنیا کی تاریخ میں کسی قوم کے کسی بھی اور کسی بہادر کی ایسی شاندار مثال موجود ہے۔

یہ وہ بلائیں تھیں جن کو انبیاء اولوالعزم بھی نہ جھیل سکے، البتہ خاتم الانبیاء کے وارث و جانشین نے تہہ دل سے ان مصائب کا خیر مقدم کیا اپنے عزیزوں اور بچوں کو کٹوایا۔ بھوک اور پیاس کی تکلیف اٹھائی۔ خود اپنے جسم پر صدہا زخم کھائے، عورتوں اور بچوں کی اسیری قبول کی، بایں ہمہ صبر و استقلال جو شروع میں تھا۔ وہی آخر دم تک رہا۔ آپ کی زبان مبارک سے سوائے اس کے اور کوئی کلمہ نہ نکلا۔ رب العالمین جو تیری مرضی اور خوشی ہے اسے پورا کر۔ میں تیری رضا پر شاکر اور تیری مرضی پر صابر ہوں۔ اور کسی صورت میں تیرے حکم سے باہر نہیں حسین کے منہ سے یہ کبھی نہ نکلا کہ رب العالمین اس آزمائش کو ٹال دے یا مجھ کو اس سے بچالے۔ وہ ازلی امین باوجود ان ناقابل برداشت مصائب کے ذرا بھی بے دل اور بے صبر نہیں ہوا۔ اس نے مسیح کی طرح بچنے کی دعا نہیں مانگی بلکہ وہ خدا کی درگاہ میں ساری رات مناجات کرتا رہا۔ اور صاف کہا کہ میں اس بار کو اٹھاؤں گا۔ بے شک حسین دنیا میں اسی لئے آئے تھے کہ انسانی استقلال، بہادری، صداقت شعاری کا ایک بے مثال نمونہ نسل انسانی کے روبرو پیش کرکے درس گاہِ عالم میں ایک سبق آموز عمل یادگار چھوڑ جائیں۔

حسین علیہ السلام کی عدیم المثال عبادت

ظاہر ہے کہ جملہ مذاہب و ادیان کی تبلیغ و تلقین کا اصلی مقصود، روحانی و اخلاقی تعلیم ہی ہے، اور اس تمام تعلیم کا لُبِ لباب خالقِ کائنات کی عبادت و پرستش، عبادت و پرستش کے طریقے گو مختلف اور متباین ہیں مگر علتِ غائی سب کی ایک ہی تھی۔ البتہ بعض نے اس قدر

افراط و تفریط سے کام لیا کہ ترکِ دنیا اور رہبانیت کو اصل اصول سمجھ لیا نفس کشی اور تزکیہ نفس کے واسطے بہایت ہی سخت اور کٹھن ریاضتیں کیں اپنے بدن کے بعض اعضا خشک و بے کار کر لئے! مگر یہ طریقہ قانونِ فطرت کی خلاف ورزی پر مبنی اور عقلاً و نقلاً ناقابل استحسان ہے، مذہب اسلام نے جہاں رہبانیت اور تجرد کو ممنوع قرار دیا وہاں تمام ارکانِ عبادت میں نماز کو رکن اعظم اور ایسا لازمی وضروری ٹھہرایا کہ کسی حالت میں بھی اس کے ترک کی اجازت نہیں ہے۔

شیعۂ کُلیار کے علاوہ دوسرے مذاہب میں بھی بڑے بڑے مرتاض اور عابد گذرے ہیں جن کی شاقہ عبادتوں اور حیرت انگیز ریاضتوں کو سن کر انسان دنگ اور ششدر رہ جاتا ہے، مذہب اسلام میں بھی بے شمار بزرگوں نے عبادت و ریاضت کی بدولت اولیا اور جلیل القدر رتبہ پایا۔ مگر آؤ ہم تم کو ایک ایسے نمازی کی عبادت کا منظر دکھائیں جس کی مثال اولین و آخرین کے واقعات عبادت میں نہ ملے گی، اور اس کی شان اپنی نوعیت میں بالکل نرالی پاؤ گے۔

غور کرو۔ ٹھیک دوپہر کا وقت ہے، لو چل ہی ہے زمین و آسمان کرۂ نار بنے ہوئے ہیں۔ گرد و غبار سے ایک اور آسمان، آسمان کے نیچے پیدا ہوگیا ہے، حدتِ آفتاب سے بدن پر ہتھیار آتش سوزاں کا کام دے رہے ہیں۔ بیابان کربلا کا ریگ تپش میں تنور کے خاکستر سے کم نہیں، میدان کارزار گرم ہے۔ دشمنوں کی ٹڈی دل سیاہ گھنگھور گھٹا کی طرح چاروں طرف چھائی ہوئی ہے۔ شدتِ تشنگی سے سب کے جگر کباب ہو رہے ہیں اور خیموں میں ننھے ننھے بچوں کی فریاد العطش نے شورِ محشر کا نمونہ برپا کر رکھا ہے۔ عورتوں کا نالہ جانکاہ جگر کے ٹکڑے کئے دیتا ہے، لاش پر لاش گر رہی ہے حسینؑ کی قلیل جماعت کے نصف سے زیادہ آدمی کام آچکے، ۳۰، ۴۰ آدمیوں سے زیادہ باقی نہیں، سب کے سب دو دن کے بھوکے پیاسے ہیں۔ زبانیں شدتِ تشنگی سے سوکھ کر کانٹا ہو گئی ہیں۔ ہاتھ پاؤں قابو سے باہر ہوتے جاتے ہیں مگر فرزندِ رسولؐ کی حمایت میں دشمن کی کثیر التعداد

فوج کو خاطر میں نہ لاکر ہمت مردانہ کے جوہر دکھا رہے ہیں۔ اتنے میں دوپہر ڈھل گئی۔ اور نماز ظہر کا وقت آگیا۔ ابوثمامہ صیداوی آگے بڑھتے ہیں اور عرض کرتے ہیں۔ یا ابن رسول اللہ میری جان آپ پر فدا ہو جب تک میں قتل نہ ہو جاؤں گا آپ کو کوئی گزند نہیں پہنچا سکتا۔ میری تمنا ہے کہ اللہ تعالیٰ سے ملاقات کرنے سے پہلے آخری نماز باجماعت آپ کے ساتھ ادا کر لوں، حضرت نے آسمان کی طرف دیکھا تو واقعی نماز ظہر کا وقت تھا۔

حسین علیہ السلام نے بروز عاشورہ ایسی حالت میں جب کہ فوج مخالف چاروں طرف سے گھیرے ہوئے تھی، دو دن کی بھوک و پیاس گرمی کی شدت آفتاب کی حدت تلواروں کی چھاؤں اور تیروں کی بوچھاڑ میں نماز ظہر کو اپنی تھوڑی سی جماعت کے ساتھ باطمینان ادا کر کے تمام دنیا کو یہ بات دکھا دی کہ احکام الٰہی کی کامل پیروی اس کو کہتے ہیں۔ اب نماز عصر کا حال سنئے حسین گھوڑے سے گر چکے ہیں سر سے پاؤں تک زخموں سے چور ہیں۔ سر تلواروں سے کٹ چکا، گلا اور سینہ تیروں اور برچھیوں سے چھدا ہوا ہے۔ دشمن بارادۂ قتل گھوڑوں سے اتر کر چاروں طرف محاصرہ کئے ہوئے ہیں۔ قاتل خنجر بکف پہلو میں کھڑا ہے، بہن، بیویاں، بیٹیاں یہ ہوشربا اور جگر خراش منظر دیکھ کر شور و واویلا کی آواز بلند کر رہی ہیں مگر نماز عصر کا وقت ہے، اس امام المصلین کا سر سجدہ الٰہی میں جھکا ہوا ہے۔ قاتل اتنا بھی صبر نہیں کرتا کہ بانیٔ نماز کے مجروح فرزند کو فریضۂ عصر ادا کر لینے دے پہلے ہی سجدہ میں سر کو قلم کرتا ہے اور آپ کی روح مقدس جسد مطہر سے مفارقت کرتی ہے، تو عین سجدۂ معبود حقیقی میں۔

جس طرح جنگ خندق میں بابا حیدر کرار کی ایک ضرب دونوں عالم کی عبادت سے افضل تھی۔ اسی طرح بیٹے حسین مظلوم کی یہ آخری نماز جمیع مخلوق کی اطاعت الٰہی سے برتر ہونے میں اپنا نظیر نہیں رکھتی ۔ رعنا

یاد رکھا اسے دکھ درد میں آزاروں میں اور سجدہ کیا چلتی ہوئی تلواروں میں

ایسی حالت میں نماز کا خیال رکھنا اور اس کو کامل اطمینان اور ذوق وشوق کے ساتھ ادا کرنا ۔ کیا ہر شخص کا کام ہے؟ حاشا وکلا ۔ یہ حوصلہ حسین اور اصحاب حسین ہی کا تھا ۔ کیا دنیا کی کوئی قوم اپنی عبادت وریاضت کرنے والوں کی فہرست میں ایسا نام پیش کرسکتی ہے جس کو اس کا نظیر کہا جائے ۔

حسین علیہ السلام کی عدیم النظیر شجاعت

یوں تو تمام قوموں کی نہ صرف ابتدائی تاریخ (جس کو قصص وحکایات کا مجموعہ کہنا چاہیے) بہادرانہ کاموں سے لبریز ہے بلکہ ہر قوم کی صحیح تاریخ میں بھی ایسے دلیروں اور شجاعوں کے متعدد نام پائے جاتے ہیں جن کی حیرت خیز طاقتوں اور ولولہ انگیز کارگذاریوں پر فخر کیا جاتا ہے ۔ جو کسی طرح بے جا نہیں ۔ ان میں ایسے بھی ہیں جو اپنی جسمانی طاقتوں اور ذاتی ہنر آزمائیوں کی وجہ سے تاریخ میں ایک خاص امتیازی درجہ رکھتے ہیں ، اور ایسے بھی ہیں جن کی فاتحانہ قابلیتوں اور اولوالعزمیوں نے ملک گیریوں کے واقعات کو زندہ کر دیا ہے ، اگر یونان کو اپنے ہرکلس اور لیونڈس پر ناز ہے تو ایران کو نریمان ، رستم ، سہراب ، فرامرز و برزو وغیرہ پر اگر عبرانی شمسون پر فخر کرتے ہیں تو ہندوستانی ارجن و بھیم ، بھیشم ، کرن و دشاسن وغیرہ پر ، اگر کارتھیجی تاریخ ہنیبال اور ہملکر پر نازاں ہے ، تو رومی تاریخ جولیس سیزر ، سپاہی اور مارک اینٹونی وغیرہ پر ۔ اگر براعظم امریکہ جارج واشنگٹن ، ایڈمسن ، بالیور کی بہادرانہ خدمات کا ممنون احسان ہے تو جاپان مارشل اوماسہ جنرل اوکو اور یاماگاٹہ کا ۔ اگر انگلستان کی تاریخ سرفلپ سڈنی ، ڈیوک آف مارلبرا ، ڈیوک آف ولنگٹن وغیرہ کے کارناموں سے مزین ہے تو جرمنی کے کونٹ مولیگ مارشل ہنڈن برگ جنرل لونڈارف وغیرہ کی کارگذاریوں سے اگر روس میں اس کو بلوف اور گورکو جیسے ہیرو گذرے ہیں تو ترکی میں عمر پاشا اور عثمان پاشا جیسے بادشاہوں کی فہرست میں بھی ۔ ایسے اولوالعزم اور ملک ستان فاتح بکثرت موجود ہیں

جنہوں نے بزور شمشیر دنیا کے وسیع حصوں کو مغلوب و مسخر کیا۔ ملک کے ملک گھوڑوں کی ٹاپوں سے روند ڈالے ان کی افواج قاہرہ کا سیلاب جس رُخ پر ہولیا۔ تر و خشک سب کو بہالے گیا۔ اُن کی فاتحانہ اولوالعزمیوں کو نہ کوئی پہاڑ روک سکا نہ کوئی سمندر۔ خواہ سکندر[1] اعظم ہو۔ یا چارلس[2] اعظم۔ فریڈرک[3] اعظم یا نپولین[4] اعظم، خاقان[5] اعظم ہو یا صاحبقران[6] اعظم۔ سلطان سلیمان[7] خان، اعظم ہو یا شاہ عباس[8] اعظم گسٹاوس[9] اعظم ہو یا پیٹر[10] اعظم۔ قیصر جولیس[11] ہو۔ یا قیصر ولیم[12]۔ بہرحال اگر تمام قدیم و جدید تاریخ کی ورق گردانی کی جائے تو ایسے بے شمار نام پائے جائیں گے تو شہرت دوام کے سائن بورڈ پر سنہری حرفوں سے لکھے ہوئے ہیں اور جن کی شاندار اور تابناک کارناموں کی عزت افراد انسانی کے قلوب پر نسلاً بعد نسل منتقل ہوتی رہے گی۔

لیکن تمام تاریخ عالم کے ورق الٹ جاؤ۔ بانی جہان عالم کے کارناموں کو چھان مارو۔ ایسا صبر ایسا استقلال ایسی استقامت ایسی شجاعت کہیں نظر نہ آئے گی۔ جیسی معرکہ کربلا کے واقعات میں دیکھو گے حسین نے جان دی۔ مگر بات نہ دی۔ سر قلم ہوجانا گوارا کیا۔ مگر اپنی عزت پر حرف نہ آنے دیا۔ سخت ترین گرمی کی شدت بھوک و پیاس کی صعوبت، انصار کی قلت، دشمنوں کی کثرت دوستوں اور عزیزوں کی شہادت، اطفال خورد سال کی تشنگی سے ہلاکت، عورتوں کی سب اسیری و ذلت ان سب مصائب و آلام کو نہایت خندہ پیشانی اور خوشی کے ساتھ قبول کیا۔ مگر وہ امر منظور نہ کیا جس سے اسلام کی سراسر بے حرمتی سراسر بے غیرتی اور سراسر توہین ہو۔ تین دن کی بھوک و پیاس میں اس قدر صدمات اوٹھانا اسقدر زخم کھانا اور پھر بھی دشمن کے مقابلہ سے قدم نہ ہٹانا شجاعت و بہادری کا ایسا زریں کارنامہ ہے جس کی نظیر دنیا کی تاریخ میں تلاش کرنا۔

(۱) مشہور بادشاہ یونان (۲) شاہنشاہ فرانس (۳) بادشاہ پروشیا (۴) شاہنشاہ فرانس (۵) چنگیز خاں (۶) امیر تیمور۔ سلطان ترکی (۸) بادشاہ ایران (۹) بادشاہ سویڈن (۱۰) شاہنشاہ روس (۱۱) فرماں روائے روم (۱۲) پچھلا قیصر جرمنی جو اس جنگ عالمگیر کا ہیرو تھا جو ۱۹۱۴ء سے ۱۹۱۸ء تک جاری رہی

عبث ہے۔

حسین کی تنہا ذاتِ مقدس پر جن مصائب کا نرغہ ہوا۔ اور جن ہوشربا اور روح فرسا صدمات و حالات کا حسین نے تنہا مقابلہ کیا وہ انسانی طاقت و برداشت سے بالاتر ہیں۔ رفیقوں اور عزیزوں کی شہادت کے بعد بھی خود تن تنہا بھوک و پیاس میں حسین کا حیرت انگیز بہادری سے ہزاروں دشمنوں کے ساتھ جدال و قتال کرنا، اور صدہا زخم کھانے پر بھی تلوار کو ہاتھ سے نہ چھوڑنا جنگی کارناموں میں ایک ایسا حیرت افزا کارنامہ ہے، کہ اس کی قدر وہی بہادر اور جری لوگ کر سکتے ہیں جنہوں نے معرکۂ جنگ میں اپنی عمریں صرف کر دی ہیں اور بارہا ایسے خوفناک اور خونیں منظر کو دیکھا ہے۔

اس حالت پر خیال کیجئے کہ سید الشہدا سر سے پاؤں تک زخموں سے چور اور بالکل ناقابل جنگ ہو چکے ہیں وہ دشمن جو آپ کو محاصرہ کئے کھڑے ہیں، عرب کے نامور اور منتخب بہادر سمجھے جاتے ہیں بایں ہمہ مجبوری و کمزوری، جب آپ کی طرف متوجہ ہوتے ہیں دشمن بدحواس ہو کر گرتے پڑتے بھاگ جاتے ہیں، ایک ہاشمی تلوار کے جوہر دکھائے بغیر جان نہیں دے سکتا۔ اپنی ساری عمر میں یہ پہلا موقعہ تھا کہ حسینؑ نے کسی دشمن کے مقابلہ کے لئے تلوار ہاتھ میں لی تھی۔ صرف تین حملے کئے، اور ہر مرتبہ فوجِ مخالف کے قدم اکھڑ گئے۔ حسینؑ کے ان یادگار حملوں کا اثر اور شمشیرزنی کی ہیبت سمجھو، یا روحانی رعب و جلال جو اس وقت حسینؑ کے خون آلود چہرے سے نمایاں تھا۔ دشمن دور سے تیر لگا رہے ہیں، قریب آنے کی ہمت نہیں پڑتی۔ اور اگر ہجوم کر کے آتے ہیں تو جدھر حسینؑ نظر اٹھا کر دیکھتے، کائی سی پھٹ جاتی۔ اب آپ پر نیم غشی کی حالت طاری ہے ایک ایک قاتل ہمت کر کے آگے بڑھتا ہی مگر آنکھیں چار ہوتی ہی، ہیبت و دہشت سے کانپنے لگتا ہے اور تلوار ہاتھ سے پھینک کر راہِ گریز اختیار کر لیتا ہے، کیا کوئی کہہ سکتا ہے، کہ کسی انسان کو اس قدر مصیبتوں اور تکلیفوں نے گھیرا ہو اور وہ اپنے عزم و استقلال پر اس طرح ثابت قدم رہا ہو، کیا دنیا کے کسی بہادر نے اتنے صدمے برداشت کرنے کے بعد ایسے دشمن

ہجوم آلام میں شجاعت و بہادری کے ایسے مافوق الفطرت جوہر دکھائے ہیں۔ ہم بلا خوف تردید دعوے سے کہتے ہیں کہ نہیں ہرگز نہیں۔ اگر تم تمام بہادران عالم کے فرداً فرداً شجاعانہ کارناموں پر غور کرو اور پھر ایک ہمہ مصائب و شدائد حسین کی شجاعت، ہمت، استقامت سے ان کا موازنہ کرو تو تمہارا ضمیر خود پکار اٹھے گا۔ کہ بے شک شجاعت و استقلال کا حسین پر خاتمہ ہوگیا۔ شجاعت و استقلال کا دوسرا نام "حسین" ہے۔

شہادتِ حسینی کا عالمگیر اثر

انسان جن چیزوں یا جن محسوسات کو دیکھتا یا سنتا ہے۔ وہ تو خود اثر قبول کرنیوالی ہیں یا دوسروں پر اپنا اثر ڈالتی ہیں دنیا میں کوئی ایسی طاقت یا آواز نہیں۔ جو ان دو صورتوں میں سے کسی ایک صورت میں نہ ہو، یا مؤثر ہوگی، یا متاثر۔ البتہ اس قدر فرق و امتیاز ضرور ہے کہ بعض اشیاء یا بعض طاقتیں محدود الاثر والتاثیر ہیں اور بعض غیر محدود، محدود یا غیر محدود ہونا، واقعہ کی اصلیت اور عظمت کے لحاظ اور اعتبار سے ہوتا ہے۔ جو واقعات یا حادثات اپنی ذات ہی میں محدود ہیں ان کی تاثیریں بھی محدود ہی ہوتی ہیں اور جو اپنی ذات میں غیر محدود ہیں ان کے آثار بھی لاتعداد ہیں۔ گریوٹی یعنی جذب و کشش ہر ایک جسم میں ثابت کیگئی ہے۔ اجسام کے سوا واقعات۔ اور اسماء میں بھی کشش پائی جاتی ہے اسکی مقدار اور وزن بھی اثر کے طریقہ پر ہی بعض واقعات ایسے ہی ایسے ہوتے ہیں جن میں بہ نسبت دوسرے واقعات اور اسماء کے کشش و جذب کی قوت زیادہ ہوتی ہے۔ کشش و جذب اور اس کی تاثیریں عموماً واقعات و حادثات کی حالت اور حیثیت سے متعلق ہوتی ہیں اگر وہ واقعات جسمانی ہوں گے تعلق رکھتے ہیں تو انکی تاثیریں بھی جسمانی ہوتی ہیں اور اگر روحانی امور سے لگاؤ رکھتے ہیں تو عموماً ان کا اثر روحوں پر پڑتا ہے۔ اور وہ اثر ایسا قوی اور زبردست ہوتا ہے کہ ہر قسم کی مزاحمتوں اور رکاوٹوں کو توڑ کر

بھی مؤثر ہو جاتا ہے طبیعتیں خود بخود اس کے قبول کرنے کو دوڑتی ہیں، اور اس سے ایسی انوس بنی ہیں کہ آنکھ کان دل اور دماغ سب کے سب اُسی طرف متوجہ ہو جاتے ہیں۔ اور اسی توجہ کا کرشمہ ہے کہ قلوب پر ایک خاص وجدانی کیفیت طاری ہو جاتی ہے۔

واقعۂ کربلا دنیا کے وقائع عظیمہ میں ایک سربرآوردہ سانحہ ہے۔ پھر اس کا سفنامیسی اثر جس قدر ہو تھوڑا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ خود قافلہ سالار کربلا کا نام ہی اپنی حالت اور حیثیت میں ایک خاص اثر اور حیرت انگیز کشش رکھتا ہے اور یہ اثر و کشش اس لئے کہ حسینؑ کا واقعہ روحانی اور ربّی امور سے تعلق رکھتا تھا۔ ایسے وسیع اور غیر محدود ہیں کہ ان کی تاثیر حس اقصائے عالم اور ہر ایک نسل انسانی تک پہنچ گئی ہیں۔ مجال نہیں کہ جس سے یہ واقعہ بیان کیا جائے اور جس کو یہ پُر درد کہانی سنائی جائے اس کے قلب پر چوٹ نہ لگے اور اس کی آنکھیں پُرآب نہوں دل و دماغ میں ہمدردی کا ہیجان پیدا نہ ہو یوں تو دنیا میں لاکھوں انسانوں پر مصیبت آئی اور بے شمار بندگان خدا مظلومیت کی حالت میں مارے گئے لیکن مظلومین کربلا کی حالت و کیفیت ہی جدا ہے۔

تمام دنیا کے پُر درد واقعات اور پُر سوز واقعات کو اکٹھا کر کے سانحہ کربلا سے مقابلہ کرو اور پھر دیکھو کہ روح اور قلب پر کس واقعہ اور حادثہ کا بجلی کی طرح اثر ہوتا ہے حسین کا نام آتے ہی آنکھیں رونے کی طرف اور دل پیچ و تاب کی جانب خود بخود مائل ہو جاتا ہے۔ یہ نام دلوں اور آنکھوں کو کیوں اپنی طرف متوجہ کر لیتا ہے، کیوں ان واقعات کو سُنتے ہی انسان کے رگ و ریشہ میں اضطراب کی بجلی گھر کر لیتی ہے، انسان کیوں سب مخالفتوں اور منافرتوں کے خیالات کو خیرآباد کہہ کر ہمدردی کا دم بھرنے لگتا ہے محض اس وجہ سے کہ حسین کے واقعات میں خداپرستی صداقت، استقامت، رحم و کرم۔ بے مثل بہادری اور بے نظیر مظلومیت و بیکسی شامل ہے، جس طرح کہا جاتا ہے "آفتاب آمد دلیل آفتاب" اسی طرح حسین کا نام بھی اپنی ازلی صداقت کی پرزور کشش سے قلوب کو اپنی طرف متوجہ کر لیتا

ہے در اس میں ایک خاموش کشش وجذب ہے جس کے سامنے دنیا کے بڑے بڑے بہادر اور بڑے بڑے بے رحم اور سنگدل موم ہو جاتے ہیں اور ادب سے سر جھکاتے ہیں۔ بے شک حسین کا یہ زندہ معجزہ ہے کہ تمام دنیا کے منصف مزاج آپ کے ساتھ ہمدردی اور آپ کے بے مثل استقلال اور بے نظیر بہادری کی داد دیتے ہیں وہ کون ایسا بہادر اور شجاع ہے جس نے تمام دنیا والوں کو خراج تحسین و آفرین حاصل کیا ہو، وہ کون ایسا مصیبتوں میں ثابت قدم رہنے والا ہے۔ جس کے ذکر خیر نے تمام دنیا نے اپنی تاریخوں صفحوں کو زیب و زینت دی ہو۔ دنیا کی ساری تاریخوں کو دیکھو گے تو سوائے حسینؓ کے تم کو اور کوئی ایسا نظر نہ آئیگا جیسیں کا ذکر ان کا یہ کہنا ہرگز داخل مبالغہ نہیں کہ دنیا کی رزم گاہ میں اول درجہ کا بہادر صرف ایک حسینؓ ہی ہے۔

جس طرح زندہ انسانوں میں آپ کی مصیبتوں پر آنسو بہائے جاتے ہیں اسی طرح روحی جماعتوں میں بھی اس جگر سوز واقعہ کا المناک اثر ہے۔ امام الصوفیہ غزالی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں

”کہ اس واقعہ جانکاہ کے بعد ایک صحابی نے آنحضرت کو خواب میں دیکھا کہ آپ کے سر مبارک کے بال پراگندہ اور گرد آلود ہیں اور آپ کے ہاتھ میں ایک شیشی ہے جس میں خون بھرا ہوا ہے۔ صحابی نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ میرے ماں باپ آپ پر فدا ہوں، آپ کی یہ کیا حالت ہے اور یہ شیشی کیسی ہے حضرت نے فرمایا کہ اس شیشی میں حسین اور اسکے عزیزوں اور مددگاروں کا خون ہے جو حسین کے ساتھ شہید ہوئے ہیں میں اس وقت مقتل حسین میں موجود تھا اس لئے میں نے اس شیشی میں وہ خون بھر لیا ہے“

وہ لوگ جن کے دل کمزور اور دماغ بودے ہیں اور جو محض نام کے مسلمان ہیں ایسی باتوں پر یقین نہ کریں گے۔ لیکن اگر روح کوئی طاقت رکھتی ہے اور اس کو اس قالب خاکی کے چھوڑنے کے بعد بھی بقا ہے۔ فنا نہیں تو ضرور اسبات کو ماننا پڑیگا کہ روحیں مُدرِک بھی ہیں۔ بالخصوص وہ پاک روحیں جو دنیا میں سچائی پھیلانے کے لئے بھیجی گئی تھیں۔ جب یہ روحیں مُدرِک ہیں تو ضرور ہے

کہ اس جانکاہ حادثہ کا ادراک ان کو بھی ہوا ہو جو لوگ اپنی کم علمی کے باعث روحانی تصرفات سے انکار کرتے ہیں ان کو ہم قواعد سپرچولزم (روحانیت) کی طرف جو زمانہ حال میں علماء یورپ نے روحوں کی تحقیقات کر کے وضع کئے ہیں توجہ دلاتے ہیں ان کو دیکھیں اور شرم کریں ہم نے اسلامی مسلمات کا حوالہ اس لئے نہیں دیا کہ نئی روشنی والوں کے ذہن میں وہ پرانے اور بوسیدہ خیالات ہیں ان کو چاہیئے کہ جدید خیالات سے اپنی تسلی کر لیں۔

بہر حال اس میں شک وشبہ نہیں کہ جیسا دردناک اثر اس شہادت کا عموماً تمام دنیا اور خصوصاً اسلامی دنیا پر پڑا اور کسی غم انگیز واقعہ سے نہیں ہوا۔ باوجودیکہ اس سانحہ کو تیرہ سو سال ہوتے آئے آج تک ویسا ہی تازہ اثر چلا جاتا ہے۔ تمام دنیا کی قوموں میں صرف مسلمانوں کی ہی قوم ایسی ہے جس میں شہادت امام حسین علیہ السلام ایک ایسا حادثہ ہوا ہے جس کا صدیوں سے ماتم ہو رہا ہے اور مسلمانوں کا ہر گروہ کم وبیش اس مظلومانہ شہادت پر ہر سال ماتم کرتا ہے۔ ہر قوم میں نہ صرف معمولی مشاہیر بلکہ پیغمبر رہنما۔ مجددین اور مصلحین نہایت بے بسی کی حالت میں قتل ہو گئے۔ جلا وطن کئے گئے۔ مخالفین نے ان پر پتھر برسائے۔ قید کی تکلیفیں دیں، تمام ممکن الوقوع مصائب توڑے گئے۔ مگر ان میں سے آج تک کسی کا ماتم کسی نے نہیں کیا۔ تمام قوموں کی مستند تاریخیں ان دردانگیز حالات سے بھری ہوئی ہیں۔ مگر وہ اثر اور خونی اثر جو حضرت سیدالشہداء کی دردناک شہادت کا اسلامی دنیا پر پڑا۔ آج تک کسی قوم پر اس کے رہنما کا نہیں ہوا۔ یہ ایک ایسا راز ہے جس کی تہہ تک پہنچنا محال عقل ہے۔ یہ ایک ایسا بھید ہے جو اب تک نہیں کھلا اس واقعہ کے متعلق بے شمار کتابیں لکھی جا چکی ہیں۔ اور شاید ہمارا یہ کہنا داخل مبالغہ نہ ہو کہ دنیا کی بے شمار تالیفات میں جس قدر اس واقعہ نے جگہ لی ہے، وہ اور کسی واقعہ نے نہیں لی ہزار ہا کتابیں اس شہادت کے بیان سے پُر ہیں شیعہ اور سنی متفق طور پر اس مظلومانہ شہادت پر آنسو بہاتے ہیں۔ علماء فریقین کی بےشمار کتابیں ان خونی بیانوں سے بھری ہوئی ہیں۔ مختصر یہ کہ دنیا میں آج تک اسلام کا کوئی ایسا فرقہ نہیں

ہوا جس نے اس بیکسانہ شہادت پر ماتم نہ کیا ہو۔ اور یقین ہے کہ یہ ماتم یوں ہی۔ قیامت یا کم از کم ایک نامعلوم زمانہ تک جاری رہے گا

حسینی کارناموں پر عیسائی مصنفین کی رائیں

مسلمان ایک طرف یہ وہ پُردرد اور پُراثر واقعہ ہے جس نے اپنوں اور غیروں سب پر عمل سحر کر کے سکوت بنا دیا ہے۔ اسلامی تاریخوں سے قطع نظر کر کے اگر ہم یورپ اور امریکہ کے مورخوں کے بیانات دیکھتے ہیں تو ہمیں تعجب ہوتا ہے کہ ہمارے ماتم نے نہ صرف ہمیں ہی افسردہ کیا ہے بلکہ مغربیوں کی ٹھنڈی فطرت پر بھی ویسا ہی خونی اثر ڈالا ہے۔

مورخ اعظم "ایڈورڈ گبن" نے اپنی مشہور کتاب "ڈکلائن اینڈ فال آف رومن امپائر" میں لکھا ہے کہ:-

> یہ مظلومانہ شہادت اور پُردرد واقعہ وطن سے اک دور دراز ملک میں واقع ہوا۔ یہ ایک ایسا سانحہ ہے جو بے رحم اور سنگدلوں کو بھی ہلا دیتا ہے۔ اگرچہ کوئی کتنا ہی قسی القلب کیوں نہ ہو اس کے دل میں بھی ایک جوش ہمدردی پیدا ہو ہی جائے گا (تاریخ دوم جلد ۹ صفحہ ۲۴۲)

علے ہذا القیاس جان لونگ کی اس نظم سے جو اس نے شہادت حسین کے متعلق پُرسوز الفاظ میں سولہ صفحات پر لکھی ہے، ثابت ہوتا ہے کہ اس منصف مزاج عیسائی سے بغیر ہمدردی کے نہ رہا گیا اس نے تقریباً چار سو اشعار میں نہایت ہی دردناک اور مؤثر الفاظ سے اس واقعہ کا مرثیہ لکھا ہے حسین کی نسبت اس کی منصفانہ رائے کا خلاصہ ان الفاظ میں ہے:-

"وہ (حسین) دیندار، خدا پرست، فروتن، خلیق اور بے مثل بہادر تھا۔ وہ سلطنت

اور حکومت کے واسطے نہیں لڑا بلکہ خدا پرستی کے جوش میں یزید سے اس لئے بیزار تھا کہ وہ اسلام اور دین محمدی کے خلاف تھا۔"

امریکن مورخ اسمتھ کلیر اپنی تاریخ عالم میں بعد ذکر واقعہ کربلا تحریر کرتا ہے:

ہم انصافاً کہتے ہیں کہ حسین کے صبر اور ثابت قدمی کی نظیر نہیں اُن کی دردناک اور مظلومانہ شہادت نے ہوا خواہان اسلام کے قلوب پر رنج وغم کے اثر کا ایسا گہرا زخم پہنچایا ہے۔ جو آج تک باوجود مرور زمانہ اندمال پذیر نہیں ہوا آپ کی شہادت کے متعلق جو واقعات بیان ہوئے ہیں وہ ایسے عجیب وغریب ہیں کہ آدمی ان کو سن کر سناٹے میں آجاتا ہے (ہسٹری آف دی ورلڈ جلد ۳ صفحہ ۲۱۵)

آرتھر دالسٹن اپنی کتاب "ہاف آورز ود محمد" میں واقعہ شہادت حسینی کو لکھتا ہوا۔ آپ کی جنگ کے متعلق تحریر کرتا ہے:۔

"حسین پھر ایک دفعہ دشمن کی فوج میں جا گھسے اور ہر طرف تباہی اور خرابی پھیلا دی۔ دشمن ان کے مقابلے سے ایسے بھاگتے تھے جیسی لومڑی شیر سے دشمن سوائے عداوت سے پاگل ہو رہے تھے اور ان کے دلوں میں دشمنی کھولتے ہوئے پانی کی طرح جوش مار رہی تھی۔ مگر وہ اپنی فوج کی کثرت سے ہی اس بہادر کو قتل کر سکتے تھے۔ آخر حسینؓ کے ہاتھ پر تلوار کا کاری زخم لگا۔ دوسرا کاری زخم ان کی گردن پر آیا۔ جب زمین پر گرے تو ایک برچھی آپ کے سینہ پر لگائی گئی اور اس طرح اُس محبوب حسین کا خاتمہ ہوا جو علی کے گھرانے کا تیسرا امام تھا۔ دشمن تہذیب اور انسانیت کے راستہ سے کوسوں دور تھے۔ اور گدھوں کی طرح حسینؓ کی لاش کے گرد جمع ہوتے تھے۔ لاش کے ساتھ ایسی حرکتیں کرتے تھے۔ جیسے پلید بھوت کرتے ہیں سر کو بدن سے جدا کر دیا گیا تھا۔ یزیدی فوج کے سوار

جوق در جوق آتے تھے اور لاش کو دیکھتے تھے جس پر اس لڑائی میں ۳۳ زخم آئے تھے، پھر انہوں نے لاش کو گھوڑوں کے سموں سے پامال کیا یہاں تک کہ اس نمازی شہید کا جسم پاش پاش ایک لوتھڑا بن گیا جو شکل سے بھی شناخت نہ ہوتا تھا، یہ لاش اس بہادر کی تھی جس کی شہزوری اور بہادری کا شاعر بڑے زور و شور سے ذکر کرتے ہیں یہ وہ بہادر تھا جس کی بہادری کی نظیر کہیں تواریخ میں نہیں ملتی، اور تمام جنگجو اور نبرد آزما قوموں میں ایسا بے مثال کوئی بہادر نہیں گزرا (صفحہ ۲۲۲)

واقعہ کربلا پر ایک مسیحی مورخ سی۔ ایچ۔ مارس اپنی کتاب "لیکچر آن اسلام" میں لکھتا ہے :-

"تاریخ عالم نے دامن میں کئی ایسے واقعات لئے ہوئے ہے جن میں بڑے بڑے مصلحین نے محبت و رضائے الٰہی اور دعوت حق کی راہ میں عظیم الشان قربانیاں پیش کی ہیں اور جن مصائب و آلام کی آزمائشوں سے ان کی آزمائش کی گئی ہے وہ نہایت ہی جانگداز ہیں مگر امام حسین کی آزمائش ان سب سے زیادہ جانگداز تھی"

ہربار ہین ایک مشہور جرمن مورخ نے شہادت حسین پر ایک خاص رسالہ لکھ کر اس واقعہ کے اسباب و نتائج پر فلسفیانہ نظر ڈالی ہے وہ ایک موقعہ پر لکھتا ہے کہ :-

حسینؓ نے یہ مصائب سلطنت و حکومت کے لئے برداشت نہیں کئے۔ اور نہ بغیر سوچے سمجھے اس تہلکۂ عظیم میں قدم رکھا۔ اگر حسین کے کلمات و حرکات پر باریک بیں نگاہ سے غور کیا جائے تو معلوم ہو جائے گا کہ بہ حیثیت سیاست انہوں نے بنی امیہ کے قبائح اور شنائع اور بنی ہاشم کے ساتھ ان کی قلبی عداوت اور نیز اپنی مظلومیت ظاہر کرنے میں کوئی دقیقہ اٹھا نہیں رکھا اور یہ بات ان کے لئے حد درجہ کی سیاست، قوتِ قلب اور اپنے مقصدِ عالی کے پورا کرنے میں خود رفتگی کو ثابت کر رہی ہے حسین نے اپنی زندگی کے آخری وقت تک اپنے شیر خوار بچہ کے متعلق وہ کام

گیا کہ حکمائے زمانہ کی عقلیں حیران ہیں ان جانکاہ مصائب کے ہجوم میں ان افکار کثیرہ کے تراکم میں اس تشنگی میں اس کثرت جراحات میں اپنے مقصد عالی سے چشم پوشی نہ کی اور باوجودیکہ وہ جانتے تھے کہ ان کے صغیر سن بچہ پر بنی امیہ رحم نہ کریں گے محض اس غرض سے کہ اپنی مصیبتوں کی عظمت بڑھائیں اور یہ مصائب زیادہ تر عظیم الشان ہو جائیں اس بچہ کو اپنے ہاتھ پر بلند کر کے سب سے اس کے لئے پانی کی درخواست کی۔ ورزبان تیر سے اس کا جواب سنا۔ گویا اس عمل سے حسین کی یہ غرض تھی کہ تمام اہل عالم واقف ہو جائیں کہ بنی امیہ کی عداوت بنی ہاشم کے ساتھ کس درجہ پر تھی اور تصور کر لیں کہ یزید اپنے دفاع کے لئے ایسے ظلم وستم کرنے پر مجبور نہ تھا۔ اس لئے کہ شیر خوار بچے کا ایسی حالت میں اس وحشت ناک طریقے سے قتل کر دینا سوائے وحشت اور بہیمانہ عداوت کے جو ہر دین و مذہب اور قانون و قاعدہ کے منافی تھی۔ اور کچھ ظاہر نہ کرتا تھا اور یہی ایک نکتہ قبائح اعمال نیات فاسد اور بغض و عناد بنی امیہ کا پردہ اچھی طرح فاش کر سکتا ہے۔ اور تمام اہل عالم بالخصوص مسلمانوں پر ظاہر کر دیا کہ بنی امیہ فقط احکام اسلام کی ہی مخالفت میں ایسے حرکات نہیں کرتے۔ بلکہ جاہلانہ تعصب کی وجہ سے کوشاں ہیں کہ ایک متنفس بھی بنی ہاشم خصوصاً ذریت محمدؐ کا باقی نہ چھوڑیں۔

پھر آگے چل کر کہتا ہے۔

حسین سے پہلے بھی رؤسا روحانی اور ارباب دیانات بحالت ظلم قتل کئے گئے ہیں یحییٰ کا قصہ بھی تاریخی واقعات میں بڑا شمار کیا جاتا ہے۔ اسی طرح یہودیوں نے جو سلوک حضرت مسیح کے ساتھ کیا اس زمانہ تک اس کی نظیر واقع نہ ہوئی تھی۔ مگر حسین کے واقعہ نے تمام واقعات پر فوقیت حاصل کر لی۔ تاریخ

سے ایسا معلوم نہیں ہوتا کہ رو حانیین اور ارباب دیانات میں کسی شخص نے بھی اپنے علم اور ارادہ سے اپنی ذات کو قتل کرا دیا ہو حسینؑ کا واقعہ عالمانہ۔ حکیمانہ، اور سیاسی حیثیت کا تھا اور دنیا کی تاریخ میں اس کی نظیر نہیں ہے کیونکہ برسوں تک حسینؑ اپنے مقتول ہونے کا انتظام اور تہیہ کرتے رہے اور جو مقصد ان کے پیش نظر تھا وہ نہایت ہی عالی اور بلند تھا۔ تاریخ میں کہیں پتہ نہیں کہ کسی نے اپنے دین کی ترویج کے لئے بہ علم و قصد اپنی جان دی ہو۔ سوائے حسینؑ کے۔ جو مصیبتیں کہ حسینؑ نے اپنے نانا کے دین کو زندہ کرنے میں برداشت کیں۔ گذشتہ ارباب دیانات پر خواہ کسی رنگ کی ہوں، اور سابقین میں سے کسی پر بھی واقع نہیں ہوئیں۔ بالفرض اگر کہا جائے کہ اور لوگوں نے بھی دین کے لئے اور دین کی راہ میں جانیں دی ہیں۔ مگر حسینؑ کے طرز و انداز پر ایسا نہیں ہوا۔ حسینؑ نے اپنی جان دی، اپنے عزیز، فرزند، بھائی، بھتیجے، بھانجے، اپنے دوست اقربا، سب دیدئے۔ مال دیا، عیال کی اسیری گوارا کی، اور یہ مصیبتیں ایک دفعہ اور ناگہاں اور نادانستہ واقع نہیں ہوئیں، کہ مجموعی حیثیت سے ایک مصیبت کا اطلاق ہوسکے بلکہ کسی قدر فاصلہ کے ساتھ۔ یکے بعد دیگرے مصیبتیں پیش آئیں اور وارد ہوئیں۔ دنیا کی تاریخ میں ایسے مصائب کا پے در پے ہجوم کرنا حسینؑ کے ساتھ خاص ہے (رسالہ فلسفہ شیعہ)

مؤلف تاریخ چین و ختن ہمیں یا کارکرن مترجم صدر دیوان عدالت کلکتہ جس نے تاریخ مذکور دو جلدوں میں لکھ کر ۱۸۵۲ء میں شائع کرائی، جہاں مغلوں اور خاقانیوں کی بہادری کا ذکر کرتا ہے وہاں اس نے بہادران معرکۂ کربلا کی نسبت نہایت منصفانہ اور قابل قدر رائے دی ہے، چونکہ یہ کتاب مورخ موصوف نے اردو میں لکھی ہے، اس لئے اس کا ریمارک بجنسہ لفظاً لفظاً نقل کیا جاتا ہے:۔

" دنیا میں رستم کا نام بہادری میں مشہور ہے لیکن کئی شخص ایسے گذرے ہیں کہ ان کے سامنے رستم کا نام لینے کے قابل نہیں ہے چنانچہ حسین ابن علی کا بہادری میں درجہ اول ہے میدان کربلا میں گرم ریت پر تشنگی اور گرسنگی میں جس شخص نے ایسا کام کیا ہو اس کے سامنے رستم کا نام وہی شخص لیتا ہے جو تاریخ سے واقف نہیں کس کے قلم کو قدرت ہے کہ امام حسینؓ کا حال لکھے کس کی زبان میں یہ لطافت و بلاغت ہے کہ ان بہتر بزرگواروں کی ثابت قدمی اور تہور و شجاعت اور تیس ہزار سوار خونخوار شامی کے جواب دینے اور ایک ایک کے ہلاک ہو جانے کے باب میں مدح جیسی کہ چاہئے کر سکے۔ کس کی نازک خیالی کی یہ رسائی ہے کہ ان لوگوں کے دلوں کے حال کو تصور کرے کہ کیا ان پر گذرا۔ اس وقت سے کہ عمر سعد نے دس ہزار سواروں سے اس کو گھیر لیا، اس وقت تک کہ شمر ملعون نے اُن کا سر کاٹ لیا کیونکہ ایک کی دوا دو مشہور ہے اور مبالغہ کی یہی حد ہے، جب کسی کے حال میں کہا جاتا ہے کہ دشمن نے چاروں طرف سے گھیر لیا۔ مگر حسینؓ اور بہتر تن کو آٹھ قسم کے دشمنوں نے تنگ کیا تھا اور اس پر بھی قدم نہ ہٹا چنانچہ چار طرف سے تو دس ہزار فوج یزید کی تھی جس کے نیزوں اور تیروں کی بوچھاڑ مثل آندھی کے آتی تھی۔ اور پانچواں دشمن عرب کی دھوپ تھی۔ جس کی مثال کسی نے بھی زیر فلک نہیں ملتی اور یہی کہنا ہوتا ہے کہ عرب کی دھوپ کے مانند، عرب ہی کی دھوپ ہے اور چھٹا دشمن وہ ریگ کا میدان تھا۔ جو آفتاب کی حرارت میں شعلہ زن اور تنور کے خاکستر سے زیادہ پرسوز تھا۔ بلکہ اس کو دریائے قہار کہنا چاہئے۔ جس کے بلبلے بنی فاطمہ کے پاؤں کے آبلے تھے اور دو دشمن سب سے ظالم بھوک اور پیاس مثل دغاباز ہمراہی کے جن کے برابر کوئی عدو نہیں ساتھ تھے اور تشنگی سے جب زبان پھول کر پھٹ جاتی تھی۔ جب

ہی، ان دونوں کی خواہش اللہ کے مثتی تھی۔ بس جنہوں نے ایسے معرکہ میں ہزارہا کافروں کا مقابلہ کیا ہو۔ ان پر بہادری کا خاتمہ ہو چکا۔ اور اس رزم کو سر دفتر تاریخ عالم سمجھنا چاہیئے۔ (تاریخ چین جلد دوم باب ۱۶ صفحہ ۲۳۵)

یہ پُر درد الفاظ اور ہمدردی کے بھرے ہوئے جملے کن لوگوں کے قلم سے نکلے ہیں۔ یہ مسلمان نہیں بلکہ عیسائی ہیں جو حسینؑ کے نانا کے مخالف ہیں مگر ان مسلمانوں سے بدرجہا افضل ہیں۔ جو مسلمان ہو کر اپنے پیغمبر کی ذریت پر ظلم کر رہے تھے اسی طرح اور بہت سے یورپین مورخ ہیں۔ جنہوں نے جناب سید الشہداء کے واقعۂ شہادت کے متعلق پر زور ریمارک اور نہایت ہی منصفانہ رائے سا تحریر کی ہیں جن میں جرجی زیدان، ارونگ واشنگٹن، سائمن ڈی کلی اور آئیسرن کے نام خصوصیت سے لئے جا سکتے ہیں ہم بخوف طوالت اسی پر اکتفا کرتے ہیں۔

واقعی حضرت امام حسینؑ تھے دل گردہ اور ہمت و استقلال کے ساتھ۔ رستم و اسفندیار، ایہرر، نپولین، اور قیصر ولیم یا ایسے ہی دوسرے مشاہیر کے کارناموں کو نسبت دینا انصاف کا خون کرنا ہے ان مصائب و شدائد پر یہ استقلال اور یہ ثابت قدمی حسینؑ ہی کا حوصلہ اور حسین ہی کی ہمت تھی۔

سانحہ کربلا پر مورّخانہ نظر

واقعہ کربلا کے متعلق کئی باتیں غور طلب ہیں۔

(۱) یہ واقعہ ناگہانی و اتفاقی تھا یا یہ قصداً عمل میں لایا گیا؟

(۲) :- اس واقعہ کے اسباب کیا تھے۔ ؟

(۳) طرفین کا اس جنگ سے کیا مقصود تھا۔ ؟

(۴) طرفین بغیر جنگ بھی اپنے مقصد میں کامیاب ہو سکتے تھے یا نہیں ؟

(۵) طرفین کہاں تک اپنے مقصد میں کامیاب ہوئے۔ ؟

(۶) اس واقعہ نے کیا نتائج پیدا کئے؟
(۷) یہ جنگ سیاسی تھی۔ یا مذہبی؟
(۸) اس جنگ کی ذمہ داری کس فریق کے ذمہ عائد ہوتی ہے؟
(۹) ہم کو اس عظیم الشان واقعہ سے کوئی سبق ملتا ہے؟ یا نہیں اور ملتا ہے تو کیا؟
(۱۰) اسلام کو اس کی کوئی یادگار قائم کرنی چاہیے۔ یا نہیں اور اس یادگار کی کیا نوعیت ہونا مناسب ہے؟

امر اول :- کی بابت کتب احادیث و تاریخ کے صفحات پر متعدد ایسی شہادتیں ملتی ہیں جن سے ہر شخص بآسانی یہ نتیجہ نکال سکتا ہے کہ یہ واقعہ ناگہانی اور اتفاقی نہ تھا۔ بلکہ جو کچھ ہوا۔ بعلم و بقصد ہوا۔ شہادت حسینی کے متعلق حضرت مخبر صادق کی پیشین گوئی جو سید الشہدا کی روز ولادت سے شروع ہوئی تھی۔ بار بار اس کا اعادہ ہوتا رہا۔ جیسا کہ ہم سرالشہادتین کے حوالے سے اوپر لکھ چکے ہیں۔ یہ پیشین گوئیاں جو باعلان ہوئیں ان سے جناب ختمی مآب کے اہل بیت اطہار و ازواج مطہرات اور صحابہ کبار سب واقف و آگاہ تھے۔

امام بیہقی شعب الایمان میں شعبی علیہ الرحمۃ سے نقل کرتے ہیں کہ

عبداللہ ابن عمر مدینہ کو آرہے تھے۔ ان کو خبر لگی کہ حسین علیہ السلام نے سفر عراق کا عزم فرمایا ہے، وہ ان سے راستہ میں آملے۔ اور زبدہ میں دو تین آپ کے ساتھ گئے اور حضرت سے کہنے لگے کہ اللہ نے اپنے رسول کو دنیا اور آخرت دونوں کو اختیار کرنے میں مختار کیا تھا۔ مگر آنحضرت صلعم نے صرف آخرت کو اختیار فرمایا۔ آپ سید عالم کے جگر گوشہ ہیں۔ آپ لوگوں میں سے کسی ایک کو دنیا نہیں ملے گی اور خدائے تعالیٰ نے آپ صاحبوں سے اس کو نہیں ہٹایا۔ مگر ایسی چیز کے لئے جو آپ کے واسطے بہت بہتر ہے۔ آپ یہاں سے واپس تشریف لے چلیں حضرت نے انکار کیا ابن عمر نے کہا میں وداع ہوتا ہوں شہید سے!!

ابن اثیر کا آخری فقرہ صاف دلالت کر رہا ہے کہ وہ بھی اس آنے والے واقعہ سے بخوبی آگاہ تھے۔ خصوصاً جناب سید الشہداء کو تو یقین کامل تھا۔ کہ میری شہادت مقدر ہو چکی ہے۔ جو کسی طرح ٹل نہیں سکتے۔ سفر عراق کے وقت دوستوں عزیزوں کے بے حد اصرار بھی آپ کا اپنے ارادے پر قائم اور ثابت رہنا اسی حکم کے تابع تھا جو اس واقعہ کے متعلق آپ کے علم میں تھا۔ اور آپ نے عبداللہ ابن عباس۔ عبداللہ ابن جعفر سے کنایتاً اور محمد ابن حنفیہ سے صراحتاً ذکر فرما دیا تھا۔ موسیو ماربین کا یہ لکھنا۔

"کہ حسینؑ نے علانیہ کہہ دیا تھا کہ میں عنقریب خدا کی راہ میں قتل کیا جاؤنگا مگر ناحق بات کی پیروی نہ کروں گا"

بالکل مطابق واقعہ ہے۔ مورخ موصوف نے اپنے اس قول کے تائید میں آگے چل کر کہا۔

کہ حسینؑ اپنے مقتول ہونے کی ہمیشہ پیشین گوئی کیا کرتے تھے۔ اور جس وقت سے مدینہ کو چھوڑا۔ صاف صاف کہتے ہے کہ میں قتل ہونے کے لئے جا رہا ہوں۔ اور اپنے سب ہمراہیوں سے بھی اتمام حجت کے لئے یہی بیان کرتے تھے۔ تاکہ اگر کوئی جاہ و جلال کی حرص وا ز سے ہمراہی چاہتا ہو تو جدا ہو جائے اور یہی بات ان کے وردِ زباں تھی کہ قتل گاہ کا راستہ میرے سامنے ہے۔ اور یہ بھی سمجھنے کی بات ہے کہ اگر حسینؑ کا یہ ارادہ نہ ہوتا اور غور و فکر اور علم و ارادہ سے قتل ہو جانے پر آمادہ نہ ہوتے تو اس طرح اپنا قتل گوارا نہ کرتے۔ اور لشکر کے جمع کرنے میں کوشش فرماتے نہ یہ کہ جو لوگ ہمراہ تھے۔ ان کو بھی متفرق و پراگندہ کر دیتے۔ چونکہ کوئی قصد سوائے قتل ہو جانے کے جو ان کے خیالات کا مقدمہ تھا ان کے مدنظر نہ تھا۔ اس لئے انہوں نے یہ سمجھ کر کہ اس کا بڑا مؤثر ذریعہ بیکسی اور مظلومی ہے اسی کو اختیار کیا۔ حسینؑ اپنے دوستوں سے جو مانع سفر ہوئے یہی فرماتے تھے کہ میں قتل ہونے کو جا رہا ہوں چونکہ ان لوگوں

کے خیالات محدود تھے اور حسینؑ کے مقاصد عالیہ پر ان کو اطلاع نہ تھی۔ اس سفر سے ممانعت پر اصرار کرتے تھے جس کا آخری جواب حسینؑ کی طرف سے یہ تھا کہ خدا کی مشیت یہی ہے اور میرے نانا نے مجھ کو یہی فرمایا ہے اور جب وہ اصرار کرتے تھے کہ جب آپ مقتول ہونے کے لئے جا رہے ہیں تو عورتوں اور بچوں کو ساتھ نہ لے جائیے تو جواب دیتے تھے کہ خدا کی مشیت یہی ہے کہ میرے اہل و عیال اسیر و مقید ہوں حسین کے یہ کلمات چونکہ اس وقت روحانیت کی حیثیت سے تھے سب لاجواب تھے اور کسی کو مجالِ دم زدن نہ ہوتی تھی۔ اس سے ظاہر ہے کہ یہ مصائب انہوں نے سلطنت و بادشاہی کے لئے برداشت نہیں کئے اور نہ بغیر سوچے سمجھے ہوئے اس مہلکہ عظیم میں قدم رکھا۔

امر دوم واقعہ کربلا کے اسباب کیا تھے اور کن وجوہ سے یہ خونی اور دردناک واقعہ پیش آیا وہ سطحی اور سرسری نظر میں بالکل صاف ہیں اور ہر شخص بآسانی کہہ سکتا ہے کہ امام عرش مقام کا بیعت یزید سے انکار اور کوفیوں کا ہواخواہی حسینؑ کے متعلق جوش و خروش سے اظہار۔ اس جنگ کے اسباب ہیں لیکن نہیں کچھ اور بھی ایسے اسباب ہیں جن پر عمیق نظر ڈالنے کی ضرورت ہے اور جو ایک حد تک اس واقعہ کے اصل اسباب کہے جا سکتے ہیں افسوس ہے کہ ان دردانگیز مظالم کے ابتدائی علل و وجوہ کو تلاش کرتے ہوئے ہمیں ایک ایسے مقام پر پہونچنا پڑتا ہے جس کا اعادہ ہم کسی طرح کرنا نہیں چاہتے تھے مگر مجبوراً اپنے سلسلۂ بیاں میں لاتے ہیں اور وہ بھی نواب مولوی شیخ احمد حسین خاں تعلقہ دار پریانواں کے رسالہ البلاء المبین سے جس کو ممدوح نے تمہید واقعات کربلا میں صفحہ ۲۹ سے ۴۷ تک وضاحت سے تحریر کیا ہے مگر ہم اس کے چند اقتباسات پر اکتفا کرتے ہیں۔ وھو ہذا۔

اگرچہ شہادت حسینی کا تیرہ و تار واقعہ ۶۱ھ ہجری میں واقع ہوا لیکن اس دیجورِ قیامت کی شام ظلمت اسی وقت سے شروع ہو چکی تھی جب خورشید رسالت غروب ہوا۔ جناب رسالت مآب صلی اللہ علیہ نے اس دارِ فانی سے عالم جاودانی کو انتقال فرمایا گیا اس کی

کی بھی ضرورت ہے اگرچہ تو میں اس مقام پر جناب مولوی نذیر احمد صاحب دہلوی کی زبان سے وہ منظر پیش کر دیتا ہوں جس کو انہوں نے رویائے صادقہ کی چوتھی فصل میں تحریر فرمائی ہے۔ وہ لکھتے ہیں۔

"جس ہستی کو سب سے زیادہ پیغمبر صاحب کی وفات سے صدمہ ہوا وہ فاطمہ تھیں۔ والدہ پہلے انتقال کر چکی تھیں۔ ماں اور باپ دونوں کی جگہ پیغمبر صاحب تھے۔ ایسا باپ جو کون دین و دنیا کا بادشاہ، ایسے باپ کا سر سے سایہ اٹھ جانا۔ اس پر حضرت علیؓ کا خلافت سے محروم رہنا اور اس پر طرہ ترکۂ پدری یعنی فدک کا دعویٰ کرنا اور مقدمہ ہار جانا۔ کسی دوسرے کو ایسے پیہم صدمات پہنچتے تو زہر کھا کر مر جاتا مگر ان کا صبر و ضبط ان ہی کے ساتھ تھا۔ پھر بھی رنجوں میں گھل گھل کر چھ مہینے کے اندر اندر انتقال فرما گئیں اور جتنے دن زندہ رہیں ان لوگوں سے جو ان کو رنج پہنچانے والے تھے نہ بولیں اور نہ بات کی یہاں تک کہ ان لوگوں کو اپنے جنازہ پر آنے کی بھی ممانعت کر دی اور شب کے وقت مدفون ہوئیں"

اس سے آگے تحریر فرماتے ہیں۔

"سخت افسوس کی بات ہے کہ اہل بیت کو پیغمبر صاحب کی وفات کے بعد ہی ایسے ناملائم واقعات پیش آئے کہ ان کا جو ادب و لحاظ ہونا چاہیے تھا اس میں ضعف آ گیا اور شدہ شدہ منجر ہوا اس ناقابل برداشت واقعہ کربلا کی طرف جس کی نظیر تاریخ میں ملنی دشوار ہے"

جس طرح جناب رسولِ خداؐ کے بعد ہی اہل بیت نبوی کو مکروہات کا پیش آنا مسلّم ہے اسی طرح اس میں بھی کلام نہیں کہ ان حضرات نے کوئی موقعہ ایسا نہیں چھوڑا جس میں کنایۃً یا صراحۃً قطع حجت نہ فرمایا ہو چنانچہ مولوی نذیر احمد صاحب دہلوی رویائے صادقہ میں لکھتے ہیں کہ:

"اس سے انکار نہیں ہو سکتا کہ حضرت علی کی خلافت کے دعویدار ضرور تھے اور

کیوں نہ ہوتے پیغمبر صاحب کے بعد۔ داماد کہو، بیٹا کہو، بھائی کہو یہ ہی تھی"!
اور مولوی احسان اللہ صاحب گورکھپوری نے اپنی کتاب تاریخ اسلام کے صفحہ ۱۰۳ میں تحریر فرمایا ہے کہ:

"حضرت علی کو پیغمبر صاحب کی وفات کے بعد ہی خلافت کا دعویٰ تھا۔ مگر نہ اس طرح کہ کوئی فساد کریں بلکہ اس قدر کہ وہ اپنے کو حقدار سمجھتے تھے حضرت ابوبکر اور حضرت عمر کی خلافتوں میں بھی ان کو تامل تھا"!

علامہ ابن عبدالبر کتاب استیعاب میں لکھتے ہیں کہ:

قال علی کرم اللہ وجہہ ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم لما قبض قلنا نحن اھلہ واولیاءہ فلا ینازعنا سلطانہ احد فانزی علینا قومنا فولوا غیرنا وایم اللہ لولا مخافۃ ان تعود الکفر ویبور الدین لغیرنا فصبرنا علی بعض الالم۔

حضرت علی نے فرمایا کہ جب رسول خدا نے رحلت فرمائی تو ہم نے آنحضرت ؐ کے اہل اور ولی ہونے کا اظہار کیا کہ رسول ؐ کی جانشینی کی بابت نزاع کرنے کا ہم سے زیادہ کوئی مستحق نہیں لیکن قوم نے ہماری بات نہ سنی اور ہمارے سوا دوسروں کو والی بنا لیا خدا کی قسم اگر قوم کے تفرقہ کا اندیشہ نہ ہوتا اور یہ خوف ہوتا کہ مبادا کفر پھر عود کرے اور دین برباد ہو جائے تو بے شک قوم کی اس کارگذاری کو ہم بدل دیتے۔ آخر ہم کو آلام پر صبر کرنا پڑا۔

شوریٰ کے زمانہ میں بھی حضرت علیؑ نے کوئی شکوہ اپنی حق تلفی کا اٹھا نہیں رکھا چنانچہ تاریخ ابوالفدا، تاریخ کبیر ابن جریر طبری وغیرہ میں صاف صاف لکھا ہے کہ حضرت عبدالرحمٰن بن عوف کی مدبرانہ پالیسی نے حضرت علی ابن ابی طالب کو امر خلافت سے محروم فرمایا۔ تو جناب امیر علیہ السلام نے

اپنی مخالف پارٹی کی جانب مخاطب ہو کر فرمایا "لیس ھذا اوّل یوم تظاھرتم علینا فیہ فصبر جمیل" آج یہ کچھ پہلا دن نہیں ہے جس میں تم نے ہمیں مغلوب کرنے کو آپس میں سازشیں کی ہوں خیر صبر ہی بہتر ہے جب خود حضرت علی کی خلافت تسلیم کی گئی تو فوراً ہی جنگ مخالفانہ سے روبکاری ہوئی اور آپ کو مجبوراً دست بقبضہ ہونا پڑا اور شدہ شدہ یہ نوبت پہنچی کہ آپنے شقی ترین امت کے ہاتھ سے شربت شہادت نوش فرمایا اور آپکی وصیت کے موافق آپ کے بڑے صاحبزادے امام حسنؑ جانشین ہوئے امام حسنؑ کے خلیفہ ہوتے ہی لوگوں نے ان سے منہ پھیرلیا۔ اور ایسا منہ پھیرا کہ مجبوراً ان کو گوشہ نشینی اختیار کرنی پڑی اور اس پر بھی چین نہ آیا، تو ان کو زہر دلوادیا اور باوجود وصیت نبیہ جد امجد کے پہلو میں بھی دفن نہ ہونے پائے امام حسنؑ کے شہید ہوتے ہی اعدائے دین نے امام حسینؑ کو نرغہ میں لے لیا اور آخر جو نتیجہ ہونا تھا وہ ہوا۔

اس کے بعد نواب صاحب ممدوح تحریر کرتے ہیں۔

کہ جناب رسالتمآبؐ نے کس کس طرح اپنے اہلبیت کے ساتھ تمسک اور ان کے اقتداکی تاکید فرمائی تھی اور ان کے کیا کیا حق امت پر ظاہر کردئے تھے کیا یہ نہیں فرمایا تھا کہ میں تم میں دو عظیم الشان چیزیں چھوڑے جاتا ہوں۔ ایک قرآن دوسری اپنی عترت اور یہ دونوں ایک دوسرے سے جدا نہ ہوں گی، یہاں تک میرے پاس کوثر پہ وارد ہوں اس حکم کا منشا بظاہر یہ تھا کہ قرآن تمہارے لئے ایسا عمدہ قاعدہ چھوڑتا ہوں جو ضروریات زندگی میں تمہارا سب سے بڑا رفیق ہے، اور قرآن کے سمجھانے کے اہل بیت (دیکھو تاریخ السلام مولوی احسان اللہ وکیل گورکھپور)

مگر افسوس ہے کہ اس کا مطلب امت کی سمجھ میں نہ آیا ورنہ قرآن خوانی وکلمہ گوئی کو بغیر تمسک اہل بیت کے کوئی وقعت سے نہیں دیکھتا کیونکہ قاتل حسینؑ اور حسینؑ کے مخالفین سب کے سب کلمہ گو اور قرآن خوان تھے۔

کیا حضور نبوی نے ارشاد نہ فرمایا تھا کہ میرے اہل بیت کی مثال سفینۂ نوح جیسی ہے۔ جو اس پر سوار ہوا۔ اس نے نجات پائی اور جس نے اس سے تخلف کیا، وہ غرق ہوگیا، آخر امتی ان ہدایات کا کیا مطلب سمجھتے تھے۔ یہی کہ علیؑ سے مخالفت فاطمہ سے مخاصمت اور حسنؑ سے عداوت قائم کریں اور حسینؑ کے ساتھ تو وہ کریں جو کافر اور مشرک بھی نہ کرتے۔

حیرت تو یہ ہے کہ اکابر صحابہ تک جن میں سے بعض تو اسمائے گرامی عشرہ مبشرہ کی صفات اضافی سے موصوف کئے جاتے ہیں۔ جناب امیر علیہ السلام کو بُرا سمجھنے لگے تھے۔ چنانچہ حضرات طلحہ و زبیر نے کوفہ اور بصرہ کی صوبہ داریوں کے نہ ملنے سے حضرت علی کی بیعت توڑ دی۔ جیسا کہ تاریخ امام ابن جریر طبری تاریخ کامل ابن اثیر جزری اور تاریخ حافظ ابن کثیر وغیرہ سے ثابت اور واضح ہے اور تاریخ ابن شحنہ، تاریخ ابو الفداء تاریخ ابن اثیر جوزی۔ تاریخ ابن جریر طبری، تاریخ ابن کثیر اور تذکرۂ خواص الامۃ وغیرہم میں مفصل موجود ہے کہ حسان ابن ثابت کعب ابن مالک، مسلمہ ابن مخلد النعمان ابن بشیر، فضالہ ابن عبید، کعب بن عجزہ زید ابن ثابت عبداللہ ابن سلام سہیل بن سنان، اسامہ ابن زید، قدامہ ابن مظعون مغزہ ابن شعبہ، رافع ابن خدیج، ابوسعید خدری وغیرہم نے جناب امیر کی بیعت سے قطعاً انکار کیا۔ ابوموسیٰ اشعری تو علانیہ منحرف ہی تھے، چنانچہ استیعاب ابن عبدالبر میں ہے کان ابوموسی الاشعری منحرفاً عن علی کرم اللہ وجہہ

مولوی احسان اللہ صاحب تاریخ اسلام میں لکھتے ہیں کہ انہوں نے بہت زور مارا تھا کہ لوگ حضرت علی کا ساتھ نہ دیں، امیر معاویہ اور عمرو بن العاص کی عداوت اظہر من الشمس ہے حضرت سعد ابن ابی وقاص اور عبداللہ ابن عمر نے علی ابن ابی طالب کی بیعت کو قطعی طور سے مکروہ تصور فرمایا چنانچہ تذکرہ خواص الامۃ سبط ابن جوزی میں ہے کہ:۔

قال الزهری والعجب ان عبد اللہ ابن عمر وسعد ابن وقاص لم یبایعا	زہری کہتے ہیں کہ تعجب ہے کہ عبداللہ ابن عمر اور سعد ابن ابی وقاص نے علی سے تو بیعت

علیان بایعا یزید ابن معاویہ۔ نہ کی اور یزید ابن معاویہ سے بیعت کرلی

امام نووی مروج الذہب میں لکھتے ہیں۔

وقعد عن بیعته جماعة عثمانیة منهم سعد ابن ابی وقاص وعبد اللہ ابن عمر و بایعوا یزید بعد ذالک	جناب امیر کی بیعت سے تو ایک جماعت نے تقاعد کیا جس میں سعد ابن ابی وقاص اور عبد اللہ ابن عمر تھے۔ اور اس کے بعد عبد اللہ

نے یزید سے بیعت کرلی۔

اور حافظ ابن کثیر شامی تاریخ میں لکھتے ہیں کہ

بایع الناس علیا المدینة وتربص نفر لم یبایعوه ابن عمر وسعد ابن ابی وقاص۔	لوگوں نے مدینہ میں علی کی بیعت کی۔ مگر ایک گروہ نے بیعت سے توقف کیا جس میں ابن عمر وسعد ابن ابی وقاص تھے۔

اور فتح الباری شرح صحیح بخاری میں یزید سے حضرت عبد اللہ ابن عمر کی بیعت کا یوں حال لکھا ہے۔

وبایع معاویة یزید بعد موت معاویة لاجتماع الناس علیه۔	عبد اللہ ابن عمر نے بعد وفات معاویہ ان کے بیٹے یزید سے بیعت کرلی اس لئے

کہ اس کی خلافت پر لوگوں کا اجتماع ہوگیا تھا۔

دیکھئے عبد اللہ ابن عمر جیسے جلیل القدر صحابی اور مفتی نے امیر المومنین علی ابن طالب کی بیعت نہ کی اور امیر شام کی اطاعت واجب خیال فرمائی۔ چنانچہ ان کے ایسے مطیع اور فرمانبردار تھے کہ ان کے فرزند رشید یزید کو امام برحق تسلیم کرکے بطیب خاطر اس کی بیعت کرلی اور فقط بیعت ہی پر اکتفا نہ کی بلکہ انہوں نے سادہ مخالفین یزید کو اس کی اطاعت وبیعت پر ترغیب دیتے تھے۔ اس کے بعد یزید کی خلافت پر بحث کرکے نواب صاحب موصوف لکھتے ہیں۔:-

سچ تو یہ ہے کہ امام غزالی ابن عربی ملا علی قاری اور شیخ ابن حجر مکی کے اقوال

پر کیا نظر کی جائے جب کہ ابتدا سے ہی بجائے نصرت و رفاقت کے انحراف اور بغاوت کی ہوا چل چکی تھی۔ قیامت تو یہ ہے کہ پیغمبر صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم سے جدا ہوتے ہی ان کی ودیعت اور امانت میں خیانت کی نگاہیں پڑنے لگیں اور اہل بیت رسالت کو ان کے دائرۂ عظمت سے ہٹادیا گیا جس کا نتیجہ یہ تھا کہ مطلع صبح نبوت پر شام ظلمت کا دمدار ستارہ نمودار ہوگیا۔ یعنے نیابت نبوت کی مقدس مسند پر خاندان بنی امیہ کا وہ ننگ اسلام ممبر قابض ہوا جس نے خاندان رسالت کی تباہی و بربادی۔ استیصال و تخریب تذلیل و توہین میں کوئی دقیقہ اٹھا نہ رکھا (البلاغ المبین صفحہ ۲۶ تا ۲۴)

نواب مولوی احمد حسین صاحب کا مندرجہ صدر مضمون۔ بادی النظر میں ناگوار و تلخ ضرور ہے مگر واقعیت کے رنگ سے خالی نہیں کیونکہ خاندان رسالت پر تمام آنے والے مصائب کا مقدمۃ الجیش اور علت العلل فی الواقع ان کا ان کے مرکز عظمت اور منصب خلافت سے ہٹایا جانا ہی قرار پاسکتا ہے کیونکہ اسی غیر معین نظام خلافت کا طفیل تھا کہ بنی امیہ کو جو بنی ہاشم کے موروثی تشنۂ خون تھے۔ اس وقت تمام اسلامی دنیا میں ایک خاص وقعت کی نگاہ سے دیکھے اسلامی سیاسیات کے بست وکشاد میں دخل پانے کا موقعہ ملا۔ اور اس طرح کہا جاسکتا ہے کہ خلافت ثانیہ میں بنی امیہ کے پولٹیکل اقتدار کا سنگ بنیاد رکھا جانا اور خلافت ثالثہ میں اس کا ایک مستحکم و استوار قصر حصین بن جانا ہی واقعہ ہائلہ روز عاشور کا اصلی اور حقیقی سبب ہے۔

بنی ہاشم اور بنی امیہ کی باہمی رقابت و عداوت جو ارث خاندانی کی طرح رگ و ریشہ میں اثر کئے ہوئے تھے۔ ایسی آشکارا اور شہرت یافتہ ہے کہ ہماری کسی صراحت کی محتاج نہیں بنی امیہ کبھی دل سے مسلمان نہیں ہوئے تھے وہ مؤلفۃ القلوب (لالچی مسلمان) اور اپنے کفر اصلی پر قائم تھے۔ اس لئے جب ان کو دنیائے اسلام پر کامل اقتدار حاصل ہوگیا، تو انہوں نے وہی زمانۂ جاہلیت کی پرانی رسمیں بلکہ ان سے بھی بڑھ کر اختیار کیں۔

چونکہ وہ اہل بیت رسالت کو محافظ اسلام اور اپنے ارادوں کی تکمیل میں سد سکندری سمجھتے تھے اس لئے بنی ہاشم خصوصاً بنی فاطمہ کا استیصال ان کا موروثی اور سیاسی نصب العین تھا بنی ہاشم کا اپنے درجہ اور اعزاز سے ہٹایا جانا اور سلسلۂ خلافت کا ایک غیر معین اصول پر قائم ہونا اپنے نتیجہ کو ایسی حالت پر لے آیا کہ قسمت آزمائی کے میدان میں بنی امیہ کامیاب اور بنی ہاشم پر غالب آئے اور اپنے آئندہ امور کے لئے راستہ صاف کر لیا۔ تیسری خلافت کا بنی امیہ میں مسلم ہونا۔ اس امر کی ضمانت کا بل تھا کہ ہر کام اور ہر مقام میں بنی امیہ دخیل ہوتے جائیں۔ اور بہ نسبت پہلی تینی اور عددی خلافتوں کے دو بالترتیب دو سال تین ماہ اور دس سال چھ ماہ۔ رہیں ان کو تقریباً بارہ سال کا ایسا کافی زمانہ مل جائے کہ وہ آئندہ کے لئے اپنی جگہ کو ایسا مستحکم کر لیں جو ایک صدی تک جنبش نہ کر سکے۔

یہ لوگ اس دیرینہ عداوت و کدورت کی وجہ سے گو بظاہر اسلام کے ساتھ خلوص وعقیدت ظاہر کرتے تھے مگر باطن میں ان کو عار معلوم ہوتا تھا کہ جس دین پر بنی ہاشم کا سکہ ہو ذلی اس کی پیروی کریں۔ مگر حصول امارت وسلطنت کے لئے اس کے سوا اور کوئی ذریعہ بھی نہیں تھا۔ اس لئے بظاہر مخالفت نہیں کر سکتے تھے۔ کیونکہ پہلی تمام مخالفتیں بے کار ثابت ہو چکی تھیں لیکن جب عزت کا اعلٰے زینہ اور ترقی کا رفیع ترمقام ان کے ہاتھ آ گیا اور اپنے جاہ وجلال کو مستحکم کر چکے تو کھلم کھلا احکام اسلام سے سرکشی شروع کر دی۔

ابوسفیان صخر بن حرب سرگروہ بنی امیہ جو ابوجہل اور ابوہشام کے بعد سب سے بڑا دشمن اسلام اور مخالف بانیٔ اسلام تھا اگرچہ فتح مکہ کے بعد بظاہر مسلمان ہو گیا تھا۔ مگر تا دم مرگ اپنے اصلی کفر پر قائم رہا۔ دوسری خلافت کے زمانہ میں اس کے دو بیٹوں۔ یزید اور معاویہ کا یکے بعد دیگرے شام کے زرخیز صوبہ پر گورنر مقرر ہونا۔ اور تیسری خلافت کے طولانی زمانہ میں خاندانی مراعات سے فائدہ اٹھا کر اس قدر رسوخ اور قوت حاصل کر لینا کہ چوتھی خلافت میں۔ قصاص خون حضرت عثمان کا حیلہ کر کے خلیفہ وقت سے مقابلہ ومقاتلہ کرنا۔ لڑائی

کی صورت اپنے حق میں بگڑتی ہوئی دیکھ کر بہ راہ چالاکی ختم کرانا۔ خاتمہ جنگ کے بعد حکمین سے نہایت شرمناک طریقہ کے ساتھ اپنے حق میں فیصلہ کرالینا۔ پھر سب سے بڑھ کر اپنے فاسق وفاجر بدعقیدہ و بدافعال بیٹے کو دنیائے اسلام پر جبراً مسلط کر دینا۔ یہ سب واقعات ایسے ہیں کہ ان کی مسلسل کڑیاں ایک دوسرے سے ملکر اس عظیم الشان واقعہ کی خوفناک زنجیر بنجاتی ہے

امیر معاویہ نے اپنی زندگی میں جو کوششیں یزید کی بیعت ولیعہدی کے متعلق کیں اور جن چار بزرگان حجاز نے جو اس وقت تمام اسلامی دنیا میں ایک خاص وقعت کی نگاہ سے دیکھے جاتے تھے۔ اس نے انکار کیا اس کا مفصل حال ہم اوپر لکھ آئے ہیں۔ مکرر اعادہ تحصیل لاحاصل ہے۔ مگر یہ بھی ظاہر ہے کہ جو وقار اور جو عزت حسین علیہ السلام کو فرزند رسول اللہ ہونے کی وجہ سے تمام مسلمانوں میں حاصل تھی وہ حضرت ابوبکر۔ حضرت عمر اور حضرت زبیر کے بیٹوں کو نہ تھی اس لئے امیر معاویہ کے جانشین کو جو کد و کاوش حسینؑ سے بیعت لینے کی بابت ہو سکتی تھی وہ دوسروں کے ساتھ ممکن نہ تھی جس طرح یزید کو اپنے مقاصد کی تکمیل کے لئے حسینؑ کا ہٹانا ضروری تھا۔ اسی طرح حسینؑ کے واسطے ایک فاسق اور دشمن اسلام کی بیعت و اطاعت اختیار کرنا ناممکن تھا۔ بہرحال یہی واقعات ہیں جن کو اس یادگار لڑائی کا اصلی سبب قرار دیا جا سکتا ہے

امر سوم:۔ طرفین کا اس جنگ سے کیا مقصود تھا کے متعلق زیادہ بیان کی ضرورت نہیں۔ تمام واقعات خود پکار رہے ہیں کہ حسین علیہ السلام اسلام کو قائم رکھنا اور بنی امیہ اس کو نیست و نابود کر دینا چاہتے تھے، یزید کا مدعا یہ تھا کہ حسینؑ بیعت کر لیں تو پھر مسلمانوں میں اس کے ناشائستہ افعال و اقوال پر مخالفت تو درکنار کسی کو نکتہ چینی کی بھی گنجائش اور جرأت نہ رہے گی۔ اور رفتہ رفتہ اسلام کے تمام مقدس احکام معطل بلکہ بنیاد اسلام ہی کھوکھلی ہو جائے گی۔ اور اسلام کے مستحکم و فولادی قلعہ کا ریت کے گھروندے کی طرح منہدم و مسمار ہو کر نشان تک نہ رہے گا لیکن حسینؑ کا نصب العین اور مقصود اور ہی کچھ تھا۔ انہوں نے حمایت اسلام میں اپنا آخری قطرۂ خون تک گرانا منظور فرما لیا اور وہ بات منظور نہ کی جس سے اسلام کی سراسر توہین ہی نہیں

بلکہ بیخ کنی ہو اور شجر اسلام کو جو نفاق و ارتداد کی باد سموم سے خشک ہو جانے والا تھا۔ اپنی ذات اپنی اولاد اپنے عزیزوں اور اپنے دوستوں کے خون سے سینچ کر سرسبز و شاداب کیا۔

بلاشبہ حسینؑ کی عظمت ان کی شہادت میں ہے کیونکہ جس نوعیت اور جس ہیئت میں حسینؑ کی شہادت ہوئی وہ بجائے خود عدیم المثال ہے۔ مگر حسینؑ کا اعلیٰ تر درجہ محض شہادت میں نہیں بلکہ اس بلند تر مفہوم میں ہے کہ حسینؑ اولاً مدبر ہیں ثانیاً شہید ثالثاً۔ غرض شہادت ایسی اہم اور ارفع ہے جس کی نظیر شہدائے اولین و آخرین میں نہیں پائی جاتی۔ رابعاً عزم راسخ، عزت نفس، استقلال اور حمایت ملت کے کامل ترین نمونہ کا اظہار۔ شہید کون ہے وہ جو اصول کے لئے قربان ہو جاتا ہے۔ مدبر کون ہے وہ جو اپنے ذمہ داری کو اس طرح ادا کرتا ہے کہ کسی طرح اس پر ان آفات کا الزام نہ لگایا جاسکے جو اس کے فرائض کے ضمن میں دکھائی دیں اور جو حتی الوسع اس بات کے لئے تمام عقلی اور امکانی پہلو اٹھا نہ رکھے جو دفع آفات کے لئے ممکن سمجھے جاسکیں۔ دنیا میں شہید بھی گزرے ہیں، مدبر بھی گزرے ہیں اور ہوں گے مگر ایسے بہت کم گزرے ہیں جو مدبر بھی ہوں اور شہید بھی اور یہ تو بہت ہی شاذ ہے کہ مدبر کو شہادت کی جرأت ہو، اور ہو بھی تو غالباً اور یقیناً ایسا کوئی نہیں ہوا۔ جو حسینؑ کے اتفاقات میں حسنؑ جیسا شہید اور مدبر اور مدبر شہید کہا جاسکے۔ حسینؑ کا زمانہ تدبر جس طرح گزرا۔ اور جس ناقابل برداشت اور تلخ زمانہ کو انہوں نے گزارا وہ کسی باحمیت اور ذی حس انسان کو پیش نہ آیا ہوگا۔ یہی حیرت انگیز سنجیدگی تھی جس کی نسبت لارڈ میکالے نے افراط مبالغہ سے نہیں بلکہ تفریط سے کہا ہے: "کہ اسلام میں اس سے زیادہ سنجیدہ معاملہ نہیں گزرا۔" یورپین لوگوں میں ایسے شاذ مورخ ہیں جو غیر یورپین یا غیر قومی واقعات کے اعتراف میں سخاوت کو راہ دیں۔ مگر واقعات اور اثر نے موسیو ماربین اور جیمس کارکرن جیسے لوگ پائے جن کی منصفانہ تحریروں سے محتاط یورپ بھی مستثنیٰ نہیں رہا۔

امر چہارم: آیا فریقین بغیر جنگ کئے اپنے مقصد میں کامیاب ہو سکتے تھے یا نہیں۔ اس کے متعلق یہی کہنا کافی ہے کہ بنی امیہ کا مقصد بغیر جنگ یوں حاصل نہیں ہو سکتا تھا کہ وہ حسینؑ کے وجود کو اپنی اغراض کا منافی جانتے تھے، ان کو یقین کامل تھا کہ حسینؑ کسی طرح بیعت پر آمادہ نہ ہوں گے اس کا آخری نتیجہ لڑائی کی صورت میں رونما ہوگا۔ اور ہمارا مقصود اصلی جو تخریب اسلام اور استیصال بنی ہاشم کے قتل کے متعلق ہے، خود بخود حاصل ہو جائے گا۔ اور چونکہ حسینؑ اب زیادہ طرح دینا گناہ عظیم اور اسلام کی بیخ کنی سمجھتے تھے اس لئے آخر الحیل السیف پر بہ مجبوری عمل کرنا پڑا۔ یہی اسباب تھے جنہوں نے اس جنگ کو اٹل کر دیا تھا۔ تاہم حسینؑ نے آخر دم تک کوشش کی کہ ان کے نانا کے کلمہ گو راہ راست پر آجائیں۔ اہل بیت رسالت کا خون ناحق اپنی گردنوں پر نہ لیں اور جہنم کا ایندھن نہ بنیں مگر افسوس ہے کہ ان بد بختوں پر کچھ اثر نہ ہوا کیونکہ ان کا منشاء اصلی بغیر جنگ حاصل نہ ہو سکتا تھا۔

امر پنجم: فریقین کہاں تک اپنے اپنے مقصد میں کامیاب ہوئے، ظاہر بیں لوگ اس سوال کا جواب بہت آسانی سے بلا تأمل دے سکتے ہیں کہ یزید کامیاب ہوا۔ اور حسین مارے گئے۔ خاندان رسالت پر ایسی تباہی آئی جس کی پھر تلافی نہ ہو سکی۔ لیکن کیا درحقیقت یزید کی دلی آرزو پوری ہوئی، کیا واقعی یزید نے اہل بیت نبوت کا خاتمہ کر کے شجر اسلام کو بیخ و بن سے اکھاڑ ڈالا۔ نہیں یہ اس کا خیال خام تھا وہ اپنے دل میں خوش تھا کہ اس کے آباء و اجداد کا بویا ہوا تخم منافقت سرسبز ہوا۔ اسلام اب دنیا سے بالکل مٹ جائے گا۔ لیکن فرزند رسول کی قولی و فعلی دعوت اپنا کام کر چکی تھی۔ اس کو محسوس ہوا کہ حسینؑ نے کیا کیا۔ اسلام مٹا نہیں بلکہ حسینؑ نے اس کی بنیاد کو ایسا مستحکم اور استوار کر دیا جو کسی زبردست سے زبردست طاقت کے ہلائے بھی نہیں ہل سکتی۔ حسینؑ نے نہ دین و تقویٰ صداقت و امانت، سخاوت و قناعت ایثار و ہمدردی حمیت و غیرت، صبر و استقلال تسلیم و رضا تحمل و شجاعت اور اطمینان قلب کے بہترین نمونے دنیا میں قائم کر دئیے بلکہ حسینؑ

نے اپنی ذات اور اپنے اقربا اور رفقا کی قربانیاں چڑھا کر ایمان ونفاق کے حقیقی معنی ظاہر کر دئے اور ایک عالم کو دکھا دیا کہ مومن کون ہے اور منافق کون ہے۔ شہدائے کربلا کے خون نے فعلی شہادت دی کہ سچے مومن یہی ہیں اور ان کی مخالفت، کفر و نفاق حسین نے چند گھنٹہ میں وہ فعلی دعوت دی جو آنحضرت نے ۲۳ سال میں دی تھی، اور اس تھوڑے عرصہ میں توحید۔ عدل۔ نبوت، امامت، قیامت، صوم صلوٰۃ، حج، زکوٰۃ، جہاد۔ تہذیب، اخلاق، تمدن اور سیاست وغیرہ وغیرہ تمام اعمال واجبہ و تبعہ کو قولاً و فعلاً ثابت کر کے دکھایا کہ دین یہ ہے، اور دیندار ایسے ہوتے ہیں۔

حسینی دعوت اسی روز ختم نہیں ہو گئی۔ یہ دعوت، دعوت دائمی تھی۔ جو ہمیشہ قائم اور جاری رہے گی، اور اطراف عالم میں برابر جاری ہے حسینؑ شہید ہو گئے۔ ان کے یار و انصار سب آغشتہ خاک و خون ہوئے یزید بظاہر فتحیاب ہوا۔ مگر درحقیقت ایسا نہیں ہوا حسینؑ زندہ ہیں اس کی دعوت جاری ہے ان کا نام روشن بلکہ روشن تر ہوتا جاتا ہے، یزید مر گیا۔ اس کا نام مٹ گیا۔ کوئی شخص حتیٰ کہ کافر بھی اس کا نام لینا پسند نہیں کرتا۔ اور جو لیتا ہے۔ برائی سے یاد کرتا ہے اس کے نام کے ساتھ ہر زبان پر لفظ پلید یا لعنت اللہ شامل ہے اور نام حسین کے ساتھ ہر زبان پر صلواۃ اللہ علیہ منضم۔

حسین کے نام لیوا اور ہوا خواہ ہر روز اطراف عالم میں بڑھتے جاتے ہیں۔ جن کی تعداد کروروں سے متجاوز ہے، لاکھوں مکانوں میں خاص حسین کا ہی ذکر ہوتا ہے۔ بلکہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ کوئی دن دنیا میں ذکر حسین سے خالی نہیں جاتا اور ایک دن ایسا آتا ہے جس میں ہر فرد بشر حسین کو یاد کرتا ہے گویا دعوت حسینی ہر کان تک پہونچ جاتی ہے۔ ہر طبقہ۔ ہر مذہب، ہر قوم اور ہر ملک میں حسین کا ذکر خیر ہوتا ہے۔ منکرین چاہتے ہیں کہ اس شمع ہدایت کو بجھا دیں اور اُس آفتاب پر خاک ڈالیں مگر ان کی یہ کوشش بے سود ہے اس صداقت کو دنیا آشکارا دیکھ رہی ہے کیسے کیسے جابر حکام وقت اور بادشاہوں نے نام حسینؑ کو مٹانے

کی کوششیں کیں مگر اس نور کی تابندگی بڑھتی گئی تو اللہ متم نورہ ولو کرہ الکافرون ذبح عظیم کی قربانی قبول ہوئی، دعوت حسینی نے اپنا اثر دکھلایا۔ منافقین کی ناک رگڑی گئی۔ اور دشمنان اسلام ذلیل وخوار ہوئے۔

امر ششم (اس واقعہ نے کیا نتائج پیدا کئے) کوئی حادثہ یا واقعہ اتفاقاً وقوع میں آئے۔ یا بالارادہ اور وہ ارادہ یا وقوع خواہ کسی بڑی طاقت کی طرف سے ہو یا کسی چھوٹی طاقت کی جانب سے ضرور ہے کہ اس کا کچھ نہ کچھ اثر اور نتیجہ پیدا ہو۔ شہادتِ حسینی تاریخ عالم کا ایک عظیم الشان واقعہ اس لئے ہم کو یہ دیکھنا چاہئے کہ اس شہادت نے کیا اثر اور کیا نتیجہ پیدا کیا، گو اس کا جواب ہمارے مذکورۂ صدر مضامین میں متفرق طور پر آچکا ہے، تاہم یہاں اجمالاً اتنا ذکر کرنا ضروری ہے کہ اس شہادت نے حق کو اپنے مرکز پر قائم کر دیا۔ دین محمدی کی گرتی ہوئی دیوار نہایت استحکام کے ساتھ سنبھل گئی حق وباطل کا امتیاز اعلان و اشتہار کے ساتھ آشکارا ہوگیا۔ لوگوں کو بنی امیہ کی گمراہی اور خاندانِ رسالت کے ساتھ معاندانہ برتاؤ آفتاب نصف النہار کی طرح روشن ہوگیا۔ لوگوں کے خیالات پر اس کا شدید اور سخت اثر پڑا۔ گویا اس شہادت نے اسلام کے نیم مردہ قالب میں تازہ روح پھونک دی اور فرزند رسول نے بیعتِ یزید سے انکار اور مصائب و شدائد پر حیرت انگیز استقلال نے مسلمانوں پر ظاہر کر دیا کہ فاسق وفاجر ہرگز خلیفہ رسول نہیں ہوسکتا گو امت کا اجماع اور تسلط فی الارض ہوا کرے۔

اسی شہادت کا نتیجہ ہے کہ آج اسلام کہیں اپنی اصلی اور کہیں اپنی بگڑی ہوئی صورت میں نظر آتا ہے، ورنہ اسلام اسی زمانہ میں رجعتِ قہقری کر کے اپنے اصلی مقام پر آجاتا اور تمام دنیا پر بدستور سابق کفر وفسق کی گھنگور گھٹا چھا جاتی، جو لوگ یزید کو امیر المومنین اور خلیفۃ المسلمین سمجھ کر اپنا امام نہ صرف دنیاوی بلکہ دینی پیشوا جانتے تھے۔ اس کے ملحدانہ افعال اور فاجرانہ اقوال سے متاثر ہو کر الناس علیٰ دین ملوکھم کے پورے مصداق بن جاتے اور رفتہ رفتہ مذہبی احساس میں اس قدر جمود پیدا ہو جاتا کہ وہ (آج کل کے

عیسائیوں کی طرح اصل نام کے مسلمان رہ جاتے اور شاید نام کے بھی نہ رہتے۔

یہی وہ مہتم بالشان نتیجہ ہے جو کسی لڑائی نے اپنے بعد دنیا میں نہیں چھوڑا۔ اور جس کی نظیر تاریخ میں نہیں ملتی۔ بنی امیہ اسلام کو مٹانے کے عوض خود مٹ گئے آج ان کا کوئی نام لینے والا بھی نظر نہیں آتا۔ اور حسینؓ کو ہم کیا غیر مذہب والے جو اُن کے نانا کی رسالت کو بھی نہیں مانتے تعظیم و تکریم سے یاد کرتے ہیں۔ مسیو ماربین نے شہادت حسینی کے نتائج پر بحث کرتے ہوئے جو رائے ظاہر کی ہے وہ بھی قابلِ غور ہے وہ لکھتا ہے ۔

حسینؑ کے قتل ہوتے ہی اور ان دردانگیز واقعات کے پیش آتے ہی اور ان کی عورتوں اور بیبیوں کے اسیر ہوتے ہی بنی امیہ کے باطن کا حال طشت از بام ہو گیا۔ اور ان کے اعمال ناشائستہ کے نتائج عالم پر روشن ہو گئے۔ سیاسی احساس اور مخالفت اور ریوولیوشن (کا مادہ مسلمانوں میں پیدا ہو گیا چنانچہ چند ہی روز کے بعد سلطنت یزیدی کے خلاف شورشیں شروع ہو گئیں۔ بنی امیہ کو مخرب اسلام سمجھ کر لوگ ان کی بدعتوں اور اختراعی اُمور کا رد کرنے لگے۔ انہیں ظالم و غاصب اور ان کے برعکس بنی ہاشم کو مظلوم اور مستحقِ ریاست جاننے لگے۔ بلکہ حقیقی روحانیتِ اسلام ان ہی میں سمجھی گئی۔ گویا مسلمانوں نے حیات تازہ اور نئی زندگی حاصل کی۔ اور اسلام کی روحانیت کیلئے ایک نئی شان پیدا ہو گئی۔ اسلام کی ریاستِ روحانی جو دفعتاً زائل ہو گئی تھی اور مسلمان جو اسلام کے جذبۂ روحانیت کو فراموش کر بیٹھے تھے۔ اس خاص نورانیت اور شان کے ساتھ اس کی تجدید ہوئی جس طرح حسینؑ کے مصائب کی عظمت تمام روحانیینِ سلف کے مصائب پر افضل و مسلم ہے، اسی طرح اس ہیجانِ مخالفت کی عظمت جو حسینؑ کے بعد پیش آئی۔ تمام پہلے (ریوولیوشن) سے بڑھ گئی بلکہ اس کا زمانہ بھی زیادہ اور اثرات بھی ان سے زیادہ تھے۔

ان وجوہ سے آلِ محمد کی مظلومیت کا اعلان تمام عالم میں ہوگیا۔

پہلا نتیجہ اس ہیجانِ مخالفت (رِوولیوشن) کا یہ ہوا کہ ریاستِ روحانی جو عوالم سیاست میں بڑی عظیم بالشان چیز ہے، از سرِ نو بنی ہاشم خصوصاً اعقابِ حسینی میں مسلم ہوگئی (مورخ موصوف کی غرض ائمہ اہل بیت سے ہے) اب تک بھی بنی ہاشم بالخصوص وہ لوگ جو حسین کی نسل سے ہیں ایک خاص نظر روحانیت سے تمام مسلمانوں میں دیکھے جاتے ہیں اور چند سال بھی نہ گزرے تھے کہ باوجود اس اقتدار اور وسعت کے خاندانِ یزید سے سلطنت نکل گئی اور ایک صدی تک میں تمام بنی امیہ پر زوال آگیا، اور اس طرح نیست و نابود ہوئے کہ آج اُن کا نام ونشان بھی موجود نہیں اور جب کبھی کتابوں میں ان کا نام آجاتا ہے تو مسلمان ایک کلمۂ شماتت اس کے ساتھ منضم کردیتے ہیں یہ سب حسینی سیاست وتدبر کے نتائج ہیں، کہا جاسکتا ہے کہ اربابِ دیانات وذو جانشین میں سلف سے آج تک ایسا انجام بین عاقبت اندیش مستقل مزاجی سرگزشت کے ساتھ تاریخ نے یادگار نہیں چھوڑا۔"

امر ہفتم (آیا یہ جنگ مذہبی تھی یا سیاسی) اس سوال کے جواب کی تحریر سے پہلے ہم یہ دکھانا چاہتے ہیں کہ مذہب کیا چیز ہے، لفظ مذہب کے لغوی معنی راہ۔ روش۔ طریقہ وغیرہ ہیں مگر اصطلاح میں بعض انسان کی ایک خاص روش یا طرزِ خیال کو مذہب کہتے ہیں۔ ایک فلسفی نے مذہب کی تعریف ان جامع وواضح مگر مختصر الفاظ میں کی ہے، کہ "وہ ایک خاص تعلق ہے جو عبد و معبود کے درمیان قائم ہے"، بالفاظ دیگر کسی قدر زیادہ وضاحت سے "مذہب اُن خاص خیالات کا نام ہے جو انسان کے دل میں ایک بالاتر ہستی کے ماتحت اپنی عام ذمہ داری اور ادائے فرض کی نسبت ہوتے ہیں اور ان خیالات کا اظہار عمل کی صورت میں ہوتا ہے" گویا مذہب ایک شاہراہ ہے جس پر انسان چلتا ہے بعض اوقات دین وایمان بھی

کے مرادف بولے جاتے ہیں۔ بہرحال لفظ مذہب سے ایک قادرِ مطلق کی ہستی کا تعین معلوم ہوتا ہے اور چونکہ جزائے اعمال کا خیال اسی تعین کیساتھ وابستہ ہے اس لئے حشر و نشر یا معاد کا عقیدہ بھی مفہومِ مذہب میں داخل ہے۔ اس اعتبار سے خدا کی ہستی اور جزا و سزا کا انکار لامذہبی ہے جس کو دہریت اور مادیت سے بھی تعبیر کرتے ہیں۔ مذہب ایک ایسا باوقعت اور ضروری سوال ہے جس پر ہر فردِ بشر کو غور و خوض کرنا لازم ہے۔ دنیا میں میری حیثیت کیا ہے دوسری مخلوقات سے میرے تعلقات کیا ہیں؟ میں کہاں سے آیا، اور کہاں جاؤں گا۔ میرے گرد و پیش کیا کیا چیزیں ہیں۔ میرا آغاز کیا تھا اور انجام کیا ہونے والا ہے، موت و حیات کا مفہوم کیا ہے۔ وغیرہ وغیرہ یہ ایسے سوالات ہیں جن کا جواب ہر شخص کو کچھ نہ کچھ دینا ہی پڑتا ہے۔ انسان کیسا ہی کاہل اور کیسا ہی خود غرض اور کتنا ہی خود بین کیوں نہ ہو، تاہم ان سوالات سے اس کو مفر نہیں۔ یہ سوالات اس کا پیچھا نہیں چھوڑتے، فرقہ لا اور یہ (جو ایک قادرِ مطلق کی ہستی میں شک کھاتا ہے) اور فرقہ دہریہ (جو اس کے وجود کا منکر ہے) اپنے اپنے مذاق کے موافق ان سوالات کے جواب کچھ نہ کچھ ضرور دیتے ہیں گو ان کے جواب کیسے ہی ناتمام اور کیسے ہی ناقابلِ اطمینان کیوں نہ ہوں۔

تجربہ شاہد ہے کہ کائنات سے بالاتر ایک اعلےٰ وجود کا تصور انسان کے دل سے محو نہیں ہو سکتا۔ ایک دہری بھی اس وجود کو ایک اعلےٰ قوت مبدأ اول، سببِ اول۔ یا علت العلل کے نام سے موسوم کرتا ہے اگرچہ وہ اس وجود میں ان صفات کاملہ کو جو اہلِ مذہب ذاتِ خداوندی میں ثابت کرتے ہیں تسلیم نہیں کرتا۔ تاہم اس کا اتنا ہی اقرار کہ عالمِ محسوسات سے بالاتر ایک اعلےٰ قوت موجود ہے۔ خدا کی ہستی پر ایک طرح کی وجدانی یا اندرونی شہادت ہے جس سے صاف ظاہر ہے کہ مذہب کا سکہ منکروں کے دلوں پر بھی بیٹھا ہوا ہے۔ اور اُن کا نفس بھی اس کے اثر سے خالی نہیں گو وہ بظاہر اس کے منکر ہیں۔

ہندو نے صنم میں جلوہ پایا تیرا ؎ آتش پہ مغاں نے راگ گایا تیرا
دہری نے کیا دہر سے تعبیر تجھے ؎ انکار کسی سے بن نہ آیا تیرا

ممکن ہے کہ انسان کسی خاص مذہب کو ترک کر دے اور اپنے پہلے اعتقاد کو باطل یا وہم پرستی قرار دے کر اس سے متنفر ہو جائے، جیسا کہ بعض اوقات دیکھنے میں آتا ہے مگر یہ ہرگز نہیں ہو سکتا کہ وہ بالکل خالی الذہن ہو جائے اور اس کے دل میں قطعاً کوئی اعتقاد نہ رہے۔ اگر ایک ظرف پانی سے بھرا ہوا ہو اور اس کا پانی گرا دیا جائے، تو ہوا پانی کی جگہ فوراً داخل ہو جائے گی۔ ظرف کا بالکل خالی رہ جانا محال ہے انسان کا ذہن بھی بمنزلہ ایک ظرف کے ہے۔ اِدھر ایک خیال یا اعتقاد تھا میں سے نکلا، اُدھر دوسرا داخل ہوا۔ بہرحال ایک اعلیٰ وجود کا تصور کسی نہ کسی حیثیت سے دل میں ضرور قائم رہتا ہے۔

خدا کے وجود کو تسلیم کرنے کے ساتھ ہی جزائے اعمال کا خیال انسان کے دل میں پیدا ہوتا ہے یعنی اس بات کا یقین ہو جاتا ہے کہ میں اپنے افعال کا ذمہ دار ہوں۔ دنیا چند روزہ ہے ایک دن اس پاک ہستی کے سامنے جس کی طرف بازگشت ہے۔ مجھے اپنے افعال کی جوابدہی کے لئے ضرور حاضر ہونا پڑیگا۔ جیسا بیج اس دنیا میں بویا ہے، ویسا ہی پھل دوسری دنیا میں ملنے والا ہے۔ یہ خیال بھی وجودِ خدا کے خیال کی طرح ایک حد تک انسانی فطرت میں داخل ہے۔ کوئی شخص اس خیال کو اپنے دل سے محو نہیں کر سکتا وہ کتنے ہی کوشش کرے مگر ممکن نہیں یہ خیال اس کے دل سے نکل جائے۔ ایک دہری یا لاادری بھی اس خیال کی جھلک اندر رکھتا ہے یہی وجہ ہے کہ جب کوئی شخص (پابند مذہب ہو۔ یا لامذہب۔ مذبذب ہو، یا مشکک۔ دہری ہو یا لاادری) کوئی نیکی کرتا ہے مثلاً بھوکے کو کھانا کھلانا۔ ننگے کو کپڑا پہنانا۔ بیمار کی تیمارداری۔ یا مظلوم کی حمایت تو اس کے دل کو کم و بیش خوشی ضرور ہوتی ہے۔ مگر جب وہ کسی بدی کا ارادہ کرتا ہے، مثلاً چوری دغابازی مردم آزاری قتل و غارت وغیرہ تو اس کا (کانشنس) وجدان ضمیر یا نفس لوامہ اس کو ضرور ملامت کرتا ہے یہ اور بات ہے کہ وہ اس کی ہدایت پر عمل نہ کرے اور اس فعل کا مرتکب ہو جاتی مگر اس کا ضمیر بُری باتوں سے روکتا ضرور ہے! البتہ انسان کی متواتر مخالفت کی وجہ سے، یہ اندرونی آواز دھیمی پڑ جاتی ہے اور اس کا زور کم ہو جاتا ہے۔ آخر یہ حالت کیوں ہے جہاں تک غور کیا جاتا ہے۔ اِس کا

بڑا سبب یہی معلوم ہوتا ہے کہ یہ خیال انسان کی فطرت میں ضرور ہے کہ میں کسی صاحب قدرت کے سامنے اپنے برے بھلے افعال کا ذمہ دار اور جوابدہ ہوں وہ اپنی زبان سے اس بات کا اوا ر نہ کرے مگر اس کی فطرت اور طرز عمل سے ایک حد تک اس کی تصدیق ہوتی ہے

اس کے علاوہ اگر قانون اخلاق کے اصول پر غور کیا جائے، تو اُن سے مذہب کی ضرورت ثابت ہوتی ہے، ہر شخص بالطبع اس بات کا طالب ہے، کہ اس کی زندگی دنیا میں امن وامان سے بسر ہو، اس مقصد کے حاصل کرنے کے لئے وہ یا تو حالت تجرد کو پسند کریگا یا حالت تعلق کو حالت تجرد سے یہ مراد ہے کہ دنیا اور مافیہا سے قطع تعلق کر کے جنگلوں یا پہاڑوں پر جا بسے جہاں نہ خورد نوش کا فکر ہو۔ نہ بال بچوں کا غم۔ بھوک لگی تو جنگل کی گھاس پتی کھالی۔ پیاس لگی تو بہتے چشموں سے بجھالی۔ سب سے آزاد اور سب سے الگ تھلگ یہ حالت گو بظاہر کیسی ہی اچھی معلوم ہو مگر منشائے فطرت کے خلاف ہے اول تو ہر شخص ایسا کر نہیں سکتا، دوسرے یہ طرز عمل دنیا کی ترقی میں ایک زبردست سد راہ ہی نہیں بلکہ اس کی تعمیل سے نظام عالم ہی درہم و برہم ہو جائیگا کسی نے خوب کہا ہے "جو دنیا سے کنارہ کش ہو کر گوشۂ تنہائی میں جا بیٹھتا ہے۔ وہ یا تو فرشتہ ہے۔ یا حیوان" بہر حال یہ حالت انسان کے مناسب حال نہیں اب ہی حالت تعلق، یہ البتہ انسان کی ضرورت اور اس کی فطرت سے مناسبت رکھتی ہے کیونکہ وہ فطرتاً مدنی الطبع بنایا گیا ہے۔ باہمی امداد کے بغیر اس کا کام چل ہی نہیں سکتا ۔ اس لئے اس کو تعلقات کے بغیر چارہ نہیں لیکن ان تعلقات کے فرائض اور ذمہ داریوں کے پورا کرنے کے لئے ایک قانون کی ضرورت ہے جس پر ہر شخص عمل کرے اور خود غرضی کی وجہ سے دوسروں کے حقوق میں دست اندازی نہ کرنے پائے۔ تاکہ ہر شخص کے جان ومال وآبرو محفوظ رکھ سکے اور امن قائم رہے، اس قانون کو قانون تمدن۔ یا قانون اخلاق کہتے ہیں۔ مذہب کی علت غائی اس قانون کو پیش کرنا اور اس کی تعمیل کرانا ہے، غرضیکہ مذہب اصل ہے اور تمام امور جو تمدن سے تعلق رکھتے ہیں اس کی فرع۔

المختصر انسان کو اپنی فطری ضرورتوں کی انجام دہی کے لئے مذہب کی طرف رجوع کرنے

اور اس پر عمل پیرا ہونے کی سخت ضرورت ہے، کیونکہ دنیا کے انتظام کی کُل زیادہ تر مذہب کے ہی ذریعہ سے چلتی ہے۔ لہذا مذہب کے بغیر انسان کا کام چل ہی نہیں سکتا۔ جن اخلاقی مسائل، قوانینِ شریعت اور اصولِ تمدن پر مذہب زور دیتا ہے ان کو دہریہ اور لامذہب بھی عموماً تسلیم کرتے ہیں، ان لوگوں کو بھی طوعاً و کرہاً ان اصول و قوانین کی تعمیل کے بغیر چارہ نہیں۔ مثلاً ماں باپ کی اطاعت، استاد کا ادب، محسن کا شکریہ، دوسروں کی معافی، تصور سلوک، [illegible] چوری نہ کرنا، جھوٹ نہ بولنا، غیبت سے بچنا، خونِ ناحق سے پرہیز۔ وغیرہ وغیرہ تو [illegible] ان کو لامذہب بھی نظامِ تمدن کے قیام و استحکام کے لئے ایسا ہی ضروری سمجھتے ہیں جیسا اہلِ مذہب۔ لہذا مذہب کی ضرورت اور لامذہبی پر اس کی فوقیت کی یہ ایک قوی دلیل ہے۔ قانونِ اخلاق کی ضرورت تو خدا پرست اور منکرِ خدا دونوں کے نزدیک مسلّم ہے مگر فرق اتنا ہے کہ خدا پرست اس کو [illegible] یعنے قانون کے ساتھ مقنن کے وجود [illegible] وغیرہ صفات کا [illegible] کو بھی تسلیم کرتا ہے لیکن لامذہب صرف قانون کو مانتا ہے اور مقنن کے وجود کا منکر ہے اس لئے خدا پرست کا عقیدہ مستحکم اور پائدار ہے اور دہری کا عقیدہ کمزور اور ناپائدار۔ بنابریں کہا جاسکتا ہے کہ لامذہبوں کا عقیدہ ایسا ہے جیسا تارِ عنکبوت۔ اگر نیکی کو عمارت کہا جائے تو مذہب کو اس کی بنیاد کہنا صحیح ہوگا، یہ ظاہر ہے کہ اگر کسی عمارت کی بنیاد مضبوط چٹان پر رکھنے کے بجائے ریتلی زمین پر رکھی جائے تو وہ قائم نہیں رہ سکتی۔ جلد بیٹھ جائیگی۔ اسی طرح اگر اخلاق قانون یعنی نیکی کی بنیاد مذہب کے بجائے کسی اور شے پر رکھی جائیگی تو اس کے استحکام کی بھی کوئی توقع نہیں ہوسکتی

بہرحال ایسا عالمگیر قانون جو فطرت و عقل کے مطابق اور عدل و انصاف پر مبنی ہو اس کا مقنن وہی ہوسکتا ہے جو اس عالم کا علۃ العلل اور مسبب الاسباب ہو، اور اس قانون کے معانی و مفہوم کے مفسر کا تعین بھی اسی کی ذات سے متعلق ہے۔ اسی مفسر کو ہم لفظ نبی یا رسولؐ سے تعبیر کرسکتے ہیں۔ موجوداتِ عالم سے جمادات میں صرف روحِ جمادی موجود ہے۔ نباتات میں روحِ جمادی و نباتی ہے، حیوانات میں روحِ جمادی۔ نباتی۔ اور حیوانی پائی جاتی ہے، انسان میں

روحیں جمادی۔ نباتی۔ حیوانی اور انسانی موجود ہیں، رسول پانچ ہیں، ان چار کے علاوہ پانچویں روح اور ہوتی ہے جس کو روح اللہ کہا جا سکتا ہے، یہ روح دوسرے انسانوں میں نہیں ہوتی۔ اس لئے نبی ایک ایسی مخلوق ہے جو انسان بھی ہے اور انسان سے بالاتر بھی۔ یہ روح یعنی قوتِ نبوت کسی ریاضت، عبادت، یا تحصیل علم سے حاصل نہیں ہو سکتی جس طرح جمادات میں سے کوئی خود ترقی کر کے نباتات میں شامل یا کوئی حیوان خود ترقی کر کے انسانوں کے زمرہ میں شامل نہیں ہو سکتا اسی طرح عام انسان خود ترقی کر کے یا دوسری مخلوقات کی مدد سے نبی نہیں بن سکتا۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ کسی وقت نہیں جب سے دنیا میں نسل آدم کا ظہور ہوا۔ دنیا دفعہ کی طرف قولی و فعلی دعوت کا سلسلہ منقطع نہیں ہوا۔ یہ بات اور ہے کہ کوئی اس سے خود مستفید نہیں ہوا۔ جس طرح نبی ایک خاص مخلوق ہوتا ہے اسی طرح اس کا نائب بھی خاص مخلوق ہونا چاہیے۔

نبی فطرتاً نبی ہوتا ہے، وصی و امام بھی فطرتاً امام ہوتا ہے جس طرح عام انسان ترقی کر کے نبی نہیں بن سکتے، اسی طرح وہ ترقی کر کے امامت کا منصب بھی حاصل نہیں کر سکتے۔ نبی اور اس کا قائم مقام دونوں مذہب اور قانونِ الٰہی کے محافظ اور اس کے تبلیغ و اشاعت کرنے والے ہوتے ہیں یہ بھی یاد رکھنا چاہیے کہ ہر نبی اپنے پیشرو نبی کی تصدیق کرتا ہے اور آنے والے کی بشارت دیتا رہا ہے یہ سلسلہ جنابِ ختمی مآب تک جاری رہا۔ آنحضرتؐ نے حضرت عیسےٰ کی تصدیق کی۔ اور آئندہ کے لئے لَا نَبِیَّ بَعْدِی فرمایا۔ اس لئے آنحضرت پر اور بھی زیادہ لازم ہوا کہ اپنے بعد قولی و فعلی دعوت کو جاری رکھنے کا انتظام فرما دیں۔ چنانچہ حضرت نے اپنی رحلت کے قریب فرمایا کہ میں تم میں دو بھاری چیزیں چھوڑے جاتا ہوں۔ ایک کتاب خدا دوسرے میرے اہل بیت اگر تم ان دونوں سے متمسک رہو گے تو کبھی گمراہ نہ ہو گے اس حکم سے صاف ظاہر ہے کہ قرآنِ مجید قولی دعوت ہے اور عترت رسول فعلی دعوت ہے۔

یہ بھی سمجھ لینا چاہیے کہ تدین اور تمدن دونوں لازم و ملزوم ہیں۔ ان میں سے ہر ایک

دوسرے کے لئے ضروری ہے بنی جو منجانب خدا صاحب امر ہوتا ہے۔ تدین اور تمدن دونوں میں ہوتا ہے یہ نہیں کہ دینی امور میں ہم اس کی اطاعت کریں۔ ورد نیا وی میں نافرمانی نبی کو روحانیات اور سیاسیات دونوں پر اقتدار کامل حاصل ہے۔ وجہ یہ کہ جہانداری و سیاست ہی عام احکام کو عمل میں لانے کا بہترین میدان ہے، گو مذہب سیاست کے بغیر بھی محدود اور مخدوش حالت میں قائم رہ سکتا ہے مگر ممکن الوقوع وسعت اور عالمگیر مفاد بغیر سیاسی اقتدار کے قائم نہیں رہ سکتا بحالتِ سیاست ہی یہ انسانی زندگیوں پر اثر ڈال سکتا۔ اور ان کے حقوق کی حفاظت اور فرائض کا تعین کر سکتا ہے اس کے زیر سایہ حدود اللہ کی حمایت و صیانت ہو سکتی۔ اور ان کے توڑنے والوں کو سزا مل سکتی ہے اگر تدین کے ذریعہ سے دین کی تبلیغ ہوتی ہے۔ تو سیاست کے وسیلہ سے دین کی حفاظت اگر سیاست دشمن کے ہاتھ میں ہے تو ہمارا دین بالعموم خطرہ میں ہے،

یہی وجہ تھی کہ جناب ختمی مآب کو تدین و تمدن تبلیغ دین۔ سیاست عامہ دونوں پر اقتدار کلی حاصل تھا۔ البتہ دنیاوی صیغوں میں ان کی حکومت عام دنیاوی بادشاہوں کی طرح نہ تھی۔ بلکہ آپ حقیقی معنوں میں خلافتِ الہٰیہ کے وارث تھے۔ اگر عترتِ رسول کو بھی اسلامی سیاسیات پر ویسا ہی اقتدار حاصل رہتا تو کس قدر بہتر ہوتا۔ مگر ایسا نہ ہوا۔ اور اس کے نتائج اسلام کے واسطے جس طرح مہلک اور ضرر رساں ثابت ہوئے وہ محتاج تشریح نہیں ہیں۔ اب عترت رسول کے لئے دو راہیں تھیں۔ یا تو خلافتِ رسول اللہ کے واسطے تلوار اٹھائیں اور حمایت و صیانتِ اسلام کے لئے سیاست اختیار کریں۔ یا اپنے منصب سے دست بردار ہو کر۔ خاموشی کے ساتھ تبلیغِ دین میں مصروف رہیں۔ مگر ان مقدس بزرگواروں نے دوسری شق کو اختیار فرمایا اور اپنے مخالف کی تمام سختیوں کو بڑے صبر و تحمل سے برداشت کیا۔ یزید کا تخت نشین ہو کر اسلامی سیاسیات پر اقتدار کامل نہ دین کے لئے ہی مہلک ضرب تھی حسین علیہ السلام جو بانی اسلام کے نواسے وارث حقیقی اور جانشین اصلی تھے ان کے واسطے یہ سب اہم مشکل کا وقت

خدا۔ اور وہ سوچ رہے تھے کہ کون سی ایسی صورت اختیار کی جائے کہ اسلام مٹنے سے محفوظ رہے۔ اگر مخالفِ اسلام اور فاسق و فاجر کی بیعت و اطاعت اختیار کی جاتی ہے تو مذہب اسلام اپنے اصلی رق ۔ ۔ ۔ سب بہتری کرتا ہے اور اگر بیعت نہیں کرتے تو ایک زبردست دشمن سے معرکہ آرا ہونا پڑتا ہے اس لئے اب آپ کے سامنے دو ہی راہیں تھیں یا تو بیعت یزید کر کے اسکے تمام حرکات کو جو رسمِ خلافت کے خلاف تھیں جائز تسلیم کر لیں یا ان کے مقابلے کے لئے بنی ہاشم اور دوسرے خاندانِ عرب کو جمع کر کے ایک لشکر تیار کریں یا اپنی جان اسلام پر قربان کر دیں اور حمایتِ دین کے واسطے آخری اتمامِ شان قربانی دیں۔ پہلی راہ اسلام کے لئے سم قاتل تھی دوسری شق اختیار کرنے سے بھی دلی و مادی مصلحت پوری نہ ہوتی، لوگ اس کو سلطنت کی جنگ سمجھ لیتے۔ اس لئے آپ کو اس آخری فیصلہ کے سوا کوئی چارہ نہ تھا کہ اب وہ وقت آ گیا ہے کہ اپنی جان اپنی اولاد اپنے مال کو اسلام پر قربان کر دیں اس لئے ایک ہم ہی کیا کسی کو بھی اس کہنے میں تامل نہ ہو گا کہ حسینؑ دینِ اسلام کے نام لیوا اور بنی امیہ دین اس کو بالکل نیست و نابود کر دینا چاہتے تھے جس کا آخری نتیجہ اس لڑائی کی صورت میں نکلا۔ اس واسطے یہ کوئی ملکی لڑائی نہ تھی۔ بلکہ مذہبی جنگ تھی۔ مگر جہادِ مدافعت نہ جہادِ تبلیغ

امر ہشتم۔ (اس جنگ کی ذمہ داری کس فریق کے ذمہ عائد ہوتی ہے اور امام علیہ السلام کی روش نزاعی تھی یا دفاعی؟

جہاں تک تمام واقعات پر نظر غائر سے تبصرہ کیا جاتا ہے ہر ایک واقعہ خود پکار رہا ہے کہ اس جنگ کی ذمہ داری کا بوجھ بادشاہِ وقت یزید کے ذمہ ہے، اور فرزند رسول اللہ کی روش ہرگز نزاعی نہ تھی، اسکے وجوہ اور دلائل حسب ذیل ہیں۔

حضرت امام حسینؑ اور یزید کے معاملات مکہ سے شروع نہیں ہوتے، بلکہ مدینہ سے مکہ سے حضرت مسلم کو روانۂ کوفہ ہوتے دیکھ کر بعض خیال اس نتیجہ پر پہنچتے ہیں کہ حضرت نے طلبِ خلافت کے لئے نزاعی روش پر پیش قدمی کی اور یہی غلطی کی ابتدا ہے جس میں سلسلۂ واقعات کی طرف

سے بے خیالی ایک غلط استنباط کی محرک ہوئی ہے، حالانکہ اگر واقعات کی ابتدا بجائے مدینہ کے مکہ ہی سے ہوئی ہوتی تاہم یہ بات قابل غور تھی کہ جن صورتوں میں حضرت مسلم کو روانہ کیا ان کی نسبت یہ کہنا کہ آپنے لڑائی کی روش اختیار کی، کیا درحقیقت ایک فاش اور شرمناک غلط فہمی نہیں ہے۔ کیا حسینؓ تھے جنہوں نے مدینہ میں رہنے پر قناعت نہ فرمائی یا انہوں نے مدینہ میں بیٹھ کر سامان حرب کی فراہمی شروع کی نہیں بلکہ وہ یزید تھا جس نے اپنے عامل کو یہ حکم بھیجا کہ حسینؓ کو یا زندہ گرفتار کرے یا ان کا سر میرے پاس بھیج دے، اگر وہ میری بیعت سے انکار کریں۔ یہ حسینؓ نہ تھے جنہوں نے فرمایا کہ عنقریب ہم میں اور ہمارے دشمنوں میں جنگ ہوا چاہتی ہے اور ایسے خیالات کے اظہار سے وہ اپنے مددگاروں اور دوستوں کو آئندہ جنگ و جدل کے لئے تیار کر رہے ہوں بلکہ وہ یزید تھا جس نے یہ خیالات اپنی فوج اور افسروں کے سامنے ظاہر کئے اور ان سے مستعدی کا عہد لیا، اگر حسینؓ قیام مدینہ سے قیام مکہ تک یہ ارادہ اور عزم فرماتے کہ ہم کوفہ جائیں اور اہل کوفہ سے مدد لیکر یزید کی سلطنت کو اولٹ دیں تو آپ کے لئے نسبتاً یہ آسان تھا کہ مدینہ سے ہی براہ راست کوفہ کو روانہ ہو جاتے نہ یہ کہ مکہ جا کر اس کا انتظار کرتے کہ کہیں مدینہ سے کوئی متعاقب فوج یا خود عامل مکہ کی حکومت یزید کے حکم سے گرفتار کرے کہیں اس کا تذکرہ نہیں ہے کہ امیر معاویہ کی موت سے اس وقت تک کہ ولید کا بیعت کے لئے صفر پر اصرار ہوا یا مدینہ سے مکہ تک اثنائے سفر میں یا مکہ کے دوران قیام میں۔ حضرت نے کبھی ظاہر نہ فرمایا کہ آپ مکہ معظمہ کو فوجی مرکز قرار دینا چاہتے ہیں حالانکہ اگر آپ کی یہ غرض ہوتی کہ اپنے وطن میں اپنے مددگاروں کو جمع کریں، یا مکہ میں ایسی روش اختیار کی جائے۔ تو ان دونوں مقامات میں بہ نسبت کوفہ کے تھوڑی ہی سہی مگر مدد کی قوی امید ہوتی جن میں سے اگر ایک وہ مقام تھا۔ جس کی عالمگیر شہرت آپ کے جد بزرگوار کی ذات اقدس سے پیدا ہوئی تھی تو دوسری جگہ تمام بلاد اسلامیہ سے آپکے نانا کے کلمہ گو پہلے جمع ہو رہے تھے کہ ارکان حج بجا لائیں۔ حضرت نے نہ صرف اس وقت جب تک کہ آپ ۴ شعبان کو مدینہ سے جلاوطن ہوئے۔ کوئی کوشش ایسی نہیں کی جس سے

آپ پر خونریزی کا حرف رکھا جا سکے۔ بلکہ مکہ معظمہ میں بھی آپ نے جب فرمایا۔ یہی فرمایا کہ
میں مکہ میں رہوں گا جب تک نکال نہ دیا جاؤں گا۔ یا جب عبد اللہ ابن زبیر نے مدد کا وعدہ
کیا تو آپ نے یہی جواب دیا کہ مکہ میں خونریزی جائز نہیں ہے یا یہ فرمایا کہ میں وہ مینڈھا
نہیں بننا چاہتا جس سے حرمت خانہ کعبہ ضائع ہو اب ہم ہر صاحب عقل اور صاحب انصاف
سے عقل و انصاف کا واسطہ دیکر پوچھتے ہیں کہ کوئی شخص جو کسی مقام کے متعلق ایسے خیالات
رکھتا ہو کیا وہ اسی جگہ کو اسلئے پسند کریگا کہ اُسے فوجی مرکز قرار دے اور اگر ایسا ہی تھا کہ:-
حضرت نے اُسے فوجی مرکز قرار دینے کا ارادہ کیا تھا تو ہمیں اس کے متعلق کوئی واقعہ یا قرینہ
بتایا جائے ہم اس کے ثبوت میں ایک لفظ کو بھی قبول کرلینے پر آمادہ ہیں اگر تمام اسلامی تاریخوں
سے ہمارے سامنے پیش کیا جائے کہ حضرت نے مسلمانوں کے مجمع کو جو حج کے لئے جمع ہو رہا تھا
کسی ایک فقرہ یا ایک لفظ سے یزید کے خلاف برانگیختہ کیا یا اپنی مدد کے لئے کوئی اپیل کی۔ کیا
کوئی شخص جس کو قدرت نے عقل سلیم عطا کی ہو، یہ باور کرنے پر آمادہ ہو سکتا ہے کہ جس نے
خلافت و سلطنت کی تمنا کی ہو، وہ ایسے نادر موقعہ کو جس سے بڑھ کر ہاتھ آنا ممکن نہیں
اس طرح ضائع کردے۔

خیر مجمع حجاج کو جانے دو جہاں پیغمبر اسلام ﷺ کے نواسہ کا مسلمانوں سے اپنے مدد کے لئے استغاثہ
بہت کچھ اثر دکھا سکتا تھا۔ اور وہ سوچ سکتے تھے کہ ہم ایک رسمی عبادت کو پورا کرکے کیا کرینگے
جب ہم سے وہ فریاد کر رہا ہے جو کعبۃ اللہ کو بتوں سے پاک کرنے والے کا گوشت و خون اور
روح ہے اپنے دشمن گھیرے ہوئے ہیں اس کی مدد اہم ترین فرض ہے۔ سب نہ سہی تھوڑے
ہی متاثر ہوتے اور حسینؑ اسی کو غنیمت سمجھتے کہ کچھ نہیں ہے سے تو کچھ ہے بہتر ہے۔ ہم اس خیال
سے باز آتے ہیں اور اتنا پوچھنے کا حق رکھتے ہیں کہ مورخین اسکے تو قائل ہیں کہ حضرت کے مکہ
پہنچتے ہی لوگوں کا ہجوم ہونے لگا۔ اور عمائد و اکابر حجاز شرف قدمبوسی حاصل کرنے کے لئے
حاضر ہونے لگے مگر کیا کوئی لفظ کوئی فقرہ کوئی خطبہ ایسا پیش کیا جا سکتا ہے جس سے حضرت

نے اس تمسخ کو مطلب کیا ہوا ور اس سے مدد چاہی ہو۔ اس سے یہ امر صاف ہو گیا کہ حضرت کے قیام مدینہ یا قیام مکہ کے زمانہ میں آپ کی طرف سے کوئی تحریک مخالفت طلبی کے متعلق نہیں ہوئی البتہ زمانہ قیام مکہ میں کوفہ والوں کی جانب سے تحریک ہوئی جسے حضرت روک نہ سکتے تھے مگر اس کو اپنے منظور نہ کیا، قاصدوں کو کوئی جواب نہ دیا، خطوط کا ٹھیک ٹھیک یا صاف انکار کر دیا مدینہ میں حضرت کے طرز عمل سے جو کچھ واضح ہے، وہ یہ ہے کہ اگر آپ بلا بیعت چھوڑ دیے جاتے تو بہ حیثیت ایک نیوٹرل کے حکومت گزیں رہتے اور ہرگز ترک وطن اختیار نہ کرتے۔ آپ کو نہ یزید کی حکومت سے موافقت ہوئی، نہ مخالفت اور یہ روش ویسی ہی رہتی جیسے ترک اختیار کرنے کے بعد حضرت امام حسنؑ کی تھی مگر چھیڑ چھاڑ کی ابتدا یزید کی طرف سے ہوئی۔ اور باوجودیکہ حضرتؑ نے جلاوطنی کو منظور فرمایا، تاہم اپنے ہم وطن دوستوں سے اپنی تائید کے متعلق کسی استمداد کی کوشش، روانگی کے آخر وقت تک نہ کی جن لوگوں نے ساتھ دیا۔ اپنی خوشی سے دیا۔

خطرہ کے وقت اپنی جان بچانے کی کوشش انسان ہو یا حیوان۔ ہر ذی روح کی فطرت میں داخل ہے۔ حضرتؑ نے بھی یہی کیا۔ مگر کسی ایسے مقام پر جو آل سفیان کی حکومت سے باہر ہو، پہنچ جانا ممکن نہ تھا اس لئے آپ نے یہ تصفیہ کیا کہ مکہ پہنچ کر پناہ لیں جہاں یہ امید ہو سکتی تھی کہ یزید جو اسلامی دنیا پر حکومت کر رہا ہے۔ شاید اس لحاظ سے کہ مکہ میں خون ریزی جائز نہیں خانہ کعبہ کی حرمت کو میرے قتل سے ضائع نہ کرے۔

مدینہ آپ کا وطن تھا یہاں بمقابلہ مکہ کے زیادہ اثر ہونا چاہیئے تھا۔ مگر آپ کو مدینہ والوں سے کیا امید ہو سکتی تھی جنہوں نے نہ کبھی آپ کے والد بزرگوار کا ساتھ دیا، برادر عالی مقدار کا۔ قیام مکہ کے متعلق بھی پورے اطمینان کی کوئی وجہ نہ تھی۔ کیونکہ وہ ایسا مقام نہ تھا جو یزید کے رقبۂ حکومت سے جدا ہو جس طرح اس نے عامل مدینہ کے نام حکم بھیجا تھا کہ حسینؑ کو میری بیعت پر مجبور کرو ویسا ہی حکم عامل مکہ کے نام بھی آ سکتا تھا۔ اس لئے آپ کا فیصلہ یہ تھا کہ جب

اس وقت تک یہیں قیام کروں گا جب تک یہاں سے ہٹا دیا جاؤں۔

اگر یہ تسلیم بھی کر لیا جائے کہ عمر بن سعید الاشدق نے جو ولید بن عقبہ کی جگہ عامل مدینہ مقرر کیا تھا۔ مدینہ سے حضرت کو امان نامہ لکھ کر واپسی مدینہ کی رائے دی تو اس کا امان نامہ جب یزید قابل اعتماد نہ تھا کہ کسی عامل کے کسی انفرادی فعل کی مرکزی حکومت ہمیشہ ذمہ دار نہیں ہوا کرتی۔ ہو سکتا ہے کہ کسی عامل کے فعل سے مرکزی حکومت کا حکم مختلف و متضاد ہو۔ یزید اپنے عامل سابق، ولید کو حسین کی گرفتاری یا قتل کا حکم دے چکا تھا اور اس کے تساہل کی وجہ سے اسے معزول کر دیا تھا ایسی صورت میں عمر بن سعید کا امان نامہ یزید کی لاعلمی پر مبنی تھا۔ تو اس کا یقین ہے کہ وہ یزید کا حکم معلوم ہو جانے پر بھی اس امان نامہ پر قائم رہتا۔ اور اگر قائم بھی رہتا تو اس کی کیا ذمہ داری تھی کہ یزید بھی اس کو قبول کر لیتا۔ اس کے علاوہ عمر بن سعید کے خط کو دیکھتے ہی حسینؑ کا بغیر ثبوت کے قبول کر لینا سیاسی بے احتیاطی ہوتی۔ کون جانتا؟؟ کہ وعدہ امان سے حسینؑ کو دھوکا دیا جا رہا ہے یا کیا۔

اگر بفرض محال حسین علیہ السلام نے یزید کی سلطنت کو الٹ دینے کا قصد کیا تو یہ کوشش کب ممکن تھی اور اپنی کامیابی کے لئے کون سے وسائل اختیار کئے تھے۔ یہ ظاہر ہے کہ ایسے خوف و تشدد کی حالت میں جس میں حضرت بسر کر رہے تھے کسی غیور اور با حمیت انسان کو سوائے تین صورتوں کے اور کوئی صورت ممکن نہ تھی۔ یا تو وہ خموشی سے خود کو دشمن کے حوالے کر دیتا۔ یا کسی تاریک گوشہ میں روپوش ہو کر ناقابل برداشت مصیبتیں گوارا کرتا۔ یا عزت کے ساتھ دشمن سے جنگ مدافعانہ کر کے مارا جاتا۔ حسینؑ کی غیرت و حمیت نے اس کو گوارا نہیں کیا کہ خود کو مسیح ابن مریم کی طرح گرفتار کرا کے دشمن کو اپنی اسیری پر مضحکہ کا موقعہ دیں۔ حسینؑ کے لئے اس وقت یہ بھی ممکن نہ تھا کہ بنی امیہ کے قلمرو سے کہیں باہر چلے جائیں۔ کیونکہ نقل و حرکت کی نگرانی کے لئے دشمن ساتھ ساتھ لگے ہوئے تھے۔ اور اس نگرانی کی سختی زیادہ روز بروز ہوتی جاتی تھی۔ اور نہ دشمن کے سامان منازعت کا مشاہدہ کرنے کے بعد حسین کی یہ غیرت عدیم المثال جرأت ہے

اس تصفیہ کی ابتدا بھی نہایت غیورانہ اور شجاعانہ تھی اُس کے بعد واقعات جس طرح خوفناک اور ہولناک صورت اختیار کرتے گئے ان قدم کے ڈگمگا دینے والی حالتوں میں حسینؓ کے اس ابتدائی نتیجہ تصفیہ میں استقلال و اصرار کا ترقی کرتا جانا ایک ایسی حیرت خیز بات تھی جو تاریخِ عالم میں حسینؓ کے لئے ہی مخصوص ہے

مکہ میں آپ کا قیام کئی مہینہ رہا اور نصفِ شعبان سے نصف ذی قعدہ تک کوئی لفظ کوئی انداز کوئی حرکت ایسی ظاہر نہ ہوئی جس سے یہ سمجھا جاتا کہ حسینؓ کسی نزاعی روش کا خیال رکھتے ہیں لیکن یہی زمانہ آپ کے لئے موقع کے احساس اور مدبرانہ تصفیہ کا تھا۔ حسینؓ جانتے تھے کہ یزید میرے متعلق اپنے حکم کو بھول نہیں گیا، وہ یہ بھی سمجھتے تھے کہ دشمن میرے اثر اور وقار سے بخوبی واقف ہے وہ یہ بھی جانتے تھے کہ مکہ کوئی فوجی چھاؤنی نہیں ہے بلکہ میرے لئے کسی سخت کارروائی کو بصرہ یا کوفہ سے فوج منگانے کی ضرورت ہوگی یا ہوسکتی ہے۔ یہی انتشار کا زمانہ تھا کہ یکایک اہل کوفہ کے مراسلوں نے ایک دوسری صورت کا رنگ جمایا۔ ایسے اضطراب کی حالت میں ذریعۂ تسکین کی طرف نگاہ اٹھنا، انسانی فطرت میں داخل ہے۔ لیکن حسینؓ میں حکومت و ریاست کی فریفتگی کا نہ ہونا ان کی ایسی صبر آزما حالتوں میں خموشی سے بخوبی ظاہر ہے بلکہ ایسے وقت میں جبکہ مدد کا وعدہ ہو رہا تھا، اور غالب قرائن تھے۔ کہ مدد مل سکتی ہے تب بھی آپ کا اسی طرح لاپروائی پر قائم رہنا، آپ کی قوتِ نفس کا ایک متین ثبوت ہے حالانکہ اگر محض طلبِ خلافت کے لئے حضرت اس وقت آمادگی بھی ظاہر فرماتے تو وہ سراسر حق بجانب تھی کیونکہ اس سے اس عہدنامہ کا نفاذ مقصود تھا۔ جو امام حسنؓ اور امیر معاویہ میں ہوا تھا۔ اور جس کی رُو سے حسینؓ کو معاویہ کے مرنے کے بعد خلیفہ ہونا چاہیئے تھا یہ معاویہ اور یزید کی بدعہدی تھی کہ انہوں نے حسینؓ کے حقوق کا لحاظ نہیں کیا۔ نہ حسینؓ پر یہ الزام قائم کیا گیا کہ انہوں نے اپنے حق کے طلب کرنے پر آمادگی ظاہر کی۔

باوجودیکہ ایسا کرنے میں حسینؓ حق بجانب تھے مگر حسینؓ سے یہ امید کرنا کہ وہ خلافت

طلبی کے لئے بزورِ شمشیر آمادہ ہونے کا ارادہ رکھتے تھے۔ تمام واقعات سے دیدہ و دانستہ چشم پوشی کرتا ہے ہادیٔ برحق کے فرزند نے جو خود بھی اپنے عہد کا ہادی تھا، اپنی روحانی ... ... لوازم کے انصرام امور کو اسوقت تک شریک نہیں کیا جب تک کہ لوگ متفقہ آواز سے اس امر پر مُصر نہوئی کہ وہ ان کے تمام دینی و دنیاوی امور کا ذمہ دار بنے۔ ناصلحین نے بھی باوجود ابوسفیان کے وعدۂ مدد کے۔ اپنی حق طلبی پر آمادگی ظاہر نہ کی تھی۔ ... سے بزورِ شمشیر حاصل کیا جائے جب تک کہ خود لوگوں نے ہم آہنگی سے خلافت کو لا کر آپ کے خود دامن پر نہ ڈال دیا۔

حضرت امام حسنؑ نے خلافت کو اس وقت ترک کیا جب انہوں نے لوگوں کو اپنی حفاظت میں تساہل کرتے پایا۔ حضرت امام حسینؑ باوجود اپنے حقوق اور اہل کوفہ کی استدعا اور باوجود حالتِ اضطرار کے ان تمام باتوں کو پائے اقدس کے نیچے مضبوطی سے دبائے رہے۔ اور اگر اس حالت میں آپکی خوشی میں حصول خلافت کا خیال پوشیدہ تھا بھی، تاہم یہ طرز عمل آپ کے اعلےٰ تدبر پر دلالت کرتا ہے جس سے وہ اپنی آمد کوشش میں اپنے اوپر کمال احتیاط سے کوئی حرف آنے نہیں دیتے تھے، وہم دوسری چیز ہے۔ واقعات پر غور و مطالعہ سے یہی سمجھ میں آتا ہے کہ اگر آپ اپنے نانا کے روضہ کی مجاوری سے دور ہٹائے جانے پر متاسف تھے۔ تو مکہ سے جلاوطنی بھی آپ کی ویسی ہی تاسف انگیز تھی۔

جب متواتر تجربہ سے یقین ہوتا جارہا تھا کہ آپ کو بیعت کی ذلت سے کسی طرح مفر نہ ہوگا۔ اور ضرور قتل کیا جاؤں گا تو دوسری طرف اہل کوفہ کی ہم آہنگی ایک ایسی صورت اختیار کر رہی تھی جس کو طالبان ہدایت کی متفقہ آواز کہنا چاہیئے اور یہ صدائے احتجاج گویا اس بات کا استغاثہ تھا۔ کہ ہمیں ظالم اور بے دینی سے بچایا جائے۔ ان کا یہ فقرہ سچائی کی بو سے خالی نہ تھا کہ اگر آپ نہ آئے تو قیامت کے دن خدائے قدوس کے حضور میں ہم آپ پر دعویٰ کریں گے کہ حسینؑ نے ظلم کیا اور ہم پر ظلم ہوتا ہوا دیکھ کر خموش بیٹھے رہے، اس استغاثہ کے بعد حسینؑ کا آمادہ ہونا۔

کسی اہل نظر کے خیال میں خود غرضی اور جاہ طلبی کے احساس سے نہیں ہو سکتا بلکہ مظلوم کی مدد، ہدایت اور ایثار سے۔

حسینؑ کے حقیقی منصب شجاعت اور ہمدردی کے لحاظ سے اس کے لئے کوئی عذر باقی نہ رہتا اگر آپ بھی آجتک اہل کوفہ کی اس عام صدائے اپیل کی سماعت نہ کرتے۔ یا اس استغاثہ کی طرف سے لاپروائی برتتے یا کوئی عذر کرکے ٹال دیتے۔ تو آپ کا یہ فعل جماعت انسانی کی نمونا حالت سے لاپروائی اور غیر شجاعانہ روش سمجھا جاتا اور پھر یہ گمان کرلینا کہ حسینؑ نے اپنے نانا کے کلمہ گویوں کی اس ضروری درخواست سے اس لئے اعراض کیا کہ اس میں خطرہ کا امکان تھا آپ حسینؑ کے لئے کیا جاتا۔ وہ تھا یہ کہ وہ مسیح ابن مریم کی طرح خود کو دشمن کے رحم اور انصاف کے حوالہ کردیتے اور اس کے منتظر رہتے کہ کانٹوں کا تاج پہنا کر مسخر کیا جائے یا اپنی عزت نفس اور وقار منصبی کی حفاظت کے لئے اپنے قول پر کمال ثابت قدمی سے قائم رہ کر اخلاقی اور روحانی شجاعت کے انتہائی جوہر دکھائیں۔

یہی اخلاقی و روحانی شجاعت ہے جس نے آپ کی شہادت کے بعد ہمدردی کا جوش پیدا کر دیا اور ایک ایسا شدید اور زبردست ہیجان ہوا جس نے بنی امیہ کی عظیم الشان سلطنت کو الٹ دیا۔ اگر حسینؑ اہل کوفہ کے استغاثہ پر توجہ نہ کرتے تو انہیں مکہ میں یا کہیں اور سفر میں بھی کب، اگر کہیں اور شہید ہوتے تو یہ کہا جاتا کہ اتنے مسلمانوں کی ایک جماعت کثیرہ کے استغاثہ پر جس کی ہدایت کی ذمہ داری کا بار عظیم آپ کے کندھوں پر تھا۔ توجہ نہ کی اور اپنے ضروری فرض کے پورا کرنے میں لاپروائی سے کام لیا مگر جب قریب کوفہ شہید ہوئے۔ تو قوم کی شکر گذاری اور اپنی بلند حوصلگی پر تمام عالم کو ابدالآباد تک گواہ بنالیا۔

پھر بھی حضرتؑ نے اس سے زیادہ نہیں کیا کہ مسلم ابن عقیل کو اس ہدایت کے ساتھ کوفہ روانہ فرمایا کہ وہ مسجد میں امامت کریں اور ان مقدمات میں جو فرائض وغیرہ کے متعلق ہوں شرعی فیصلہ دیں نعمان بن بشیر جو یزید کی طرف سے کوفہ کا گورنر تھا بدستور حاکم رہنے دیا جائے۔

مدعا یہ : بجز امر شرعی کے اور کسی امر میں دخل دینے کا کوئی حکم نہیں دیا گیا تھا۔ نعمان کے متعلق کسی ایسی ہدایت کا نہ ہونا جس سے اس کے اختیارات میں مداخلت و مزاحمت ہو۔ یا تو اس وجہ سے تھا کہ سوائے امور شرعی کے اور کسی امر میں دخل دینے کا ارادہ ہی نہ تھا یا یہ کہ نعمان ہماری جانب مائل ہے۔ یا کہتے کم ہمارا دشمن نہیں ہے اور چونکہ وہ کوفی ہے اس کا اسی جگہ برقرار رکھنا حفاظت کے حق میں زیادہ مفید ہے۔ کیونکہ اس قسم کا اضطراب کچھ ہیجان نہ ہوگا۔ رہا یہ امر کہ اگر حضرت کا ایسا خیال تھا تو اہل بصرہ کو مدد کے لیئے خط لکھنے کی کیا ضرورت تھی لیکن جب حسینؓ صاف طور پر یہ دیکھ رہے تھے کہ ہم کس حالت میں ہیں تو کیوں نہ اہل بصرہ کی نبض ٹٹولتے۔ باایں ہمہ اپنے خط میں جو خاص بات تحریر کی تھی وہ یہ تھی کہ میں تم کو کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ کی دعوت دیتا ہوں اس استغاثہ سے بھی اتمام حجت مقصود تھا تاکہ لوگ اس بات سے ناواقف نہ رہیں کہ اسلام کی باگ کن ہاتھوں میں ہے اور ذوی القربیٰ کے ساتھ کیا برتاؤ ہو رہا ہے۔ دوسری غرض یہ تھی کہ لوگ آئندہ کے ظاہر نتائج سے واقف ہو کر صورت معاملات سے ناواقفیت کا عذر نہ کر سکیں۔

بہرحال اس تنقیح کا لب لباب یہ ہے کہ حسینؓ صورت معاملات سے اس بات کا تصفیہ کر چکے تھے کہ میں کہیں ہوں مگر قتل سے بچ نہیں سکتا۔ اب آپ کے لیئے تین راہیں تھیں بیعت یزید کر لیتے یا لشکر فراہم فرماتے یا شہادت پر تیار ہو جاتے۔ آپ نے آخری بات قبول فرمائی۔ پہلی بات تو آپ کو ہرگز گوارا ہی نہیں تھی، اور دوسری بات ممکن ہی نہ تھی۔ کیونکہ جس تھوڑے وقت میں آپ محصور ہوتے جاتے تھے۔ اس کے بعد اور نیز اس لحاظ سے کہ لوگ ایک زمانہ سے اہل بیت رسالت کے اثر سے دور ہو رہے تھے۔ اتنے وقت میں جو حسینؓ کو مل سکتا تھا کسی کامیابی کا قرینہ نہ تھا اور اسی پر حضرت کو یقین بھی تھا جس سے آپ کچھ بھی کوشش نہیں فرماتے تھے، یہ بھی فرماتے جاتے تھے کہ میں عنقریب شہید ہوں گا اور اگر شہادت کو صاف لفظوں میں نہ بھی فرماتے تھے تو ایسے لفظ استعمال کرتے تھے

کہ عنقریب ایک وعدہ پورا ہونے والا ہے یا جو مجھے حکم دیا گیا ہے وہ ضرور پورا ہوگا۔ اس تصفیہ کا کا نتیجہ یہ ظاہر بھی ہو سکتا تھا کہ یزید کامیاب ہوا وحسینؑ اور اس کے تھوڑے سے رفقا مارے جائیں اور لوگوں کو یہ کہنے کا موقعہ ملے کہ حسینؑ (معاذاللہ) اپنی بغاوت میں ناکام رہے۔ جو لوگ حسینؑ کی اس کوشش کے نتیجہ کا انتظار کر رہے تھے وہ بھی اس شہادت کے بعد یزید سے کشیدگی بے سود سمجھ کر اس کی اطاعت پر جھک پڑتے اور اس طرح وہ آخری امید اور تھوڑا سا مخلصانہ اور شجاعانہ قیام جو اہل بیت اور اسلام کی محبت کے متعلق تھا ہمیشہ کے لئے فنا ہو جاتا اور یہ گویا اہل بیت اور اسلام کے نظام روحانی کی شکست ہوتی لیکن حسینؑ نے ان تمام شکستوں کو اس شکست کے مقابلہ میں ہیچ سمجھا۔ حسینؑ نے عظیم الشان قربانیاں دیں۔ تاکہ اس مہتم بالشان مقصد کے نتائج کو کمزور نہ ہونے دیں ان ہی قربانیوں کی عظمت نے ایک ایسا ہیجان پیدا کیا جو لوگوں میں حسینؑ کی مدد نہ کرنے کی ندامت اور بنی امیہ سے نفرت پیدا کرنے میں کامیاب ہوا جس کام کو یزید اپنی فوج اور خزانہ اور تدبر سے نہ کر سکا اسے حسینؑ نے اپنی قربانی سچائی استقلال ایک بڑی درجہ کی حیرت انگیز حمایت اور مظلومیت سے پورا کیا۔

بہر حال ان تمام واقعات کی تنقید و تنقیح سے بخوبی ثابت ہو جاتا ہے کہ ابتدا یزید کی طرف سے ہوئی اور حضرتؑ نے جو روش اختیار فرمائی وہ دفاعی تھی۔ نزاعی نہ تھی۔ نہ آپ کا سفر کوفہ جارحانہ پیش قدمی کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس لئے اس جنگ کی ذمہ داری یزید پر عائد ہوتی ہے حسینؑ کی یہ منشا ہرگز نہ تھی کہ حصول خلافت کے لئے سلطنت کے خلاف ہتھیار اٹھائے جائیں۔ یا اپنے حقوق کو بزور شمشیر منوایا جائے۔ آپ کو بیعت یزید سے صرف اس بنا پر انکار تھا کہ اس کے اعمال و افعال فاجرانہ ہیں اگر آپ کو بیعت پر مجبور نہ کیا جاتا تو آپ بھی اپنے پدر بزرگوار اور برادر عالیمقدار کی طرح خموشی سے زندگی بسر کر دیتے مگر افسوس ہے کہ مخالفوں نے چین سے بیٹھنے نہ دیا۔ اور اُن مظالم کا مظلمہ اپنی گردن پر لیا جن کی مثال تاریخ میں نہیں ملتی۔ موسیو ماربین نے بھی اسی خیال کی تائید کرتے ہوئے بڑی خوبی اور وضاحت کے ساتھ لکھا ہے۔

سب سے بڑی دلیل اس بات پر کہ حسین قتل گاہ تک گئے، اور ہرگز ان کا قصد سلطنت اور ریاست پر عمل کرنے کا نہ تھا۔ یہ ہے کہ حسینؑ اپنے اس علم سیاست اور تجربہ سے جو انہیں اپنے والد عالی مقدار اور برادر نامدار کے زمانہ سے بنی امیہ کے ساتھ جنگ وجدل کرنے کا متعلق تھا۔ خوب جانتے تھے کہ اپنے فقدان سامان اور بزرگوں کے اس عظمت و اقتدار کے ہوتے ہوئے اس کے ساتھ مقابلہ کی طرح ممکن نہیں۔ دوسرے یہ کہ حسین اپنے پدر بزرگوار کی شہادت کے بعد اپنے مقتول ہونے کی پیشین گوئیاں ظاہر کرتے تھے اور جس وقت آپ نے مدینہ سے نقل وحرکت کی صاف صاف آواز بلند فرماتے تھے کہ میں قتل ہونے کے لئے جا رہا ہوں اور اپنے سب ہمراہیوں سے بھی اہتمام سخت کے لئے یہی بیان کرتے تھے تاکہ جو کوئی دنیا وجلال کی حرص وطمع کی وجہ سے ہمراہی ہو وہ جدا ہو جائے، اور یہی بات ان کی ورد زبان تھی کہ قتل گاہ کا راستہ میرے سامنے ہے۔ اگر یہی غور وفکر و علم ارادہ کے ساتھ مقتول ہو جانے پر آمادہ نہ ہوتے تو اس درجہ اپنا قتل کو زمانہ مرتے اور اس کے اہتمام کرنے میں بقدر امکان کوشش عمل میں لاتے۔ یہ کہ جو ہمراہ تھے ان کو متفرق و پریشان کر دیتے۔ ظاہر ہے کہ وہ محبوبیت کا مرتبہ جو اس زمانہ میں حسینؑ کو مسلمانوں میں حاصل تھا۔ اگر اس کے ساتھ اپنی قوت بڑھانا چاہتے تو ایک بڑا لشکر فراہم کر سکتے تھے۔ مگر اسی صورت میں اگر وہ مقتول ہوتے تو یہی کہا جاتا کہ سلطنت اور بادشاہی کی خواہش میں مقتول ہوئے اور وہ مظلومیت جس کا نتیجہ عظیم الشان انقلاب تھا حاصل نہ ہوتی، حسینؑ نے سوائے ان لوگوں کے جن کی جدائی ممکن سے باہر تھی کسی کو اپنے ساتھ نہیں رکھا مثل فرزند برادر، بھتیجوں، بنی اعمام اور چند مخصوص احباب باوفا تاکہ ان سے بھی فرمایا کہ تم بھی چھوڑ کر جدا ہو جاؤ مگر انہوں نے منظور نہیں کیا، اور وہ بھی ایسے حضرات تھے کہ مسلمانوں کے نزدیک تقدس اور جلالت قدر کے اوصاف رکھتے تھے اور یہ مصائب انہوں نے سلطنت و بادشاہی کے لئے برداشت نہیں کئے اور نہ یہ سمجھے ہوں کہ انہوں نے اس مہلکہ عظیم میں قدم رکھا، جیسا کہ بعض مورخین نے خیال کر لیا ہے۔

امر لنصہ۔ اہم کو اس عظیم الشان واقعہ سے کوئی سبق ملتا ہے یا نہیں اور ملتا ہے تو کیا؟ اس زمانہ میں مذہبی خیال روز بروز دھندلا ہوتا جاتا ہے، دنیا مذہب پرستی کو چھوڑ کر خود پرستی کی طرف مائل نظر آتی ہے، زندگی کا معیار حق پرستی نہیں بلکہ خود پرستی قرار دیا گیا ہے۔ اخلاقی پہلو [illegible] ترقی ہے ایثار و ہمدردی فروتنی وغیرہ فضائل خود اہل دہر سے محو اور فنا ہوتے جاتے ہیں۔ تہذیب جدید کا جو محض ظاہری ملمع ہے انسانی قلوب پر سکہ بیٹھتا جاتا ہے۔ تہذیب اور اخلاق یہ دو لفظ آج کل زبان زد خاص و عام ہو گئے ہیں مگر ان کا مفہوم بہت کم لوگ سمجھتے ہیں۔ بعض شخصوں کے نزدیک رہبانیت ہی کمال اخلاق ہے۔ بعض کا اخلاقی دستور العمل یہ ہے کہ نفسانی خواہشوں کو بغیر کسی مزاحمت کے پورا کیا جائے۔ ایک گروہ نے اہل فرنگ کی کورانہ تقلید کو تہذیب و اخلاق کا معیار قرار دے لیا ہے مگر حق یہ ہے کہ یہ لوگ مرکز اعتدال سے منحرف ہو کر افراط و تفریط کے دائرہ میں آوارہ اور سرگردان اور اخلاق کے سیدھے اور صاف راستہ کو چھوڑ کر بد اخلاقی کی ٹیڑھی اور خطرناک راہوں میں سرگشتہ و حیران ہیں۔

جہاں تک نظر غائر اور فکر صائب سے کام لیا جائے ہر شخص اس نتیجہ پر پہنچ سکتا ہے کہ نظام تمدن کا روح رواں حسن عمل ہے اور تمام انبیاء مجددین اور مصلحین اس کی تعلیم و تلقین کرتے آئے ہیں۔ اب سوال یہ ہے کہ حسن عمل کیا چیز ہے، اس کا جواب مختلف مذاہب نے مختلف طور پر دیا ہے۔ بنا بریں جس قدر مذہب و ملل ہیں ان کی دو قسمیں ہو سکتی ہیں، ایک قسم کے مذاہب وہ ہیں جو لوگوں کو اپنی طرف دعوت دیتے ہیں، دوسری قسم کے وہ ہیں جو کسی کو اپنے گروہ میں شامل ہونے کے لئے دعوت نہیں دیتے۔ پہلے قسم کے مذاہب کو مذاہب تبلیغی اور دوسرے قسم کے مذاہب کو مذاہب غیر تبلیغی کے نام سے موسوم کر سکتے ہیں۔

مذاہب تبلیغی کا منشا یہ ہے کہ اہل عالم کی عقلیں اُن کی زیر حکومت اور زیر اثر ہوں ان کا دعویٰ یہ ہے کہ ہم حسن عمل کا نشان دیتے ہیں، یہ حسن عمل بھی خود اصول نظری و عملی پر ہے اور اس کی مختلف حیثیتیں ہیں جن کو ہر ایک نظام تمدن نے اپنے لئے اختیار کیا ہے۔

مختلف نظام جو لوگوں کو فلسفہ یا مذہب کے نام سے اپنی طرف دعوت دیتے ہیں تین قسم پر منقسم ہیں۔

اول ... "بدھ ازم" جو ملک ہند میں عموماً بہار سے ظاہر ہوا۔ اور ہندوؤں کے بعض فرقے اور حکماء ... اور زمانۂ حال کے اہل یورپ میں سے بعض لوگ جو خود کو "تھیاسوفسٹ" کے نام سے موسوم کرتے ہیں اس مشرب کو کم و بیش مانتے ہیں، بدھ مذہب والوں کی تعداد ان ... ممالک چین اور ایشیائے مشرق میں تمام دنیا کی آبادی کے ایک تہائی حصہ میں پچاس کروڑ تک ... ہے، اس مذہب کو حضرت مسیح کی نسبت سے تقریباً بارہ سو سال ... اور حضرت مسیح کی ولادت سے تخمیناً چھ سو برس پہلے گوتم نے جس کو بدھ (عقل کل) کہتے ہیں، جاری کیا تھا۔ اس مذہب کا خلاصہ یہ ہے:-

"یہ دنیا دکھ اور مصیبت کا گھر ہے جس چیز کو تم خوشی یا راحت کہتے ہو وہ بھی رنج و پریشانی پیدا کرنے والی ہے ہر ایک راحت کا انجام زحمت ہے بلکہ وہی راحت یا لذت کچھ عرصہ کے بعد ناخوشی بن جاتی ہے اور اس زحمت سے نجات پانا دشوار ہے کیونکہ ہم سب تناسخ (آواگون) کے جال میں پھنسے ہوئے ہیں جو شخص ظاہراً مرجاتا ہے وہ اسی طرح باقی رہتا ہے اور فوراً دوسری شکل میں ظاہر ہو جاتا ہے۔ پس ان مصیبتوں سے جس کو فرحت و خوشی یا رنج و زحمت کے نام سے موسوم کیا گیا ہے نجات کی کیا سبیل ہے؟"

بدھ اس کا یہ جواب دیتا ہے۔

جب آدمی دنیا کے رنج و راحت سے علیحدہ ہو جاتا ہے تو سکون و اطمینان ... وقار کی استعداد اس کے نفس ناطقہ میں منتقل ہو جاتی ہے اس طرح سے کہ ... حالتِ جنم میں ظاہر ہوتا ہے تو اس زندگی میں سکون و اطمینان و وقار ... اور رنج و راحت کا احساس کم تر ہوتا جاتا ہے۔ اسی طرح تیسری اور چوتھی ... (جنم) میں عمل کرنا چاہیے یہاں تک کہ بہت سے قرن گزرنے کے بعد کسی ایک ... میں اس کا ذہن رنج و راحت کا ادراک نہیں کرتا ...

نجات حاصل ہو جاتی ہے یہ روح فنا ہو جاتی ہے اور عقل خالص باقی رہ کر
مادّہ عالم کے ساتھ مخلوط ہو رہی ہے ۔

الغرض بدھ مذہب ازلی و ابدی قوانین کو مانتا ہے ۔ عالم کو قدیم جانتا ہے جزا و سزا کا اعتقاد رکھتا ہے اور اس جزا و سزا کو ایسا سمجھتا ہے جیسے مرتب ہو اضطراری طور پر خواہ مخواہ لگ سے لگی ہوتی ہے یہ مذہب ایک ایسے ذاتی ذی حیات اور صاحب ارادہ کا قائل نہیں جو عالم کو عدم سے لایا ہو اور جس نے یہ تمام قوانین و علامات معین کئے ہیں ۔ اور یہ بھی کہتا ہے کہ اگر انسان نفس کشی کے ذریعہ سے مدارج کمال کو پہونچ کر بعد حقائق اشیاء کی معرفت حاصل کر کے ان پر حاوی ہو جائے تو وہ خود ایک خدائے عظیم زندہ ہو جاتا ہے اور اس کا حکم لاکھوں اور کروڑوں برس تک مادہ میں جاری رہتا ہے ان لوگوں کے بہت سے عقیدے بعد کی تعلیم میں داخل کر لئے گئے ہیں یہ لوگ دنیا کی پرستش نہیں کرتے ہیں اور ان کے نزدیک زندگی کی غرض صرف یہی ہے کہ زندگی کو فنا کر دیا جائے اور روح کو باقی نہ کیا جائے گو وحدت وجودی کے قائل اور بزرگان صوفیہ اسلام بھی بدھ کے اکثر خیالات کے شیدا ہیں مگر اسلام ان کے دلوں پر ایسی گہری اور مضبوط گرفت رکھتا ہے کہ وہ ذات واجب کے وجود سے انکار نہیں کر سکتے مگر بدھ مذہب میں ایک ذی شعور خالق اور الہامی ہدایت کے لئے کوئی گنجائش باقی نہیں چھوڑی گئی ۔

دوسرا ایک اور مذہبی نظام ہے جس کا داعی کوئی خاص شخص نہیں ہے ۔ بلکہ وہ بجائے مذہب کے دراصل ایک فلسفیانہ تخیل ہے جو عالم کو ایک دوسرے نقطہ نظر سے دیکھتا ہے ۔ جو سابق مذہبی نظام (بدھ مذہب) کے نقطہ نظر کا مخالف اور اس کا مد مقابل ہے ۔ اس مذہب نے یونان میں حضرت مسیح سے کئی سو برس پہلے قوت پکڑی اور وہ اپیکورس کی طرف منسوب ہے اس نظام کے ماننے والوں کو لاادریہ (اپیکورین) نفس پرست یا مادئین کہتے ہیں اس وقت یہ مشرب یورپ اور امریکہ میں نہایت استحکام رکھتا ہے ۔ اور

اہل ایشیا کی طبیعتوں میں بھی جو یورپ کے فلسفۂ سطحی کے معتقد ہیں عملی طور پر یہ ہی فلسفہ ایک غالب اور بلند مقام حاصل کرتا جاتا ہے ان لوگوں کے عقائد کا خلاصہ یہ ہے۔

دنیا عارضی اور چند روزہ ہے ہم نہیں جانتے کہ موت کے بعد دوسری زندگی ہے یا نہیں اگر ہو تو بھی ہمارے عیش میں مخل نہ ہونا چاہیئے۔ ہم کو چاہیئے کہ اس زندگی کو پوری خوشی و شادمانی سے بسر کریں۔ اچھے مکانات، دلفریب باغ، عمدہ عمدہ بستر، ماکولات مسکرات بقدر اعتدال اور دوسری لذائذ از قسم عورات، طعام و لباس و سامان پسندیدہ اپنے لئے مہیا کریں اس تھوڑے سے زمانہ کے بعد کوئی دوسرا مقام ہمیشہ کے عیش کا ہمارے لیے نہیں ہے۔

اس نظام تمدن کی بدولت سب لوگ اپنی نفسانی یا قومی اغراض کے لئے کشمکش میں مبتلا رہتے ہیں حصول منفعت کا خیال ان کی زندگی کا اصل ہے۔ خالق کو چھوڑ کر لذائذ دنیوی اور مادیت کے بندے بن جاتے ہیں اپنی خود غرضی اور ہوا و ہوس کے سامنے عدل و انصاف بلکہ جملہ مکارم اخلاق کو پس پشت ڈال دیتے ہیں اس قسم کی کشمکش اور تصادم ایک عرصہ تک ملک کی فلاح اور ترقی کا باعث ہوتا ہے مگر تھوڑی مدت کے بعد آپس میں کشاکش اور چھینا جھپٹی شروع ہو جاتی ہے اور آخر یہ تمام تمدنی اسباب و حشیانہ حرکات باہمی جنگ و جدل اور ملک و دولت کی تباہی کا باعث ہو جاتے ہیں۔

سوئیم – ان دونوں مذکورہ بالا نظاموں کے علاوہ ایک اور مذہبی نظام ہے جو لوگوں کو اپنی طرف دعوت دیتا ہے، یہ نظام اس خطہ میں ظاہر ہوا۔ جو ہندوستان اور یونان کے درمیان واقع ہے۔ حضرت ابراہیم کی مقدس نسل نے جو اس ملک میں قیام پذیر تھی اور جس کے بعض افراد عرب میں مقیم ہوئے تھے اس نظام کی بنیاد ڈالی چونکہ ہر نظام اسی سلسلہ سے تعلق رکھتے ہیں ان کی تین مختلف صورتیں ہیں اور

پہلی موسوی تعلیم ہے نظامِ موسوی. توحید الٰہی کا معتقد ہے اور خدا و بندے کے درمیان ایک واسطہ کا بھی قائل ہے جس کو رسول کہتے ہیں. یہ مذہب اس بات کو ماننا ہوگا کہ دنیا میں اخلاق و معاشرت کے تمام اصول ایسے لوگوں (رسولوں) کی ہدایت سے جاری ہوئے ہیں جو خود قادرِ مطلق سے حقائق حاصل کر کے لوگوں کو تعلیم دیتے تھے

اس مذہب کی باطنی اور روحانی حقیقت مسیحیت ہے. حضرت مسیح نے اس بات پر زور دیا کہ تزکیۂ نفس کیا جائے اور لوگ احکام کی حقیقت اور اس کے صحیح مفہوم پر عمل کریں. یہودی علماء و مشائخ کا عمل زیادہ تر ظاہری احکام پر تھا. یہ سامی یا سامی نظام ایک خاص نسل کی وساطت سے اشاعت پذیر ہوا. جو احساسِ نبی اور حقائقِ الٰہی کے ادراک میں تمام عالم سے ممتاز تھی مگر جب نظرِ بصیرت سے دیکھا جاتا ہے تو یہ دونوں نظام (نظامِ موسوی و نظامِ عیسوی) بجائے خود صحیح اور نیز سہل اور لوگوں کی بہبودی کا باعث تھے. تاہم ان میں سے ہر ایک نظام ناکمل تھا اور اس قابل نہ تھا کہ ہر زمانہ میں اہلِ عالم کے لئے تنہا کافی و وافی ہو. ان دونوں نظاموں کی تکمیل ایک ایسے نظام کے ذریعہ سے عمل میں آئی جو قانونِ شریعت اور قانونِ معرفت دونوں ہم آغوش رکھتا تھا یا بالفاظ دیگر حکمت اور تزکیۂ نفس (موسوی شریعت و ناموس اور عیسوی روحانیت و معرفت) دونوں کا جامع اور شامل تھا. وہ مذہب محمدی (اسلام) ہے. اس مذہب کا خلاصہ ان مختصر الفاظ میں بیان کیا جاتا ہے.

"زندگی جو انسان کو عطا کی گئی ہے عبث اور بے کار نہیں اور یقیناً انسان اپنے خالق کی طرف رجوع کرنے والا ہے"

اسلام نفس کشی سے مطلق انکار نہیں کرتا بلکہ اس کو معتدل اور رفاہِ عام کا محکوم رکھتا ہے. اسلام نے حظِ نفس کو منع نہیں کیا بلکہ اس کو بھی اعتدال اور فلاحِ عام کا محکوم قرار دیا ہے. اسلام نے انسانی ترقی کا ذریعہ ان نفوسِ مقدسہ کی تعلیم و ہدایت کو قرار دیا ہے جو

خدا تعالیٰ کی طرف سے حقائق کو حاصل کرکے لوگوں کو تعلیم دیتے اور خود بھی حسن عمل اور تہذیب و تمدن کے اعلیٰ ترین نمونہ تھے۔ ہادی اسلام نے اپنی رسالت کا مقصد تکمیل اخلاق کو ہی بتایا ہے آپ فرماتے ہیں:-

"بعثت لاتمم مکارم الاخلاق، مجھے اس واسطے نبی بناکر بھیجا گیا ہے کہ اخلاق کی خوبیوں کو کمال تک پہنچا دوں"

اور علمائے اخلاق کا قول ہے کہ اگر فضائل اخلاق کے دس حصے کئے جائیں تو نو حصے عدالت کے ہیں اور ایک حصہ میں باقی ماندہ فضائل ہیں نہیں بلکہ عدالت ہی تمام فضائل کا مجموعہ ہے اور اگر رذائل کے دس حصے کئے جائیں تو نو حصہ جور کے ہیں جو عدالت کی ضد ہے۔ اور ایک حصہ میں باقی رذائل ہیں نہیں بلکہ جور ہی تمام رذائل کا مجموعہ ہے۔ چونکہ عدالت تمام فضائل کے باہمی اعتدال کا نتیجہ ہے جو افراط و تفریط سے بچاتا ہے، اور اسی لئے جور جو عدالت کی ضد ہے، ان دونوں کا خلاصہ ہے عدالت کی تمام قسموں بلکہ یوں کہنا چاہیئے کہ تمام فضائل اخلاق کا لب لباب ایک چھوٹی سی حدیث میں جمع ہے جس کے الفاظ یہ ہیں-

التعظیم لامر اللّٰہ والشفقة علیٰ خلق اللّٰہ، خدا کے حکم کی تعظیم اور خلق خدا پر مہربانی"

اس حدیث میں اخلاق کے وسیع دریا کو چند لفظوں کے کوزہ میں بند کر دیا ہے۔ کیونکہ عدالت یا تو ان معاملات میں ہوگی جو عبد اور معبود کے درمیان ہیں یا ان معاملات میں جن کا تعلق انسان اور دوسری مخلوق سے ہے۔ حدیث مذکور کا پہلا حصہ پہلی قسم کی عدالت (حقوق اللّٰہ) سے اور دوسرا حصہ دوسری قسم کی عدالت (حقوق العباد) سے تعلق رکھتا ہے۔

جس طرح سرخیل مصلحین و مجددین سید المرسلین و خاتم النبیین جامع فضائل اخلاق بلکہ مکمل و متمم فضائل اخلاق تھے ویسے ہی آپ کے اہل بیت طاہرین حسن عمل اور اخلاق محمدی کا بہترین نمونہ

تھے حسینؑ نے اسی مکمل الاخلاق معلم روحانی اور مدرس حقانی کے دامن تربیت میں نشوونما پائی انوارِ وحی و تنزیل کو اپنی آنکھوں سے دیکھا کلماتِ الٰہیہ کو کلمۃ اللہ کی زبان سے سُنا اور جس طرح بچہ جسمانی تربیت اپنے ماں باپ سے پاتا ہے ویسے ہی حسینؑ نے روحانی اور اخلاقی تربیت اپنے جدِ بزرگوار سے پائی اور انوارِ نبوت ان کے لوحِ قلب پر اس طرح چھپے کہ حسینؑ بھی کمالِ محمدی اور اخلاقِ محمدی کا آئینہ بن گئے ایسی حالت میں حسینؑ سے بڑھ کر فلسفہ اخلاق کا جاننے والا اور اس کا عملی نمونہ کون ہو سکتا ہے وہ خود جس طرح اخلاق کامل تھے ویسے ہی دوسروں کے لئے تکمیلِ اخلاق بھی تھے۔ ان کا کوئی فعل اور کوئی عمل ایسا نہ تھا۔ جس میں روحانی اور اخلاقی تعلیم کی روح موجود نہ ہو تاریخ عالم کا ہر واقعہ نتیجہ خیز اور ہر سانحہ سبق آموز ہے تو کیا شہادت حسینی کے عظیم الشان واقعہ نے ہمارے لئے کوئی سبق نہیں چھوڑا بے شک چھوڑا۔ ہم اس شہادت کے فلسفہ اور تاریخ پر جہاں تک غور کرتے ہیں اسے روحانی اور اخلاقی تعلیم کا بحرِ ناپیداکنار پاتے ہیں۔

اس شہادت کی علت غائی صرف یہی نہیں ہے کہ محرم کا چاند نظر آیا اور ماتمی لباس پہنا۔ مجلس عزا منعقد کی، مرثیے اور نوحے پڑھے۔ آنسو بہائے، سر پیٹا، سینہ کوٹا۔ اور بس اگر اس شہادت کا مدعا صرف اتنا ہی ہے اور ہم نے اس سے یہی سبق حاصل کیا ہے۔ تو دنیائے اسلام کے لئے یہ دوسری مصیبت ہے جو حادثۂ ناسورہ سے کم نہیں اور اس واقعہ کی ذلت و اہانت ہے۔ مصائب و آلام پیٹنے اور آنسو بہانے کے لئے نہیں آتے۔ بلکہ ان کی ایک اہم غرض ہوتی ہے جو ان میں پوشیدہ رہتی ہے۔ شہادتِ حسینی امتِ محمدیہ کو یہ سبق دیتی ہے کہ انسان کو ہمیشہ حق پر قائم رہنا اور اپنے ضمیر و زبان کو ہر حالت میں ایک رکھنا چاہیے۔ اور راہِ حق پر قائم رہنے کے لئے اپنے آخری قطرۂ خون سے بھی دریغ نہ کرنا چاہیے تسلیم و رضا کی خو ڈالنا، ہمت و استقلال سے کام لینا، عزت و آبرو کے لئے جان قربان کر دینا چاہیے حسینؑ نے اپنے استقلال اور طرزِ عمل سے یہ سبق دیا کہ اپنی ضمیر کی شہادت پر ایک راست باز

انسان کس طرح ثابت اور قائم رہ سکتا ہے۔ رضا بالقضا کا عملی نمونہ کیا ہے، قوم و مذہب کے لئے قربانیاں کس رنگ میں کی جاتی ہیں صداقت پرستی میں کن کن دشواریوں کا سامنا ہوتا ہے۔ [illegible] کا مقابلہ کس طرح کرتے ہیں، بُری تحریکات اور بُری جذبات کا نتیجہ مقدم [illegible] جس وقت انسان کن کن آفات و مصائب میں گرفتار ہو سکتا ہے۔ اور اُن کی [illegible] مذہب کی حمایت اور پرستاری کا حقیقی مفہوم اصلی نمونہ کیا ہے یہ بات انسانی [illegible] مادی اور معادی رنگ میں کہاں تک ضرورت ہے برائی کا مقابلہ اس طرح کرنا چاہیئے حمایت مذہب حمایت حق، عبادت شجاعت غیرت صبر استقلال رضا خودداری، عزت [illegible] ذلت، [illegible] حق، ابطال باطل حلم۔ تواضع۔ وقار۔ ایثار قناعت ایثار سخاوت ہمدردی، [illegible] وغیرہ جس قدر فضائل اخلاق ہیں وہ سب [illegible] وقت میں حضرت کی ذاتِ اقدس [illegible] ہوئے۔ گویا آپ نے خود عملی نمونہ بن کر اپنے نانا کی اُمت کو ان تمام صفات حسنہ کا ایسا سبق دیا جس کی نظیر اولین اور آخرین [illegible] یہی باتیں اس شہادتِ کبریٰ کی جان اور روح ہیں اور یہی وہ باتیں ہیں جس کی وجہ سے یہ شہادت دوسری شہادتوں سے سرآمد و ممتاز ہے اور اخلاق کا ایسا مکمل عملی نمونہ دنیا کی اور کسی شہادت میں نہیں پایا جاتا۔

اب ہم صرف یہ کہنا چاہتے ہیں کہ حسین کے نام لیوا حسین کی غلامی کا دعویٰ کرنیوالے حسین کے مصائب پر رونے والے حسین کے نام پر دولت لٹانے والے جو اس شہادتِ عظمیٰ کو اپنے لئے ذریعہ نجات اور اس غم میں رونے کو بہترین عبادت سمجھتے ہیں۔ اس شہادت کے نتائج سے کہاں تک سبق حاصل کرتے اور ان اخلاقی و روحانی تعلیمات پر جو حسینؑ نے اس عظیم الشان کام میں مضمر اور پوشیدہ ہیں کس حد تک عمل پیرا ہوتے ہیں۔ افسوس ہے کہ ہم زبانی جمع خرچ کے سوا عملی و فعلی ثبوت نہیں پاتے۔ بے شک محبت ایک قوی جذبہ ہے۔ اگر خالص اور بناوٹ سے پاک ہو تو اطاعت پر مجبور کرتا ہے۔ ہم نہیں سمجھ سکتے کہ یہ حسین کی کیسی

محبت ہے جس میں ناستی کا رنگ نہیں۔ سب سے اول نماز کو ہی لیجئے جو ستون اعظم ایمان ہے۔ حسینؑ نے ایسے پُرخطر وقت میں کہ شاید نماز کے زمانہ سے آج تک کسی نمازی پر نہیں گزرا عین سجدہ میں سر کٹوا دیا اور عملاً دکھا دیا کہ نماز اور اس کے وقت کی پابندی مذہب اسلام کا کس قدر ضروری رکن ہے۔ مگر یہ سخت تعجب ہے کہ ان کے نام نہاد کے شیدائی اکثر و بیشتر تارک الصلوٰۃ پائے جاتے ہیں۔ حسینؑ نے حمایت حق میں ناقابل برداشت مصائب اٹھا کر ہم کو صداقت و حق پرستی کی تعلیم دی مگر ہم میں کتنے ہیں جو صداقت کے حامی ہوں۔ ایثار و ہمدردی جو اس شہادت کے ممتاز نتائج ہیں ہم میں بالکل نہیں پائے جاتے۔ یَا لَیْتَنِیْ کُنْتُ مَعَکَ کہہ دینا بہت آسان۔ مگر یہ امر مشکل ہے۔ افسوس ہے کہ ہم میں ایسے افراد بکثرت پائے جاتے ہیں جو قولاً تو حسینؑ کے پیرو، مگر فعلاً یزید کے مرید ہیں۔ یزید نے جو کچھ کیا وہ ایک عظیم الشان سلطنت کے واسطے مگر ہم صرف تھوڑے سے فائدے کے لئے اس کے بھی استاد بنے ہوئے ہیں۔ ہم یزید کو حسینؑ کے حق کا غاصب سمجھ کر برا کہتے ہیں لیکن خود دوسروں کے مال اور حقوق کا غصب کر لینا ہمیں ہاتھ کا کھیل جانتے ہیں، احکام شریعت سے تساہل۔ بلکہ سرتابی۔ ایک دوسرے پر ظلم بد اخلاقی بد نیتی خبثِ باطن اور حسد کو اپنا شعار بنائے ہوئے دعوائے غلامی حسینؑ کرنا سراب بے حقیقت سے زیادہ وقعت نہیں رکھتا۔ یاد رکھو کہ یزیدی افعال کی پیروی کرنا اور حسینی اعمال کو پس پشت ڈالنا حسینی گروہ کا کام نہیں۔

ترسم نرسی بہ کعبہ اے اعرابی ۔ کیں رہ کہ تو می روی بترکستان است

امر دہم: (اسلام کو اس واقعہ کی کوئی یادگار قائم کرنا چاہیئے یا نہیں۔ اور اس یادگار کی کیا نوعیت ہونا مناسب ہے)۔

دنیا میں جس قدر بڑے واقعات و حادثات رونما ہوئے وہ دو حیثیتوں سے انسانی جماعتوں میں مشہور ہیں یا تو محض ایسے واقعات ہیں کہ جن کے صرف وہی لوگ واقف ہیں جن کو تاریخ سے دلچسپی ہے یا ایسے واقعات ہیں جن کو کتابی صفحات کے علاوہ کوئی یادگار قائم کر کے

زندہ رکھا گیا ہے اور ان کی عظمت و اہمیت لوگوں کو خود بخود اپنی طرف متوجہ کرتی ہے۔
اگر مشاہیر عالم کی طولانی لسٹ پر نظر ڈالی جائے تو معلوم ہو جائے گا کہ دنیا نے بعد ان
شہرت میں مختلف طریقوں سے صدہا بزرگوں اور ناموروں کی یادگاریں قائم کی گئی ہیں
ان سے برکت یادگاروں کو پایا جاتا ہے کہ واجب الاحترام مشاہیر نے انسانی جماعتوں کے
سلسلے کیا کیا اور اپنے ہی ابنائے جنس کے ہاتھوں سے کیسی کیسی تکلیفیں اور مصیبتیں اوٹھائیں جس
قدر واقعہ کی اہمیت اور صاحب واقعہ کی عظمت ہوتی ہے اسی قدر اس کی یادگار بھی عظیم
الشان اور موثر ہوتی ہے۔ اگر یادگاریں ایک ستون یا ایک مینار یا ایک برج یا سرائے یا مسافر
خانہ وغیرہ تک ہی محدود رہتی ہیں سیاح اور مسافر ان ستونوں یا میناروں کو دیکھ کر
صرف اتنا تصور کر لیتے ہیں کہ یہ کسی نامور کی یادگار ہے۔ جب اس مقام سے گزر جاتے ہیں تو
انہیں خیال بھی نہیں رہتا کہ پہلے حصہ میں کیا دیکھا تھا۔ تاریخوں میں بھی اسی قسم کے ذکر
پائے جاتے ہیں لیکن یہ اذکار صفحات کتاب تک محدود اور اس کے پردہ میں مستور رہیں۔ دنیا
میں بے شمار نامور مشاہیر گذرے ہیں مگر ان کی زندگی کے حالات سے کتنے آدمی واقف ہیں
معدودے چند۔

ان تمام یادگاروں کے خلاف حسینی واقعہ کی یادگار ایک ایسی عالمگیر یادگار ہے۔ جو صرف
تاریخی صفحوں اور نقش و نگار ہی میں محدود نہیں اس کا اثر میدان کربلا تک ہی ختم نہیں ہوا۔
بلکہ اس واقعہ نے ہر مومن کے دل کو بجائے خود کربلا بنا دیا۔ یہ یادگار لوح قلوب پر ایسی کندہ
ہوئی ہے کہ قیامت تک نہ مٹے گی قدرت کی طرف سے اس واقعہ کی نسبت مسلمانوں کے دلوں
میں جو ہمدردی اور رقت رکھی گئی ہے اس کا اندازہ مسلمان ہی کر سکتے ہیں جس طرح موسم
کی تبدیلی پر انسان کے رگ و ریشہ میں خون دورہ کرتا ہے اسی طرح حسینی ایام میں ایک عام
جوش اور ہیجان پیدا ہو جاتا ہے مسلمانوں کے رگ و ریشہ میں ہمدردی خون کی طرح دوڑنے
لگتی ہے جس طرح بجلی تمام اعصاب میں موثر ہو جاتی ہے اسی طرح حسینی ہمدردی ہر ایک مسلمان کے

دل میں جوش مارتی ہو بچوں کو دیکھو جن کو نیک و بد اور بُرے بھلے کی کچھ بھی تمیز نہیں۔ وہ بھی اس ہمدردی کے نشہ میں سرشار نظر آتے ہیں یہ ہمدردی کوئی بناوٹی امر نہیں اور نہ تصنع کا اس قدر اثر پیدا ہو سکتا ہے یہ ہمدردی وہ ہمدردی ہو جو قدرت نے ہر مسلمان کے دل میں ودیعت فرمائی ہو یہ جوش وہ ہے جو کسی مزاحمت سے رُک نہیں سکتا۔ یہ وہ ولولہ ہے جس کو کوئی مخالف مٹا نہیں سکتا یہ وہ پُر درد واقعہ ہو کہ دشمن بھی متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ یہ جو کچھ ہے خدائی قدرت کا کرشمہ ہے اور کیوں نہو۔ جب حسینؑ نے اس قدر مجروح و مجبور ہونے پر بھی آخر دم تک رضاء الٰہی کے جادۂ مستقیم سے قدم نہ ہٹایا اور ایسی حالت میں کہ قاتل تیغ بکف سر جدا کرنے کو پاس کھڑا ہو اپنی گردن سجدۂ معبود میں جھکا دی حسین نے سب کچھ خدا کی راہ میں دیدیا تو "هَلْ جَزَاءُ الْإِحْسَانِ إِلَّا الْإِحْسَانُ" خدا اُس کا متکفل کیوں نہ ہوتا اور کیوں نہ اس کے واقعہ شہادت اور نام میں ایسی تاثیر اور کشش رکھ دیتا کہ کوئی دل اس سے خالی نہ رہے۔

کربلا کی عظیم الشان قربانی و ایثار جان و مال ایسا زرین کارنامہ ہے کہ تیرہ سو برس گذر جانے پر بھی اس کی یاد ایسی ہی تازہ ہے کہ گویا کل کا واقعہ ہے کربلا کے صداقت کیش شہیدوں نے اُس سنسان سرزمین میں اپنی خون سے ایسا میموریل قائم کیا ہے جس کے مقابلہ میں تمام یادگاریں ہیچ ولاشے ہیں۔

یادگاروں کے قائم کرنے کا خواہ وہ کسی قوم و ملت سے متعلق ہوں، مذہبی ضرورت سے قائم کی گئی ہوں یا قومی لحاظ سے ایک ہی مقصد ہوتا ہو اور وہ مقصد یہ ہے کہ تمام آنے والی نسلیں جب تک وہ یادگار قوم کے تغافل سے محفوظ اور اپنی قوت اثر کے لحاظ سے قائم رہ سکتی ہے اس سے فائدہ حاصل کر سکیں۔ کم از کم سال میں ایک مرتبہ اس یادگار کے ہیرو کا کیرکٹر ان کی پیش نظر ہو جاوے وہ اس کی ارادی اور عملی قوتوں پر غور کریں اپنے جذبات کی تصحیح اور شعار کی اصلاح میں اس کے واقعات سے مدد لیں اور کبھی زمانہ اور وقت اس کا مقتضی ہو

تو دنیا کے سامنے ویسی ہی شاندار اور رزمیہ مثال پیش کر سکیں۔ محرم کا حسینؑ ایسے ہی کیریکٹر کا انسان تھا جس کے واقعات کا مطالعہ اور جس کی یادگار کا مشاہدہ ہر قوم و ملت کی افراد کے لیے یکساں مفید اور سبق آموز ہے حسینؑ نے انسانیت کی حفاظت۔ حق کی حمایت اور باطل کی مخالفت میں ایسی شاندار قربانیاں کی ہیں اور نوع انسان کو فلسفۂ خلاق کا بہترین سبق دیکر وہ بین الاقوامی پوزیشن حاصل کر لی ہے کہ آج وہ تنہا مدینہ او کربلا کا شیعہ اور سنی مسلمانوں یا ہندوؤں اور دوسری اقوام کا حسینؑ نہیں ہے۔ بلکہ ایک انگریز کے قول کے مطابق کل دنیا کا حسینؑ ہے۔

گو ایسا پُر درد واقعہ جس کی یاد ہر مومن کے لوح قلب پر اس طرح کندہ ہے کہ کالنقش علی الحجر کا حکم رکھتی ہے بظاہر کسی رسمی یادگار کا محتاج نہیں لیکن یہ ایک ناشکر گذاری ہوتی اگر مسلمان اپنے محسن ہیرو کی جو اسلام کو نئے سرے سے زندہ کرنے والا اور اس کی بقاء ہستی کا باعث ہے اور جس کی عظیم شان اور لاثانی مثال پر اسلامی تاریخ جس قدر فخر و ناز کرے۔ تھوڑا ہے، کوئی یادگار قائم نہ کرتے۔ مسلمانوں نے یادگار قائم کی اور ایسی کی کہ:۔ دوسری قومیں اس کی نظیر پیش نہیں کر سکتیں۔ مگر یہ امر تاسف خیز ہے کہ جدت طرازی نے اس میں اس قدر رنگینیاں بھر دیں کہ اس کی اصلی صورت کو مسخ کر دیا۔

یہ یادگار جو مجالس عزا، تعزیہ، ضریح، علم، دلدل وغیرہ کے نام سے ہر سال تازہ کی جاتی ہے اس میں یقیناً کچھ ایسی باتیں ہیں جو نہ عقلاً درست ہیں نہ شرعاً۔ یہ صورتیں و لولہ انگیز اور جذبات غم کی برانگیختہ کرنے والی سہی - ہم کلیتاً اس کے خلاف نہیں - ہمارا حتمی فیصلہ ہے کہ ایسی عالی مرتبت ہیرو کی یادگار میں جتنا زیادہ اہتمام کیا جائے۔ کم ہے۔ اور اس کا عدم احیا ایک بڑی قومی ناسپاسی ہو گی لیکن اتنا کہنے سے نہیں رک سکتے۔ کہ یادگار کی نوعیت اس ہیرو کی شان کے شایاں اور اس کے مقصد جلیل پر مبنی ہونی چاہیے اور اس کی تمام باتوں میں وہ مفید سبق مد نظر رہنا چاہیئے۔ جو اس ہیرو نے حمایت حق

تردید باطل، ہمدردی قوم، ایثار نفس اور سب سے آخر مگر اہمیت میں سب سے بڑھ کر۔ صبر و تسلیم کے متعلق اپنے متبعین کو سکھلایا ہے۔

ہم اس کو تسلیم کرتے ہیں کہ اگر اس ماتمی یادگار کے سلسلہ کو بالکل مسدود کر دیا جائے تو وہ حزن انگیز اسباب جو ہر سال واقعہ عاشورہ کی یاد کو تازہ اور جذبات غم میں ہیجان اور ولولہ پیدا کرنے والے ہیں کمزور ہو کر، رفتہ رفتہ فنا ہو جائیں گے بے شک اس ماتمی یادگار کی ضرورت اور اشد ضرورت ہے اس طریقہ وہ ہونا چاہئے جو آئمہ اہل بیت کا تھا مجلس عزا کو بزم مشاعرہ اور جلسۂ موسیقی نہ بنایا جائے۔ دوسرے رسوم کو ایسے سادہ اصول سے کیا جائے جو ہر قسم کی لغویات تصنع اور نمود و نمائش سے مبرا ہوں نہ ایسے طریقہ پر کہ مخالف مضحکہ اڑائیں۔ ہم اپنے برادران ملی و قومی سے نہایت ادب کے ساتھ اپیل کرتے ہیں کہ ا۔ ان تمام امور پر نظر ثانی کرکے ایسا فیصلہ دیں جو موجودہ رفتار زمانہ سے مناسب حال ہو۔ ماتم حسینؑ پر روپیہ صرف کریں لیکن اس طریقہ پر کہ اُسے اسراف و تبذیر سے تعبیر نہ کیا جائے یہ سچ ہے کہ لا اسراف فی الخیر۔ مگر اس پر عمل کرنے کا بھی موقعہ و محل ہے، تو یہ مراسم یادگاری اس طرح ادا کی جائیں کہ بدعات سیئہ اور حرکات نامشروع کی حد تک نہ پہونچیں اور اس مصرعہ کی مصداق نہ بنیں کہ "ماتم کریں حسین کا لوٹیں حسن پورہ"۔ ہم کو گفتگو ہے تو اس میں ہے کہ ہم ان حسینی یادگار کے ایام میں بعض ایسے شرمناک حرکات دیکھتے ہیں جو حیا سوز اور ناقابل بیان ہیں یہ کیوں ہے اس وجہ سے کہ اس یادگار کے مفہوم کے سمجھنے میں غلطی کی جاتی ہے اعتدال کی صراط مستقیم کو چھوڑ کر افراط و تفریط کے جنگل میں سرگرداں ہیں اور اس شہادت کے اصلی اغراض و مقاصد پر نظر نہیں کرتے، وہ اصحاب خوش نصیب ہیں جو کربلا کے عظیم الشان معرکہ کو اس کے حقیقی رنگ میں دیکھتے ہیں اور وہ لوگ بدنصیب اور کوتاہ خرد ہیں جو نادانی حماقت سے اس واقعہ ہائلہ کو اپنے حق میں خسر الدنیا والآخرۃ کا موجب بناتے ہیں۔

قاتلان حسین مسلمان تھے اس میں کیا حکمت تھی

جس طرح دنیا کی تاریخ میں سرگزشت کربلا بہ اعتبار واقعات عدیم المثال ہے اسی طرح انسانی جماعت میں یہ سرگزشت بھی سرمایۂ حیرت ہے کہ ایک مذہب کے متبعین نے جنہیں خیر الامم ہونے کا دعویٰ تھا۔ اپنے ہی پیغمبر کے نواسے اور اس کی ذریت پر وہ مظالم کئے۔ جو اپنی نوعیت کے لحاظ سے جواب نہیں رکھتے۔ اور جن کو سن کر سنگدل سے سنگدل اور مخالف سے مخالف بھی ششدر ہو جاتا ہے فی الحقیقت یہ بات کچھ کم تعجب کی نہیں کہ بانی اسلام کی وفات کو صرف ۵۰ سال گزرے ہوں اور اس کی شرف صحبت سے فیضیاب ہونے والے سینکڑوں کی تعداد میں زندہ موجود ہوں اور اس کے کلمہ گو اور نام لیوا اسی کے فرزند و اُسی کے اہل بیت پر آب و دانہ بند کر کے اُن ہولناک مظالم کے موجد کہلائیں جن کے مقابلہ میں اولین اور آخرین کی سفاکیاں بے حقیقت اور ظالم آرائیاں گرد ہو جائیں۔

آخر ایسا کیوں ہوا۔ اس سوال کا جواب بہت صاف ہے اور اتنا ہی کہہ دینا کافی ہے۔ کہ اہل بیت رسالت اور خاندان نبوت کے ساتھ مسلمانوں کی بے اعتنائی اور کم توجہی ابتدا سے ہی شروع ہو گئی تھی اور باوجودیکہ آنحضرت ؐ نے بارہا اپنے اہل بیت کی عزت و محبت کے متعلق تاکید و ہدایت فرمائی پھر بھی کلمہ گویان امت کا ان کے ساتھ ایسا سلوک اس قابل ہے کہ اس پر جس قدر تعجب کیا جائے کم ہے جو لوگ علیؑ حسنؑ اور حسینؑ کے ساتھ سوُلِ خدا کا عاشقانہ تعلق اپنی آنکھوں سے دیکھ چکے تھے اور ان بزرگواروں کے متعلق آنحضرت ؐ کے ارشادات کو اپنے کانوں سے سُنا تھا افسوس ہے کہ ان کا برتاؤ جیسا کہ چاہئیے تھا کبھی خوشگوار نہ ہوا۔ رفتہ رفتہ محبتِ اہل بیت کے بدلے عداوتِ اہل بیت مسلمانوں کے عقیدہ میں داخل ہو گئی۔ بلکہ اس سے آگے قدم بڑھا کر ممبروں پر علانیہ سب و شتم ہونے لگا۔ محبت اہل بیت الحاد زندقہ سے بڑھ کر اور بڑے سے بڑے سیاسی جرم سے زیادہ سنگین اور ناقابل معافی قرار دی گئی۔

جن لوگوں نے علی مرتضیٰ کا تعلق اور رسو لخدا سے ان کی خصوصیت کو اپنی آنکھوں سے دیکھا اور فضائل علی کو آنحضرت کی زبانی اپنے کانوں سے سنا تھا۔ انہوں نے علیؑ سے بیعت تک نہ کی تھی۔ درا نحالیکہ یزید اور عبد الملک جیسوں کی بیعت کو بخوشی گوارا کر لیا۔ ان بزرگواروں میں (۱) سعد ابن ابی وقاص (۲) عبد اللہ ابن عمر (۳) عبد اللہ ابن سلام (۴) صہیب بن سنان اسامہ بن زید (۶) قدامہ بن مظعون (۷) مغیرہ بن شعبہ (مہاجرین)

(۱) حسان بن ثابت (۲) کعب بن مالک (۳) مسلمہ بن مخلد (۴) محمد بن مسلمہ (۵) النعمان بن بشیر (۶) زید بن ثابت (۷) رافع بن خدیج (۸) فضالہ بن عبید (۹) کعب بن عجزہ (۱۰) سلمہ بن سلامہ (انصار)۔

جیسے اکابر و مشاہیر اسلام شامل ہیں۔ انہوں نے جناب امیر سے بیعت تک نہ کی امداد دینا تو درکنار یہاں تک کہ آپ نے دل برداشتہ ہو کر مدینہ سے ہجرت اختیار کی۔ کوفہ کو اپنا دار السلطنت قرار دیا۔ اور پھر جیتے جی مدینہ میں قدم نہ رکھا۔

حضرت امام حسنؑ کے ساتھ بھی جو بے اتفاقی کا سلوک رہا وہ محتاج تشریح نہیں۔ حتّٰی کہ تنگ آکر حضرت کو خلافت سے دست بردار ہونا پڑا۔ پھر بھلا حسینؑ کے زمانہ میں ان لوگوں سے کیا امید ہو سکتی تھی۔ سمرہ بن جندب صحابی رسول تھے۔ اور آنحضرتؐ کی عاشقانہ محبت حسینؑ کے ساتھ اپنی آنکھوں سے دیکھ چکے تھے۔ ان کی نسبت علامہ ابن ابی الحدید شرح نہج البلاغہ میں لکھتے ہیں۔

کان سمرة بن جندب ایام مسیر الحسین الی الکوفة علی شرطة عبید الله ابن زیاد وکان یحرض الناس علی الخروج الی الحسین وقتاله +	سمرہ بن جندب صحابی رسول حسین کی تشریف آوری عراق کے زمانہ میں ابن زیاد کی طرف سے کوتوال تھے اور لوگوں کو حسینؑ پر خروج اور ان سے لڑنے پر ترغیب دلاتے تھے۔

انس بن مالک جو اکابر صحابہ میں شمار کئے جاتے ہیں اور جن کی روایت کی ہوئی حدیثیں

صحاح ستہ میں بھری پڑی ہیں۔ مجلس ابن زیاد میں حاضر باش تھے جس روز اہل بیت اطہار کی زود بکاری ابن زیاد کے دربار میں ہوئی وہ بھی تماشائیوں کے ساتھ موجود تھے۔ مگر حضرت کی مدد نہ کی۔ علامہ عینی نے عمدۃ القاری فی شرح صحیح بخاری میں سبط ابن جوزی سے نقل کیا ہے۔

اما کان لرسول اللہ صلعم علی انس من الحقوق ان ینکر علی ابن زیاد فعلہ و یقیم لہ ما ذکر من قرعہ ثنایا الحسین بالقضیب ،	رسول خدا کے حقوق سے انس کے ذمہ یہ تھا کہ ابن زیاد کے فعل پر اس کو ملامت کرتے۔ جو اس نے سر مقدس حسین کے ساتھ کیا کہ چوب بید سے دندان مبارک کھولے۔ اور

کسی نے اس فعل سے نہ روکا۔

سب انس قبل واقعہ کربلا کوفہ میں موجود تھے اور رسول خدا کی اولاد پر فوجوں کی چڑھائی کا بندوبست آنکھوں سے دیکھ رہے تھے پھر کیوں نصرت حسین کو نہ گئے۔ اگر کہا جائے کہ بوجہ کبر سن امداد سے معذور تھے تو رسول خدا کی نواسیوں کو بے پردہ دیکھنے کے لئے جانے کی کیا ضرورت تھی اس کے علاوہ جابر ابن سمرہ، زید بن ارقم، زید بن خالد، النعمان بن بشیر، براء بن عازب کہ یہ بھی اصحاب رسول اللہ ہیں ان کے ماسوا شریح بن ہانی، شریح بن حارث، علقمہ بن قیس، مسروق ابن اجدع، سوید بن غفلہ، عبد اللہ بن شداد، ابو عبیدہ بن عبد اللہ بن مسعود اکابر تابعین میں شمار کئے جاتے ہیں یہ سب اس وقت کوفہ میں مقیم تھے۔ مگر حسینؑ کی نصرت کو نہ گئے اور خاموش بیٹھے تماشہ دیکھتے رہے، اور کسی نے اپنی جگہ سے جنبش نہ کی۔

اسی طرح جب حسینؑ نے عراق کی طرف کوچ فرمایا۔ بزرگان و مشاہیر حرمین بخوبی واقف تھے کہ کوفی یقیناً بے وفائی کریں گے۔ اسی بنا پر ابن عمر، ابن زبیر، ابن عباس، ابو سعید اور ابو واقد وغیرہ نے حضرت کو روکا اور عبد اللہ ابن عمر نے صاف کہہ دیا کہ میں شہید سے رخصت ہوتا ہوں۔ مگر باوجود اس علم کے ان بزرگان اسلام نے نصرت و معیت سے روگردانی

کی، اگر عبداللہ ابن عباس، عبداللہ ابن جعفر اور جابر انصاری بوجہ نابینائی معذور تھے۔ تو عبداللہ ابن حنظلہ، عبداللہ ابن مطیع، ابوسعید، ابو واقد اور دوسرے حاضرین حرمین کو کون امر مانع تھا کہ بدسلوکی یزید کو فرزند رسول کے ساتھ جان کر بھی خاموشی اختیار کی۔ گویا ہلاکت فرزند رسول ان سرداران اسلام کے خیال میں ایک معمولی اور خفیف بات تھی۔ ان کے علاوہ بریدہ بن حصیب اسلمی، مسلمہ بن مخلد انصاری، ابو بردہ اسلمی، مسعد بن مخرمہ صحابی، اسید بن ظہیر اوسی، ابوسعید بن معلی انصاری، رافع بن خدیج انصاری، عریاض بن ساریہ، سائب بن یزید مدنی، سنان بن سلمہ مصری وغیرہ یہ سب صحابی زندہ موجود تھے مگر ان حضرات کو ذریت رسول خدا کے دشمنوں کی مدافعت کا خیال بھی نہ آیا۔ دوسرے تابعین یا شرفائے اسلام کا تو ذکر ہی کیا ہے اور صرف ان بزرگواروں نے نصرت اہلبیت کا حق ادا کیا جنکے لئے یہ فوز عظیم مقدر ہو چکا تھا۔ چنانچہ حرمین شریفین کے باشندوں کو جن پر رسول خدا کے حقوق زیادہ تھے اس بے اعتنائی کی یہ سزا ملی کہ واقعہ حرا میں سیکڑوں صحابی اور ہزاروں دوسرے شرفا اور باشندے قتل ہو گئے۔

افسوس ہے کہ اُس وقت ایسے بھی مسلمان تھے جو اپنے پیغمبر کے نواسہ کا قتل اور اپنے رسول کی ذریت کی ہتک حرمت کو باعث دخول جنت اور موجب ثواب عظیم سمجھتے تھے جس کی نسبت متعدد تاریخی شہادتیں موجود ہیں اور ہم ان کو سلسلہ واقعات شہادت میں اپنے اپنے موقعہ پر بیان کریں گے۔ یہ عداوت اور خصومت بنی امیہ تک ہی محدود نہ تھی۔ اس لئے بغض و عناد اہل بیت کا الزام سراسر اُن ہی کے سر تھوپ دینا انصاف سے بعید ہے۔ کیونکہ مرتکب قتل اہل عراق ہوئے شامی ان میں شامل نہ تھے پھر ہم کس طرح اس بدکرداری کو جس کا بدنما داغ دامن اسلام سے کبھی چھوٹ نہیں سکتا۔ نواصب شام سے منسوب کر سکتے ہیں۔

ایسے نام نہاد مسلمانوں سے جن کو مسلمان کہنا اسلام کی توہین اور انسان کہنا انسانیت کی تحقیر ہے۔ اہل بیت رسول اللہ کیساتھ ایسی زیادتیاں اور بے ادبیاں سرزد ہونا۔ کچھ

محل ستعجاب نہیں اور اس میں خداوند کریم کی ایک خاص حکمت ومصلحت تھی کہ حسینؑ ان ہی لوگوں کے ہاتھ سے شہید ہوئے جو ان کی قدر ومنزلت وقعت وعزت کو بخوبی جانتے تھے آپ کا اپنے ہی ہمقوم اور بظاہر اپنے ہی ہم ملت اور نانا کی کلمہ گو امت کے ہاتھوں سے جام شہادت پینا اس شہادت کی صداقت کا ایک اعلےٰ معیار ہے۔ اگر آپ دوسری قوم اور دوسرے مذہب والوں کے ہاتھ سے شہید ہوتے تو یہ خیال کیا جاسکتا تھا کہ مخالفوں کا یہ فعل ناوابستگی کی حالت میں ہوا۔ اور اس واقعہ کی اس قدر وقعت اور دلچسپی نہ ہوتی۔ غضب تو یہ ہے کہ یہ خون گروہ خود کو اُسی گھرانے کا نام لیوا اور پیرو کہتا تھا۔ جس کے رُکن اعظم حسینؑ تھے ان کو معلوم تھا کہ یہ وہی حسینؑ ہیں جن کو آنحضرت خوشی سے اپنے دوش اقدس پر اٹھائے پھرتے تھے، یہ وہی حسینؑ ہیں جس کے لئے رسولخداؐ نے فرمایا تھا کہ:
حسینؑ مجھ سے ہے اور میں حسینؑ سے ہوں یہ وہی حسینؑ ہیں کہ جب آنحضرتؐ فاطمہؑ کے گھر میں تشریف لے جاتے تھے تو پوچھا کرتے تھے کہ فاطمہ! میرے ریحان (حسنؑ وحسینؑ) کہاں ہیں یہ وہی حسین ہیں جن کے خاندان والوں کے لئے قرآن مجید میں آیہ تطہیر نازل ہوئی ہے۔
یہ وہی حسین ہیں جنہیں آیۂ مباہلہ (ابنائنا وابنائکم) میں خدائے تعالےٰ نے فرزند رسول قرار دیا ہے باایں ہمہ کہ وہ بدبخت یہ سب کچھ جانتے تھے۔ اُن کی آنکھوں پر ایسا پردہ پڑا تھا کہ انہوں نے حسینؑ اور اہل بیت رسالت کے ستانے اور اذیت دینے میں کوئی دقیقہ اُٹھا نہ رکھا۔ خَتَمَ اللّٰہُ عَلٰی قُلُوْبِھِمْ وَعَلٰی سَمْعِھِمْ وَعَلٰی اَبْصَارِھِمْ غِشَاوَۃٌ وَّلَھُمْ عَذَابٌ عَظِیْمٌ۔

خود سالار لشکر قریشی النسب سادس الاسلام سعد ابن ابی وقاص کا بیٹا اور خاندان رسالت کا قریبی رشتہ دار تھا مگر حکومت صوبہ رے کا لالچ ایسا غالب آیا کہ لوگوں کی فہمائش پر بھی آنکھیں نہ کھلیں اور ابن زیاد کے پاس گیا تو یہ اشعار پڑھتا ہوا گیا ؎

اتترک ملک الری والری رغبتی	ام ارجع مذموما بقتل حسین
وفی قتلہ النار التی لیس دونہا	حجاب و ملک الری قرۃ عین

کیا میں ملک ری کو چھوڑ دوں اور ملک رے ہی مجھے خواہش ہے یا حسینؑ کو قتل کرکے مذموم واپس آؤں ان کے قتل کرنے سے میں دوزخ میں جاؤں گا جس کا کوئی مانع نہیں ہے۔ اور ملک رے کی حکومت میری آنکھوں کی ٹھنڈک ہے۔

خاص قاتل شمر جب حضرت کے گلوئے مبارک پر خنجر پھیر رہا تھا تو (بقول ابو مخنف) یہ اشعار پڑھتا جاتا تھا۔

اقتلک الیوم ونفسی تعلم	علما یقینا لیس فیہ مزعم
ان اباک خیر من تکلم	بعد النبی المصطفیٰ المعظم
اقتلک الیوم وسوف اندم	وان مثوی عذاب جہنم
افیض دمک بالتراب بعصبۃ	ولا لاولاد النبی ارحم

آج میں تمہیں قتل کر رہا ہوں اور میرا نفس بغیر کسی شبہ کے بالیقین جانتا ہے کہ تمہارا باپ گل بولنے والوں میں نبی مصطفیٰ اعظم کے بعد ممتاز ہے آج میں تمہیں قتل کر رہا ہوں اور عنقریب مجھے ندامت ہوگی اور اس کے بعد عذاب جہنم بھگتنا پڑیگا، تمہارا خون زمین پر گرا رہا ہوں اور اولاد نبی پر رحم نہیں کرتا۔ اس سے ہر شخص اندازہ کرسکتا ہے کہ وہ دنیا و آخرت کے بدبخت دیدہ و دانستہ کس طرح اندھے اور بہرے بن گئے تھے۔

شجاعت و بہادری کی صفت صرف یہی نہیں ہے کہ تلوار کا تلوار سے اور نیزہ کا نیزہ سے مقابلہ کیا جائے بلکہ بہادری کی ایک اعلیٰ صفت یہ ہے کہ مخالفین پر رحیم اور معاندین پر کریم ہو۔ ہر ایک مصیبت اور تکلیف کو حوصلہ و استقامت سے برداشت کرے، بے صبری اور کمزوری و اضطراب اس کے قدم کو جادہ استقلال سے نہ ہٹا سکیں یہ سب اوصاف حسینؑ کی ذات مقدس میں جمع تھے حسینؑ اپنے دشمنوں کو ہتیاروں سے جواب بھی دیتے تھے باوجود اس

تک اُن پر رحیم اور مہربان تھے کیا کوئی شخص ان مظالم و مصائب کے ہجوم پر بھی اپنے دشمنوں کی بہبودی چاہے گا یا اس کے انتقامی جذبات دوسرے اوصاف کو مغلوب نہ کر لیں گے۔ ہرگز نہیں یہ صرف حسینؓ ہی کا حوصلہ اور حسینؓ ہی کی ہمت تھی کہ انہوں نے آخر دم تک اپنے نانا کے کلمہ پڑھنے والوں کو آخرت کے وبال سے بچانے کی کوشش کی اور بار بار اتمام حجت اور شفقت کے لئے فرماتے رہے۔ آپ کا ارشاد کہ کیا تم کو معلوم نہیں کہ میں کس گھرانے اور کس خاندان کا ہوں۔ کیا تم میری بزرگی و عزت سے ناواقف ہو، تم خدا کو کیا جواب دو گے؟ اپنی جان اور اپنی عاقبت پر رحم کرو اس امر کو ثابت کر رہا ہے کہ آپ اپنے دشمنوں پر رحیم تھے۔ اور آپ کو ان تکالیف و شدائد کے اٹھانے پر بھی اپنے بزرگ نانا کی امت کے بہبودِ آخرت کا خیال رہا۔ اشقیائے امت تو اس کے قتل کے درپے ہو رہے ہیں اور وہ مصلح کامل اور رحم مجسم اسی دھن میں مصروف ہے جس دھن میں اس کا نانا امتی امتی کہتا چلا جاتا تھا۔ کیا حسینؓ کے حوصلہ اور اس بردباری کو کوئی بہادر پہنچ سکتا ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ یہ انسان کا کام نہ تھا بلکہ اس تائید ایزدی کا تھا جو حسینؓ کے رگ و ریشہ میں بھری گئی تھی انسانی کا یہ طبعی امر ہے کہ جب اُس کے سامنے اُس کے اہل و عیال کو قتل کرنے اور گھر بار لوٹنے کی دھمکی دی جائے۔ تو وہ ہر ایک بری بھلی بات اور مشورہ کو قبول کر لینے پر آمادہ ہو جاتا ہے مگر حسینؓ ہی کا حوصلہ اور استقلال تھا کہ باوجود ان تمام خطرات کے جو پیش نظر تھے، اُس امر کو منظور اور گوارا نہ کیا جو اسلام کے لئے مہلک اور باعثِ توہین و تذلیل تھا اور اس کی کچھ بھی پروانہ کی کہ خاندان پر مصیبت آئے گی گھر لوٹا جائے گا عورتیں اور بچے اسیر ہوں گے۔

افسوس ہے کہ یہ سب کچھ مسلمانوں کے ہاتھوں سے ہوا۔ اور وہ ایسے زمانہ میں جب کہ اسلام کی عمر ۶۰ ہی سال کی تھی۔ خود سالار فوج اُس اسلامی ہیرو کا بیٹا تھا۔ جسے سابق الاسلام اور داخل عشرۂ مبشرہ ہونے کے علاوہ رسولِ خدا کے ماموں زاد بھائی ہونے کا شرف حاصل تھا اور جو اسلامی تاریخ میں فاتح عجم کے ممتاز لقب سے

ہمیشہ پکارا جائیگا۔ اسی طرح اور حاضرین بھی خود رسولِ خدا اور صحابہ کرام کے دیکھنے والے اور حسین کے درجے اور حسین کی عظمت کو جاننے والے تھے۔ اسی وجہ سے حسین کو بڑا اصرار سے بلایا تھا۔ پھر بھی انہوں نے وہ کیا جو اسلام کی بڑی سے بڑی مخالف قوم بھی نہ کرتی۔ سب کچھ جاننے پر انجان بن گئے ایک کاذب اور فاسق کی رضا جوئی کے لئے دینی حمایت دکھنا۔ قومی غیرت کو بھی نہ یاد رکھ بیٹھے۔ اپنے تمام عہود و مواثیق سے پھر گئے۔ حسینؑ کے مدارج و مراتب کو کما حقہ جانتے تھے۔ حسینؑ کے بچوں اور حرم کی جو دردناک حالت تھی آنکھوں سے دیکھ رہے تھے۔ حسینؑ کی فصیح و بلیغ نصیحتیں اور دردانگیز تقریریں کانوں سے سن رہے تھے لیکن پتھر کی مورت کی طرح نہ ان کے قلوب پر کچھ اثر ہوتا تھا نہ آنکھیں اور کان متاثر ہوتے تھے

افسوس ہے کہ مسلمانوں نے اپنے نبی کی ذریت کی وہ توہین کی کہ بقول مولوی نذیر احمد دہلوی ایسی نالائق حرکت مسلمانوں کی ہوئی کہ اگر سچ پوچھو تو دنیا میں منہ دکھانے کے قابل نہیں ہیں۔ اگر یہ شہادت مسلمانوں کے ہاتھ سے نہ ہوتی تو اس کو اس قدر اہمیت اور وقعت نہ دی جاتی اور اس شہادتِ عظمیٰ کو ایسی تکمیلِ اتم کا درجہ حاصل نہ ہوتا اور یہ سمجھا جاتا کہ مخالفینِ اسلام نے بانیٔ اسلام سے اپنا بدلہ لیا۔

کیا قاتلانِ حسین نماز نہ پڑھتے تھے، کیا وہ روزہ نہ رکھتے تھے، کیا ان میں حاجی، حافظ قاری اور محدث نہ تھے، ضرور تھے۔ مگر ان کی یہ عبادتیں رسمی ورزش کی زیادہ وقیع نہ تھیں جن کو عبادت کے صحیح مفہوم سے کبھی نسبت نہیں دی جاسکتی۔ جن لوگوں نے اپنے ہی نبی کے نواسہ کو قتل کیا اپنے ہی رسولؐ کے ذریت کی تذلیل و توہین میں کوئی دقیقہ اٹھا نہ رکھا۔ تو کیا اُن کو مسلمان کہا جا سکتا ہے نہیں بلکہ ان کو مسلمان کہنا اسلام کی توہین کرنا ہے۔ اسی خاندانِ نبوت کا صدقہ اور طفیل تھا کہ بنی امیہ صاحب طبل و علم ہوئے مگر یہ دیکھنا چاہیئے کہ یزید نے حسینؑ کے خلاف یعنی حیثیت انسان، انسانیت کے ساتھ کیسا برتاؤ۔ کیا کوئی کہہ سکتا ہے کہ دشمنانِ حسینؑ سے بجز خود غرضی، دنیا طلبی، بغض و عداوت، قساوت، شقاوت، ظلم و سفاکی

بے رحمی، بے حمیتی نامردی اور خلاف انسانیت افعال کے رحم و کرم، عفو، احسان اور انسانیت ظاہر ہوئی ابن سعد باوجود دینے بشارہ اجتہاد، روایت، حدیث اور صحابی زادگی کے ایسا نہ تھا کہ اپنے ولی نعمت کا احسان یاد رکھتا یہ گروہ اصول کی روح کو تو پس پشت ڈالے ہوئے ہی تھا۔ اس پر خوفناک فریب یہ ہے رہا تھا کا کثر نے رسماً یا ایک سیاسی ذریعہ سمجھ کر عبادت ظاہری سے لوگوں کی آنکھوں میں خاک اور منہ میں لگام دیدی تھی بانی نماز کے فرزند کو عین حالت نماز میں قتل کیا جاتا اور اظہار مسرت کے لئے تکبیر کے نعرے بلند کئے جاتے ہیں کسی نے سچ کہا ہے ؎

جاؤ ابراسك یا ابن بنت محمد | مترملا بدمائه ترميلا
ويكبرون ادا قتلت تكبيراً | قتلوا بك التكبير والتهليلا

اے دختر رسول کے فرزند تیرا سر لائے ہیں جو اپنے خون میں لتھڑا ہوا ہے۔ وہ تجھ کو قتل کر کے تکبیریں کہتے ہیں سچ یہ ہے کہ تیرے ساتھ تکبیر و تہلیل کو بھی قتل کر ڈالا۔

شہادت حسینی سے انکار

یہ تو تیرہ سو برس پہلے کے مسلمانوں کا ذکر ہوا جو دور صحابہ اور اسلام کے سیاسی عروج کا بہترین عہد تھا اب اس زمانہ کے بعض مسلمانوں کو لیجئے کہ انہیں شہادت حسین ہی سے انکار ہے۔ میدان کربلا میں شہید ہو کر حسینؓ نے جو مرتبۂ شہادت کبریٰ کا پایا جس کی وجہ سے آپ کا نام نامی آفتاب جہاں تاب کی طرح عالم میں روشن ہے۔ اس شہادت کبریٰ کے مرتبہ کو مٹایا جاتا ہے۔ محبت حسینی کا خون کیا جاتا ہے تعلیم حسینی کو خاک میں ملایا جاتا ہے۔ مخبر صادق کی پیشین گوئی شہادت حسینی کی تکذیب اور ترغیب محبت حسینی سے مخالفت کی جاتی ہے۔ پہلے بھی کچھ لوگ منکر ہوئے تھے۔ مگر وہ اور صورت تھی۔ اب جو انکار کیا جاتا ہے اس کی دوسری

شان ہے۔

علامہ ابن بابویہ قمی کتاب عیون میں ابو صلت ہروی سے روایت کرتے ہیں کہ حضرت امام موسیٰ رضا علیہ السلام کی خدمت میں عرض کیا گیا کہ کوفہ میں ایک جماعت کا خیال ہے کہ:۔ حسین بن علی علیہ السلام شہید نہیں ہوئے۔ خدا نے حنظلہ بن سعد شامی کو حضرت کی صورت میں تبدیل کر دیا اور آپ کو عیسیٰ بن مریم کی طرح آسمان پر اٹھا لیا اور ان لوگوں کو اس آیہ پر استدلال ہے "وَلَنْ يَجْعَلَ اللّٰهُ لِلْكَافِرِيْنَ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ سَبِيْلًا" حق تعالیٰ کافروں کو مومنوں پر غلبہ نہیں دیتا۔ حضرت نے فرمایا وہ لوگ جھوٹے ہیں اور پیغمبر خدا کی تکذیب کرتے ہیں۔ کیونکہ آنحضرت نے بارہا قتل حسین کی خبر دی تھی۔ خدا کی قسم حسین شہید ہوئے اور وہ بزرگوار بھی شہید کئے گئے جو حسین سے بہتر تھے یعنی علی ابن ابی طالب۔ اس آیہ کا مقصد یہ ہے کہ مومنوں پر کفار کی کوئی حجت نہیں۔

کتاب کمال الدین اور احتجاج وغیرہ میں محمد ابن ابراہیم۔ ابن اسحٰق طالقانی سے منقول ہے کہ میں ایک روز مع جماعتِ احباب شیخ ابو القاسم حسین بن روح نائب حضرت صاحب الامر کی خدمت میں حاضر تھا کہ ایک آدمی نے اٹھ کر شیخ ابو القاسم سے سوال کیا

سائل:۔ میں آپ سے ایک مسئلہ پوچھتا ہوں۔

ابو القاسم:۔ پوچھو!

سائل:۔ آیا حسین بن علی ولیِ خدا ہیں۔

ابو القاسم:۔ بے شک۔

سائل:۔ قاتل ان جناب کا دشمن خدا ہے یا نہیں۔

ابو القاسم: بلاشبہ۔

سائل:۔ کیا یہ جائز ہے کہ خدا اپنے دشمن کو اپنے دوست پر مسلط کرے۔

ابو القاسم:۔ خدا اپنے دشمن کو اپنے دوست پر مسلط نہیں کرتا بلکہ اپنے دوستوں کا

مصائب سے امتحان لیتا ہے اور یہ امتحان ان کی صداقت کا معیار ہے۔ جیساکہ طبقہ انبیاء کے ساتھ ہوا دشمن کا یہ تسلط ایک ظاہری غلبہ ہے، ورنہ وہ خود آخر کار مخذول و مقہور ہو کر غضب خدا کا مورد اور جہنم کا ایندھن بن جاتا ہے۔

بہرحال یہ ایک خیالِ باطل تھا جو کچھ عرصہ تک چند لوگوں میں محدود رہا۔ مگر اس واقعہ کی عام شہرت اور تواتر نقل و روایت نے رفتہ رفتہ اس کو فنا اور محو کر دیا۔ اس سے زیادہ حیرت انگیز یہ ہے کہ اب تیرہ سو برس کے بعد مرزا مراد بیگ نامی شخص حیرت دہلی کے ایک گم نام آدمی کو جو نہ طبقہ علماء میں شمار کرنے کے قابل ہے نہ زمرہ محققین میں بلکہ ایک اخبار کا اڈیٹر اور معمولی قابلیت کا شخص تھا شہادت حسینی کے انکار پر اصرار ہوا۔ اور اس نے ۲۳ جولائی سنہ ۱۹۰۵ء کے کرزن گزٹ دہلی میں انکار شہادت کے متعلق ایک مضمون شائع کیا جو ملخصاً ذیل میں درج کیا جاتا ہے۔

تیرہ سو برس کے بعد ایک حیرت انگیز راز کا افشاء

اس بات کی ضرورت نہیں ہے کہ جو عقیدہ یا خیال ہزار دو ہزار برس سے کسی قوم میں چلا آتا ہو وہ غلط نہ ہو مثلاً بت پرستی کئی ہزار برس سے دنیا میں رائج ہے اور کروڑہا بندگان خدا اس پر دل سے یقین اور ایمان رکھتے ہیں۔ مگر پھر بھی یہ مسئلہ سراسر غلط ہے لہٰذا اگر کوئی عقیدہ ایسا ہو جس کو صدہا سال سے لوگ مانتے ہوں اور کروڑہا بندگان خدا کا اس پر یقین رہ چکا ہو تب بھی اس میں بہت کچھ تحقیق کی گنجائش ہے اور اس کے متعلق ایک بالتفصیل بحث کرنے کی جگہ موجود ہے، اس اصول متعارفہ سے فائدہ اٹھا کر ایک مشہور و معروف واقعہ کی جو تیرہ سو برس سے یکساں مسلم چلا آتا ہے۔ تحقیق کرنا چاہتے ہیں اگرچہ ہمیں یقین ہے کہ ہمارا جدید طرز استدلال اور عجیب و غریب تحقیق

دیکھ کر ناظرین چونک پڑیں گے، مگر ہم ان سے التجا کرتے ہیں کہ اگر انہوں نے نہایت صبر اور توجہ سے ہماری اس تحقیق کو دیکھا۔ تو کم سے کم ان کو اتنا ضرور فائدہ پہونچے گا کہ عظیم غلط فہمی جاتی رہے گی۔ اور تیرہ سو برس کے رازِ سربستہ کا انکشاف ہو جائے گا جس واقعہ پر ہم بحث کرنا چاہتے ہیں اس کا تعلق حضرت امام حسین علیہ السلام کی شہادت سے ہے۔ ایک طولانی اور گہری تحقیق کے بعد ہمیں اس بات کا پتہ لگ گیا کہ حضرت امام حسین شہید نہیں ہوئے، اس جملہ کو پڑھ کر چونکنے کی کوئی بات نہیں۔ پہلے ہماری رام کہانی سُن لو۔ اس کے بعد اپنی رائے قائم کرنا۔ ہماری تحقیق کا سلسلہ سب سے پہلے سنیوں اور شیعوں کی حدیثوں سے شروع ہوتا ہے۔ سنیوں کی حدیثوں کی کتابیں تو اس واقعہ کی نسبت ایک حد تک خاموش ہیں ان کہیں کہیں کنایہ اور اشارات سے کام لیا گیا ہے۔ اور سنیوں کی جن احادیث میں حضور انور رسولخدا صلے اللہ علیہ وسلم کی شہادت کی نسبت پیشین گوئیاں درج ہیں وہ حدیثیں سب کی سب یا تو موضوع ہیں۔ یا ضعیف اور اگر کسی حدیث کو مرتبہ حسن نصیب ہو اتبھی ہے رحالانکہ یہ مرتبہ حدیث کے لئے کوئی اعلیٰ درجہ کا نہیں ہے) تو بھی اس حدیث سے کوئی صاف روشنی شہادت کے واقعہ پر نہیں پڑتی، اب رہیں شیعوں کی کتبِ احادیث اُن میں شہادت کے واقعہ کے متعلق متضاد روایتوں کا وہ طومارِ بے تمیزی جمع کیا ہے جس سے دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی علیحدہ نہیں ہوتا۔ اس کے بعد ہم تاریخوں پر نظر ڈالتے ہیں تو ان میں اس بلا کا اختلاف ہے کہ سمجھ میں نہیں آتا کہ کس بات کو مانیں اور کس بات کو نہ مانیں۔ مورخوں نے جیسا کہ عام دستور ہے مثل بے وقوف بھیڑوں کے ایک دوسرے کی تقلید کی ہے۔ مگر کسی بڑے سے بڑے مورخ کو بھی یہ بات نصیب نہیں ہوئی کہ بجائے خود روایتوں کے جانچنے

کا ایک صحیح معیار قائم کرنا اور تقلید کی پٹی کو آنکھوں سے کھول دیتا جو معیار طبعیات
کے کہ تاریخی واقعات کو جانچنے کا قائم کیا ہے اس معیار سے اگر جانچا جائے
کا تو شہادت کے متعلق ایک واقعہ کی بھی صحت کا ہونا ناممکن محض ہے۔

یہاں تک تو صحیح ہے کہ حضرت امام حسین سخت پریشان ہو کر مدینہ سے مکہ میں تشریف لائے اور وہاں آپ کے پاس شیعیان علیؓ کے دستخطی صدہا خطوط بلاوے کے آئے۔ آخر آپ عبداللہ ابن عباس اور عبداللہ ابن عمر کے سمجھانے سے بھی باز نہ آئے اور بال بچوں کو لے کر سیدھے شام کی طرف روانہ ہو گئے۔ جب آپ مقام سہ ریف پر پہونچے، تو حر عبیداللہ ابن زیاد کا سپہ سالار دو ہزار سواروں کے ساتھ نمودار ہوا جب امام حسین نے یہ دیکھا کہ مجھے سواروں نے گھیر لیا ہے تو آپ نے حرؓ سے کہا کہ تم ہی لوگوں کا بلایا ہوا آیا ہوں مجھ کو واپس چلا جانے دو حر نے جواب دیا کہ میں ایک گورنر کوفہ کے حکم کو نہیں ٹال سکتا۔ تو حضرت نے تین شرطیں پیش کیں ایک شرط تو یہ تھی جیسا کہ ابوالفدا وغیرہ نے لکھا ہے کہ مجھے ادھر ادھر گھاٹیوں میں چلا جانے دو۔ دوسری شرط یہ تھی کہ مجھے یزید کے پاس لے چلو۔ حر نے یہ تینوں شرطیں عبیداللہ ابن زیاد کے پاس لکھ کر بھیج دیں وہاں سے حکم آیا کہ ہم منظور نہیں کرتے۔ حر نے ابن زیاد کا حکم امام حسینؓ کو پڑھ کر سنا دیا۔ آپ کو بہت صدمہ ہوا اور آپ نے ایک دن کی مہلت جنگ سے مانگی چنانچہ مہلت دیدی گئی۔ شب کو پوشیدہ طور پر حضرت امام حسینؓ اور حر کی ملاقات ایک خیمہ میں ہوئی، بڑی قیل و قال کے بعد یہ امر طے پایا کہ آپ مستورات اور بچوں کو چھوڑ کر یا دو تین آدمی جیسا مناسب ہو ساتھ لے کر قسطنطنیہ کی طرف چلے جائیں آپ کی مستورات کی حفاظت کا میں ذمہ دار ہوں۔ حضرت امام حسینؓ نے یہ فرمایا کہ غیرت تقاضہ نہیں کرتی کہ اپنے بچوں اور عورتوں کو دشمن کے پنجہ میں چھوڑ کر چلا جاؤں حر نے کہا اس وقت آپ تنہا اپنے کنبہ کی حفاظت نہیں کر سکتے اور اگر آپ نے پانچ ہزار فوج کے مقابلہ میں تلوار اٹھائی اور میدان میں مارے گئے۔

تو اسے ناقتل بطور خودکشی کے سمجھنا چاہیئے۔ کیونکہ آپ یزید سے جنگ مدافعت نہیں لڑتے بلکہ اس پر آپ حملہ کرکے آئے ہیں۔ چنانچہ جو کچھ میں کہتا ہوں۔ اُسے گوش گزار کرلیجئے۔ آپ کے اور آپ کے خاندان کے لئے یہی بہتر ہے۔ چنانچہ حضرت امام حسین علیہ السلام نے منظور کرلیا اور آپ حُرمتِ مستورات کی حفاظت کا عہد کرکے اپنے چند بچوں کے ساتھ قسطنطنیہ چلے گئے دوسرے دن حُر چاہتا تھا کہ کسی طرح باقیوں سے لڑائی نہ ہو مگر ابن زیاد کے تشدد سے شمر جنگ کرنے کے لئے آمادہ ہو گیا اور حضرت امام حسینؑ کی غیر موجودگی میں عبداللہ ابن جعفر کے بیٹوں اور آپ کے بھائیوں اور بھتیجوں نے سختی سے مقابلہ کیا اور سب کے سب میدان جنگ میں کام آئے پھر یزیدی سپاہ کے افسروں نے کل مستورات کو بحفاظت دمشق پہنچا دیا۔ یزید نے ان کے ساتھ ہمدردی کی اور ان کو بہت کچھ دے دلاکر بحفاظت مدینہ پہونچا دیا۔ یہ ہماری سالہا سال کی تحقیق اور جانکاہی کا نتیجہ ہے جو ہم نے مسلمانوں کے سامنے پیش کیا ہم نے جو کچھ اس کے متعلق تحقیق کی ہے وہ ابھی محفوظ ہے انشاءاللہ ہم کتاب کی صورت میں آئندہ شایع کریں گے۔

یہ ہے وہ نیا شگوفہ جو مرزا حیرت کی جدت طرازی نے ہندوستان کی اسلامی دنیا میں چھوڑا ہے یہ ہے اس کی سرمایۂ ناز تحقیقات کا لب لباب جس کو ناظرین نے ملاحظہ فرمایا۔ ہم اس کو تسلیم کرتے ہیں کہ بعض واقعات جو نہایت ہی مشہور اور سینکڑوں برس سے سنیوں اور شیعوں میں نسلاً بعد نسلٍ منتقل ہوتے چلے آرہے ہیں۔ سرے سے بے بنیاد اور محض بے اصل ہیں۔ ہم اس کو بھی مانتے ہیں کہ طبقۂ علماء کے بڑے بڑے اراکین مفسرین ہوں یا محدثین ہوں مورخین ہوں یا دوسرے مصنفین متقدمین ہوں یا متاخرین ان کو یکے بعد دیگرے۔ بلا سوچے سمجھے نقل کرتے آئے ہیں اور ان کی صحت و غیر صحت کو معیارِ اُصول پر نہیں جانچا اور

تساہل اور تسامح کا نتیجہ یہ ہوا کہ یہ غلط اور بے بنیاد قصے عوام تو عوام، خواص کے اذہان
و قلوب میں ایسے راسخ اور استوار ہو گئے کہ اب ان کا انکار گویا بدیہات کا انکار ہے اور
شہید علیہ کو سمجھتے ہوئے ان کی تصحیح یا تردید ایک امرِ دشوار اور نسلِ انسانی کے دل و دماغ
سے ان کا ازالہ ناممکن نظر آتا ہے۔

لیکن دیکھنا یہ ہے کہ یا واقعہ شہادتِ سیدالشہداء بھی فرضی یا خود ساختہ افسانہ ہے
اور کیا اس کے وقوع کو بھی محالِ عقلی یا محالِ عادی سمجھ لیا جائے یا ہم ان محدثین اور مورخین
کو جو حدیث اور تاریخ کے امام مانے جاتے ہیں۔ کاذب و دروغگو مان لیں اور ان کی تالیفات
کو جن کے سوا ہمارے پاس معلومات کا اور کوئی ذریعہ و سہارا نہیں، انبارِ موضوعات
جانِ کذب و افتراء سے زیادہ وقعت نہ دیں۔ اور اس بات کو تسلیم کر لیں کہ اساتذہ و
فن کی تالیفات کا سارا سلسلہ وساوس و اوہام کا اور کورانہ تقلید کا نتیجہ ہے۔ تمام روایتیں
سرے سے غلط، راوی جھوٹے اور لکھنے والے کو چہ تحقیق سے نابلد تھے۔ تو ہم نہیں کہہ
سکتے کہ وہ سانحے واقعات جن کی واقعیت سے مرزا حیرت کو بھی انکار نہیں ہو سکتا تھا۔
ان کی صحت کہاں تک قابلِ اطمینان قرار پا سکتی ہے اگر کوئی مخالفِ اسلام وجودِ بانیٔ اسلام سے
انکار کر دے اور آنحضرت کے معجزات و واقعات کو مصنوعی اور من گھڑت افسانہ بنائے۔
کیونکہ موجودہ نسلوں نے نہ رسول اللہ کی زیارت کی نہ آپ کے معجزات کو آنکھوں سے دیکھا۔
بلکہ جو کچھ ان تک پہنچا وہ سب ان ہی محدثین اور مورخین کے ذریعہ سے۔ تو مرزا حیرت اور
اسکے مویدین اس کا کیا جواب دے سکتے ہیں کسی واقعہ کے فروعات میں اختلاف کا ہونا اس کے وجود
کی نفی اور اس کی اصلیت کے ابطال کی دلیل نہیں ہو سکتا۔ دنیا کی تمام تاریخیں اختلافات
سے پُر ہیں، خود اسلامی تاریخ کے واقعات اختلافات سے خالی نہیں۔ آنحضرت کی تاریخ
ولادت اور تاریخ رحلت ہی کو دیکھو کس قدر مشکوک و مشتبہ ہیں لیکن جو کچھ ہم تک پہنچا ہے۔ وہ
سب ان ہی محدثین اور مورخین کی مساعی حسنہ اور جہدِ بلیغ کے واسطے سے۔ اگر ان کی تحریریں

ایسے مہتم بالشان اور خاص واقعات کے متعلق بھی نا قابل اعتبار ہیں تو سارے واقعات کے مشتبہ اور نا قابل اطمینان ہونے میں کیا شک رہا۔ ؎

"قیاس کن زگلستانِ من بہار مرا"

مرزا حیرت نے امام عالی مقام کا قسطنطنیہ چلا جانا بہرحال کسی کتابی روایت سے ہی اخذ کیا ہے ورنہ اس کو کوئی الہامی طاقت حاصل نہیں تھی وراثتی واحد روایت پر قیاسی شواہد و دلائل قائم کر لئے ہیں ہم نہیں سمجھ سکتے کہ جس روایت کی بنا پر یہ تمہید اٹھائی گئی ہے وہ کیونکر صحیح ہے اور اس کی توثیق کے کیا ذرائع ہیں۔ مرزا نے مذکور نے جس کتاب کی اشاعت کا وعدہ کیا تھا۔ حیرت ہے کہ اس کو شائع کیوں نہ کیا تاکہ دیکھا جاتا کہ ان حجج و دلائل کی صحت کا جن کے استدلال پر مرزا کو اس قدر ناز اور دعویٰ تھا کیا معیار قائم کیا گیا ہے۔ اور اس کے پاس کون کون سی شہادتیں موجود ہیں اور ثقہ و غیر ثقہ راویان کی جرح و تعدیل کس طریقہ سے کی گئی ہے جس کے مقابلہ میں تمام متقدمین اور متاخرین کی تحقیق و تدقیق تقویم پارینہ خیال کر لی گئی مرزا حیرت کو اس جدت آفرینی سے اتنا فائدہ ضرور پہنچا کہ اس نے اخباری دنیا میں ہلچل ڈال کر شہرتِ عام حاصل کر لی تو اس کا روئے سخن شیعوں کی طرف تھا کہ اس اشتعال انگیز کارروائی سے ان کو برانگیختہ کیا جائے۔ مگر حضرات اہل سنت نے بھی مرزائے مذکور کی اس انوکھی تحقیق کے خلاف شیعوں سے زیادہ بردکشت میں حصہ لیا اس عام طوفانِ مخالفت کا یہ نتیجہ نکلا کہ اس کے ابطال و تردید میں متعدد رسالے لکھے گئے۔ اخبارات میں پرزور مضمون چھپے اور مرزا کو مناظرہ کے لئے چیلنج دیا گیا۔ اہل سنت کے دو رسالے جن میں مرزا کی خوب خبر لی گئی ہے۔ اس وقت ہمارے پیش نظر ہیں۔ ایک ابو البرہان مولوی سلطان الدین حسینا مبین ثانی النارنولی کا رسالہ "سلطان مبین"۔ دوسرا شاہ محمد حسن صاحب پھلواروی کا رسالہ "شہادت حسین" کہ ان دونوں بزرگواروں نے عالمانہ اور محققانہ بحث کر کے دنداں شکن جواب دئے ہیں۔

سب سے اول مرزا کو ان احادیث کی صحت میں جو آنحضرت صلعم نے پیشین گوئی شہادت کے متعلق ارشاد فرمائی ہیں کلام ہے اور لکھا ہے کہ یہ حدیثیں سب کی سب یا تو موضوع ہیں یا ضعیف اس کا جواب شاہ محمد حسن صاحب یہ دیتے ہیں۔

دیکھنا چاہئے کہ یہ پیشین گوئی شہادت کس قدر کثرت طرق سے مروی ہے۔ اگر اس پر تواتر معنوی کا بھی حکم لگایا جائے تو بے جا نہ ہوگا۔ حضرت امیر المومنین علی مرتضیٰ، حضرت امام حسینؓ، حضرت عبداللہ ابن عباسؓ، حضرت انس، حضرت امہات المومنین، حضرت عائشہ، حضرت ام سلمہ، حضرت زینب بنت جحش اور والدہ عبداللہ ابن عباس حضرت ام الفضل اس پیشین گوئی کے رواۃ ہیں اور ہر طبقہ کے محدثین اس کو اپنی کتابوں میں سند کرتے آئے ہیں۔ مثل امام احمد بن محمد بن حنبل۔ ابن ابی شیبہ۔ عبد ابن حمید کشی، ابو داؤد۔ ابن سعد، طبری، امام حاکم، عبدالرزاق، ابو نعیم۔ ابو یعلی۔ ابن عساکر۔ طبرانی خطیب۔ بیہقی وغیرہم رحمہم اللہ تعالیٰ اور پھر ان سے اکابرین محدثین اور علمائے محققین نقل کرتے آتے ہیں جیسے ابن تیمیہ، ابن قیم، نووی ابن صلاح۔ سبکی ابن سبکی، قاضی عیاض۔ بیضاوی، غزالی، ابن عربی، قرطبی ذہبی، مزی، ابن اثیر، ابن حجر عسقلانی۔ ابن حجر مکی عینی، سخاوی سمہودی شعرانی، جلال الدین سیوطی، شیخ علی متقی، شیخ عبدالحق۔ شاہ ولی اللہ۔ اور شاہ عبدالعزیز وغیرہم رحمہم اللہ اجمعین۔ اور کسی محدث نے ابتدائے زمانہ تالیف و تصنیفِ احادیث سے لے کر آج تک پیشین گوئی شہادت کو موضوع نہیں کہا بعضے طرق کا واہی یا ضعیف ہونا اور بات ہے۔ تمام طرق اور اصل واقعہ کو کسی نے موضوع یا غلط نہیں سمجھا۔ موضوعاتِ صغانی ابن جوزی۔ موضوعاتِ سخاوی، موضوعاتِ سیوطی، موضوعاتِ ملا علی قاری اور موضوعات

شعر کافی وغیرہم شائع اور ذائع ہیں مگر ان کتابوں میں اصل واقعہ کی حدیث
کو نہ موضوع کہا گیا اور نہ اشارتاً و کنایتاً کسی نے بھی اس پیشین گوئی کا انکار کیا
علمائے اندلس جو خاص بنی امیہ کی سطوت وجبروت میں تھے۔ وہ بھی اس واقعہ
کو نہ چھپا سکے اور اکابر محدثین اور علمائے اندلس مثل ابوعمرہ، امام قرطبی ابن حزم
حمیدی، ابن عربی مالکی، ابن عربی صوفی، ابن عبدربہ، مقری وغیرہم رحمہم
اللہ تعالےٰ اپنی تصانیف و تالیفات میں برابر شہادت امام حسین علیہ السلام کا ذکر
کرتے آئے اور ان کی کتابیں ہم لوگوں کے ہاتھوں میں موجود اور ذائع و شائع
ہیں (رسالہ شہادت حسین صفحہ ۴۰)

واقعات کی نسبت مرزا حیرت کو یہ حجت ہے کہ ان میں بے شمار اختلافات ہیں جو معیار طبیعات گذشتہ تاریخی واقعات کو جانچنے کا قائم کیا ہے، اس معیار سے اگر جانچا جائے گا تو شہادت کے متعلق ایک واقعہ کی بھی صحت کا ہونا ناممکن محض ہے، شاہ صاحب نے ثبوت شہادت کے روایتوں کے متعلق بھی جیسی کچھ عالمانہ اور محققانہ تنقید کی ہے وہ مسلمانوں کی ہدایت کے لئے کافی ہے، مولوی مفتی سلطان الدین صاحب عثمانی مرحوم نے مرزا حیرت کے اس حیرت انگیز خیال کا ابطال ایک اور ہی طریقہ سے کیا ہے چونکہ کتب احادیث اور تواریخ کے حوالہ جات سے مرزا کی تو تو میں میں بند ہونے کی امید نہ تھی۔ اس لئے مولوی صاحب نے آیہ کریمہ :۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِذَا لَقِيتُمْ فِئَةً فَاثْبُتُوا وَاذْكُرُوا اللَّهَ كَثِيرًا لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُونَ ۔	اے ایمان والو جب تم دیکھو کہ کوئی گروہ تم سے لڑنے کو آیا ہے تو ثابت قدم رہو اور خدا کو بہت یاد کرو شاید تم فلاح پاؤ۔

سے استدلال کرکے ثابت کیا ہے کہ جب خدائے قدوس نے اہل ایمان کے لئے یہ فرمان جبروت نشان نافذ فرمایا کہ جب تمہارا کسی گروہ سے مقابلہ ہو تو ثابت قدم رہو تو ایسا نہیں ہو سکتا۔ اور ہرگز

نہیں ہو سکتا کہ فرزند رسول خدا جس کو رہنمائے مسلمین اور پیشوائے مومنین کہنا اس کے لئے باعث افتخار نہیں بلکہ اہل ایمان و اسلام کا افتخار ہے اس حکم الٰہی سے مخالفت کر کے کوفیوں کے لشکر جنگی کے مقابلے سے ہٹ جائے اور جان بچا کر قسطنطنیہ کی طرف راہی ہو۔ اگر کوئی یہ حجت پیش کرے کہ یہ حکم کفار کے مقابلہ کا ہے اور کربلا میں مسلمانوں سے مقابلہ تھا اس مقام پر کیونکر منطبق ہو سکتا ہے۔ اس کا جواب ہے کہ اللہ تعالیٰ نے یہاں "اِذَا لَقِیْتُمُ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا" نہیں فرمایا جس سے یہ حکم مقابلہ کفار کے ساتھ مخصوص سمجھا جائے بلکہ "اِذَا لَقِیْتُمْ فِئَۃً" فرمایا اور فئۃ کا ترجمہ گروہ ہے جو عام ہے کہ کافر ہوں یا مسلم واجب القتال ہیں۔ اس لئے اس حکم میں معرکہ کربلا بلاشبہ داخل ہے۔ اس پر بھی اگر معترض یہ کہے کہ یہاں فئۃ سے مراد فئۃ کفار ہی ہے۔ کیونکہ یہ آیت حکایات معرکہ بدر کے ضمن میں ہے تو اس کا جواب یہ ہے کہ آیات قرآنیہ کا نزول تو مورد خاص میں ہوا ہے۔ مگر حکم ان کا عام مانا گیا ہے۔ آنحضرت ؐ کے زمانہ سے آج تک شریعت محمدیؐ میں یہی عملدرآمد ہے۔ اور ہزاروں مسئلہ اسی قاعدہ کی رو سے قرآن مجید سے اخذ کئے گئے ہیں۔ اس قاعدہ کی رو سے اگرچہ اس آیت کا نزول حکایت معرکہ بدر میں ہوا ہو۔ لیکن یہ حکم قیام قیامت تک ہر اس معرکہ قتال پر صادق ہوگا۔ جو مسلمانوں کے مقابلہ میں ہو یہ آیت جن آیات کے ذیل میں واقع ہے وہ آیتیں معرکۂ بدر سے پہلے۔ یا معرکۂ بدر کے وقت نازل نہیں ہوئیں کہ اس آیت کو جنگ بدر کی تعلیم سمجھ کر یہ کہا جائے کہ بدر میں معرکہ کفار سے تھا اس لئے فئۃ سے فئۃ کفار ہے۔ بلکہ وہ سب آیات جن میں یہ آیت داخل ہے حکایت معرکۂ بدر میں ہیں جس سے ظاہر ہے کہ یہ آیت بعد معرکۂ بدر نازل ہوئی کیونکہ کسی واقعہ کا بیان اس واقعہ کے وقوع کے بعد ہوا کرتا ہے اس لئے صاف طور پر ثابت ہو گیا کہ یہ آیت بعد معرکہ بدر جو اور معرکہ مسلمانوں کو پیش آنے یا قیامت تک پیش آئیں ان کے لئے تعلیم ہے اور اس تعلیم میں "اَلَّذِیْنَ کَفَرُوْا" نہیں فرمایا بلکہ فئۃ کا عام لفظ ارشاد ہوا ہے۔ تو اس آیتہ کے صاف معنے یہ ہوئے کہ اے ایمان والو جب تم کسی گروہ سے مقابل ہو خواہ وہ کافر ہوں یا مسلمان جن واجب القتال تو اس وقت تم ثابت قدم رہو، پھر آگے فرماتے ہیں۔

کہ چونکہ یہ مسئلہ تمام اہل سنت کا بالاتفاق مسلمہ ہے کہ معرکہ کربلا میں حسین علیہ السلام بر سر حق تھے اور جن لوگوں نے آپ کو شہید کیا وہ بر سر ناحق اس لئے کوفیوں کے واجب القتال ہونے میں کیا شبہ رہا۔

بہرحال اپنی عورتوں بچوں، بھائیوں بھتیجوں اور بھانجوں کو دشمنوں کے نرغہ میں چھوڑ کر صرف اپنی جان بچانے کے لئے روپوش ہو جانا ایسا حقارت آمیز ننگ و عار ہے۔ جسے کوئی معمولی شخص بھی بشرطیکہ اس کو غیرت اور شجاعت کا احساس ہو گوارا نہیں کر سکتا۔ چہ جائیکہ رسول خدا کا نواسہ شیر خدا کا بیٹا جس کو تمام فضائل اخلاق اپنے جد بزرگوار اور پدر عالی مقدار سے میراث میں پہنچے ہوں اور جس کے رگ ریشہ میں غیرت اور شجاعت خون کی طرح دوڑ رہی ہو اس دائمی ذلت و حقارت کو منظور کر لیتا۔ یہ مرزا حیرت جیسے ہی لوگوں کا کام ہے کہ فرزند سید المرسلین کی تحقیر و توہین کو اپنے خیال باطل میں نئی تحقیق اور نیا انکشاف سمجھ کر اس پر نازاں ہوں ورنہ ہر مسلمان خیال کر سکتا ہے کہ حسینؑ جیسے غیور و شجاع سے جو تمام اخلاق و فضائل میں اپنی جد نامدار کا بہترین نمونہ تھے ایسی بے حمیتی بے جبنی اور بزدلی کا سرزد ہونا محال عادی کیا محال عقلی ہے۔ (فافہم وتدبر)

چونکہ یہ بحث طوالت طلب ہے اس لئے ہم مجبوراً اسی پر اکتفا کرتے ناظرین کو توجہ دلاتے ہیں کہ جس کا جی چاہے وہ رسالہ سلطان سبین۔ مولوی سلطان الدین صاحب نارنولی۔ کتاب شہادت حسین۔ شاہ محمد حسن صاحب پھلواروی اور رسالہ ثبوت۔ شہادت مولوی محمد ہارون صاحب نگی پوری کو جو مرزا کے جواب میں تحریر ہوئی ہیں ملاحظہ کر کے اپنا اطمینان کر لے اور اس امر کو سمجھ رکھے کہ اگر مرزا حیرت جیسے لاکھ مخالف پیدا ہو کر اس شہادت کی واقعیت کو مٹانے میں سر توڑ کوشش کریں گے، تو اپنی مساعی لاحاصل میں کامیاب نہیں ہو سکتے۔ مرزا حیرت سے ایسے نازک زمانہ میں جب کہ مسلمانوں کا رشتہ تعلقات باہمی روز بروز کمزور اور نااتفاقی کی خلیج وسیع ہوتی جاتی ہے، ایک عبث اور فضول بحث کو چھیڑنا کس قدر

افسوسناک حرکت ہے۔ کاش مرزائے مذکور نے اپنے دماغ اور وقت کو کسی ایسے کام میں صرف کیا ہوتا جس سے قوم کو نفع پہونچتا تو کس قدر اچھا ہوتا۔ مگر وہاں تو مطلب سعدی دیگر است مقصود تو تھا کہ شیعوں اور سنیوں کو لڑوا دیا جائے اور یہ صورت اسی ایجاد بندہ اگر کند دے سے ہو سکتی تھی اس لئے اپنی ڈہائی اینٹ کی مسجد الگ ہی بنائی مگر اس کا خیال غلط نکلا شیعہ اور سنی آپس میں الجھنے کے بدلے اُسی سے لپٹ پڑے۔

حضرت ہیں ہی یقین ہے صبوحی کشانِ عشق ؎ اک میکدہ جدا لب کوثر بنائیں گے

ذکر حسینی سے مخالفت

اس وقت جب کہ آفتاب علم نے اُفق مغرب سے سر نکالا ہے اور صدیوں کی تاریکی جہالت کے بعد ہر جگہ علم کا اوجالا پھیل گیا ہے۔ اس میں اولوالعزم عالی ہمت اور قومی جاں نثاروں کی تصویریں جن کی بے انتہا کوشش اور سرفروشیوں کی نسل انسانی ممنون ہے، ہم کو صاف نظر آتی ہیں۔

ہم میں ہزاروں ایسے بھی ہیں جو ان کی تاریخی حالات کا مطالعہ اپنا خاص مشغلہ سمجھتے ہیں اور ان کی خیالی تصویروں کے نظارہ سے ان کا جی نہیں بھرتا کتابوں کی ورق گردانیاں ان کے قلوب پر ایک خاص اثر ڈالتی ہیں یہاں پر ہم مثالاً نپولین اعظم شاہنشاہِ فرانس اور قیصر ولیم شاہنشاہ جرمنی کو پیش کرتے ہیں جن کی مثال نے یورپین دنیا میں علو ہمتی کی روح پھونک دی اور درحقیقت ان کی بہادری، عالی ہمتی۔ بلند خیالی اولوالعزمی حیرت انگیز اور قابل حسنت ہے۔

نپولین کے اس جملہ کی کہ دنیا میں کوئی بات ناممکن نہیں تمام دنیا مشکور ہے اور اسی جملہ کی بدولت بہت سے مشکل کام نہایت ہی آسانی سے انجام پا گئے ہیں۔

لیکن دنیا نے اس کو صفحۂ ہستی سے ایسا مٹا یا کہ جب ہم کو کتاب دیکھنے کا موقعہ ملتا ہے یا ہم دنیا وی ترقی خواہوں کی سوسائٹی میں چلے جاتے ہیں تو اس کا تذکرہ سنتے ہیں۔ مگر ہم نپولین کا نام سنتے ہی نہیں اگر اس کے بعد ہم کو تلاش ہوتی ہے تو کسی صفحہ کاغذ پر اس کی تصویر مل جاتی ہے جس کو دیکھ کر ہمارے منہ سے نپولین کا نام نکلتا ہے اور اگر یورپ کا سفر کریں تو اس کے اسٹیچو پیرس، لندن روم وغیرہ میں ملتے ہیں اور دریافت کرنے پر کوئی ہم کو پتہ دیتا ہے کہ یہ نپولین کا سنگین بت ہے، اگر زیادہ سے زیادہ اس کی قبر تک پہونچ جائیں۔ تو تھوڑی دیر کے لئے مجملاً اس کے کارنامے ہمارے دل و دماغ میں گھومنے لگتے ہیں۔

قیصر ولیم کے کارنامے نپولین اعظم سے کہیں بڑھ چڑھ کر ہیں گو آج اس کی مخالفت کا مادہ سارے یورپ میں ساری ہے، مگر وہ وقت دور نہیں ہے ممکن ہے اس کی عزت نپولین سے زیادہ کی جائے۔ تاہم نتیجہ اس کا بھی وہی ہوا اور ہوگا جو نپولین کا ہوا۔ افسوس کیسے کیسے شاہان اولوالعزم کیسے کیسے بہادران قوم کیسے کیسے حکما و فلسفی، کیسے کیسے نبرد آزما، کیسے کیسے ریاضی داں ہیئت داں دنیا کی اسٹیج پر آکر کیسے کیسے دلفریب اور حیرت افزا ایکٹ کر گئے، اور پھر خاک کے پیوند ہو کر اس میں اس طرح ملے کہ ڈھونڈے ان کا پتہ نہیں ملتا، اکثر کا تو نام و نشان بھی نہیں گویا دنیا میں آئے ہی نہ تھے یا دنیا میں آکر کچھ کیا ہی نہ تھا جن کے نام یادگار رہیں ان کو اپنے کارہائے نمایاں کا صرف یہ صلہ ملا۔ کہ تاریخی صفحات پر ان کے نام درج ہو کر صندوقچہ یا الماری میں بند کر دیئے گئے ایک انگریز لکھتا ہے:۔

"جب میرا دل گھبراتا ہے تو میں ویسٹ منسٹرایبی میں (جہاں انگلستان کے مشاہیر قوم مدفون ہیں) چلا جاتا ہوں، بڑی بڑی اونچی قبریں خواہ وہ پتھر کی ہوں یا تانبے کی مجھ سے اپنے مدفون کے متعلق صرف اتنا کہہ دیتے ہیں کہ یہ شخص فلاں دن پیدا ہوا۔ اور فلاں دن مرگیا اور بس یہی اس کی یادگار ہے"۔

افسوس کوئی ان کا نام لیوا بھی نہیں، اور ہے بھی تو ان ہی صورتوں میں جو ہم نے نپولین کے

بارہ میں بیان کئیں۔

لیکن اگر ہم غور سے دیکھیں اور تاریخی یادگاروں پر گہری نظر ڈالیں اور اپنے ضمیر کو اپنا رہبر بنالیں تو ان ہی تاریخوں صفحوں پر ایک ایسی مثال بھی ملے گی جو اپنی نوعیت میں بے مثال ہے اور اس کا ہیرو ایسا بہادر مستقل مزاج، اولوالعزم اور جاں نثارِ قوم و ملت تھا کہ آج اس کو دنیا سے اُٹھے ہوئے تقریباً تیرہ سو برس گزر چکے، تاہم اس کا ذکر ہماری وردِ زباں ہے۔ اس ذکر میں ہماری کوئی غرض نہیں ہوتا ہم اپنی خوبیوں کے سبب سے وہ نام خود بخود بلا ارادہ زبان تک آہی جاتا ہے ہم نہیں یاد کرتے وہ زبردستی یاد دلاتا ہے۔ ہم بھاگتے ہیں اور وہ ہمارے ساتھ ساتھ ہے اور کچھ تو ایسے بھی ہیں جو اس وقت سے برابر کوشش کر رہے ہیں کہ یہ ذکر ہمارے سامنے سے کیا، بلکہ دنیا سے اُٹھ جائے۔ مگر یہ چمکتی ہوئی روشنی آفتابِ نصف النہار کی طرح سب کی آنکھوں کو خیرہ کر دینے والی ہے وہ کونسا ذکر ہے (ذکرِ حسینؑ) کون حسینؑ۔ خدا کا عاشقِ جانباز، راہِ معبود میں مٹ جانے والا۔ حامیٔ اسلام اور اس کو دنیا میں قائم رکھنے والا کیا کیا کوششیں اس نام اس غم کے مٹانے میں نہیں کی گئیں کون کون سی تدبیریں ہیں جو اس ذکر کو نسیاً منسیاً کرنے میں اٹھا رکھی گئیں۔ اسلام کے ایک مشہور بزرگوار کی نسبت شیخ ابن حجر مکی صواعق محرقہ میں لکھتے ہیں۔

وَقَالَ الغزالی وغیرہ ویحرم علی الواعظ روایۃ مقتل الحسن وَالحسین وَحکایتھا مَاجری بین الصَّحابۃ من المشاجر والتخاصم فانہ یھج علی بغض الصَّحابۃ وَالطعن فیھم۔

امام غزالی وغیرہ فرماتے ہیں کہ حالاتِ مقتلِ حسنینؑ اور واقعات مشاجرات و مخاصمات صحابہ کا بیان کرنا واعظ وغیرہ پر حرام ہے کیونکہ بے شک ایسی باتیں بغض و طعن صحابہ پر برانگیختہ کرتی ہیں۔

لیکن اس حق کے فدائی اور راہ راست کے ہادی نے کس طرح اور کس عالم میں اپنا فرض ادا کیا اور کیسا مقناطیسی اثر اپنے نام کے ساتھ چھوڑا۔ کہ آج اس کے مخالف بھی۔ اس کے

نام کو چمکانے کی کوشش کرتے ہیں اور اس کے نام لیواؤں کے ساتھ علم اور تعزیہ کے آگے پیچھے حسین حسین کہتے چلے جاتے ہیں، وہ کون سا جادو ہے، جو تیرہ سو برس سے آجتک باوجود ہزارہا انقلابات کے دنیا کے اس سرے سے اُس سرے تک کام کررہا ہے جس کا اثر نسلاً بعد نسلٍ جوں جوں دنیا شائستہ اور مہذب ہوتی جاتی ہے ایک نئی ادا اور ایک نئی شان سے دنیا کی اسٹیج پر دلوں کو مسخر کرتا ہوا بڑھتا چلا جارہا ہے وہ جادو حسینؓ کا وقتِ نزع جب کہ جلاد خنجر پھیر رہا تھا۔ اپنے خشک ہونٹوں کو حرکت دینا تھا وہ حرکت کیا تھی ان الفاظ کا نکلنا تھا

"خداوندا میں نے اپنا وعدہ پورا کیا چونکہ تو صادق الوعد ہے اب تو اپنا وعدہ ایفا کر میری جدامجد کی امت کو بخش دے شکر ہے کہ میں تیرے دربار میں سُرخرو حاضر ہوتا ہوں"

حق یہ ہے کہ یہ کام کربلا کے ہیرو کا ہی تھا اسلام ہمیشہ اس کا ممنون رہے گا۔ آج اسلام کا نام باقی نہ رہتا مگر اسی کی ذاتِ عالی تھی کہ آج اس کے طفیل میں ہم اسلام کی سیاسی اور مذہبی عزت دیکھ رہے ہیں یہی وجہ تھی کہ رسولخداؐ حسینؓ کی عزت کرتے تھے اور حُسَینٌ مِنِّی وَاَنَا مِنَ الحسین بار بار فرماتے تھے۔

جب سے کرۂ ارض پر انسانی نسل کا نشوونما ہوا بے شمار حادثات و واقعات رونما ہوئے اور جب تک یہ دنیا قائم ہے یہ سلسلہ بھی یوں ہی جاری رہے گا۔ مگر دنیا میں آج تک کوئی ایسا ہیرو ایسا بہادر ایسا حامیٔ مذہب ایسا مستقل مزاج ایسا عاشقِ باری زمانہ نے نہیں پیدا کیا جس کی یادگار دوسری قومیں بھی قائم کرتی ہوں اور اس کے لئے اپنا مال لٹاتی ہوں البتہ یہ شرف اور یہ درجہ قدرت نے صرف حسینؓ کو ہی بخشا حسینؓ ہی دنیا میں وہ فردِ کامل گذرا ہے جس کی نظیر لانے سے دورِ زمانہ کی سالانہ اور روزانہ گردشیں قاصر ہیں ہم اپنی آنکھوں سے دیکھتے ہیں کہ حسینؓ کے دوست تو دوست ہی ہیں اس کے مخالف اور وہ قومیں جن کو حسینؓ کے خدا حسینؓ کے نانا حسینؓ کے مذہب اور خود حسینؓ سے کوئی سروکار

نہ حسینؑ کی عالی ہمتی اور بلند عزم کی مالا جپتی ہیں اس کے مصائب پر روتی ہیں اس کی یادگاریں قائم کرتی ہیں اور بڑے خلوص و اعتقاد سے اس کے نام پر اپنا روپیہ اور اپنا وقت صرف کرتی ہیں جس کا اس شعر کا

ہرگز نمیرد آنکہ دلش زندہ شد بعشق ٭ ثبت است بر جریدۂ عالم دوامِ ما

عملی ثبوت ملتا ہے کیا کسی کی یہ طاقت ہے کہ حسینؑ کے اثرِ مظلومیت کو صفحۂ ہستی سے مٹا دے۔ کیا کسی کا یہ خیال ہے کہ اس عظیم الشان واقعہ کو ایک عالم کے دل سے محو کر دے ایسی فضول کوشش ہرگز بارآور نہ ہوگی گو ایسے لوگ ہمیشہ رہے اور اب بھی ہیں جو ذکرِ حسینؑ کی مخالفت کو اپنا مقصد سمجھتے ہیں لیکن صدیوں کا تجربہ ہم کو بتا رہا ہے کہ حسینؑ کے ساتھ جوشِ عقیدت اور جوشِ محبت و ہمدردی ہمیشہ غالب رہا اور اب بھی باوجود طرح طرح کی مخالفتوں اور مزاحمتوں کے ذکرِ حسینؑ اس جہاز کی طرح جو سخت طوفان کے بعد نسبتاً کمزور تلاطم میں خوشنمائی سے پانی کو چیرتا ہوا چلا جائے روز افزوں ترقی پر ہے۔

باوجودیکہ کوئی ظاہری قوت محرک نہیں نہ خود حسینؑ دنیا میں موجود ہے۔ نہ ان کا کوئی وکیل ہے جو باقوت و صولت سمجھا جائے اور نہ کسی سلطنت کا دباؤ اور دبدبہ ہے نہ کسی قسم کی حصولِ دولت کی طمع ہے بایں ہمہ ایک عالم ہے کہ تنہا اس امر پر مجبور ہے کہ وہ حسینی واقعات پر ہر سال بلکہ ہر مہینہ بلکہ ہر ہفتہ بلکہ ہر روز بلکہ ہر ساعت روشنی ڈالتا رہے کوئی حسینؑ کے واقعاتِ شہادت کے نظم میں مصروف ہے کوئی اُسے نثر میں ادا کرنے کی کوشش کر رہا ہے کوئی اُسے بیان کرنے کی سعی میں مصروف ہے کوئی مصائب پر رو رہا ہے کوئی ماتم کر رہا ہے کوئی سر پر خاک ڈالے ہوئے ہے کوئی مشہدِ حسینی کی زیارت کا تہیہ کرتا ہے کوئی تعزیہ علم ضریح کی درستی میں مشغول ہے کوئی اہتمامِ مجالس میں ہمہ تن منہمک ہے غرض ایک عالم ہے کہ حسینی ارادوں کو پورا کرنے میں اس طرح سرگرم ہے گویا خود حسینؑ سامنے موجود ہیں اور وہ حکم دے رہے ہیں اور واجب الامتثال حکم دلوں کو مسخر کیے ہوئے مسلسل کام لے

رہا ہی حالانکہ فی الواقع ایسا نہیں نہ خود حسین اس وقت دنیا میں بہ ظاہر موجود ہیں۔ نہ کوئی ظاہری قوت کسی قسم کا دباؤ ڈال رہی ہے۔ نہ تبین طور پر کوئی امید نفع عاجل کی نظر آتی ہے۔ بلکہ بجائے نفع کے بہت زیادہ مقدار میں اپنا مال خرچ ہوتا ہی اپنا وقت صرف ہوتا ہے جس کا حسی معاوضہ کچھ بھی دکھائی نہیں دیتا تو کیا آپ خیال کرتے ہیں کہ یہ تمام کام بلا سبب اور بلا کسی زبردست باطنی تحریک کے انجام پا رہے ہیں ہرگز نہیں بلکہ ان تمام کاموں کی محرک ان تمام امور پر بقوتِ قاہرہ قلوب عامہ کو مسخر کرنے والی صرف وہ خدائی مشیت ہے جو سب پر غالب ہے۔

یہ امر بتجرباتِ کثیرہ اور مشاہداتِ روزمرہ سے متیقن ہو چکا ہے کہ اس بارہ سو برس کے اندر جس نے یہ کوشش کی کہ حسینی آثار کو مٹا دے یا کم سے کم اس میں کمی ہی پیدا کر دے وہ خود منہ کے بل گرا اور اپنی سعی بے سود اور جہد لاحاصل میں ناکام رہا۔ یاد کرو ان سلاطینِ اسلام کے دور جن کے ہاتھ میں عرب و عجم اور تمام شمالی افریقہ کی باگ تھی جن کی سطوت و ہیبت سے دوسرے تاجدارانِ عالم خائف و لرزاں تھے جب ان لوگوں نے یہ قصد کیا کہ حسینی اثر کو جو عالم میں پھیلا ہوا ہی مٹا دیں اور انہوں نے اپنی ایڑی چوٹی تک کا زور صرف کر دیا تو آخر کیا نتیجہ ہوا یہی ناکہ خود فنا ہو گئے ان کی عظیم الشان سلطنتیں نیست و نابود ہو گئیں ان کے تخت اوندھے ہو گئے اور وہ ایک تاریک غار میں بند کر دئے گئے مگر حسینی آثار و اذکار پر ذرہ برابر بھی اثر نہ پڑا۔ وہ جس طرح اس وقت تھا اسی طرح آج بھی موجود ہے بلکہ اس سے بھی کہیں زیادہ۔ اس لئے وہ اہل دنیا جن کے پاس نہ شان و شوکت ہے نہ سلطنت نہ دولت ہی نہ زور نہ قوت، نہ علم و عمل نہ فوج ہی نہ حشم۔ اس امر کے ساعی نظر آتے ہیں کہ امامِ مظلوم کے آثار پر برا اثر ڈالیں اور دنیا کی اس سب سے بڑی شہادت کو غلط اور بے بنیاد ثابت کر دیں وہ کیا کر لیں گے سوائے اس کے کہ ندامت سے سر جھکا لیں اور ذلیل و خوار ہوں شاید ان لوگوں کو یہ معلوم نہیں "باآل نبی ہر کہ درافتاد برافتاد"

واقعاتِ شہادت میں اختلاف

اور اُن کے اسباب

حضرت امام حسینؑ کی دردانگیز شہادت کا افسوسناک حادثہ جس طرح تاریخ عالم میں عموماً اور تاریخ اسلام میں خصوصاً عدیم المثال سمجھا جاتا ہے اس سے زیادہ تعجب خیز اس واقعہ کی روایتوں کا اختلاف ہے، عام کتابوں سے قطع نظر کرکے فریقین کی وہ مستند کتابیں جو اسلامی تاریخ کی جان سمجھی جاتی ہیں اس قدر مختلف البیان ہیں کہ دیکھنے والے ششدر رہ جاتے ہیں کوئی لائق سے لائق مورخ بھی. کیسے ہی معقول وسائل و ذرائع فراہم کرے مجتہدانہ رائے قائم کرنے کی جرأت نہیں کرسکتا۔ اگرچہ متقدمین و متاخرین کے لائق مصنفوں نے نہایت جانکاہی سے رطب و یابس کے چھانٹنے میں حتی الوسع کوشش دسعی سے کام لیا ہے۔ تاہم تحقیقی رائے اور فلسفیانہ اجتہاد کے کافی ہوجانے کی وجہ سے توجہ بہت دشوار ہے۔

واقعات کربلا کے بیان سے سینکڑوں کتابیں بھری پڑی ہیں لیکن اگر دو مستند سے مستند کتابوں کو بھی سامنے رکھ کر دیکھا جائے تو تمام واقعات کی تحریریں اول سے آخر تک متفق اللفظ نہیں ایسی حالت میں اگر ہم فلسفہ تاریخ کے اصول کو پیش نظر رکھ کر ان واقعات کو معیارِ حقیقت پر جانچیں تو کہاں تک اور کس کس روایت کی صحت و غیر صحت پر حجت و استدلال سے کام لیں واقعاتِ کربلا کے دوران تحریر میں ہم نے مقتل ابومخنف لوط ابن یحیٰی ازدی، تاریخ کبیر ابوجعفر طبری، مروج الذہب مسعودی۔ تاریخ کامل ابن اثیر۔ تاریخ ابن خلدون، تاریخ ابوالفدا، تاریخ اعثم کوفی، دُوَلِ اسلام ذہبی۔ تاریخ الخلفاء سیوطی، عیون والحدائق، اخبار الدول قربانی، تاریخ ابن واضح عباسی، فتوح البلدان بلاذری کتاب معارف ابن قتیبہ۔ اعلام الوریٰ۔ اعلام الاعلام۔ تذکرہ خواص الامۃ ابن جوزی، نجوم الزواہر، مرآت الجنان یافعی۔ شرح شافیہ ابی فراس تاریخ

معینی. صواعق محرقہ ابن حجر مکی، شرح سفر السعادۃ شیخ عبدالحق محقق دہلوی. سرالشہادتین شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی. مفتاح النجات فی مناقب آل عبا مرزا معتمد خاں بدخشی. تذکرہ قرطبی وفیات الاعیان قاضی ابن خلکان. مناقب السادات قاضی شہاب الدین دولت آبادی. تاریخ ابی خاتم مکی، روضۃ الصفا خاوند شاہی، روضۃ الشہداء ملا حسین کاشفی. مسند ابن عساکر. مطالب السئول فی مناقب آل رسول کمال الدین شافعی، جمع الجوامع سیوطی، فردوس الاخبار دیلمی. معجم سنیہ طبرانی، دلائل النبوۃ بیہقی، ینابیع المودۃ شیخ الاسلام سلیمان قندوزی اسلامبولی سیرۃ ابی الملک کلبی، نورالابصار شیخ شبلنجی المصری، جواہر العقدین، علامہ نورالدین. نورالعین فی مشہد الحسین ملا ابواسحاق اسفرائنی. مناقب حافظ ہمدانی. سعادت الکونین فی فضائل الحسنین مفتی اکرام الدین خاں دہلوی وسیلۃ النجاۃ ملا مبین لکھنوی از اہل سنت، کتاب مناقب ابن شہر آشوب. کتاب اقبال سید ابن طاؤس، کتاب لہوف سید ابن طاؤس. کتاب امالی شیخ صدوق، کتاب امالی علامہ طوسی، کتاب عوالم عبداللہ ابن نوراللہ، بحار الانوار علامہ مجلسی، حیات القلوب علامہ مجلسی، ناسخ التواریخ، مرزا محمد تقی سپہر کاشانی. جلاء العیون عبداللہ بن محمد مقتل ابن شہر آشوب، طوفان البکاء جوہری. کتاب خرائج قطب راوندی. مثیر الاحزان جعفر ابن نما. بشارۃ المصطفیٰ شیخ عماد الدین طبری. مصباح المتہجد ابوجعفر بن حسن طوسی، منہاج الصلاح علامہ حلی. محرق القلوب آقا مہدی نراقی، مجالس المتقین ملا محمد تقی برغانی. مخزن البکاء ملا محمد صالح قزوینی، اسرار الشہادۃ اخوند ملا آقا دربندی منتخب شیخ فخرالدین طریحی، قمقام الزخار شہزادہ فرہاد مرزا، ریاض الشہادۃ ملا محمد حسین قزوینی الکلیل المصائب محمد بن سلیمان تنکابنی، مجالس مفجعہ سید العلماء لکھنوی، مقاتل الطالبین ابوالفرج اصفہانی کامل الزیارۃ ابن قولویہ، کشف الغمۃ علی بن عیسیٰ اربلی، کتاب ارشاد شیخ مفید، کتاب المزار سید مرتضیٰ علم الہدیٰ، انوار النعمانیہ سید نعمت اللہ جزائری ماتین فی مقتل الحسین مولوی غلام حسین کنتوری، مہیج الاحزان اخوند ملا حسن یزدی، بحر المصائب

مولوی امداد علی لکھنوی (شیعہ) کو دیکھا مگر سب میں اس قدر اختلافات پائے کہ اس کے خیال سے بھی دماغ چکراتا ہے۔

آخر اسلامی واقعات کے اس سب سے بڑے اور مہتم بالشان حادثہ کی نوعیت اس قدر ڈانواں ڈول اور سلسلۂ روایات کے لاانتہا مختلف البیان ہونے کی کیا وجہ ہے۔ تمام دنیا کی قوموں میں مسلمان اپنی قومی تاریخ کی صحت پر جس قدر ناز کریں تھوڑا ہے مسلمانوں نے ہی تاریخ کو بہ حیثیت فن زندہ کیا۔ پھر کیا سبب ہے کہ یہ مشہور سانحہ جو ہر سال مسلمانوں میں گھر گھر بیان کیا جاتا ہے اور ان کے نبی کے خاص خاندان اور ذریت سے تعلق اور سیاسی نہیں بلکہ ایک بڑی حد تک مذہبی شان رکھتا ہے اس قدر مشتبہ اور مشکوک ہے۔

اس اہم مسئلہ پر جہاں تک غور کیا جاتا ہے بظاہر اس کی وجہ یہ معلوم ہوتی ہے کہ مردان اہل بیت اور انصار امام سب میدان کارزار میں کام آچکے تھے۔ سید الساجدین حالت بیماری میں خیمہ کے اندر تھے حسن مثنیٰ یا دو لوگ جو درجہ شہادت پر فائز نہ ہوئے ان سے کوئی واقعہ مروی نہیں اور اگر ہے تو شاذ۔ فوج مخالف کے جو لوگ کوفہ میں آئے انہوں نے جس طرح ان خبروں کو مشہور کر دیا ویسے ہی شہرت پذیر ہو گئیں چونکہ یہ حادثہ نہایت عظیم الشان تھا اس واسطے بہت جلد اس کا اعلان و اشتہار ہو گیا جس شخص نے جیسا سنا دوسرے سے اور دوسرے نے تیسرے سے بیان کر دیا بیان واقعات میں سے کسی راوی سے سہو ہوا کسی کے طرز بیان نے واقعہ کی اصلیت کو افراط و تفریط سے مسخ کر دیا۔ کسی کو راوی کا اصل مدعا سمجھنے میں غلط فہمی ہوئی کسی نے واقعہ کو پُراثر بنانے کے لئے مبالغہ سے کام لیا، کسی نے شدت احتیاط سے واقعہ مغرالامری کو نامعتبر سمجھا۔ اور اس میں اپنے خیال کے مطابق کمی کر دی اور ایسا ہونا کچھ تعجب خیز بھی نہیں کیونکہ مشاہدہ خود اس کا شاہد ہے اگر کسی جگہ کوئی واقعہ رونما ہوتا ہے، تو اس کے متعلق طرح طرح کے مختلف متضاد افواہیں مشہور ہو جاتی ہیں۔ زید کچھ کہتا ہے تو بکر کچھ اور۔ اس کے علاوہ عہد بابنی

طبعزاد تراشی گئیں واقعات کی تدوین عرصۂ دراز کے بعد ہوئی۔ اسوقت تک یہ سب واقعات سینہ بسینہ منتقل ہوتے چلے آئے اور تغیر الفاظ کے ساتھ مفہوم میں بھی تغیر پیدا کرتے رہے جب مولف کو جو خبر جس ذریعہ سے مل گئی اس نے وہی لکھدی رفتہ رفتہ اختلافات کی اس قدر کثرت ہوگئی کہ سچ کو جھوٹ سے اور جھوٹ کو سچ سے علیحدہ کرنا مشکل ہوگیا۔ حمید ابن مسلم ازدی جو عبید اللہ ابن زیاد کی طرف سے غالباً عہدہ واقعہ نگاری پر مامور تھا اکثر واقعات کا راوی ہے مگر اس کے اقوال بھی نہایت اختلاف کے ساتھ مشہور ہیں۔

ابومخنف لوط ابن یحییٰ ازدی نے جو ان دنوں کوفہ میں موجود تھے مورخانہ حیثیت سے اپنی کتاب مقتل میں تمام حالات کو سلسلہ وار لکھا ہے مگر وہ کربلا میں خود موجود نہ تھے اس لئے یہ سب واقعات انہوں نے بھی سماعی لکھے ہیں لہذا مقتل ابومخنف پر بھی پورا وثوق نہیں پھر لطف یہ کہ مقتل ابومخنف کے متعدد نسخہ پائے جاتے ہیں جو ایک دوسرے سے مختلف البیان ہیں اور ان سے معلوم پایا جاتا ہے کہ خود ابومخنف ان واقعات کے جامع نہیں بلکہ کسی اور ہی شخص نے ان کے بیان کردہ سماعی واقعات کو قلمبند کر دیا ہے۔

مختصر یہ کہ شہادت امام حسین ؑ کے متعلق تمام واقعات ابتدا سے انتہا تک اس قدر اختلاف سے پُر ہیں کہ اگر ان کو فرداً فرداً بیان کیا جائے تو کئی ضخیم دفتر فراہم ہو جائیں اکثر واقعات مثلاً اہل بیت پر تین شبانہ روز پانی کا بند رہنا فوج مخالف کا لاکھوں کی تعداد میں ہونا۔ جناب زینب ؑ کے صاحبزادوں کا نو اور دس برس کی عمر میں شہادت پانا، فاطمہ کبریٰ کا عقد روز عاشورہ قاسم ابن حسن کے ساتھ ہونا۔ عباس ؑ علمدار کا اس قدر جسیم اور بلند قامت ہونا کہ باوجود سواری اسپ دور کابیہ آپ کے پاؤں زمین تک پہنچتے تھے جناب سید الشہداء کی شہادت کے موقعہ پر آپکی خواہر گرامی جناب زینب بنت امیر المومنین کا سر دپا برہنہ خیمہ سے نکل کر مجمع عام میں چلا آنا شمر کا سینۂ مطہر پر بیٹھ کر سر جدا کرنا آپکی لاش مقدس سے کپڑوں تک کا اتار لینا نعش مطہر کا لگدکوب سم اسپاں کیا جانا۔ سرادقات اہلبیت

...غارتگری اور بنی زادیوں کی چادریں تک چھین لینا۔ شمر کا سکینہ بنت حسین کے منہ پر طمانچہ ...نا۔ سکینہ کی عمر تین سال کی ہونا۔ روانگی اہل بیت کے وقت جناب زینب کی پشت پر ...تے لگانے جانا اہل بیتِ رسالت کو بے مقنع و چادر ننگے اونٹوں پر سوار کرنا۔ سید ساجدین کو طوق و زنجیر پہنا کر ساربانی کی خدمت دیا جانا علاوہ کوفہ و دمشق کے اثنا ...ہ میں جا بجا اہل حرم کو نہایت ذلت و خواری سے تشہیر کرنا۔ مجلس دمشق میں عرصۂ ...راز تک بنی زادیوں کا قید رہنا، ہندہ زوجہ یزید کا قید خانہ میں آنا یا اس کا اہلبیت ...ن رو لکاری کیوقت محل سرائے شاہی سے سر در بار نکل آنا۔ سکینہ کا قید خانہ ہی میں ...فات پانا۔ سید السا جدین کا سرہائے شہدائے کربلا بعین (۲۰ صفر) کو کربلا میں واپس ...جانا اور چالیسویں روز لاشہائے شہدا کو سپرد خاک کرنا وغیرہ وغیرہ نہایت مشہور اور ...بال زدِ خاص و عام ہیں حالانکہ ان میں سے بعض سرے سے غلط بعض مشکوک بعض ضعیف بعض مبالغہ آمیز اور بعض من گھڑت ہیں۔

اصل یہ ہے کہ اس زمانہ میں صرف روایات ہی پر تاریخ کا حصر تھا جس مورخ کو جس معقول ذریعہ سے جو بات معلوم ہوئی اور اس نے اس کو اپنے خیال میں معتبر سمجھا۔ لکھ دیا۔ رفتہ رفتہ ان اختلافات و شبہات کی انتہا نہ رہی۔ ذاکرین نے صرف رونے رلانے کو مدنظر رکھ کر واقعات کی صحت و غیر صحت کو پس پشت ڈال دیا۔ اور جو واقعہ ہاتھ آیا بے سمجھے سوچے۔ سادگی یا رنگ آمیزی سے بیان کرنا شروع کیا۔ عوام کو جانے دو۔ جو لوگ اہلِ علم کے طبقہ میں شمار کئے جاتے ہیں وہ بھی اسی لکیر کو پیٹتے رہے۔ اب رہے شاعر تو ان کا اصول ہی یہ ٹھہرا کہ جو بات عام طور پر مشہور ہو خواہ وہ صحیح ہو یا غلط اس کو نظم کر دیں اس کے علاوہ جدت طرازی لازمۂ شاعری ہے، جو مضمون آفرینی کے ساتھ واقعات میں تراش و خراش کئے بغیر نہیں رہتی۔ کیونکہ اس واقعہ کو اسلام کے ہست و بود سے ایک خاص اور گہرا تعلق ہے اس لئے جسقدر کتابیں اس موضوع پر تحریر

ہوئیں وہ یقیناً تاریخ اسلام کے کسی اور واقعہ کے متعلق نہیں لکھی گئیں اس وقت تک مختلف زبانوں میں بے شمار کتابیں لکھی جا چکی ہیں اور ان کی تعداد میں ہر سال اضافہ ہوتا رہتا ہے تاہم یہ امر کس قدر افسوسناک ہے کہ عموماً مورخین و مصنفین نے قلتِ تدبر کی وجہ سے رطب و یابس سب کو بھر دیا اور صحیح و غیر صحیح روایتوں میں تمیز نہ کی، اکثر نے نکا اور ابکا کے سوا کوئی دوسرا مقصد پیش نظر ہی نہیں رکھا، سب سے زیادہ حیرت انگیز یہ بات ہے کہ:۔ شیعوں میں جو واقعات آئمہ اہل بیت سے مروی ہیں اور جن کو حدیث سے تعبیر کیا جاتا ہے وہ بھی اسی طرح مختلف البیان ہیں جس طرح عام راویوں کے بیان کردہ واقعات۔

خاص واقعاتِ کربلا پر آج تک کوئی ایسی کتاب نہیں لکھی گئی جس میں صرف صحیح واقعات کا التزام کیا جاتا ہے، غلط روایات کی تردید کی جاتی، ضروری واقعات کی صحت و غیر صحت کو تنقیدی اصول پر جانچا جاتا، اور اس اہم اور نہایت ضروری کام کو قومی اور مذہبی خدمت سمجھ کر غلط اور مشتبہ واقعات کی تنقید و تصحیح کا اہتمام کیا جاتا یہی وجہ ہے کہ مستند سے مستند اور معتبر سے معتبر کتابوں میں رطب و یابس سب موجود ہے اس لئے ضرورت ہے کہ نہایت کثرت سے تاریخ و مقتل کی کتابیں فراہم کی جائیں اور پھر کامل تحقیق و تنقید سے ایک مستند کتاب تیار کی جائے مگر سینکڑوں کتابوں کا استقصا کے ساتھ دیکھنا اور ان سے معلومات کا اقتباس کرنا ایک شخص کا کام نہیں، کیا حسینؑ کے نام لیوا جوان کے نام پر ہزاروں روپیہ لٹاتے اور اس ذکر خیر کو باعثِ اجرِ عظیم جانتے ہیں اتنی تکلیف گوارا نہیں کر سکتے۔ کیا ان کو کبھی ایسی توفیق ہوگی، کہ ایک علمی جماعت تیار کر سکیں جو تحقیقاتِ جدید کے کل اسلحہ سے تیار ہوں اور دوسرے مشاغل سے بے فکر ہو کر اسی کام میں پوری سرگرمی اور انہماک سے کام لیں کیا لکھنؤ کا وہ مقدس اور واجب الاحترام خطہ جو قوم کا مذہبی سرگروہ اور مسند علم کا مالک ہے اتنی زحمت گوارا نہیں کر سکتا کہ اس مہتم بالشان کام کو اپنے ہاتھوں میں لے کر انصرام کو پہونچائے اور ان غلط اور بے سروپا افواہوں کی جو خاندان رسالت سے منسوب

ل جاتی ہیں حجت ہائے قاطع کے ساتھ تردید کر کے پڑھنے اور سننے والوں کو آخرت کے وزرو
ن سے بچانے کی کوشش کریں۔

نصف تاریخ اصحابِ تعلیم کا اب ایک ضروری اور لازمی جزو ہے نئی نسلیں جو نئی تعلیم کی روشنی سے مستفیض ہو رہی ہیں ان کے جدت پسند دماغ اور تحقیق طلب طبائع، بے سروپا قصوں کو بھی تسلیم کرنے والے نہیں نہ ان کو اس سے کوئی سروکار ہے کہ فلاں امام ایسا لکھ گئے ہیں اور فلاں مجتہد ایسا فرماتے ہیں کیونکہ جب تنقیح و تنقید اور جرح و تعدیل کی گنجائش ہو تو کسی مصنف کی شخصیت اس کی تحریر کو آئندہ تصحیح و تردید سے بے نیاز نہیں کر سکتی، پھر کیوں نہ مستقبل کی ضروریات پر لحاظ رکھ کر ایک ایسی جامع اور صحیح کتاب جو آئندہ نسلوں کو شکوک وشبہات کے تاریک گڑھے سے نکال کر مشعل ہدایت کا کام دے، مرتب و مدون کی جائے۔

چند مشہور غلط واقعات کی تنقید

یہ واقعات ایک عرصہ دراز کے بعد لکھے گئے۔ اس لئے مصنفین کا ماخذ کوئی کتاب نہ تھی بلکہ اکثر زبانی روایتیں تھیں اس قسم کا واقعہ جب پیش آتا ہے یعنی کسی زمانہ کے حالات مدت کے بعد قلمبند کئے جاتے ہیں تو یہ طریقہ اختیار کیا جاتا ہے کہ ہر قسم کی بازاری افواہیں ضبط تحریر میں لے لی جاتی ہیں جن کے راویوں کے نام ونشان تک نہیں معلوم۔ پھر ان افواہوں میں سے وہ واقعات انتخاب کر لئے جاتے ہیں جو قرائن و قیاس کے مطابق ہوتے ہیں کچھ عرصہ کے بعد یہی خرافات ایک دلچسپ تاریخی کتاب بن جاتے ہیں چنانچہ یورپ کے اکثر تاریخی تصنیفات اسی اصول پر لکھی گئی ہیں لیکن مسلمانوں نے اس فن کا جو معیار قائم کیا وہ اس سے بہت زیادہ بلند تھا اس کا پہلا اصول یہ تھا کہ جو واقعہ بیان کیا جائے۔ اس شخص کی زبان سے بیان کیا جائے، جو خود شریک واقعہ تھا وہ اگر خود نہ تھا تو شریک واقعہ تک

تمام راویوں کا نام بہ ترتیب بتایا جائے اس کے ساتھ ہی یہ بھی تحقیق کیا جائے کہ جو اشخاص سلسلہ روایت میں آئے ہیں کون لوگ تھے، کیسے تھے، کیا مشاغل تھے، چال چلن کیسا تھا، حافظہ کیسا تھا، سمجھ کیسی تھی، ثقہ تھے، یا غیر ثقہ تھے، سطحی الذہن تھی، یا دقیقہ بین، عالم تھے یا جاہل ان جزوی باتوں کا پتہ چلانا بہت دشوار بلکہ ناممکن تھا، مگر علماء کرام نے بڑی جانکاہی سے راویوں کے متعلق ہر قسم کی معلومات بہم پہونچائیں اس تحقیقات کے ذریعہ سے اسماء الرجال (ہیوگرافی) کا وہ عظیم الشان فن تیار ہوا جس کی بدولت آج لاکھوں آدمیوں کے حالات معلوم ہو سکتے ہیں تحقیق واقعات کا دوسرا اصول یہ تھا کہ جو واقعہ بیان کیا جاتا ہے عقلی شہادت کے مطابق بھی ہے یا نہیں آخر رفتہ رفتہ درایت کے اصول منضبط ہوئے جن کا خلاصہ یہ ہے کہ حسب ذیل صورتوں میں روایت اعتبار کے قابل زندگی اور اس کے متعلق اس تحقیقات کی ضرورت نہیں کہ اسکے راوی معتبر ہیں یا نہ معتبر۔

(۱) جو روایت عقل کے مخالف ہو۔

(۲) جو روایت اصول مسلمہ کے خلاف ہو۔

(۳) محسوسات ومشاہدہ کے خلاف ہو۔

(۴) قرآن یا حدیث متواتر کے خلاف ہو۔

(۵) روایت رکیک المعنیٰ۔

(۶) جو راوی کسی شخص سے ایسی روایت کرتا ہو کہ کسی اور نے نہیں کی اور نہ یہ راوی اس شخص سے ملا ہو۔

(۷) جو روایت ایسی ہو کہ تمام لوگوں کو اس سے واقف ہونے کی ضرورت تھی۔ باینہمہ ایک راوی کے سوا اور کسی نے یہ روایت نہ کی۔

(۸) جس روایت میں ایسا قابل اعتنا واقعہ بیان کیا گیا ہو کہ اگر وقوع میں آتا تو سینکڑوں آدمی اس کو روایت کرتے باوجود اس کے صرف ایک ہی راوی نے اس کی

روایت کی ہو۔

(۹) وہ روایت جس کے غلط ہونے کے دلائل موجود ہوں مثلاً عوج بن عنق کا قد تیس ہزار گز کا تھا۔

(۱۰) وہ روایت جس کی تردید کے قرائن زیادہ ہوں۔ مثلاً تاریخوں میں ایک یہ واقعہ بیان کیا جاتا ہے کہ آنحضرت صلعم نے خیبر کے یہودیوں کو جزیہ سے معاف کر دیا تھا ملا علی قاری اس روایت کے متعلق کہتے ہیں کہ یہ بیان مندرجہ ذیل وجوہ سے باطل ہے۔

(۱) اس معاہدہ پر سعید بن معاذ کی گواہی بیان کی جاتی ہے حالانکہ وہ غزوہ خندق میں وفات پا چکے تھے۔

(۲) دستاویز میں کاتب کا نام معاویہ ہے حالانکہ وہ بعد فتح مکہ اسلام لائے۔

(۳) اس وقت تک جزیہ کا حکم ہی نہیں آیا تھا، جزیہ کا حکم جنگ تبوک کے بعد قرآن مجید میں نازل ہوا۔

(۴) دستاویز میں تحریر ہے کہ یہودیوں سے بیگار نہیں لی جائے گی حالانکہ آنحضرت صلعم کے زمانہ میں بیگار کا رواج ہی نہ تھا۔

(۵) عرب کے دور دراز حصوں میں جب جزیہ معاف نہیں ہوا حالانکہ ان لوگوں نے چنداں مخالفت نہ کی تھی تو خیبر والے جو اسلام کے سخت مخالف تھے۔ کیونکر معاف ہو سکتے تھے

(۱۱) جس درجہ کا اہم واقعہ ہو شہادت بھی اسی درجہ کی اہم ہونی چاہیئے۔

(۱۲) سب سے اہم اور قابل بحث یہ بات ہے کہ راوی جو واقعہ بیان کرتا ہے اس میں کس قدر حصہ اصل واقعہ کا ہے اور کس قدر حصہ راوی کا قیاس کیونکہ تفحص اور استقراء سے بعض جگہ یہ صاف نظر آتا ہے کہ راوی جس بات کو واقعہ کی حیثیت سے بیان کرتا ہے وہ درحقیقت اس کا قیاس ہے واقعہ نہیں۔

(۱۳) ثقہ راوی سے بھی مفہوم و مقصد روایت کے سمجھنے یا بیان کرنے میں غلطی کا ہو جانا

ممکن ہے۔ چنانچہ ثقات کی روایت سے جب کسی موقعہ پر انکار کیا جاتا ہے تو اسی بنا پر

(۱۴) واقعات کی تنقید میں یہ بھی دیکھنا ضروری ہے کہ جو واقعہ کسی کی طرف منسوب کیا جاتا ہے اس کا اس سے سرزد ہونا اس کی شان اس کے مرتبہ اور اس کی عادت کے خلاف تو نہیں ہے۔

(۱۵) واقعہ بیان کردہ پر محالِ عقلی یا محالِ عادی ہونے کا تو اطلاق نہیں ہے۔

ایک اور صورت روایتِ احاد کی ہے۔ روایت احاد وہ ہے جس کے سلسلہ اسناد میں صرف ایک راوی پر مدارِ روایت ہو یعنی کوئی دوسرا راوی موئد روایت ہو۔ بہرحال حجیتِ روایات کے لئے حسب ذیل اصول کا پیش نظر رکھنا نہایت ضروری ہے۔

(۱) واقعات کو صرف معتبر و مستند کتابوں میں دیکھنا چاہیئے نہ کہ ہر کتاب کو ذریعہ معلومات قرار دیدیا جائے۔

(۲) کتابیں خواہ کیسی ہوں اور ان کے مؤلف خواہ کتنی ہی بلند پایہ ہوں۔ محتاج تنقیح ہیں اور ان کی روایات واسناد کی تنقید لازم ہے۔

(۳) بصورتِ اختلافات ثقہ رُوات کی روایتوں کو دوسروں پر ترجیح ہوگی۔

(۴) واقعات کی ترتیب میں سلسلۂ علت و معلول کی تلاش نہایت ضروری ہے۔

(۵) نوعیتِ واقعہ کے لحاظ سے شہادت کا معیار قائم کرنا چاہیئے۔

(۶) روایت میں اصل واقعہ کس قدر ہے۔ اور راوی کی ذاتی رائے اور فہم کا کس قدر جزو شامل ہے۔

(۷) اسباب خارجی نے خواہ مذہبی ہوں خواہ سیاسی، واقعہ کی نوعیت پر اپنا اثر ڈالا یا نہیں اور اگر ڈالا تو کس قدر

(۸) جو روایت عام وجوہ عقلی مشاہدہ عام، اصول مسلمہ اور قرائنِ حال کے خلاف ہو محتاج تصحیح و تنقیح ہے۔

(۹) اہم موضوع پر مختلف روایات کی تطبیق و تعدیل سے اس کا اطمینان کر لینا چاہیئے کہ راوی سے ادائے مفہوم میں غلطی تو نہیں ہوئی ہے۔

(۱۰) روایات احاد کو موضوع کی اہمیت اور قرائن حال کی مطابقت کے لحاظ سے قبول کرلینا چاہیئے۔

(۱۱) بصورت اختلاف صرف وہ روایت قابل اعتبار ہوسکتی ہے جو قرائن عقلی اور نقلی سے مطابق ہو وَاِلّا فَلا۔

(۱۲) ہم صرف اسی پر اکتفا نہیں کرسکتے کہ ابن شہر آشوب نے یہ لکھا ہے اور ابن طاؤس یہ فرماتے ہیں یا ابن اثیر ایسا لکھ گئے ہیں یا ابن خلدون کا یہ بیان ہے بلکہ ہم کو واقعہ بیان کردہ کی صحت کے تمام امکانات و قرائن پر خود بھی نظر غائر ڈالنے کی ضرورت ہے۔

فن تاریخ و روایت پر جو خارجی اسباب اثر کرتے ہیں ان میں سب سے قوی اثر حکومت کا ہوتا ہے گو مسلمانوں کو اس پر ہمیشہ فخر کا موقعہ حاصل رہے گا کہ ان کا قلم تلوار سے نہیں دبا۔ حدیثوں کی تدوین بنی امیہ کے زمانہ میں ہوئی جنہوں نے پورے نوّے برس تک سندھ سے اندلس تک بنی فاطمہ کی توہین کی، اور ہر جمعہ کو برسرمنبر جناب امیر پر لعن کہلوایا۔ ہزاروں حدیثیں منقصت اہل بیت و منقبت امیر معاویہ میں وضع کرائیں، عباسیوں کے زمانہ میں اگرچہ خلیفہ کے نام نامی نبیین کو ان حدیثوں میں داخل ہونے کا نتیجہ ملا، اور عین اسی زمانہ میں محدثین نے علانیہ منادی کرا دی کہ یہ سب جھوٹی روایتیں ہیں آج حدیث کا فن اس خس و خاشاک سے پاک ہے۔ اور بنو امیہ اور بنو عباس جو ظل اللہ اور جانشین رسول اللہ تھے، اسی مقام پر نظر آتے ہیں جہاں ان کو ہونا چاہیئے تھا تاہم یہ عالمگیر اثر بالکل نہ اسوقت زائل ہوا۔ اور نہ اب ہے۔

اسی طرح خارجی اسباب میں ایک بڑا سبب مذہبی اثر ہے جو حکومت کے اثر سے

بھی زیادہ زہریلا اور خطرناک ہے اس اثر کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ بیان کرنے والے پر مذہبی جذبات اس قدر متاثر ہو جاتے ہیں کہ وہ صدق و کذب اور حق و باطل میں تمیز نہیں کرتا جو لوگ مذہبًا اس کے ہم خیال نہیں ہوتے ان پر حتی الوسع برائیاں عائد کرتا ہے۔ ان کے خصائل کو بصورت رذائل اور ان کی قومی و انفرادی کارناموں کو سبک و خفیف کر کے ظاہر کرتا ہے بلکہ بعض اوقات ہی ان کی صورت ہی مسخ کر دی جاتی ہے۔ اس کے برعکس اپنے ہم مذہبوں کے حرکات و واقعات کو تصنع، تکلف اور توغل کی رنگ آمیزی سے خوشنما اور دل کش بنانے کی بڑی سرگرمی سے کوشش کیجاتی ہے۔ یہ مذہبی جنبہ داری اور خوش اعتقادی بڑھتے بڑھتے کورانہ تقلید اور ہذیان کے درجہ تک پہونچ جاتی ہے۔ ہر لغو اور بیہودہ روایت کو آمنا و صدقنا کہہ کر سر تسلیم خم کر دیا جاتا ہے۔ دوسروں کے غیر معمولی واقعات قابل مضحکہ اور اپنے واجب الاحترام سمجھنے لگتا ہے۔ یہ خوش اعتقادی عجیب عجیب مجہولات کے جال میں پھنسا دیتی ہے، اس دلدل میں پھنس جانے کے بعد انسان نہ کسی تحقیق سے کام لیتا ہے نہ توثیق سے۔

گو یہ بحث بہت طول و طویل ہوا اور تنقید روایات کے اور بھی اصول و ضوابط بیان کئے جا سکتے ہیں لیکن ہم انہی چند اصول پر اکتفا کرتے ہیں کیونکہ ان ہی کو عام تاریخی واقعات کی صحت و غیر صحت کا معیار سمجھا جاتا ہے۔

افسوس ہے کہ نا اہلوں نے اپنی بیہودہ روایات سے صحیح اور غیر صحیح واقعات کو خلط ملط کر دیا اور لغو قصے کہانیاں ادھر ادھر سے لے کر اور خود وضع کر کے بھر دئے آنے والی نسلوں نے ان کے بعد ان کے اخبار و آثار کی پیروی کی اور جیسا سنا سلسلہ بسلسلہ ہم تک پہونچا دیا۔ نہ واقعات کے اسباب کو جانچا اور نہ غلط روایات کی تنقید کی۔ یہی وجہ ہے کہ اکثر تاریخیں تحقیق سے خالی ہیں۔ تنقیح کا تو ذکر ہی کیا ہے بے شمار روایتیں اغلاط و سہو ہوات سے بھری پڑی ہیں۔ عام طور پر تقلید پھیلی ہوئی ہے۔ مگر حق ہمیشہ غالب ہے

اور کوئی اس کا مقابلہ نہ کرسکا۔ ناقلین رطب و یابس جو چاہیں نقل کریں بہترین کھوٹا کھرا پرکھ لیتے ہیں اور ان کا احساس صحیح صدق و کذب کو جدا جدا کر دیتا ہے۔ اگر نقل روایت پر ہی اعتبار کر لیا جائے اور اصول عادت، قواعد سیاست تمدن کی طبیعت اور انسان کی احتیاجی حالت کو حکم نہ بنایا جائے اور غائب کو حاضر اور حال کو ماضی پر قیاس نہ کیا جائے تو لغزش و غلطی اور شاہراہ صدق و صواب سے دور جا پڑنے کا قوی احتمال ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بڑے بڑے علماء کو خواہ وہ مفسر ہوں یا محدث یا مورخ تحریر واقعات میں سخت مغالطے واقع ہوئے۔ جو روایت معتبر و غیر معتبر سامنے آئی اس کو اسی معیارِ اصول پر پرکھا۔ نہ کائنات کی طبیعت پر جانچ کی نہ غور و فکر و بصیرت سے کام لیا۔ اس لئے حق و ثواب سے دور جا پڑے اور اوہام و اغلاط کے جنگل میں کھیلنے لگے اصول و عادات سے نکل کر وسوسوں میں پھنس گئے۔ نہ خطائے عمدا و خطائے محض میں فرق کیا۔ نہ روایات میں واسطہ کی پرواکی نہ تنقیح و تعدیل سے کام لیا۔

یہ جو کچھ ہم نے بیان کیا، عام تاریخی کتابوں کی حالت ہے مگر ایک صحیح واقعات کے متلاشی کے لئے یہ امر سخت حیرت افزا اور پریشان کن ہے کہ واقعات کربلا جن کو تاریخ اسلام میں بوجہ تعلق خاندان رسالت ایک خاص وقعت و اہمیت حاصل ہے تاریخِ عالم کے تمام سلسلہ میں سب سے زیادہ مختلف الروایات ہیں جس مورخ نے جس روایت کو اپنے خیال میں معتبر سمجھا لکھ دیا۔ تمام اختلافات کو دکھلا کر تنقید و تنقیح کی زحمت گوارا نہیں کی تاکہ جو روایت اصولِ درایت پر ٹھیک اترتی۔ وہی قولِ فیصل سمجھی جاتی افسوس ہے کہ ہم بھی اس عظیم الشان مہم کا بیڑا اٹھانے سے قاصر اور تمام اختلافی روایتوں کی جرح و تعدیل سے معذور ہیں کیونکہ اس کام کے لئے بہت بڑے سامان اور بڑی فرصت کی ضرورت ہے اور قدرت نے ہم کو ان دونوں نعمتوں سے محروم رکھا ہے۔ البتہ مذکورۂ بالا اصول کو پیش نظر رکھتے ہوئے صرف چند مشہور غلط یا مشکوک و مشتبہ اقوال

کی تنقید ہمارے امکان میں ہے۔

قوم کا زیادہ حصہ جاہل ہے اگرچہ یقین ہے کہ کوئی مصیبت ایسی نہ ہوگی جس کو اس کا ہر فرد نہ جانتا ہو لیکن نہ اس کو اسباب شہادت معلوم ہیں نہ ان کڑیوں کی خبر ہے جن کے چھوڑ دینے سے یہ خوفناک زنجیر بن جاتی ہے۔ وہ لوگ جن پر لکھے پڑھے کا اطلاق ہوتا ہے وہ بھی عموماً تاریخ خصوصاً فلسفۂ تاریخ پر توجہ نہیں کرتے بلکہ اس کی معلومات کا سرمایہ یا تو میر اور مرزا کے مرثیے یا بحور الغمہ و بحر المصائب یا ذاکرین کا بیانِ زبانی ہے، اس میں شک نہیں کہ ایسے لوگ بھی بکثرت ہیں جو ان واقعات اور اسباب و نتائج کو نظر غائر سے دیکھنے والے ہیں تاہم غلو اور مبالغہ ان پر بھی خاص اثر کئے ہوئے ہے۔

واقعہ خوانوں میں سب ایسے نہیں ہیں جو افراط و تفریط سے بچ کر انتخابِ اعتدال کا صحیح حس رکھتے ہوں ان کے اس خیال نے کہ رونے اور رلانے میں جس قدر اہتمام کیا جائے، جس طرح کوشش ان میں صرف ہو وہ مقبول ہے مصائب یا فضائل کی روایتوں میں تحقیق سے لاپروا رکھا اس کے علاوہ انہیں ذمہ دار اور صاحب حس لوگوں کی خاموشی سے پوری پوری مدد ملی اور وہ روز بروز بے احتیاط اور دلیر ہوتے گئے۔ اور یہی خود سری اور غلط بیانی آخر کار واقعہ خوانوں کی ایک مستند شان ہو گئی لیکن ایک محتاط سلیم العقل اور صاحب حس کے خیال میں آئی ہوئی یا سنی سنائی باتوں کا اگل دینا کافی نہیں بلکہ ان پر غور کرنا اور سمجھنا ضرور ہے۔ یہی حال مصنفین کا ہے اور نہایت افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ ان لوگوں نے محض اس خیال سے کہ فضائل و مصائب اہلبیت کی اشاعت ہو اور ایسے واقعات بیان کئے جائیں جن سے سامعین کے دل پر چوٹ لگے اور گریہ آور ہوں باوجود علم و خبر اور قوتِ تمیز صحیح و سقیم مطلق ادھر توجہ نہ کی اور اپنے خیال میں ہر قسم کی بے اصل روایتوں اور جعلی حکایتوں کو جائز سمجھ کر سچے واقعات کے ساتھ خلط ملط کر دیا۔ اور کہنے والوں کو گنجائش مل گئی کہ فلاں قبلہ و کعبہ ایسا لکھ گئے ہیں اور فلاں سرکار۔

شریعت مدار نے ایسا اور ویسا تحریر فرمایا ہے فلاں علامہ کا یہ قول ہوا۔ فلاں فاضل کی کتاب میں ایسا درج ہے۔

کبھی ایسا ہوتا ہے کہ مؤلف کتاب چند مشہور کتابوں کو سامنے رکھ کر واقعات کو ان سے نقل کر دیتا ہے مگر نہ تو اس کو اصول فن کی خبر ہوتی ہے نہ مؤلفین کے حالات کی اطلاع اس وجہ سے رطب و یابس میں تمیز نہیں کرتا۔ اور جس واقعہ کو عجیب و غریب اور رقت خیز سمجھتا ہے بلا تامل لکھ دیتا ہے حالانکہ نہ کچھ اس کی اصلیت ہوتی ہے نہ بنیاد اس واسطے اس کی کتاب میں مفتریات و موضوعات بہ کثرت ہوتے ہیں مثلاً اسرار الشہادۃ ایک مشہور عالم اخوند ملا آقائے دربندی کی مؤلفہ ہے، فاضل موصوف نے اپنی اصل کتاب میں فوج کوفہ کی تعداد چھ لاکھ سوار اور دو کروڑ پیادے لکھ دی ہے اب ذاکرین کو موقعہ ہے کہ بلا سوچے سمجھے کہہ سکتے ہیں، کہ فاضل دربندی نے ایسا لکھا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ آقائے موصوف ایک مشہور عالم اور جید فاضل سمجھتے تھے، لیکن ان کی کتاب علمائے فن اور نقادانِ تاریخ کے طبقہ میں کیونکر نگاہِ وقعت سے دیکھی جا سکتی اس سے زیادہ حیرت انگیز لطیفہ یہ ہے کہ آخوند مذکور خود نقل کرتے ہیں کہ میں نے کسی زمانہ میں ایک عالم کو یہ کہتے ہوئے سنا تھا کہ یوم عاشورہ بہتّر گھنٹہ کا طولانی تھا۔ میں اس وقت متعجب ہوا تھا اور یہ بات میری سمجھ میں نہیں آئی تھی مگر اب جب میں تمام واقعات روز عاشورہ پر غور کرتا ہوں تو مجھے اطمینان ہو جاتا ہے کہ درحقیقت وہ نقل صحیح تھی کیونکہ یہ تمام واقعات جو اس روز رونما ہوئے بغیر اس قدر مدت کے پورے نہیں ہو سکتے اور کتاب جواہر الایقان کے صفحہ ۱۸۴ - ۱۸۵ - ۱۸۶ میں بھی بڑا زور دیا ہے اور ایک طویل بحث کی ہے اس سے فاضل موصوف کی صحتِ رائے کا اندازہ کر لینا چاہیئے، بعض کتابوں پر یہ خیال کیا گیا ہے کہ یہ فلاں اور فلاں مستند عالم کی تصنیف ہیں اور ان پر اعتبار کر لیا گیا حالانکہ درحقیقت ایسا نہیں ہے۔

علما کے تسامح کا یہ جواب دیا جاتا ہے کہ چونکہ اس ذکر خیر کی علتِ غائی یہ ہے کہ گریہ ہو کر مومنین اور سامعین ماجور و مثاب ہوں اس لئے روایت کسی طرح کی ہو اس کے بیان کرنے میں کوئی حرج نہیں مگر اس کو اچھی طرح سمجھ لینا چاہیئے کہ یہ محض خیال ہی خیال ہے، ایک جھوٹ بات کو اُن ذوات قدسی کی طرف منسوب کرنا انتہا درجہ کی گستاخی اور توہین ہے اگر واقعہ سچا ہوگا تو سننے والا اور سننے والا دونوں مثاب ہوں گے ورنہ دونوں گناہگار۔

یہ خیال کس قدر رکیک اور بے معنی ہے کہ واقعات شہادت صحیح ہوں۔ یا موضوع ضعیف ہوں یا مشکوک سب کا بیان کرنا جائز اور بہرحال موجب ثواب ہے کیونکہ اس کی علت غائی۔ جذبات غم کو ہیجان میں لانا ہے ہم نہیں سمجھ سکتے کہ اس ادعا کا مفہوم کیا ہے اور اس کی تائید میں کون سی عقلی و نقلی حجت پیش کی جا سکتی ہے۔ صرف ان ہی واقعات کا بیان باعث اجر جزیل ہو سکتا ہے، جن کی صحت پایۂ ثبوت کو پہونچ چکی ہو۔ لیکن جو روایتیں ضعیف یا مشکوک یا موضوع ہیں اور روایتاً و درایتاً صحیح نہیں مانی جا سکتیں۔ ان کے جواز کا کون سی شریعت فتویٰ دے سکتی ہے۔ ضعف یا شک کا مفہوم حالت تذبذب کا مرادف ہے جب ہم کو اس میں شک ہو کہ جو کچھ بیان کرنا چاہتے ہیں وہ سچ ہے۔ یا جھوٹ تو لازمۂ احتیاط یہی ہے کہ ہم اس کی تحریر و تقریر سے احتیاط کریں مبادا خدا کے سامنے گرفت میں آئیں اور اس کی بابت باز پرس کی جائے، جب ضعف و شک کی یہ حالت ہے تو جو روایات یقیناً موضوع یا غلط ہیں اور متعدد قرائن و دلائل سے ان کا ابطال ہوتا ہے ان کا بیان کرنا قطعاً حرام ہونے میں کیا شک ہے۔

غلط اور موضوع ہونے کا مفہوم کیا ہے۔ یہی نا کہ وہ جھوٹ ہیں، بہتان ہیں۔ اور افترائے محض ہیں کیا عقلاً اور نقلاً کوئی ایسی دلیل اور وجہ موجہ موجود ہے جس سے کذب و افترا کے جواز کا فتویٰ دیا جا سکے، کذب و افترا، اور وہ بھی اُن ذوات قدسی آیات پر جن کی عزت اور جن کا احترام مذہبی فرائض میں داخل ہو۔ اِس کذب و افترا کی نسبت

جو عامۃ الناس (زید بکر) پر کیا جائے جرم کو اسی قدر سنگین کر دینے والا ہے جس قدر کہ جرم کی نوعیت ہے مگر اہل بیت رسالت کی نسبت دیدہ دانستہ کسی جھوٹے قول اور جھوٹے واقعہ کو منسوب کر دینا معمولی بات نہیں بلکہ مُخرِج عن الایمان ہے۔ قرآن مجید صاف اور کھلے لفظوں میں کذب و افترا سے اجتناب کی تعلیم دیتا ہے۔

(۱) اِنَّ اللّٰہَ لَا یَھْدِیْ مَنْ ھُوَ مُسْرِفٌ کَذَّابٌ۔ — بے شک خدا اس کو ہدایت نہیں کرتا۔ جو فضول خرچ اور جھوٹا ہو۔

(۲) لَعْنَۃُ اللّٰہِ عَلَی الْکَاذِبِیْنَ۔ — جھوٹوں پر خدا کی لعنت ہے۔

(۳) اِنَّ لَعْنَۃَ اللّٰہِ عَلَیْہِ اِنْ کَانَ مِنَ الْکَاذِبِیْنَ — بے شک اس پر خدا کی لعنت ہے۔ اگر وہ جھوٹوں میں سے ہے۔

یہ تو عام جھوٹ کی مذمت کی گئی ہے لیکن اگر ذاتِ باری تعالےٰ جناب ختمی مآب آئمہ طاہرین اور ذریت رسالت کی نسبت افترا کیا جائے تو اس کا کیا ٹھکانہ ہے سورۂ انعام میں ارشاد ہے۔

(۱) وَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنِ افْتَرٰی کَذِبًا بِاٰیَاتِہٖ اِنَّہٗ لَا یُفْلِحُ الظَّالِمُوْنَ۔ — جو شخص خدا پر جھوٹ اور بہتان لگائے اس کی نشانیوں کو جھٹلائے اس سے بڑھ کر ظالم کون ہوگا۔ ایسے ظالم ہرگز نجات نہ پائیں گے۔

(سورۂ ہود میں ہے)

(۲) وَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنِ افْتَرٰی عَلَی اللّٰہِ کَذِبًا یُعْرَضُوْنَ عَلٰی رَبِّھِمْ وَیَقُوْلُ الْاَشْھَادُ ھٰؤُلَاءِ الَّذِیْنَ کَذَبُوْا عَلٰی رَبِّھِمْ اَلَا لَعْنَۃُ اللّٰہِ عَلَی الظّٰلِمِیْنَ — جو شخص خدا پر بہتان باندھے۔ اس سے زیادہ ظالم کون ہوگا ایسے لوگ اپنے پروردگار کے حضور میں پیش کئے جائیں گے اور گواہ لوگ اظہار کریں گے کہ

یہی وہ لوگ ہیں جنہوں نے اپنے پروردگار پر جھوٹ باندھا سن رکھو کہ ظالموں پر خدا کی لعنت

(۳) اِنَّ الَّذِیْنَ یَفْتَرُوْنَ عَلَی اللّٰہِ الْکَذِبَ لَا یُفْلِحُوْنَ مَتَاعٌ قَلِیْلٌ وَّلَھُمْ عَذَابٌ اَلِیْمٌ

اس میں شک نہیں کہ جو لوگ خدا پر بہتان باندھتے ہیں وہ کبھی کامیاب نہ ہوں گے۔ دنیا میں فائدہ تو تھوڑا ہی مگر آخرت میں ان کے لئے دردناک عذاب ہے۔ (سورہ زمر میں ارشاد ہوا ہے)

(۴) فَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنْ کَذَبَ عَلَی اللّٰہِ وَکَذَّبَ بِالصِّدْقِ اِذْ جَآءَہٗ اَلَیْسَ فِیْ جَھَنَّمَ مَثْوًی لِّلْکٰفِرِیْنَ

اس سے بڑھ کر ظالم کون ہوگا جو خدا پر جھوٹ باندھے اور جب اس کے پاس سچی بات آئے تو جھٹلا دے کیا جہنم کافروں کا ٹھکانہ نہیں ہے (ضرور ہے)

کتاب کافی شیخ کلینی، کتاب محاسن علامہ برقی، تفسیر عیاشی، کتاب ارشاد شیخ مفید، کتاب امالی ابو علی طوسی، کتاب بشارت المصطفٰے عماد الدین طبری آملی، کتاب غوالی اللآلی ابن ابی جمہور احسائی وغیرہم بہ تغیر الفاظ جناب رسولخدا اور جناب امیر سے مروی ہے کہ جو شخص رسولخدا اور آئمہ ہدا پر برابر دیدہ و دانستہ افترا بندی کرے اور جو بات انہوں نے نہیں فرمائی، یا جو فعل انہوں نے نہیں کیا اس کو ان سے منسوب کرے تو اس کا ٹھکانہ جہنم ہے۔

شیخ کشی کتاب الرجال میں حضرت امام جعفر صادق ؑ سے نقل کرتے ہیں کہ رسولخدا ؐ نے فرمایا ہے کہ جو ہم اہل بیت پر کسی جھوٹی بات کا اتہام لگائے وہ قیامت کے روز اندھا اور یہودیوں کے ساتھ محشور ہوگا مختصر یہ کہ نہی عن الکذب میں بہت سی آیتیں اور حدیثیں موجود ہیں پھر ان مفتریات کو کیونکر جائز سمجھا جاتا ہے۔

اس طویل لیکن ضروری تمہید کے بعد ہم اپنے اصل مقصد کی طرف رجوع کرتے ہیں ماحصل مدعا یہ ہے کہ واقعات شہادت از ابتدا تا انتہا اس قدر اختلافات اور موضوعات سے بھرے ہیں کہ صحیح اور غیر صحیح میں امتیاز دشوار اور کٹھن ہے یہ ظاہر ہے کہ جب ایک ہی واقعہ کی

چند یا کم سے کم دو مختلف اور متضاد صورتیں بیان کی جائیں تو ان میں صرف ایک صحیح ہوگی باقی غلط اب دیکھنا یہ ہے کہ ان میں سے کس کو قابل اعتبار اور کس کو ناقابل اعتبار سمجھا جائے اس جانچ اور تنقید کا معیار قرائن و شہادت اور اصول مذکورۂ صدر ہی کو قرار دیا جاسکتا ہے واقعہ شہادت کے متعلق بیشمار مختلف روایتیں مشہور ہیں اگر ان سب کو فراہم کرکے ہر روایت کو اصولِ درایت پر جانچا جائے تو بڑے سامان اور وقت کی ضرورت ہے۔ پھر بھی سب روایتوں کی تنقیح و تعدیل یقیناً ایک شخص کا کام نہیں اس لئے ان سے قطع نظر کرکے یہاں صرف ان واقعات کی جو عام طور پر مشہور ہیں اور جن کو ذاکرین عموماً مجالس میں بیان کرتے ہیں اور ان ہی کو بار بار مرثیوں میں دہرایا گیا ہے تنقید کافی ہے۔

(۱) حضرت امام حسین علیہ السلام کا روانگی مکۂ معظمہ کے وقت ایک بیمار بیٹی کو جس کا نام فاطمہ صغریٰ تھا مدینہ میں چھوڑ جانا۔

(۲) روانگی کے وقت اہل بیت رسالت کی سواری کا تزک واحتشام۔

(۳) پسران مسلم کی کوفہ میں شہادت۔

(۴) حضرت کا داخل کربلا ہو کر اس قطعہ زمین کو جو شامل حائر ہے خرید فرمانا۔

(۵) فریقین کی فوجوں کی تعداد۔

(۶) اہل بیت پر تین شبانہ روز پانی بند رہنا۔

(۷) صبح عاشورہ کو جناب زینب کے دونوں بیٹوں کی تمنائے علم برداری دونوں کا ایک ساتھ جنگ کرنا دونوں کی عمر میں ۹-۱۰ برس کی ہونا۔

(۸) ہاشم بن عتبہ کی جنگ۔

(۹) عقد قاسم ابن الحسن و فاطمہ بنت الحسین۔

(۱۰) علی اکبر کون ہیں۔ سید سجاد۔ یا علی الشہید۔ زینب خاتون کا شہادت علی اکبر کے وقت خیمہ سے نکل آنا قصۂ دختر بادشاہِ حلب۔

(۱۱) جناب زینب کا حضرت کو آخری رخصت کے وقت گھوڑے پر سوار کرنا۔
(۱۲) زعفر جن کا حضرت کی کمک کو آنا۔
(۱۳) حضرت کے ہاتھ سے لاکھوں دشمنوں کا مارا جانا۔
(۱۴) قاصد صغریٰ کا آنا۔
(۱۵) حضرت جبریل کا میدان کربلا میں نزول۔
(۱۶) عبداللہ ابن حسن کی شہادت اور ان کی عمر۔
(۱۷) جناب زینب کا بھائی کی شہادت کے وقت سر برہنہ مجمع عام میں نکل آنا۔
(۱۸) قصۂ شہریار
(۱۹) تاراجی خیام۔ تاراجی لباس نعش مبارک۔ پامالی نعش مقدس۔
(۲۰) مخدرات اہل بیت کو کشودہ رو شتران بے عماری وکجاوہ پر سوار کرنا۔ سید الساجدین کو خدمت ساربانی دیا جانا اور جا بجا تشہیر۔
(۲۱) قصۂ ام حبیبہ، خادمہ جناب سیدہ۔
(۲۲) قصۂ شیریں کنیز جناب شہربانو۔
(۲۳) زندان شام سکینہ کا حبس میں وفات پانا، واقعہ کربلا کے وقت سکینہ کی عمر۔
(۲۴) ہندہ زوجہ یزید کا سر دربار نکل آنا۔ یا زندان میں ملاقات اہلبیت کے لئے جانا۔
(۲۵) واپسی روز اربعین، دفن نعش ہائے شہدا۔ دفن سر مبارک۔

ان میں سے بہ استثنا چند سب واقعات پر مجملاً یا مفصلاً اپنی اپنی جگہ جرح و تعدیل کی جا چکی ہے لیکن یہاں بھی بقدر ضرورت بیان کیا جاتا ہے۔

(۱) حضرت نے مدینہ سے روانگی کے وقت ایک بیٹی فاطمہ صغریٰ کو بوجہ علالت اپنی نانی ام المومنین جناب ام سلمہ رضی اللہ عنہا کے پاس چھوڑ دیا تھا۔ اس واقعہ کو نظماً ونثراً درد انگیز اور رقت خیز پیرایہ میں بڑے ستہ و مد کے ساتھ بیان کیا جاتا ہے۔ لیکن

یہ روایت بالکل غلط اور بے بنیاد ہے۔ مقتل اخطب خوارزمی، روضۃ الشہدائے ملا حسین واعظ یا اور جن کتابوں میں یہ واقعہ پایا جاتا ہے ان میں سے کسی نے بھی سند مسلسل و معتبر کا حوالہ نہیں دیا، نہ مشہور و مستند تاریخوں میں کہیں اس کا تذکرہ درج ہے۔ اس سے قطع نظر کرکے علم انساب کی کتابوں کو دیکھا جائے تو ان میں بھی فاطمہ صغریٰ کا کہیں ذکر نہیں ہے۔ شیخ مفید کتاب ارشاد میں ابن شہر آشوب کتاب مناقب میں حافظ عبد العزیز ابن اخضر معالم العترۃ میں سبط ابن جوزی تذکرہ خواص الامۃ میں اور صفوۃ الصفوۃ میں نورالدین ابن صباغ مالکی فصول المہمہ میں محمد رضا حسینی جلاء العیون میں تحریر کرتے ہیں کہ حضرت کے صرف دو بیٹیاں فاطمہؑ اور سکینہ تھیں۔ جو تمام مصائب و شدائد میں ہی اپنے والد بزرگوار کے ساتھ کربلا میں حاضر رہیں۔ علامہ محمد بن سلیمان تنکابنی اکلیل المصائب میں لکھتے ہیں :" و اینکہ می گویند۔ فاطمہ صغریٰ در مدینہ ماند و بیمار بود اصلے ندارد "۔ البتہ ملائے مجلسی بحار میں حافظ محب الدین ذخائر عقبےٰ میں محمد ابن طلحہ شافعی مطالب السئول میں علی بن عیسیٰ اربلی کشف الغمۃ میں نیز ابن خشاب وغیرہ فاطمہ اور سکینہ کے علاوہ تیسری بیٹی زینب کا نام لکھتے ہیں۔ مگر فاطمہ صغریٰ کا تذکرہ کسی نے نہیں کیا۔ ہم نے جہاں تک مورخین و نسابین کی مستند اور معتبر کتابوں کو دیکھا اور اس اختلاف کی چھان بین کی، ہمارے خیال میں بھی حضرت کی صرف دو ہی بیٹیاں فاطمہ اور سکینہ تھیں جن کو حضرت نے اپنے ساتھ ہی سفر میں لے لیا تھا۔ اور تیسری کوئی بیٹی نہ تھیں جن کو آپ وطن میں چھوڑ جاتے۔

صاحب ناسخ التواریخ کی تحقیق کا بھی نتیجہ یہی ہے چنانچہ وہ لکھتے ہیں :-

"مکشوف باد کہ آں چہ ایں بندہ بے بضاعت باستقرا و استیعاب رنج برد و اختیار نمود آنست کہ حسین علیہ السلام را چہار پسر بود۔ علی اکبر الشہید و علی اوسط ہو الامام و علی اصغر و عبداللہ سہ تن از ایشاں در یوم طف شدند

وآنحضرت را از دو دختر افزوں نبود نخستیں فاطمہ وآں دیگر سکینہ "

مولانا سید ناصر حسین صاحب قبلہ مجتہد عصر لکھنو کا یہی خیال ہے۔ چنانچہ آپ ایک سوال کے جواب میں فرماتے ہیں کہ:-

روایات متکاثرہ ومعتبرہ سے ثابت ہے کہ جناب فاطمہ حضرت سید الشہدا علیہ السلام کے ہمراہ معرکہ کربلا میں موجود تھیں۔ اوران کا مدینہ میں بوجہ مرض کے رہ جانا کسی ضعیف روایت میں بھی نہیں دیکھا۔ ہاں بحار الانوار میں ایک روایت مشتمل بر ذکر غراب ایسی پائی جاتی ہے جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ جناب فاطمہ صغریٰ مدینہ میں تھیں لیکن یہ روایت غرابت غریب ہے۔ جیسا کہ مجلسی علیہ الرحمہ نے خود اس کی تصریح جلاء العیون میں فرمادی ہے چنانچہ بعد اس روایت کے فرماتے ہیں "واین حدیث خالی از غرابتے نیست بجہتِ مخالفت با اخبارِ دیگر" چونکہ یہ روایت مقتل اخطب خوارزم سے ماخوذ اور ضعیف السند ہے، اور روایات کثیرہ معتبرہ سے مخالف لہذا مقبول نہیں ہوسکتی اور جناب سید الشہداء علیہ السلام کی صاحبزادیاں بنابر قول مشہور دو تھیں ایک حضرت فاطمہ صغریٰ دوسری حضرت سکینہ (رسالہ ہدایات ناصریہ مطبوعہ یوسفی پریس دہلی صفحہ ۴)

بہر حال چونکہ یہ روایت تمام مشہور ومستند کتابوں کے خلاف ہے اس لئے اس کے ناقابل اعتبار اور ساقط الاعتبار ہونے میں کیا شک ہے اگر اس کی روایت بہ سند مسلسل کہیں مل بھی جائے تو بھی اس وجہ سے کہ حضرت کی کوئی تیسری بیٹی جس کا نام فاطمہ ہو تھی ہی نہیں پھر اس سند کو کیونکر مستند سمجھا جائے گا۔

(۲) ان ہی مصنوعی اور اختراعی قصوں میں یہ روایت بھی ہے کہ جو حضرت کی ہجرت مکہ سے تعلق رکھتی ہے اور جس کو آقائے دربندی نے عبداللہ ابن سنان کوفی سے نقل

کیا ہے۔ اس روایت میں بیان کیا گیا ہے کہ آپ کی روانگی کے وقت چالیس محملیں مخدرات عصمت کی سواری کے لئے تیار تھیں جن میں حریر اور دیبا کے پردہ آویزاں تھے اس کے بعد کنیزوں کا ہجوم اور سواری کا تزک واحتشام دکھایا گیا ہے یہ راوی ہمراہ تھا۔ یہاں تک کہ اس نے روزِ عاشورہ اہل بیت کی سواری بے محمل کو بھی دیکھا۔ تعجب ہے کہ اس لغو اور بے سروپا روایت کو بھی فاضل موصوف نے بلا تامل لکھ دیا اور تمام ذاکرین بڑے شدومد سے اس کو بیان کرتے ہیں حالانکہ مندرجۂ ذیل قرائن ایسے موجود ہیں جن پر لحاظ کرتے ہوئے اس روایت کے دروغ بے فروغ ہونے میں ذرا بھی شک نہیں رہتا۔

(ا) راوی صرف ایک ہے اور وہ بھی غیر ثقہ۔

(ب) یہ روایت کتاب اسرار الشہادۃ ملا آقائے دربندی کے سوا اور کسی کتاب میں مذکور نہیں اور مورخین فریقین میں سے کسی نے اس کو قلمبند نہیں کیا۔

(ج) راوی رسولِ خدا کی نواسیوں کو سوار ہوتی دیکھنا اپنا چشمدید واقعہ بیان کرتا ہے حالانکہ ایسا ہونا کسی طرح ممکن نہ تھا۔ کہ مردان اہل بیت اور خود حضرت کے موجود ہوتے اور سواری کا اہتمام کرتے ہوئے کوئی غیر اور نامحرم ایسے مقام پر جہاں مخدراتِ عصمت سوار ہو رہی ہوں ٹھہر کر ان کا تماشہ دیکھتا اور دوسرا شخص بتاتا جاتا کہ یہ زینب ہیں اور یہ ام کلثوم۔ یہ شہربانو ہیں اور یہ ام لیلےٰ۔

(د) راوی جنابِ شہربانو کی سواری کا تزک و احتشام سب سے زیادہ بیان کرتا ہے۔ درحالیکہ وہ معظمہ اس وقت زندہ ہی نہ تھیں۔

(ہ) اہل بیت مدینہ سے نہایت خوف و ہراس کی حالت میں پہر بھر رات گزری دشمنوں سے خفیہ روانہ ہوئے تھے اسی پر جمہور کا اتفاق ہے ایسی اخفا اور پریشانی کی حالت میں اس طرح کا امیرانہ اہتمام اور غیروں کو اس کی آگاہی کیونکر ممکن تھی۔

(و) یہ کروفر اور تکلفات جو آقائے دربندی نے نقل کئے ہیں سلطنت و امارت

کے شایانِ شایان اور دنیاوی تفاخر و نمود کے نشان ہیں ۔

سیرتِ خاندانِ نبوت و امامت کو شاہانہ جاہ و جلال اور امیرانہ تکلفات سے کیا علاقہ کیا اس کو عقل سلیم قبول کر سکتی ہے کہ الفقر فخری فرمانے والے کا نواسہ سلطان الاولیا جیسے تارک الدنیا کا بیٹا دیبا اور حریر کے پردے استعمال کرے اس اسراف و تبذیر کو حضرت سے منسوب کرنا آپ کی سخت توہین ہے ۔

(۳) محمد و ابراہیم پسران حضرت مسلم کی شہادت کے متعلق اس کے موقعہ پر حصہ دوم میں مفصل بحث کی جائی گی یہاں صرف اس قدر لکھ دینا کافی ہے کہ یہ واقعہ قدیم اور مستند کتابوں میں قطعاً نہیں بیان کیا گیا سب سے اول صاحب روضۃ الشہدا نے اس کو نقل کیا ہے لیکن کسی کتاب کی سند تحریر نہیں کی، روضۃ الشہدا کوئی مستند کتاب نہیں اس میں ضعیف اور بے اصل روایات بکثرت بھری ہوئی ہیں ۔ کیا عجب ہے کہ ملا صاحب کی اجتہادآفرینی اس روایت کی موجد ہو ۔ دوسرے مورخوں نے جو اس کی ناقل ہیں محض ملائے موصوف کی تقلید اور پیروی کی ہے سلسلہ روایت کے وثوق و عدم وثوق سے قطع نظر کر کے اصول درایت سے بھی اس کی تصدیق مشتبہ اور مشکوک ہے، جب نہ کوئی مسلسل سند ہے نہ کوئی معتبر تاریخی شہادت اور نہ اصول درایت اس کی موافق ہیں تو سوائے اس کے کہ اس روایت کو غلط اور موضوع کہا جائے اور کیا چارہ کار ہو سکتا ہے ۔

(۴) حضرت کے داخلہ کربلا کے بعد عام طور پر ایک روایت یہ بھی مشہور ہے کہ آپ نے نینوا ۔ غاضریہ کے باشندوں کو جو اس زمین کے مالک تھے بلوا کر فرمایا کہ میں یہاں قتل کیا جاؤں گا میرے دوست دور دور سے زیارت کو آئیں گے اس لئے چاہتا ہوں کہ اس زمین کو میرے ہاتھ فروخت کر دو وہ لوگ راضی ہوئے تو آپ نے ساٹھ ہزار درہم مرحمت فرمائے مگر یہ روایت سوائے معمولی کتابوں کے کسی معتبر اور مستند کتاب میں نہیں پائی جاتی ۔ مولوی غلام حسنین صاحب مرحوم اپنی کتاب ماتمین جلد اول کے صفحہ ۲۰۹ میں فرماتے ہیں کہ :۔ "یہ روایت

کسی کتاب میں مضمون مندرجہ بحر المصائب نہیں پائی جاتی اور آج تک مجھ کو اس کی سند نہیں ملی بہر حال علامہ کنتوری نے اس روایت کو محض بحر المصائب کے حوالے سے نقل کیا ہے حالانکہ بحر المصائب تاریخی کتاب کا درجہ نہیں رکھتی۔ بلکہ وہ بہت سی بے سر وپا روایات کا مجموعہ ہے

(۵) میدان کربلا میں کوفیوں کی فوج کس قدر فراہم ہوئی تھی۔ اس کی صحیح تعداد میں شدید اختلاف ہے اور مختلف اندازے۔ چھ ہزار سے چھ لاکھ تک بلکہ نو لاکھ ہیں جن کی مختصر کیفیت حسب ذیل ہے۔

چھ ہزار۔ تذکرہ خواص الامۃ سبط ابن جوزی۔
بیس ہزار۔ لہوف۔ سید ابن طاؤس۔ تاریخ اعثم کوفی۔
بائیس ہزار۔ مرات الجنان یافعی۔ مطالب السئول ابن طلحہ، روضۃ الشہدا۔ ملا حسین
تیس ہزار۔ بحار الانوار علامہ مجلسی۔ ناسخ التواریخ مرزا محمد تقی۔
پینتیس ہزار۔ مناقب ابن شہر آشوب۔
پچاس ہزار۔ شرح شافیہ ابی فراس۔
اکیاون ہزار۔ ناسخ التواریخ
اسی ہزار۔ مقتل ابو مخنف لوط ازدی۔

یہ اختلاف بڑھتے بڑھتے اس حد تک پہونچ گئے کہ بعض نے ایک لاکھ بعض نے دو لاکھ، بعض نے تین لاکھ بعض نے آٹھ لاکھ اور بعض نے ۹ لاکھ تک لکھ دیا۔ ان سب کی تفصیل فصل موجب طوالت ہے آقا ی دربندی اس مبالغہ میں سب سے آگے بڑھ گئے ان کا قول ہے کہ میدان کربلا میں چھ لاکھ سوار اور دو کروڑ پیادے جدال و قتال کے واسطے موجود تھے۔

اس میں شک نہیں کہ جب حضرت مسلم کوفہ میں آئے اور ان کے ہاتھ پر اٹھارہ ہزار یا ان سے بھی زائد آدمیوں نے بیعت کرلی اور یزید کو اس کی خبر ہوئی تو ممکن ہے کہ اس نے

بڑے لشکر کا تہیہ کیا ہو اگر اس کے کل صوبوں سے جنگی فوج آجاتی تو نو لاکھ سے بھی زیادہ تعداد ہو جانا کچھ بعید نہ تھا۔ غالباً جس قدر افواہیں شمارِ فوج کی بابت مشہور ہو گئیں ان سے بعض مورخوں کو دھوکا ہوا۔ اور انہوں نے بلا سوچے سمجھے جو سنا وہی لکھ دیا غور و تامل سے کام نہ لیا۔ مگر دیکھنا یہ ہے کہ اس مختصر فوج کشی کے واسطے جس میں کئی سازوسامان بادشاہ سے مقابلہ نہ تھا۔ اس قدر کثیر التعداد اور عظیم الشان لشکر کی ضرورت تھی بھی یا نہیں۔ اور اس کا اجتماع و انتظام ممکن بھی تھا یا نہیں اگر اس زمانہ کے اصولِ سیاسی اور نظام حربی پر نظر ڈال کر تفکر و تدبر سے کام لیا جائے تو یہ معاملہ صاف ہو جاتا ہے۔ مگر اس سے پہلے چند تنقیحات قابلِ غور ہیں۔

(۱) گورنر (عامل) کوفہ کی حدودِ حکومت میں کون کون سے علاقہ داخل اور اس کے اختیارات کس قدر وسیع ہیں۔

(۲) کوفہ میں کوئی فوجی چھاؤنی تھی یا نہیں۔

(۳) اس زمانہ میں فوجی نظام کیا تھا۔ فوجی دستوں کی تقسیم کس طریقہ پر تھی۔ فوجی عہدہ کون کون سے مقرر تھے۔

(۴) افواج کو دوامی تنخواہ ملتی تھی یا ضرورت کے وقت رضا کا۔ (والنٹیر) بھرتی ہو جاتے تھے۔

(۵) سامانِ حرب، خائر رسد اور بار برداری کا کیا انتظام تھا۔

(۶) فوجی نقل و حرکت کے وسائل کیا تھے۔

(۷) عبداللہ ابن زیاد کوفہ میں گورنر مقرر ہو کر کب آیا؟

(۸) عبیداللہ کو اس مہم کی انجام دہی کے متعلق کامل اختیارات حاصل تھے یا وہ امپیریل گورنمنٹ کے احکام کا پابند تھا۔

(۹) اگر گورنر کوفہ نے کتنے عرصہ میں فوجوں کی فراہمی کا انتظام کیا اور اتنے مدت میں اس قدر

فوجوں کا اجتماع ممکن تھا یا نہیں۔

(۱۰) دارالصدر سے فوجوں کے دستے کس طریقہ پر میدان جنگ کو روانہ کئے گئے۔

(۱۱) یہ فوج خاص کوفہ کی ہی تھی یا اس میں دوسری صوبوں کی فوجیں بھی شامل تھیں۔

(۱۲) تمام فراہم شدہ فوج کربلا میں پہونچ گئی تھی یا اس کے بعض دستے۔

اس زمانہ کے اصولِ جہاں داری اور صوبوں کی تقسیم سے پایا جاتا ہے کہ شہر کوفہ تمام علاقہ جات ایران آرمینیہ اور عراق کا دارالصدر تھا۔ عامل کوفہ ان سب ملکوں کا گورنر جنرل تھا اور صرف گورنر کوفہ پر ہی منحصر تھا بلکہ ہر صوبہ کا گورنر اپنے علاقہ حدود میں سیاہ و سفید کا مختار ہوتا تھا اور اپنے علاقہ کے کل نظم و نسق اور امن و بدامنی کا وہی جوابدہ اور ذمہ دار تھا اس کو ہر قسم کے ملکی و جنگی اختیارات حاصل ہوتے تھے۔ کوفہ جغرافیائی حیثیت سے اگرچہ ایک بڑا فوجی مرکز سمجھا جاتا تھا لیکن وہاں کوئی ایسی باقاعدہ چھاؤنی نہ تھی۔ جس میں مستقل فوجیں بستی ہوں۔ نہ اس زمانہ میں آج کل کی طرح کوئی خاص فوجی نظام مقرر تھا۔ نہ سلطنت کی طرف سے رعایا یا سپاہیوں کو فوجی قواعد کی مشق کرائی جاتی تھی۔ نہ فوجی دستوں کی تقسیم تھی نہ آرمی کور قائم تھے۔ نہ ڈویژن نہ پلٹنیں تھیں نہ رسالے نہ دوامی فوجی عہدوں کا تقرر عمل میں آتا تھا آج کل کی طرح نہ جنرل تھے۔ نہ کرنل نہ کپتان نہ رسالدار۔ نہ افسروں اور سپاہیوں کی دوامی تنخواہ مقرر تھی بلکہ فوجی ضرورت کے وقت سرداران قبائل اور عمالِ شاہی اپنی جمعیتوں کو لے کر شاہی جھنڈے کے نیچے فراہم ہو جاتے تھے۔ یہی عملدرآمد تمام صوبوں میں تھا۔ گورنران صوبہ جات مقامی شورشوں کو ایسے ہی سرداروں کی مدد سے فرو کر دیتے تھے۔ اگر کسی بڑے دشمن سے مقابلہ ہوتا۔ یا کسی دوسرے ملک پر چڑھائی ہوتی تو اس وقت خزانوں کے منہ کھول دئے جاتے جس قدر فوج کی ضرورت مناسب سمجھی جاتی اوسی قدر صوبوں سے طلب کر لی جاتی۔ ہر شخص سپاہی اور فنونِ جنگ کا ماہر و مشتاق تھا۔ رعایا میں سے جس قدر سپاہیوں کی ضرورت

ہوتی۔ بطور والنٹیر فوج میں بھرتی ہو جاتے، سرداران قبائل یا وہ لوگ جو اپنی قابلیت و شجاعت سے جنگی شہرت حاصل کرتے ان فوجی دستوں کی کمان کرتے تھے۔ لڑائی کے وقت فوجی تقسیم و ترتیب اور صف بندی خاص اصول کے ساتھ ہوتی تھی اور تمام سپاہی اپنے افسروں کے احکام و اشارات کی تعمیل اسی طرح کرتے تھے جس طرح آج کل کے قواعد دان پلٹن اور رسالے کرتے ہیں۔

سامانِ حرب اور ذخائرِ رسد کے گودام مہیا رہتے، مگر باقاعدہ رسد رسانی کا بھی کوئی خاص مکمل انتظام نہ تھا۔ فوجی نقل و حرکت میں جو سامان زیادہ [illegible] باقی ہوتا تھا [illegible] کا وجود ہی نہ تھا۔

بہرحال [illegible] تاریخی شہادتوں پر غور کیا جاتا ہے تو ان سے ثابت ہے کہ عبید اللہ ابن زیاد نے آخر ماہ ذی قعدہ یا شروع ۱۰ ذی الحجہ ۶۰ھ ہجری میں وارد کوفہ ہو کر نعمان بن بشیر سے چارج لیا۔ عبید اللہ کو یزید کی طرف سے کوفہ کی شورش اور بغاوت کے انسداد کے متعلق کامل اختیارات عطا کئے گئے تھے اور سوائے ان احکام کے جو دربارِ دمشق سے اس کے پاس پہنچیں ان کی تعمیل اس پر فرض تھی اور تمام معاملات اس کی رائے پر چھوڑ دئے گئے تھے۔ عبید اللہ نے آتے ہی اول تو حضرت مسلم کی گرفتاری اور قتل کی تدبیریں کیں، کوفیوں کو ڈرا دھمکا کر۔ بلکہ لالچ سے بھی برگشتہ کر دیا، چند ہی روز کے بعد ۹ ذی الحجہ کو حضرت مسلم کی شہادت کا واقعہ پیش آیا ادھر اس کو یہ پتہ لگا۔ کہ حسین علیہ السلام مکہ سے کوفہ کی طرف چل پڑے ہیں اس لئے اس کو بڑی عجلت اور تیزی سے کام لینا پڑا۔ وقت میں زیادہ گنجائش نہ تھی اس کو اندیشہ تھا کہ اگر حسین کوفہ میں آگئے تو ممکن ہے شہر والے ان کا ساتھ دینے پر آمادہ ہو جائیں اور پھر یہ معاملہ بالکل قابو سے باہر ہو جائے نہ اتنا وقت تھا کہ مرکزی حکومت کو اطلاع دی جاتی یا دوسرے صوبوں سے فوجوں کی فراہمی کا بندوبست کیا جاتا اُسے کوفیوں کی بدعہدی اور بیوفائی غداری اور زر پرستی پر پورا بھروسہ تھا۔ چنانچہ اس نے کوفیوں کو اپنے جوڑ توڑ سے سلطنت کا ساتھ دینے پر آمادہ کر لیا تھا اب اس نے پہلے تو راستوں کی ناکہ بندی کی اس کے بعد حُر کو ایک ہزار سوار کے ساتھ خاص اس خدمت پر مامور کیا کہ وہ آگے بڑھ کر حسین کا راستہ روک لے۔ اور حتی الامکان ان کو

کوفہ میں نہ آنے دے بلکہ وہ کسی دوسری طرف بھی نہ جانے پائیں اور جس طرح ممکن ہو، کسی ایسے مقام پر پہنچائے جائیں جو لڑائی کے لئے موزوں ہو۔ اس عرصہ میں حسین علیہ السلام کوفہ کے قریب پہونچ چکے تھے اور حُر نے دو منزل آگے بڑھ کر راستہ روکا، تو آپ کوفہ سے بائیں طرف ہٹ کر شمال و مغرب کی طرف ۳۰ میل اور آگے بڑھ گئے۔ اور کربلا میں پہونچ کر قیام فرمادیا۔

جب ابن زیاد کو یہ اطمینان ہوگیا کہ حسین کے ساتھ زیادہ جمعیت نہیں ہے اور یہ بھی انتظام کرلیا کہ دوسرے قبائل عرب کے لوگ آپکی مدد کو نہ آسکیں گے۔ تو اُس نے اُن ہی سرداروں کی ماتحتی میں جنہوں نے حسینؑ کو ۱۸ ہزار سے بلایا تھا۔ اور اب اپنے عہد و پیمان سے پھر چکے تھے جس قدر سوار و پیادے بہم ہوسکے مختلف دستوں کی حیثیت میں کربلا کی جانب روانہ کرنے شروع کر دئے چونکہ اس اہتمام و انصرام میں عجلت منظور رکھی وقت زیادہ نہ گذر جائے اس خیال کی وجہ سے کوفی والنٹیروں کے جس قدر دستے وقتاً فوقتاً مرتب ہوسکے تھے وہ سب افسر اور ممتاز سرداروں کے زیر حکم بھیجتا گیا یہی وجہ تھی کہ کسی سردار کے ساتھ ایک ہزار کسی کے ساتھ دو ہزار کسی کے ساتھ چار ہزار اور کسی کے ساتھ پانچ ہزار سپاہی روانہ ہوسکے، اگر اتنی عجلت نہ کی جاتی اور حضرت کے ساتھ بھی معتدبہ لشکر ہوتا تو البتہ دوسرے صوبوں کے باشندوں سے فوجوں کی طلب کرنے کی ضرورت ہوتی۔ اور بے شک اسوقت لشکر کی تعداد بہت زیادہ ہوتی مگر ضروریاتِ وقت اور ان کے متعلق عجلت و جلدی نے ایسا کرنے کی مہلت نہ دی۔ اور صرف کوفیوں کو تہدید و تحریص سے آمادہ کرلیا۔ یہی سبب تھا کہ اس فوج میں سوائے کوفیوں کے کوئی شامی یا حجازی۔ بصری یا مصری عجمی یا ارمنی شامل نہ تھا۔ صرف ایک شہر کوفہ سے لاکھوں سپاہی کیونکر میدان جنگ میں پہنچ سکتے تھے۔ نہ کوفہ اتنا بڑا شہر تھا جیسے فی زمانہ لندن و پیرس ہیں۔ دوسرے صوبوں سے فوجوں کا آنا یا دوسرے گورنران صوبہ جات کے نام فوجوں کی فراہمی کے احکام کا اجرا کسی کتاب سے

پایا نہیں جاتا اور نہ ہمارے پاس اس کے متعلق کوئی تاریخی شہادت موجود ہے جس قدر بھی تھے صرف کوفی تھے ابن زیاد آغاز ماہ ذی الحجہ میں کوفہ پہونچا تھا اور آخر ماہ ذی الحجہ تک اس کو یہ سب انتظام کرنا پڑا۔ ایک مہینہ سے بھی کم میعاد میں اس قدر وسیع پیمانہ پر فوجی انتظام کسی طرح ممکن نہیں ہو سکتا۔

اس کے علاوہ یہ بات بھی قابل غور ہے کہ اگر کسی سلطنت یا ایسے شخص سے مقابلہ کی ضرورت ہوتی جیسے ساتھ بڑا لشکر ہوتا تو اسی قدر فوجوں کی فراہمی ضروری سمجھی جاتی لیکن جب حاکم کوفہ کو یہ معلوم تھا کہ حسینؓ کے ساتھ بہت تھوڑے آدمی ہیں کوفی جن کے بھروسہ پر وہ اُدھر آ رہے ہیں اب ان کا ساتھ نہ دیں گے ورنہ وہ سب میرے قابو میں آچکے ہیں تو اُسے دغدغہ اور کھٹکا ہی کیا رہا تھا۔ لہٰذا اس نے بقدر ضرورت فوج جس کی تعداد بیس یا بائیس ہزار یا زیادہ سے زیادہ تیس ہزار تھی صرف کوفہ سے فراہم کر کے روانہ کر دی پچاس ہزار یا اسی ہزار یا لاکھوں سپاہیوں کی نہ تو ضرورت ہی تھی نہ ۲۰ - ۲۵ روز میں اس قدر آدمی فراہم اور تیار ہو سکتے تھے۔

فی زمانہ مستقل اور دوامی فوجیں متعدد چھاؤنیوں میں ہر وقت حاضر اور تیار رہتی ہیں ذخائر حرب۔ سامان رسد اور وسائل باربرداری کا انتظام اعلیٰ پیمانہ پر ہے صیغہ حرب کی ہر ایک شاخ کا اہتمام ایک مستقل محکمہ کی نگرانی میں ہے ذرائع آمد و رفت کی سہولت کے واسطے ریلیں اور جہاز موجود ہیں فوری احکام اور خبر رسانی کے لئے برقی تاروں کا جال پھیلا ہوا ہے تاہم کسی خاص مقام پر فوجی اجتماع میں طرح طرح کی دشواریاں حائل اور سدِ راہ ہوتی ہیں اور باوجود اس قدر آسانیوں کے فی الفور جنگی نقل و حرکت نہیں ہو سکتی۔ نہ سامان حرب، رسد اور باربرداری کا انصرام ہو سکتا ہے جس زمانہ میں یہ وسائل و ذرائع تھے ہی نہیں تو کیونکر ممکن تھا کہ ۲۰ - ۲۵ روز یا مہینہ سوا مہینہ میں لاکھوں سوار و پیادے معہ سامان رسد میدان جنگ میں پہونچ جاتے کس قدر حیرت اور افسوس ہے

کہ فاضل دربندی جیسا باخبر شخص اغراق کی حد سے بھی گزر جائے اور مہابھارت کے افسانے کو بھی مات کر دے جب سے دنیا میں نسل انسانی کا نشو ونما ہوا۔ بے شمار ہولناک اور خوں ریز معرکے پیش آچکے ہیں جن میں لاکھوں ہستیاں نذرِ خدنگ و تفنگ ہوگئیں خون کے ندی نالے بہہ گئے خصوصاً پچھلی عالمگیر زد وکشت نے دنیا کی جنگی تاریخ میں فوجی اجتماع کے لحاظ سے سب سے اونچی اور ممتاز جگہ حاصل کی مگر اس میں بھی ایک ہی وقت میں ایک محاذ پر اتنی فوجیں فراہم نہیں ہوئیں نہ اتنی بڑی عظیم الشان فوج کا اجتماع ایک ہی میدان میں نہ قیصر جرمنی سے ہوسکا اور نہ زار روس سے کربلا میں جہاں ایک طرف صرف ۷۲ یا ۸۲ یا زیادہ سے زیادہ ۱۴۵ آدمی تھے۔ لاکھوں سپاہیوں کی ضرورت ہی کیا تھی ممکن ہے کہ اس عرصہ میں ابن زیاد نے بہ نظر حزم واحتیاط مزید فوجی بھرتی کا سلسلہ جاری رکھا ہو اور کچھ دستے تیار بھی کر لئے ہوں مگر حضرت کی شہادت کے بعد اور فوج روانہ کرنے کی ضرورت ہی پیش نہ آئی۔

صاحب ناسخ التواریخ کا قول ہے کہ ابن زیاد نے ۱۵ ہزار فوج تیار کی تھی لیکن جن افسروں کے تحت میں پے بعد دیگرے سپاہ روانہ کی اس کی تعداد تیس ہزار سے زیادہ نہ ہونے پائی تھی اس کے بعد کہتے ہیں کہ میں نے جہاں تک استقرار اور تحقیق سے کام لیا میری رائے یہ قرار پائی کہ امام حسین علیہ السلام کا لشکر ۱۴۵ آدمی سے زیادہ نہ تھا۔ اور ابن زیاد کی فوج بیس ہزار سے کسی طرح کم نہ تھی۔ اگر مختلف روایتوں کو قبول کر لیا جائے تب بھی ابن زیاد کا لشکر ۵۱ ہزار سے زیادہ نہ تھا لیکن میرا ذاتی اجتہاد یہ ہے کہ ابن زیاد نے ۱۵ ہزار فوج مختلف سرداروں کے تحت میں روانہ تو کی تاہم چونکہ سب لشکر ایک ہی مرتبہ روانہ نہ ہوسکا۔ بلکہ پے بعد دیگرے روانہ ہوکر میدان جنگ میں پہنچتا رہا اس لئے حضرت کی شہادت کے وقت تک میدان کربلا میں تیس ہزار سے زیادہ فوج نہ پہنچ سکی۔ اور حضرت کی شہادت کے بعد تو اس کی کچھ ضرورت ہی نہ رہی (ناسخ التواریخ جلد ۶ صفحہ ۲۴۲)

ملائے مجلسی نے جن سرداران فوج کے نام لکھے ہیں اور ہر افسر کے ماتحت دستہ کو شمار کیا ہے اس سے صرف ۲۰ ہزار کی تعداد معلوم ہوتی ہے جس کے بعد فرماتے ہیں کہ میدانِ کربلا میں ابن زیاد کی بھیجی ہوئی فوج تیس ہزار تھی ناسخ التواریخ اور روضۃ الشہدا میں جن افسروں کے نام لکھے ہیں ان کی تفصیل حسب ذیل ہے۔

نمبر شمار	نام افسر	تعداد فوج	نمبر شمار	نام افسر	تعداد فوج
تعداد مندرجہ ناسخ التواریخ			تعداد مندرجہ روضۃ الشہدا		
۱	عمرو بن سعد	۶ ہزار	۱	عمر بن سعد	۵ ہزار
۲	سنان بن انس	۱۰ ہزار	۲	شمر بن ذی الجوشن	۴ ہزار
۳	خولی بن یزید	۱۰ ہزار	۳	حصین بن نمیر	۴ ہزار
۴	شمر بن ذی الجوشن	۴ ہزار	۴	یزید بن رکاب	۲ ہزار
۵	شیث بن ربعی	۴ ہزار	۵	عروہ بن قیس	۲ ہزار
۶	عروہ بن قیس	۴ ہزار	۶	قیس بن حنظلہ	۲ ہزار
۷	حصین بن نمیر	۴ ہزار	۷	نصر بن خرشہ	۲ ہزار
۸	بحر بن کعب	۳ ہزار	۸	حجار بن حر	۱ ہزار
۹	مضاہر بن رہینہ	۳ ہزار			
۱۰	یزید بن رکاب	۲ ہزار			
۱۱	نصر بن حرشہ	۲ ہزار			
۱۲	محمد بن اشعث	۱ ہزار			
۱۳	عبداللہ بن حصین	۱ ہزار			
۱۴	حجار بن حر	۱ ہزار			
	چودہ افسر	۵۵ ہزار		آٹھ افسر	۲۲ ہزار

یہ تو شمار و اعداد کے پرانے تخمینے تھے جو بیان کئے گئے اب جو زمانۂ جدید کے مایۂ ناز مورخ مولوی شبلی نعمانی کی سنئے آپ اپنی مشہور کتاب موازنہ انیس و دبیر کے صفحہ ۳۰ میں فرماتے ہیں۔

"کربلا کے واقعات جو میر انیس اور تمام مرثیہ گویوں کی موضوع شاعری ہیں جہاں تک تاریخ و روایت سے ثابت ہوتا ہے نہایت مختصر ہیں"

پر صفحہ ۱۱۲ میں لکھتے ہیں۔

"اس موقعہ پر شاید تم کو یہ خیال آئے کہ میر انیس کے رزمیہ میں گو الفاظ کی شکوہ و شان کی کچھ انتہا نہیں مگر اصلیت و واقعیت سے بمراحل دور ہے۔ معرکہ کے لحاظ سے اس واقعہ کربلا کی صرف یہ حیثیت ہے۔ کہ ایک طرف سو سوا سو آدمی تشنہ لب اور بے سروسامان تھے دوسری طرف تین چار ہزار کا مجمع تھا جو دفعتہً ٹوٹ پڑا اور تین گھنٹہ میں لڑائی کا فیصلہ ہو گیا"

پھر آگے لکھتے ہیں کہ "لیکن حقیقت یہ ہے کہ شاعری میں اصلیت اور واقعیت کا لحاظ تاریخی حیثیت سے نہیں کیا جاتا فرض کرو کہ شاہنامے کے سارے واقعات غلط ثابت ہو جائیں۔ تو اس سے فردوسی کے کمالِ شاعری میں کیا فرق آئیگا۔ ہم کو مولوی صاحب جیسے وسیع النظر مورخ سے تعجب ہے کہ انہوں نے اس واقعہ کو اس قدر خفیف سمجھا ہے کہ گویا اس کی تاریخی حیثیت سے کچھ وقعت ہی نہیں واقعہ کربلا ایک چھوٹی اور ناقابلِ اعتنا لڑائی نہیں ہے جس کا مرثیہ گویوں نے اس قدر طومار باندھ دیا ہے، ورنہ حقیقت میں ایسا نہ تھا معرکہ کربلا کی مثال شاہنامہ کے بے سروپا واقعات سے دیکھ کر یہ لکھنا صاف ظاہر کر رہا ہے کہ اگر مرزا حیرت کی رائے صحیح ہے تو بھی میر انیس کا کلام باعتبار شاعری اچھا ہے واقعہ سے غرض نہیں ہے مولوی صاحب نے فوج مخالف کی تعداد صرف تین چار ہزار تسلیم کی ہے مگر ہم نہیں سمجھ سکتے کہ یہ خیال ان کو کیونکر پیدا ہوا جہاں تک متقدمین اور متاخرین کی کتابوں کو دیکھا جاتا ہے۔ سپاہ کوفہ کا اسس

قدر قلیل التعداد ہونا کسی نے نہیں لکھا۔ علامہ سبط ابن جوزی نے تذکرہ خواص الامت میں سب مورخوں سے کم تعداد یعنی صرف ۶ ہزار لکھی ہے مگر وہ بھی مولوی صاحب کے اندازہ سے دو چند ہے اگر اس کو مولوی صاحب کا قیاسی اجتہاد مانا جائے۔ تب بھی کسی تاریخی شہادت کی ضرورت ہے۔ مورخ مختلف اقوال و روایات میں اصول و قرائن کی بنیاد پر فیصلہ کرتے ہیں نہ یہ کہ اپنی طرف سے فرضی اور قیاسی حکم لگادیں اس میں شک نہیں کہ اس تعداد میں ضرورت سے زیادہ مبالغہ کیا گیا ہے،، وضعہ خوانوں اور شاعروں نے واقعات کی صورت کو مسخ کیا ہے لیکن اگر میر انیس کے رزمیہ اشعار اصلیت اور واقعیت سے بمراحل دور ہیں تو مولوی صاحب کی تحریر بھی اصلیت اور واقعیت سے اس کے ہم پلہ ہے۔ اگر میر انیس نے مبالغہ میں زیادہ بڑھا دیا ہے تو مولوی صاحب نے حد سے زیادہ گھٹا دیا ہے جو مورخ کی شان سے بعید ہے۔

جن مورخوں نے حسینؑ اور انصار حسینؑ کے ہاتھ سے مقتولین سپاہ کوفہ کی تعداد لکھی ہے۔ مانا کہ وہ مبالغہ آمیز سہی جیسا کہ علامہ ابو اسحٰق اسفرائنی دشمنوں کی لاشوں کا شمار ۳۰ ہزار لکھتے ہیں اور آقائے دربندی تین لاکھ آٹھ ہزار، تین لاکھ تیس ہزار خود حضرت کے ہاتھ سے اور پچاس ہزار اصحاب و اقربا کے ہاتھ سے، تاہم اس میں شک نہیں کیا جاسکتا کہ اس کی میزان کسی طرح چار پانچ ہزار سے کم نہیں ہوتی ایسی حالت میں مولوی صاحب کا یہ ارشاد کہ سپاہ مخالف تین چار ہزار سے زیادہ نہ تھی صرف ان کی انفرادی رائے ہے۔ جس کی تائید میں نہ کوئی تاریخی شہادت ہے نہ دلیل تھوڑے آدمیوں کا مقابلہ کے وقت زیادہ آدمیوں کا قتل کر ڈالنا کچھ تعجب آمیز اور نرالی بات نہیں۔ تاریخ میں ایسی مثالیں بکثرت موجود ہیں مولوی صاحب کا یہ لکھنا کہ دوسری طرف تین چار ہزار کا مجمع تھا۔ جو دفعتہً ٹوٹ پڑا۔ اور تین گھنٹہ میں لڑائی کا فیصلہ ہوگیا ان کی منطق سراسر خلاف واقعہ اور مسلمہ عام کے برعکس ہے ظاہر ہے کہ گرمی کا موسم تھا۔ دن بڑا ہوتا تھا تین گھڑی دن چڑھا

تھا کہ لڑائی شروع ہوگئی اور تین گھڑی دن باقی تھا کہ حضرت شہید ہوئے اور جنگ کا خاتمہ ہوا۔ اگر شمار کیا جائے تو ۸ یا ۹ گھنٹہ سے کم لڑائی نہیں ہی۔

فوج مخالف کی طرح سپاہِ حسینی کی تعداد میں بھی اکثر مورخ مختلف البیان ہیں جس کی مجملاً کیفیت حسب ذیل ہے۔

(۱) حیات القلوب ملائے مجلسی، عوالم عبداللہ ابن نوراللہ۔ جلاء العیون۔ عبداللہ بن محمد رضا حبشی، روضۃ الشہدا۔ ملاحسین کاشفی، فتوح البلدان بلاذری۔ زبدۃ الفکرہ۔ عبوس منصوری۔ کتاب ارشاد شیخ مفید۔ تاریخ کامل ابن اثیر جزری۔ تاریخ خمیس شیخ حسین دیار بکری، اخبار الدول قرمانی۔ تاریخ مدائنی :۔ ۳۲ سوار۔ ۴۰ پیادے جملہ ۷۲۔

(۲) اعلام الوریٰ ابو علی فضل بن حسن طبرسی ۳۲ سوار ۴۰ پیادے جملہ ۷۲

(۳) العقد الفرید احمد بن عبد ربہ حیوٰۃ الحیوان دمیری ۷۷

(۴) فصول المہمہ نورالدین بن صباغ۔ رجال شیخ کشی ۷۸

(۵) مرات الجنان عبداللہ یافعی، مطالب السئول محمد ابن طلحہ شافعی ۸۲

(۶) مروج الذہب ابوالحسن علی بن حسین المسعودی ۸۷

(۷) محمد ابن ابی طالب ۳۲ سوار ۸۲ پیادے جملہ ۱۱۴

(۸) تاریخ کبیر محمد ابن جریر طبری ۴۰ سوار ۱۰۰ پیادے جملہ ۱۴۰

(۹) ناسخ التواریخ میرزا سپہر، تذکرہ سبط ابن جوزی، اسعاف الراغبین محمد بن علی صبان۔ لہوف سید ابن طاؤس ۴۵ سوار ۱۰۰ پیادے جملہ ۱۴۵

(۱۰) تذکرہ خواص الامۃ ابن جوزی ۷۰ سوار ۱۰۰ پیادے جملہ ۱۷۰

(۱۱) شرح شافیہ ابی فراس جملہ ۱۰۰۰

ان سب کی تفصیل و تنقیح محتاج طوالت ہے اس لئے ہم اپنی تحقیق و اجتہاد کا خلاصہ صرف اتنا ہی لکھ دینا کافی سمجھتے ہیں کہ فوج مخالف کی تعداد ۲۰ ہزار سے کم اور تیس ہزار سے

زیادہ نہ تھی اور ناصران امام ۷۲ سے کم اور ۸۲ سے زیادہ نہ تھے۔

(۶) علی العموم یہ بھی مشہور ہے کہ اہل بیت اطہار پر تین شبانہ روز پانی بند رہا اور یہ بندش ۷ محرم کی شام سے شروع ہو کر ۱۰ محرم کی شام تک رہی۔ بے شک ایسا ہی ہوا کہ ۷ محرم کو عبداللہ ابن زیاد کا حکم امتناعِ آب آنے پر عمر سعد نے دریا کے گھاٹوں پر پہرہ چوکی کا انتظام کر دیا جب آٹھویں کی صبح سے نہایت شدت کے ساتھ روک ٹوک دیکھی گئی۔ اور حضرت کے اہلِ بیت اور اصحاب پر پیاس کا غلبہ ہوا تو آپ نے اپنے دست مبارک سے پشتِ خیام پر زمین کھودی پانی نکل آنے پر آپ نے اور آپ کے سب ساتھیوں نے پیا۔ اور مشکیں اور پکھالیں بھر لیں شام تک سب پانی ختم ہو گیا۔ پیاس کی شدت اور دوسری ضروریات نے مجبور کیا تو حضرت عباس نے پھر کنواں کھودا۔ مگر پانی نہ نکلا رات کو جناب عباس ۳۰ سواروں اور ۲۰ پیادوں کے ساتھ بیس مشکیں لے کر دریا پر گئے اور بزور تیغ پانی بھر لائے۔ یہ پانی بھی رات بھر کے لئے ہی کافی تھا۔ نویں کی صبح کو پھر وہی پانی کا قحط اور پیاس کی شدت موجود تھی، رات کو پانی لانے سے اب دریا پر اس قدر انتظام تھا کہ آٹھ ہزار سے زیادہ جنگی سپاہی دریا کے گھاٹوں کو روکے ہوئے تھے۔ اس طرح نویں تاریخ کی صبح سے دسویں کی شام تک پھر پانی میسر نہ آیا۔ نویں کا تمام دن۔ دسویں کی تمام رات اور دسویں کا تقریباً تمام دن، گویا دو دن اور ایک رات پانی بالکل بند رہا جسکے تقریباً ۱۲ پہر یا ۳۶ گھنٹہ ہوتے ہیں۔

مخدرات کے لئے بچوں کا ساتھ، گرمی کا موسم خیموں کے گرد خندق کی آگ اور آگ پر سے گزرتے ہوئے لُو کے جھونکے۔ مردوں کے لئے ہنگامہ جدال و قتال، ہتھیاروں کی تپش، دھوپ کی حدت، گرد و غبار کا بادل، لُو کی لپٹیں، زخموں کی کثرت یہ ایسے اسباب تھے جنہوں نے پیاس کی شدت کو بدرجہا بڑھا کر بالکل ہی ناقابل برداشت بنا دیا تھا ورنہ درحقیقت پانی تین شبانہ روز بند نہیں رہا۔ بلکہ ان لوگوں کے لئے جو صبح کے بعد درجہ شہادت پر فائز ہوئے ایک دن اور ایک رات جنہوں نے ظہر تک شہادت پائی ان پر ڈیڑھ دن : در

ایک رات پانی کی بندش کی ابتدا خود حضرت کو ایک دن ایک رات اور دوسرے روز شام تک (جو وقت شہادت تھا) پانی نہیں ملا، اور اہل بیت کو اس سے بھی بعد تک قریب مغرب تین شبانہ روز کا دعویٰ کیا غالباً لوگوں کو اس حکم سے ہوا ہے جو ابن زیاد نے عمر کو بھیجا تھا۔ اور اس کی تعمیل اسی وقت سے شروع ہوگئی تھی اور اسی پر تمام مورخین کا سلف سے آج تک اتفاق ہے۔

(۷) اسی موضوع و واقعات میں حضرتِ زینب کے صاحبزادوں کے متعلق تین باتیں عام طور پر غلط مشہور ہوگئی ہیں۔ (۱) وہ علم داری لشکر کے امیدوار تھے (۲) دونوں ساتھ لڑے اور شہید ہوئے (۳) بڑے کی عمر ۱۱ سال اور چھوٹے کی ۹ سال تھی لیکن یہ کوئی تاریخی اور کتابی باتیں نہیں بلکہ مرثیہ گو شاعروں کی مضمون آفرینی کے ساتھ واقعہ آفرینی کے نتائج ہیں ورنہ درحقیقت ان تینوں باتوں کا وجود ہی نہیں، نہ وہ علم کے خواہشمند ہوئے جس سے جناب زینب کی ناخوشی اور فہمائش کی نوبت آتی، نہ دونوں ایک ساتھ لڑائی کو گئے بلکہ پہلے عون معرکہ آرا ہوئے اور ان کی شہادت کے بعد محمد جس طرح یہ دونوں صورتیں من گھڑت ہیں اسی طرح ان کی کم عمری کا مبالغہ بھی ہیچ از دست ہے۔ واقعہ کربلا کے وقت جناب زینب کی عمر ۵۴ یا ۵۵ سال سے کم نہ تھی، وہ حضرت سید الشہدا سے ڈیڑھ دو سال چھوٹی اور آپ کے بعد جناب امیر علیہ السلام کی اولاد میں سب سے بڑی تھیں۔ جوانی کے عام قاعدہ فطرت کو چھوڑ کر بلا کسی تاریخی ثبوت کے سن کہولت میں ان کی اولاد ہونا کیونکر تسلیم کر لیا جائے۔ نہ کسی مورخ نے ان صاحبزادوں کی عمر ۹۔۱۰ سال لکھی ہے اس کے علاوہ مورخوں نے اس کا تذکرہ بھی نہیں کیا کہ یہ دونوں جنابِ زینب کے بطن سے تھے۔ یا ان میں سے ایک۔ جیسا کہ ہم دوسری جلد میں بالتفصیل بیان کریں گے۔

(۸) جنگ ہاشم بن عتبہ، بن ابی وقاص۔ محرق القلوب، روضۃ الشہدا اور اسرار الشہادت میں ہاشم کی لڑائی، بڑی شد و مد اور شان و شوکت سے بیان کی گئی ہے مگر

یہ ہے کہ صاحبِ ریاض نے جہاں معرکہ ہاشم کو لکھا ہے وہاں یہ بھی تحریر کیا ہے کہ صاحب روضہ چند معتبر تاریخوں سے اس واقعہ کو نقل کرتے ہیں۔ حالانکہ روضۃ الشہدا اگر گھر موجود ہے جس میں اس واقعہ کے متعلق کسی کتاب کا حوالہ درج نہیں ہے کس قدر حیرت کی بات ہے کہ ملا بیچارہ نے تو ایک کتاب کا بھی حوالہ نہیں دیا اور صاحبِ ریاض زبردستی چند معتبر کتابوں کا حوالہ اس کے سر تھوپتے ہیں تو نفسًا اگر روضۃ الشہدا میں ایک نہیں دس کتابوں کا حوالہ تحریر بھی ہوتا تو فضول تھا کیونکہ تمام مورخین کا اتفاق ہے کہ ہاشم جنگ صفین میں واقعہ کربلا سے ۲۴ برس پہلے جناب امیر علیہ السلام کے ہمرکاب شہید ہو چکے تھے اس پر لطف یہ کہ خود صاحبِ ریاض ملا محمد حسن قزوینی تحریر فرماتے ہیں کہ:-

"ہاشم بن عتبہ کہ ملقب بہ مرقال بود، در جنگِ صفین علمدار جناب امیر المومنین و شجاع و نامدار و از مشاہیرِ روزگار بود و دراں غزوہ بہ عزِ شہادت فائز گردید"

اس سے زیادہ عجیب یہ کہ اس لڑائی کے متعلق بیان کیا گیا ہے کہ جب عمر سعد نے ہاشم کے مقابلہ پر چار ہزار سوار بھیجے تو حضرت نے بھی اپنے بھائی فضل بن علی کو دس سواروں کے ساتھ کمک پر بھیجا حالانکہ علمائے انساب جنھوں نے بڑی جستجو تلاش اور محنت سے جنابِ امیر کی اولاد کے نام اور حالات فراہم کئے ہیں ان میں کسی ایک نے بھی فضل کا نام نہیں لکھا اس سے ثابت ہوتا ہے کہ جنابِ امیرؑ کے صاحبزادوں میں کسی کا نام فضل نہ تھا۔ راوی مفتری نے واقعہ کے ساتھ یہ نام بھی وضع کیا ہے۔

(۹) ان وضعی اور جعلی روایتوں میں سب سے زیادہ مشہور اور قابلِ لحاظ دامادیٔ قاسم کی وہ روایت ہے کہ حضرت نے انصار اور بنو عقیل اور بنو جعفر کے بعد اپنی بڑی بیٹی فاطمہ کا عقد اپنے بھتیجے قاسم بن الحسن سے کر دیا وجہ اس کی یہ بیان کی گئی کہ جب حضرت قاسمؑ نے آپ سے جنگ کی اجازت چاہی۔ اور آپ نوجوان بھتیجے کو اجازت دینے پر رضامند

ہوئے۔ تو قاسم نہایت محزون اور متفکر ہو کر الگ جا بیٹھے۔ اس وقت خیال آیا کہ میرے والد بزرگوار نے وقتِ انتقال ایک کاغذ بطور تعویذ میرے بازو پر باندھ کر فرمایا تھا۔ قاسم! جب تجھ پر سخت مصیبت کا وقت پیش آئے تو اس کاغذ کو کھول کر پڑھنا۔ اور اس میں جو کچھ لکھا ہے اس پر عمل کرنا۔ یہ خیال آکر کہ اس وقت سے زیادہ اور مصیبت کا کون سا وقت ہوگا اس تحریر کو کھول کر پڑھا۔ تو حضرت امام حسن علیہ السلام کی طرف سے ایک وصیت نامہ تھا جس میں آپ نے تحریر فرمایا تھا کہ میرے بھائی حسینؑ پر ایک وقت ایسا آنے والا ہے تجھ کو لازم ہے کہ اسوقت اپنی جان ان پر قربان کرنے سے دریغ نہ کرنا۔ قاسم اس تحریر کو دیکھ کر نہایت خوش ہوئے اور فوراً خدمتِ عمِ نامدار میں حاضر ہو کر اس تحریر کو پیش کیا آپ اس کو پڑھ کر بہت روئے اور فرمایا تمہارے باپ نے جس طرح تم کو وصیت کی ہے مجھ کو بھی ایک وصیت کی تھی یہ فرماکر خیمہ میں تشریف لائے۔ اور مخدراتِ عصمت کو طلب فرماکر ارشاد کیا کہ میرے بڑے بھائی نے مجھ کو وصیت کی تھی۔ کہ فاطمہ کبریٰ کا عقد قاسم سے کرنا اب یہ اپنے باپ کی وصیت پر عمل کرنے کو تیار ہیں میں بھی چاہتا ہوں کہ اپنے بھائی کی وصیت کو پورا کر دوں۔ یہ فرماکر قاسم اور کبریٰ کا عقد پڑھا اور اس کے بعد حضرت نے بھتیجے کو میدانِ جنگ کی اجازت دی۔

مگر یہ قصہ محض بے بنیاد، بے اصل اور سراسر بہتان و افترا ہے۔ قدما کی تمام کتابوں میں اس کا کہیں ذکر نہیں۔ متاخرین نے بھی جس نے روایات و واقعات کی صحت وغیرہ صحت کا لحاظ رکھا ہے اس روایت کو نقل نہیں کیا۔

کتابِ کامل الزیارۃ ابن قولویہ، ارشاد شیخ مفید۔ کتاب المزار سید مرتضیٰ علم الہدیٰ، مثیر الاحزان ابن نما۔ لہوف سید ابن طاؤس، خرائج الجرائح قطب راوندی۔ مناقب ابن شہر آشوب، کشف الغمہ علی بن عیسیٰ اربلی، اعلام الوریٰ علامہ طبرسی، امالی شیخ صدوق، امالی شیخ طوسی، بحار ملائے مجلسی الانوار النعمانیہ سید نعمت اللہ جزائری، نظم الزہرا ملا رضی قزوینی

طوفان البکا جوہری۔ نہج الصلاح علامہ حلی۔ ناسخ التواریخ، مرزا سپہر کاشانی۔ قمقام الزخار، شہزادہ فرہاد مرزا۔ علماء و مورخین شیعہ۔ تاریخ کبیر طبری۔ تاریخ کامل ابن اثیر۔ تاریخ ابن خلدون، تاریخ ابوالفدا۔ تاریخ اعثم کوفی، دول الاسلام ذہبی، اخبار الدول قرمانی۔ مرآت الجنان یافعی۔ صواعق محرقہ ابن حجر مکی۔ تاریخ ابی حاتم مکی۔ تاریخ ابن عساکر دمشقی۔ ینابیع المودۃ شیخ سلیمان قندوزی، نورالابصار شیخ مومن، نورالعین علامہ ابواسحٰق اسفرائنی (وغیرہم علماء اہل سنت) کسی نے بھی اس کا ذکر تو کیا اشارہ تک نہیں کیا۔ علامہ نوری طبرسی کتاب لولو و مرجان میں لکھتے ہیں :-

"چگونہ می شود قضیہ باایں عظمت و قصہ چنیں آشکار المحقق و مضبوط باشد و بنظر تمام ایں جماعت نرسیدہ باشد حتی مثل شہر ابن آشوب کہ تصریح کردہ اند کہ ہزار جلد کتاب مناقب نزد او بود"

مختصر یہ کہ قدیم کتابوں میں تو اس روایت کا بالکل وجود نہیں البتہ آخر زمانہ میں کتاب روضۃ الشہداء سے جو اکاذیب و اباطیل کا خزانہ ہے یہ بلا نکلی ... سے ایک نئی اور دلچسپ بات دیکھ کر شیخ فخر الدین طریحی نے اپنی منتخب میں نقل کر دیا۔ اس کے بعد دوسرے بدعت پسند غیر محتاط اور رطب و یابس میں تمیز نہ کرنے والے اشخاص بلا سوچے سمجھے اس روایت کو نقل در نقل کرتے آئے۔ اور یہ تو رانہ تقلید آئندہ نسلوں کے لیے حجت ہو گئی ہے۔

بہر حال اس روایت کا ماخذ حسب تحریر سید العلماء مولانا سید حسین عرف میرن صاحب بھی روضہ کاشفی ہے۔ چنانچہ آپ مجالس مفجعہ میں تحریر فرماتے ہیں

روایۃ تزویج القاسم لم تذکر فی اکثر الکتب المعتبرۃ ولذا ترکھا مولانا المجلسی لکن ذکرھا فخر الدین فی جامعہ وکان ماخذہ

تزویج قاسم کی روایت اکثر کتب معتبرہ میں ذکر نہیں کی گئی اسی وجہ سے اس کو علامہ مجلسی نے چھوڑ دیا۔ البتہ فخر الدین نے اپنے جامع میں اس کا ذکر کیا ہے

ساہر بن الحسن الکاشفی | اور اس کا ماخذ حسین کاشفی کی تاریخ ہے۔

اس واقعہ کا منشاء یہ روایت ہے کہ غیر معتبر کتابوں میں سند بنتی ہوئی شروع ہوگئی۔ مورخین اور علماء نے اس کی طرف توجہ کی اور دوسری بے اصل باتوں کی طرح اس کو بھی اپنی کتابوں میں بھر دیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ یہ روایت جو افتراء محض اور جسارت کی شان مباہات میں گستاخی اور توہین ہے، ایک واقعہ مسلمہ کی حیثیت اختیار کر کے ایسی ذائع و شائع ہوئی کہ اب عام لوگوں کے دماغوں اور خیالوں سے اس کا ازالہ دشوار ہوگیا اور اس کے متعلق طرح طرح کی باتیں جو مخرب ایمان ہیں۔ عزاداری کا ایک جزو اہم قرار دی گئیں۔ تاہم علماء کی ایک جماعت نے اس کی قدح بھی کی ہے ملا باقر مجلسی جلاء العیون میں فرماتے ہیں: "روایت دامادی قاسم در کتب معتبرہ بنظر حقیر نرسیدہ" علامہ نوری کہتے ہیں: "قصہ عروسی قاسم قبل از روضہ در ہیچ کتاب دیدہ نشدہ" ملا محمد قزوینی کہتے ہیں "کتب معتبرہ میں دامادی قاسم کا ذکر نہیں ہے۔ ہم بھی اس کو چھوڑتے ہیں اس لئے کہ ناقل نے کسی راوی کی طرف اسکو منسوب نہیں کیا" لکھتے ہیں:

"واز قبیل ہمیں خرافات است آنچہ مابین عوام الناس اشتہار گرفتہ کہ فاطمہ بنت الحسین را در کربلا با قاسم ابن الحسن عقد بستند"

سیر الائمہ میں ہے:

"کہ روایت دامادی قاسم در کربلا از اکاذیب روایات است"

ناسخ التواریخ میں ہے کہ:-

"حدیث دامادی قاسم در کربلا و تزویج کردن حسین فاطمہ را با او از اکاذیب روایات است حسین را دو دختران افزوں نبود یکے فاطمہ زوجہ حسن مثنی و آں دیگر سکینہ بود"

ہم نے جو کچھ اوپر بیان کیا وہ مختصراً و مجملاً ایک تمہید ہے جس کی تشریح و تفصیل آگے کی جائے گی۔ بہرحال اس مسئلہ نے ایک عرصہ سے نزاعی صورت اختیار کر لی ہے۔ ایک گروہ قصئہ عروسی کا مؤید اور دوسرا مخالف ہے اس کے متعلق متعدد کتابیں اور رسالے تحریر ہوئے ہیں اور مجتہدین عراق و ایران سے فتوے طلب کئے گئے ہر فریق اپنے مفید مدعا دلائل و براہین پیش کرتا ہے اگرچہ ہمارا یہ کام نہیں ہے کہ کسی مباحثہ اور مناظرہ کو اپنی کتاب میں جگہ دیں یا کسی نزاعی امر میں اپنی تحریر کو قولِ فیصل قرار دیں۔ تاہم ہمارا فرض یہ ضرور ہے کہ تاریخی واقعہ کے اختلاف کو بنظرِ غائر دیکھیں اور صرف اصولِ مقررہ اور تاریخی شہادتوں سے اس کو جانچ کر نہایت آزادی کے ساتھ اپنی رائے کا اظہار کر دیں اس بحث کے متعلق اس وقت دو کتابیں ہماری پیشِ نظر ہیں ایک رسالہ حج قاطعہ مرتبہ مولوی ابوالحسن صاحب مجتہد لکھنؤ۔ اس روایت کے اثبات و تائید میں دوسرا التقریرات القاسم مرتبہ مولوی سید ظہور حسین صاحب قبلہ مجتہد لکھنؤ اس کے ابطال و تردید میں ہم کو ان دونوں بزرگواروں کے تبحر تقدس اور اجتہاد سے کوئی بحث نہیں کیونکہ مذہبی عالم ہونے کی حیثیت سے ہمارے نزدیک دونوں یکساں واجب الاحترام ہیں نہ ہم ایک کو دوسرے پر ترجیح دے سکتے ہیں۔ مگر دیکھنا یہ ہے کہ من حیث الوجوہ کس کے دلائل قوی ہیں اور کس کے حجج و براہین کو فنِ تاریخ کے نقاد تسلیم کر سکتے ہیں۔

ہم کو افسوس ہے کہ رسالہ حجج قاطعہ کے دلائل اس کے نام کے موافق حجج قاطعہ نہیں۔ اور اس کے ذی قدر مؤلف نے اپنے محض قیاسات کی بنا پر اپنے مقلدین اور متبعین کی دلجوئی کو مدنظر رکھتے ہوئے ایک محض بے اصل قصہ کو ثابت کرنے کی کوشش کی ہے لطف یہ ہے کہ وہ خود بھی اس کے وقوع اور عدمِ وقوع میں مذبذب ہیں۔ اور ان کے وجدانِ سلیم نے اس کا کوئی قطعی فیصلہ نہیں کیا کہ یہ واقعہ ہوا ہی تھا۔ تاہم احتمالات و قیاسات سے فائدہ اٹھا کر اس کے جواز کا فتویٰ دیتے ہیں۔ جیسا کہ ذیل کے

کے منقولہ اقتباسات سے ظاہر ہوگا۔

مولانا ممدوح کا ارشاد ہے کہ ہم اس کے مدعی نہیں ہیں کہ عقدِ قاسم حتماً واقع ہوا۔ اور نہ یہ کہتے ہیں کہ یہ موضوع اور بے اصل ہے حتماً واقعہ نہیں ہوا۔ بلکہ دوسری روایات فضائل ومصائب کی طرح اس میں بھی وقوع اور عدم وقوع کا احتمال ہے لہٰذا جس طرح ان روایات فضائل ومصائب کا پڑھنا جائز ہے اسی طرح عقدِ قاسم کا پڑھنا بھی جائز ہے۔ پھر آگے فرماتے ہیں کہ اگر بیانِ مصائب وفضائل میں روایات وجوب وحرمت اور اعتقادات کی طرح تحقیق وتنقید کی جائے، تو تمام کتب فضائل ومصائب جس کو علماء نے بہ ہزار دقت ودشواری جمع کیا ہے بے کار اور غیر معتبر ہو جائیں گی، اور بابِ فضائل ومصائب ذکر بالکل مسدود ہو جائے گا گویا آپ کو اس سے یہ مقصود ہے کہ فضائل ومصائب کے متعلق کیسی ہی بے اصل ومزخرف روایت کیوں نہ ہو، اس کا پڑھنا جائز ہے، اور اس کی تحقیق وتنقید کی ضرورت نہیں پھر آگے کتابِ کافی کا حوالہ دیکر لکھتے ہیں کہ جناب امیر سے منقول ہے کہ جب تم کوئی روایت بیان کرو تو اس کی نسبت ناقل کی طرف کر دو۔ اگر وہ روایت صحیح ہے تو اس کا نفع وثواب تم کو ملے گا اور اگر جھوٹ ہے تو اس کا نقصان ناقل پر ہوگا نہ کہ تم پر یہی وجہ ہے کہ ابنِ شہر آشوب نے خارجیوں اور غالیوں حتیٰ کہ قاتلانِ حسین کی روایت کی ہے اس سے ثابت ہے کہ نقلِ روایت میں تحقیق کی کوئی ضرورت نہیں۔ احتمالِ صدق کافی ہے۔ اس پاور ہوا تمہید کے بعد ارشاد ہوتا ہے کہ روایتِ دامادیِ قاسم بھی مثل اور مصائب اور واقعات کے ہے ہرگز علم ویقین اس کے کذب کا نہیں ہے ناقلِ معتبر نے اس کو بیان کیا ہے۔ بلکہ ایک جماعت علماء ومجتہدین نے اس کو لکھا ہے اور معتبر جانا ہے اگر یہ روایت بے اصل محض ہوتی۔ تو اس قدر علماء اس کو ہرگز نہ لکھتے نہ پڑھنے کی اجازت دیتے۔ اس سے معلوم ہوا کہ یہ بھی دوسرے مصائب کی طرح ہے اور اس کا پڑھنا بھی جائز اور موجبِ ثواب ہے بلکہ اگر بحوالۂ کتاب پڑھا جائے تو بلا خوف جائز۔

اِس کے بعد فرماتے ہیں کہ ملا حسین کاشفی ایک مشہور اور معتبر عالم ہیں وہ جھوٹی روایت نقل نہیں کر سکتے کیونکہ جو شخص اپنے مذہب کا بڑا عالم ہو صاحب تصنیفات اور بہ لقب واعظ مشہور ہو وہ ایک جھوٹی روایت جس کا ماخذ معتبر نہ ہو بلا سوچے سمجھے اپنی کتاب میں لکھ دے۔ پھر روضۃ الشہداء کے معتبر اور مستند ہونے پر زور دیتے ہوئے لکھتے ہیں کہ یہ بلاشبہ معتبر کتاب ہے اور اس کا مؤلف بھی معتبر ہے اس کے بعد ایک قیاسی فیصلہ کرتے ہیں کہ ملا کاشفی نے ضرور کسی معتبر کتاب سے لکھا ہوگا گو کسی کے نام کی صراحت نہیں ہے ممکن ہے کہ ملائے موصوف سے پہلے بھی کسی نے اِس روایت کو لکھا ہو اور ہمیں اُس کا حال معلوم نہ ہو، کیونکہ تمام کتبِ تاریخ کا استقراء غیر ممکن ہے، بس کوئی وجہ نہیں ہے کہ اتنا بڑا عالم بلا وجہ جھوٹ بولے۔ اگر کسی واقعہ یا روایت کو ہم نے کسی کتاب میں نہیں دیکھا تو اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ وہ واقعہ بے اصل محض ہو۔ اکثر ایسا ہوا ہے اور ہوتا ہے کہ بعض روایات اور واقعات سے انکار کیا جاتا ہے اور بعد تتبع عام وہ واقعہ نکل آتا ہے ایسا ہی واقعہ دامادیٔ قاسم کا ہے کسی مورخ معتبر کا کسی واقعہ کے بیان میں منفرد ہونا مستلزم اُس واقعہ کے کذب کا نہیں ہے، جیسا کہ عون بن علیؑ کی شہادت کو سوائے صاحب روضۃ الاحباب کے اور کسی نے نہیں لکھا۔ اور صاحب ناسخ التواریخ نے بوجہ ایک جید عالم ہونے کے اُسی پر اعتماد کرکے اپنی کتاب میں درج کر دیا ہے اسی طرح ملا کاشفی بھی جلیل القدر عالم ہیں ان کی روایت کو موضوع کہنا کیا معنے رکھتا ہے۔

دامادیٔ قاسم کو ایک گروہ علماء و مجتہدین نے لکھا ہے اور پڑھنے کو جائز جانتے ہیں بلکہ بعض مجتہدین پڑھتے بھی ہیں اگر یہ روایت غلط ہے تو کیا کسی کو تنبہ نہ ہوا۔ ایک گروہ کی نسبت غفلت و سہو کا اور توہم نہیں ہو سکتا واقعہ دامادیٔ قاسم کا مضمون تاریخی ہے اور مضمون تاریخی کے ثبوت کی دلیل کل علماء کے نزدیک مورخ معتمد کا بیان ہے۔ صاحب روضۃ الشہداء کا اعتماد ثابت ہے علاوہ روضۃ الشہداء کے علامہ طریحی نجفی بھی اس کے ناقل ہیں ان کے اعتبار میں تو کوئی شبہ نہیں کر سکتا کسی عالم نے اس کے موضوع ہونے کی تشریح نہیں کی۔ بلکہ ایک

جماعت علما اس کو صحیح جانتی ہے اور پڑھنے کی اجازت دیتی ہے۔ خود صاحب روضۃ الشہدا نے اس کے ماخذ کو لکھ دیا ہے بلکہ قاسم کے بیان سے بھی عقد کو ثابت کیا ہے۔ ثبوت اس کا یہ ہے کہ ترجمۂ ابوالمفاخر میں رجز کے اشعار درج ہیں ان میں حضرت قاسم فرماتے ہیں ؎

با اس و نبساس دامادی ✿ عزم ترتیب راہ خواہم کرد

معلوم ہوا کہ ملائے کاشفی نے ابوالمفاخر خوارزمی کی کتاب سے اس روایت کو لیا ہے۔ اور کتب تاریخ میں مقتل ابوالمفاخر ایسا معتبر ہے جس سے کاشفی سا عالم واقعات کو اپنی کتاب میں نقل کرتا ہے۔ اس کے بعد آپ کا قیاسی اجتہاد یہ ہے کہ چونکہ ناقل معتبر نے ابوالمفاخر سے نقل کیا ہے لہذا وہ ضرور معتبر ہے، اگر روضۃ الشہدا کو معتبر نہ مانا جائے۔ حالانکہ کسی عالم نے اس کو غیر معتبر نہیں لکھا تو علامہ طریحی تو معتبر ہیں کیا عجب ہے کہ انہوں نے بھی روایت عروسی کو ابوالمفاخر سے ہی نقل کیا ہو، یہ لفظ روی بالنقل کہہ کر انہوں نے بھی نقل کیا ہے۔ اگر یہ کہا جائے کہ روز عاشورہ روز مصیبت تھا۔ روز شادی نہ تھا۔ اور اس واقعہ کا ہونا عقلاً مستبعد ہے۔ تو اس کا مستبعد ہونا مسلم نہیں۔ حضرت ؑ نے کوئی تکلف نہیں کیا۔ بلکہ صرف اپنے بھائی کی وصیت پر عمل کر کے عقد پڑھا دیا۔ اور یہ خیال فرمایا کہ اپنی بیٹی کے رنڈاپے کو بھی گوارا کر لوں تاکہ کوئی مصیبت رہ نہ جائے۔ اور درگاہ خداوندی میں میرے اجر میں اور زیادتی ہو۔

اب رہا یہ امر کہ حضرت کے صرف دو صاحبزادیاں فاطمہ اور سکینہ تھیں۔ اور فاطمہ کا عقد حسن مثنیٰ سے ہو چکا تھا۔ مگر دختران حضرت کا صرف دو میں انحصار باطل ہے کسی نے دو کسی نے تین کسی نے چار صاحبزادیاں لکھی ہیں، جب فریقین کی تصریحات سے تین اور چار بیٹیوں کا ہونا بھی ثابت ہے تو اس حالت میں کوئی کیونکر یقین کر سکتا ہے کہ دو سے زیادہ صاحبزادیاں حضرت کے نہ تھیں ممکن ہے کہ حضرت نے کسی تیسری بیٹی سے بموجب

وصیت قاسم کا عقد کر دیا ہو۔ اس میں خلاف عقل و نقل کون سی بات ہے جو اس کو جھوٹ اور موضوع کہا جاتا ہے اور عزاداری میں کی کی جاتی ہے۔ روضہ اور منتخب میں بھی یہی لکھا ہے ان میں کسی صاحبزادی کے نام کی تصریح نہیں ممکن ہے کہ تیسری یا چوتھی صاحبزادی کو فاطمہ کبریٰ بھی کہتے ہوں بلکہ فاطمہ صغریٰ کا ہونا اس بات کا قرینہ واضح ہے کہ حضرت کی اولاد میں کوئی فاطمہ کبریٰ بھی تھیں اس سے ثابت ہوتا ہے کہ حضرت کی صاحبزادیاں دو سے زیادہ ہیں ان ہی زائد کا نام فاطمہ کبریٰ تھا۔ اگرچہ ان کو زینب وغیرہ بھی کہتے ہوں یہ کہنا کہ حضرت کی بیٹیوں میں فاطمہ ایک ہی تھیں ان ہی کو فاطمہ صغریٰ بہ سبب جناب سیدہ صلوٰۃ اللہ علیہا کے کہتے تھے، اور راوی نے ان ہی کو فاطمہ کبریٰ سے تعبیر کیا ہے۔ اس خیال سے کہ وہ جناب سکینہ سے بڑی تھیں نہ یہ کہ فاطمہ کبریٰ کوئی بیٹی ہیں۔ فاسد ہے۔

آگے چل کر فرماتے ہیں کہ ہمارے علمائے کرام کی ایک جماعت نے عقد قاسم کو اپنی کتب مقاتل میں لکھا ہے اگر یہ موضوع اور جھوٹا ہوتا تو اس قدر علمائے جلیل القدر اپنے مقاتل میں کیوں لکھتے بلکہ بعض نے یہ استدلال بیان کیا ہے کیا کوئی عاقل متدین ان حضرات کی نسبت یہ کہہ سکتا ہے کہ انہوں نے ایک جھوٹی روایت اپنی کتابوں میں لکھ دی۔

پھر چند علما کے نام لکھتے ہیں یعنی شیخ فخر الدین طریحی نجفی۔ سید ہاشم بن سلیمان۔ ملا محمد تقی برغانی ملقب بہ شہید ثالث۔ حاجی ملا محمد صالح برغانی۔ ملا مہدی ترانی۔ محمد بن سلیمان تنکابنی۔ شیخ جعفر شوستری نجفی۔ سید العلما سید میرن صاحب۔ تاج العلما سید علی محمد صاحب۔ شمس العلما مفتی سید محمد عباس صاحب کہ ان سب بزرگواروں کے فضائل اور تبحر فی العلم کو بیان کر کے لکھتے ہیں کہ ایسے باخبر لوگ کیونکر کسی غلط خبر کو اپنی کتابوں میں درج کر دیتے۔ یا اس کو پڑھنے کی اجازت دیتے۔ اگر سوائے روایات قطعیہ کے اور روایات کا پڑھنا جائز نہیں تو یہ خلاف اجماع ہے۔ باب فضائل و مصائب بالکل مسدود ہو جائے گا۔ فضائل و

مصائب بیان کرنے کا مدار ناقل معتبر پر ہے۔ جب ناقل معتبر بیان کریگا خواہ وہ کسی لفظ سے بیان کرے اس کے پڑھنے میں کوئی مضائقہ نہیں ہے اور ایسے احتمالات تو کل مقاتل پر ہو سکتے ہیں وہ سب غیر معتبر ہو جائیں گے۔

آخر میں ارشاد ہوتا ہے کہ روایتِ عروسیِ قاسم کے پڑھنے کو کسی عالم نے منع نہیں کیا۔ بلکہ خود علما نے پڑھا ہے یہاں بھی لکھنؤ میں عہد جناب غفراں مآب مولوی سید دلدار علی صاحب سے آج تک جس قدر علما اور مجتہدین گزرے ہیں کسی نے منع نہیں کیا۔ سلطان العلما سید العلما مولانا سید تقی۔ سید بندہ حسین۔ سید ابراہیم۔ سید کچھن۔ سید ابو صاحبان وغیرہم یہ سب علما شنا کئے اور ان کی مجالس میں پڑھا جاتا تھا۔

یہ ہے حج قاطعہ کا خلاصہ جس پر مثبتین اور موئدینِ قصۂ دامادی کو ناز ہے لیکن یہ ایک تاریخی واقعہ اور اس کی تحقیق و تنقید ہے کسی مسئلہ فقہ یا تفسیر و حدیث پر بحث نہیں جو علما اور مجتہدین کے فتوؤں اور اس کے جواز دعام جواز پر استدلال کیا جائے۔ جو لوگ اس واقعہ کو تاریخی نگاہ سے دیکھنے والے اور تاریخی شہادتوں سے اس کی جانچ کرنے والے ہیں وہ خوب سمجھ سکتے ہیں کہ ایک نقاد فن ان کمزور اور بودی تاویلات کو کہاں تک نظرِ وقعت سے دیکھ سکتا ہے۔

دینیات میں تبحر اور مسائل شرعی میں اجتہاد دیگر شے ہے اور تاریخ و فلسفہ تاریخ پر عبور شے دیگر۔ کوئی روایت جب تک کہ درایت کے معیار پر پوری نہ اترے تاریخی حیثیت سے ہرگز قابلِ قبول نہیں ہو سکتی خواہ کوئی ملا یا مجتہد اس کو تحریر فرما دیں یا کوئی علامہ اور آقا۔

حج قاطعہ کے علاوہ ایک اور رسالہ مخزن الانوار ہماری نگاہ سے گذرا۔ جو اس قصہ کے اثبات میں تحریر ہوا ہے اس کا ماحصل یہ ہے کہ حکایتِ شادیِ قاسم اکثر مرثیوں میں نظم ہے۔ گو مرثیوں میں اس کے بیانات کو مختلف عنوانوں سے لکھا گیا ہے مگر اصل قصہ کو علامہ فخر الدین طریحی نجفی نے بیاضِ فخری نجفی میں سید ہاشم بحرینی نے مدینۃ المعاجز میں ملا محمد حسن قزوینی نے ریاض الشہادت میں اور فاضل دربندی نے اسرار الشہادت میں اس عروسی کو بدلائل

طویلہ و براہین عقلیہ تحریر کیا ہے اور جناب علیین مکان سید میرن صاحب نے باوجودیکہ اس مضمون کو شاذ فرمایا ہے تاہم اس قصّہ کو اپنی کتاب مجالس صفحہ میں جگہ دی ہے اس لئے بعض لوگوں کا ذکرِ عروسی قاسم سے منع کرنا قابل قبول نہیں اور مبنی اس کے ضعف کے صرف دو مقام معلوم ہوتے ہیں اول صاحب ناسخ التواریخ کا انکار۔ دوسرے کتاب المآثر والآثار۔ صاحب ناسخ التواریخ اگرچہ وسیع النظر اور محقق فن تاریخ ہیں۔ مگر اتنے جلیل القدر علماء کے مقابلہ میں ان کا قول قابل حجت نہیں ہے۔ صاحب کتاب المآثر والآثار۔ تو نہ زمرۂ علماء و ثقات سے ہیں نہ کوئی مرد جیدالاستعداد۔ صرف کتب خانہ شاہی کے داروغہ رہے ہیں اس لئے ان کی کتاب ایسی حیثیت نہیں رکھتی جو قابل اعتماد ہو۔

اب ہم تقریر القاسم لقصۂ عقد القاسم کے ان محقق و مدلل اقتباسات کو درج کرنا چاہتے ہیں جو اس قصۂ بے اصل کے ابطال و تردید میں مولوی سید ظہور حسین صاحب کے پُر زور قلم سے نکلے ہیں اور جس سے صرف ہم کو ہی اتفاق نہیں ہے بلکہ ہر وہ شخص جو فہمیدہ دل و دماغ عقلِ صائب، احساسِ صحیح اور علم تاریخ میں وسعتِ نظر رکھتا ہے، اس کا وجدان سلیم ان براہینِ قاطعہ کی حقانیت کو بلا تامل تسلیم کرلیگا اور اس کا ضمیر خود شہادت دیگا۔ کہ جو لوگ اس من گھڑت روایت کے اثبات میں اپنا وقت ضائع کرتے ہیں۔ اور حضرت کی شانِ مبارک میں اس بہتان و افترا کو ایک خفیف اور معمولی بات ہی نہیں سمجھتے۔ بلکہ اس کی ترویج و قیام کو عزاداری کا جزو اہم قرار دیتے ہیں وہ کس طرح ایک افسوسناک غلط فہمی میں مبتلا ہیں۔ آمدم برسرِ مطلب۔ تقریر القاسم کے اقتباسات حسب ذیل ہیں۔

بظاہر اس قصّہ کی ابتدا روضۃ الشہدا سے معلوم ہوتی ہے۔ جیسا کہ کتاب مذکورہ مطبوعہ بمبئی باب نہم صفحہ ۳۰۵ میں مرقوم ہے۔

"راوی گوید کہ چوں قاسم بن الحسن چہرۂ برادر خود را دید۔ آہ از نہاد او برآمدہ پیش عم بزرگوار خود آمد وگفت۔ اے شہزادہ دو جہاں مرا دیگر قوت مفارقت

اقا۔ ب نماند وزمانہ از سر برسر ور دبہجتم بر خاکِ اندوہ ومصیبتم نشاندہ دستوری
دہ تا کینہ برادر باز جویم امام حسینؑ گفت۔ اے جانِ عم تو مرا از برادر یادگاری
من ترا چگونہ اجازت دہم۔ مادرِ قاسم نیز از درِ خیمہ بیروں دوید ودامن
قاسم بر دست پیچیدہ فریاد برکشید، القصہ قاسم اجازتِ حرب نیافت۔
وبخیمہ درآمدہ سر بزانوئے اندوہ نہاد۔ ناگاہ یادش آمد کہ پدر تعویذے بر
بازوے وے بستہ بود وفرمودہ کہ در محلے کہ اندوہ بسیار بر تو غلبہ کند ایں
تعویذ را باز کن وبخوان وبدانچہ درآں جا نوشتہ است کارکن۔ قاسم
با خود اندیشید کہ تا من بودہ ام مرا حالتے چنیں نیفتادہ وبدنسیاں ملائے
دست ندادہ بیا تعویذ را بخوانم ومضمون آں را بدانم پس آں تعویذ را از
بازو باز کردہ وبکشادہ۔ دید کہ امام حسن بخطِ مبارک خود نوشتہ است۔ اے
قاسم وصیتے می کنم ترا کہ چوں برادرم وعمت حسینؑ را بینی در کربلا بدست
شامیانِ پُر دغا۔ وکوفیانِ بے وفا۔ گرفتار شدہ زنہار کہ سر خود در قدم
وے اندازی۔ وجانِ خود را برائے رضائے وے در بازی وہرچند ترا از
مصاف باز دارد تو مبالغہ نمائے ودر الحاح وابرام افزائی کہ جان فدائے
حسین کردن مفتاحِ بابِ شہادت ووسیلۂ اقبال وسعادت است قاسم
ایں وصیت نامہ را فرد خواند۔ وازشادی ندانست کہ چہ کند۔ زود از جائے
بجست وبخدمتِ شاہزادہ آمدہ نوشتہ بدست وے داد۔ چوں شاہ
شہیداں آں مکتوب را بدید، آہِ سوزناک از جگر برکشید۔ زار زار بنالید
وگفت اے جانِ عم ایں وصیتِ پدرِ تست بہ نسبتِ تو ومی خواہی کہ بدیں
وصیت کار کنی ومرا ہم در بارۂ تو وصیتے دیگر فرمودہ ومن نیز داعیہ دارم کہ
آں را بجا آرم بیا تا ساعتے بدیں خیمہ درآئیم وبداں وصیت قیام نمائیم پس

دست قاسم گرفتہ بخیمہ درآورد و برادرانِ خود عون و عباس را طلبید و مادرِ قاسم را گفت کہ جامہ ہائے نو در قاسم پوش۔ و خواہر خود زینب را گفت کہ عیبہ جامہ امام حسن را بیار فی الحال بیاوردند و در پیش وے حاضر کردند۔ سر عیبہ را کشادو درّاعۂ حسن و یک جامۂ قیمتی خود در قاسم پوشانید و دستار زیبا بدستِ مبارکِ خود و در سرِ وے بست و دستِ دختر ے کہ نامزدِ قاسم بود گرفتہ گفت اے قاسم ایں امانتِ پدرِ تست کہ بتو وصیت کردہ تا امروز نزدِ یک من بود اکنوں بستاں۔ پس دختر را باوے عقد بست و دستش بدست قاسم داد و از خیمہ بیروں آمد۔

مگر اس روایت کا بطلان بھی خود صاحب روضۃ الشہداء کی تصریحات سے واضح ہوتا ہے اور جس سے دروغ گورا حافظہ نباشد کی پوری تصدیق ہوتی ہے۔ اس عبارت میں ملائے کاشفی نے حضرت قاسم کی دامادی کو بیان کیا ہے مگر حضرت کی دختر کا نام معین نہیں کیا۔ لہٰذا اس تعین میں خود ان ہی کے کلام کی طرف رجوع کرنا چاہیئے۔ چنانچہ انہوں نے حضرت سید الشہداء کی اولاد دختری میں فقط، فاطمہ اور سکینہ کو بیان کیا ہے اور فاطمہ کے زوجہ حسن مثنیٰ ہونے کی تصریح کر دی ہے جیسا کہ کتاب مذکور کے صفحہ ۴۳۰ ذکر اولاد حضرت سید الشہداء میں لکھتے ہیں: "او را چہار پسر و دو دختر بودہ" اور اسی صفحہ کی سطر آخر میں لکھتے ہیں کہ:-

"و چوں فاطمہ خواہر زین العابدین ہم زشہر بانو بودہ۔ و بہ حسن بن حسن دادہ اند پس اولاد حسن مثنیٰ را پیغامبری و بادشاہی جمع باشد"

ان عبارتوں پر نظر کرنے سے صاحب روضۃ الشہداء کے بیان کا تناقص اور قصۂ مذکور کا موضوع و بے اصل ہونا کسی طرح پوشیدہ نہیں رہ سکتا۔ اس لئے کہ عبارت مذکورہ سے حضرت کی اولادِ دختری کا فاطمہ و سکینہ میں انحصار اور فاطمہ کا زوجہ حسن مثنیٰ ہونا ثابت ہوتا ہے۔

اس کے بعد ممدوح نے ان لوگوں کے بیان کی تردید کی ہے جس کے کلام سے رسالہ مخزن الرزوائیں استدلال کیا گیا ہے ان میں سب سے پہلے شیخ فخر الدین طریحی نجفی ہیں۔ جنھوں نے اس قصہ کو منتخب میں تحریر کیا ہے اور اس مقام پر وہ عبارت یقیناً نقل کی جاتی ہے جو مجالس مضبوعہ کے مطبوعہ لکھنؤ میں منتخب سے نقل کی گئی ہے۔

قال مولانا فخر الدين في جامعه انه جاء القاسم بن الحسن وقال يا عم الاجازة لامضي الى هؤلاء الكفرة فقال له الحسين يا ابن الاخ انت من اخي علامة واريد ان تبقى لاسلي بك ولم يعطه اجازة للبراز فجلس مهموما مغموما باكي العين حزين القلب واجاز الحسين اخوته للبراز ولم يجزه فجلس القاسم متألما ووضع راسه على رجليه وذكر ان اباه كان قد ربط له عوذة في كتفه الايمن وقال له اذا اصابك الم وهم فعليك ان تحل العوذة وتقرأ فافهم معناه واعمل بكل ما تراه مكتوبا فيها فقال القاسم لنفسه مضى برهة من السنين علي ولم يصبني مثل هذا الالم فحل العوذة ففضها ونظر

مولانا فخر الدین اپنی کتاب میں لکھتے ہیں کہ قاسم بن حسن حضرت کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کی کہ چچا مجھ کو بھی ان کافروں سے لڑائی کی اجازت دیجئے۔ آپ نے فرمایا بھتیجے تو میرے بھائی کی نشانی ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ تو باقی رہے اور میں تجھ سے تسلی پاؤں اور آپ نے ان کو میدان میں جانے کی اجازت نہ دی قاسم مغموم روتے ہوئے رنجیدہ دل بیٹھ گئے۔ اس کے بعد حضرت نے قاسم کے بھائیوں کو میدان جنگ کی اجازت دیدی مگر ان کو نہ دی۔ قاسم با دل غمناک بیٹھ گئے۔ اور اپنے سر کو دونوں زانوؤں میں رکھ لیا۔ اسی عرصہ میں ان کو یاد آیا کہ ان کے والد بزرگوار نے ایک تعویذ ان کے بازو پر باندھا تھا اور فرمایا تھا کہ جب تجھ کو کوئی صدمہ پہنچے تو اس تعویذ کو کھول کر پڑھنا اور اس کے مطلب پر غور

ابی کتابھا اذا فیھا یا ولدی یا قاسم
اوصیک انک اذا رأیت عمک الحسین
فی کربلا وقد احاطت بہ الاعداء
فلا تترک البراز والجہاد لاعداء اللہ
واعداء رسولہ ولا تبخل علیہ بروحک
وکلما نھاک عن البراز عاودہ لیاذن
لک فی البراز لتحظی بالسعادۃ فقام
من ساعتہ واتی الی الحسین و
عرض ما کتب اخوہ الحسن علی عمہ
الحسین فلما قرء الحسین العوذۃ
بکی بکاءً شدیداً ونادی بالویل
والثبور وتنفس الصعداء وقال یا بن
اخی ھذا الوصیۃ لک من ابیک
وعندی منہ الیک وصیۃ ولا بد
من انفاذھا فمسک الحسین علی
ید القاسم وادخلہ الخیمۃ وطلب
عونا وعباسا وقال لام القاسم
الیس للقاسم ثیاب جدد قالت لا فقال
فقال لاختہ زینب ائتینی بالصندوق
فاتت بہ الیہ ووضعت بین یدیہ
ففتحہ واخرج منہ قباء الحسن والبسہ

کرنا اور جو کچھ اس میں لکھا ہے اس پر عمل
کرنا۔ قاسم نے دل میں خیال کیا کہ:-
جس قدر زمانہ میری عمر کا گذرا اس میں
ایسی مصیبت کی گھڑی نہیں آئی۔ تب اس
تعویذ کو کھولا۔ پڑھا اور غور کیا اس میں لکھا
تھا کہ اے میرے بیٹے القاسم میں تجھے وصیت
کرتا ہوں کہ جب تو اپنے چچا حسینؑ کو کربلا میں
اس حالت سے پائے کہ ان کو دشمنوں نے
گھیر لیا ہو تو لازم ہے کہ میدان جنگ میں
جانے سے منہ نہ موڑنا حسینؑ اور رسول خداؐ
کے دشمنوں سے جہاد کرنا۔ اپنی جان سے
دریغ نہ کرنا اور اگر حسینؑ تجھ کو میدان
میں نہ جانے دیں تو تو اس قدر اصرار کرنا کہ
وہ تجھ کو جہاد اور حصول سعادت کی اجازت
دے دیں یہ پڑھ کر قاسم فوراً کھڑے
ہو گئے، حضرت کی خدمت میں حاضر ہوئے
اور جو کچھ امام حسنؑ نے تحریر فرمایا تھا اپنے
چچا کے سامنے پیش کر دیا۔ حضرت نے اس
نوشتہ کو پڑھا شدت سے روئے اور با آواز
بلند گریہ فرمایا یہاں تک کہ آپ کی آواز رک
گئی اور فرمایا کہ اے بھتیجے یہ وصیت تیرے

القاسم ویلف علی راسه عمامة الحسن
ومد بید ابنته التی کانت مسماة
للقاسم فعقد له علیها وافرد له خیمة
واخذ بید البنت ووضعها بید
القاسم وخرج عنها فعاد القاسم ینظر الی
ابنة عمه ویبکی الی ان سمع الاعداء
یقولون هل من مبارز فرمی بید
زوجته واراد الخروج وقال دونی
فی الفراق وخاب الظن وانقطعا دیت
والقلب منه یشتکی الوجع والحاسدی
رق لی مما اکابره والکید قطعه ذکر
الغوی قطایا بین بان اصطباری
یوم فرقتهم رفقا بمهجة قلب قلبه
جزعاً یا دهر هیجت احزانی بفرقتهم
یا لیت نجم النوا والبین ما طلعا
واضحت الدار قصرا الا الیس لهما
سواء البکاء وشعل الحی ما اجتمعا
یا خیبتی این احبابی وما صنعت
بهم عواذل ایام فقد قطعا و
طلع من الخیمه فجذبت ذیل القاسم
ومانعته من الخروج وهی تقول

باپ نے تجھ کو کی ہے۔ مجھے بھی تیرے لئے ایک وصیت فرمائی تھی۔ ضرور ہے کہ میں اس کو پورا کروں۔ یہ فرما کر آپ نے قاسم کا ہاتھ تھام لیا اور خیمہ میں تشریف لائے اپنے بھائیوں عون اور عباس کو طلب فرمایا اور والدۂ قاسم سے ارشاد کیا قاسم کے نئے کپڑے نہیں ہیں انہوں نے عرض کی نہیں تب آپ نے اپنی بہن زینب سے فرمایا کہ میرے پاس کپڑوں کا صندوق اٹھا لاؤ۔ وہ لے آئیں اور ان کے سامنے رکھ دیا۔ آپ نے صندوق کھول کر امام حسنؑ کی قبا نکالی اور قاسم کو پہنائی، پھر ان کے سر پر امام حسنؑ کا عمامہ باندھا اور اپنی اس بیٹی کا جو قاسم سے منسوب تھیں ہاتھ تھام کر قاسم سے عقد کر دیا ایک خیمہ ان کے لئے خالی کرا دیا۔ اور بیٹی کا ہاتھ تھام کر قاسم کے ہاتھ میں دیدیا اور خیمہ سے باہر تشریف لے آئے۔ پس قاسم لوٹے اپنے چچا کی بیٹی کو دیکھتے تھے اور روتے تھے۔ یکایک انہوں نے سنا کہ دشمن ہل من مبارز کی آواز دے رہے ہیں یہ سن کر انہوں نے اپنی زوجہ کا ہاتھ

يا بحظر بيالك وما الذي تريد نفعله
قال لها اريد ملاقاة الاعداء فانهم
يطلبون البراز واني على الميدان
عازم والى دفع الاعداء جازم
فلزمته الزوجة فقال لها خليلي
ذيلي فانا عرسنا اخرناه فصاحت
وناحت وانت من قلب حزين و
دموعها جارية على خديها فقالت
في يوم القيامة باي شي اعرفك
وفي اي مكان اراك فمد القاسم
بيده وضربها على ردنه فقطعها
وقال يا بنت العم اعرفيني
بهذا الردن المقطوعة فانضجع
اهل البيت بالبكاء والعويل لفعل
القاسم وبكى بكاء شديدا ونادى
ايا لويل والثبور ثم انه جزع وقال
ايا منا عذرت والدهر غدار في الرجا
واوقد بالعشاء نارا مطرحين
على الرمضا كانهم اسود غاب لهم
نور واقمار هذا الفراق من الاحباب
واسفا من النصير ومن يحمي عن العار

چھوڑ دیا خیمہ سے باہر آنے کا ارادہ کیا اور فرمانے
لگے۔ فراق نزدیک ہوا اور جو گمان مجھ کو تھا۔
میں اس سے محروم رہا اور امید منقطع ہو گئی اور
میں نے ایسی حالت میں شب بسر کی کہ میرا
دل اس کے درد سے شکایت کر رہا تھا۔ میرا
حاسد بھی مجھ پر آفت لانے لگا۔ ان تکلیفوں
سے جن کو میں برداشت کر رہا ہوں اور
میرے جگر کی یہ حالت ہے کہ اس کو نیت
سفر کے ذکر نے ٹکڑے ٹکڑے کر دیا ہے۔
اے فراق میری بے صبری ان کے فراق
کے دن ظاہر ہو گی ایسے عاشق کی جان
کے ساتھ نرمی سے پیش آ جس کا قلب جزع
و فزع میں ہے۔ اے زمانہ تو میرے غم و اندوہ
کو ان کے فراق کے سبب سے ہیجان میں لایا ہے۔
اے کاش نیت سفر اور جدائی کا ستارہ طلوع
نہ ہوتا گھر ویران ہو گیا اب کوئی اس گھر سے انس
کرنے والا نہیں رہا سوائے گریہ و بکا اور
پراگندہ قبیلہ کے جو جمع نہیں ہے ہائے محرومی
میرے احباب کہاں ہیں اور زمانہ کی ملامت
گردش نے ان کے ساتھ کیا کیا پس وہ سلسلہ منقطع
ہو گیا اس کے بعد خیمہ سے باہر آ گئے۔ اس وقت

یا کربلا للبلا یا فیک تجرعنا
بالمیت لان کا ضعنا نحوک سار
یا کربلا فیک قد کانت منینا
یا طول حزنی و قلبی فیہ تا افکار
یا ابنۃ العمان القلب فی حزن
فالقلب فیہ حرارات و اکدار

ان کی دُلہن نے ان کا دامن تھام لیا باہر جانے سے روکا اور کہا کہ تمہارا کیا خیال ہے اور کس کام کا ارادہ کر رہے ہو قاسم نے کہا کہ میں دشمنوں سے مقابلہ کا ارادہ کر رہا ہوں۔ اور وہ لڑائی کے لئے بلا رہے ہیں اس لئے میں میدان جنگ کا عزم اور دشمنوں کو دفع کرنے کا قصد کر رہا ہوں ان کی عروس نے پھر روکا۔ قاسم نے فرمایا میرا دامن چھوڑ دو۔ ہماری عروسی ختم ہوئی اس پر وہ دلی رنج سے روئیں۔ نوحہ کیا ان کے رخساروں پر آنسو جاری تھے۔ پھر کہا۔ میں قیامت کے دن تم کو کس طرح پہچانوں گی اور تم کس جگہ ملو گے۔ یہ سن کر قاسم نے اپنی آستین چاک کر کے الگ کی اور کہا کہ اے چچا کی بیٹی تم مجھ کو اس آستین سے پہچان لینا۔ قاسم کی ان باتوں پر اہل بیت میں بہت رقت اور گریہ وزاری ہوئی۔ سب بلند آواز سے روئے اس کے بعد قاسم باہر آ گئے اور یہ فرماتے جاتے تھے۔ ہمارے زمانہ نے بے وفائی کی اور زمانہ بے وفا ہے۔ زمانہ نے مردوں کو فنا کر دیا اور جسم کے اندر آگ بھڑکا دی ہمارے ساتھی ریگ پر پڑے ہوئے ہیں گویا وہ سب شیر نیستاں تھے جیسے نور تابندہ ہے ان کے چہرے چاند ہیں یہ دوستوں کی جدائی ہے۔ ہائے افسوس کون مددگار ہے۔ اور کون ہے جو عار سے بچانے کے لئے حمایت کرے اچوتھا شعر غلط مہمل ہے کوئی معنی نہیں اے کربلا تجھ میں ہم سب کی موت ہے۔ ہائے میرا ملال کس قدر طویل ہے اور میرا قلب تجھ میں شگافتہ ہے اے چچا کی بیٹی البتہ میرا دل حزن و ملال میں ہے اس لئے دل میں گرمیاں اور کدورتیں ہیں۔

واضح ہو کہ منتخب کے اکثر نسخوں میں اس قصہ کی ابتدا بہ لفظ نقل یا رُوِی کی گئی ہے۔ اور مجالس مضجعہ میں جو اشعار ہیں وہ اکثر نسخوں میں نہیں بہر حال صاحب منتخب کا اس قصہ

کو تحریر کرنا کئی وجوہ سے قابلِ استدلال نہیں۔

(۲) انھوں نے لفظ رُوی یا نُقل درج کیا ہے جس سے ان کے نزدیک اس روایت کا ضعیف یا مشکوک الصحت ہونا ثابت ہوتا ہے اس لئے کہ لفظ رُوی یا نقل۔ یا جاءت الروایت یا ذُکِر کذا وغیرہ کا استعمال خبر ضعیف یا مشکوک الصحتہ میں کیا جاتا ہے اور یہ مسئلہ علمائے فریقین کا متفق علیہ ہے۔

(۳) صاحب منتخب نے غالباً اس قصہ کو روضۃ الشہداء سے نقل کیا ہے۔ جیسا کہ سید العلماء نے مجالسِ مفجعہ میں فرمایا ہے۔ لٰکن ذکرھا فخرالدین فی جامعۃ و کان ماخذہ تاریخ الحسین الکاشفی چونکہ بیان روضۃ الشہداء کی تردید کی جا چکی ہے اس لئے جب اصل نامعتبر ہے، تو فرع کے نامعتبر ہونے میں کہاں تک کلام۔

(۴) بالفرض یہ روایت منتخب میں روضۃ الشہداء سے ماخوذ نہ ہو تب بھی کوئی عاقل اس کو صحیح نہیں مان سکتا۔ اس لئے کہ منتخب کی عبارت جو مجالسِ مفجعہ سے نقل کی گئی ہے ایسے اشعار پر مشتمل ہے جو حضرت قاسم کی جلالتِ قدر کے سراسر منافی ہیں کیونکہ ان اشعار میں ایسے عاشقانہ مضامین مذکور ہیں جن کو عاشقِ سرگشتہ کے سوا کوئی بیان نہیں کر سکتا۔ بالخصوص جناب سید الشہداء اور اہلِ بیتِ اطہار کے سامنے۔ ایسے اشعار کا زبان پر جاری کرنا نہایت بے شرمی بے باکی اور جسارت ہے جس کے لوث و آلودگی سے حضرت قاسم کا دامنِ طہارت مبرا اور منزہ ہے۔

(۵) ان اشعار میں ایسے عیوب اور نقائص موجود ہیں جو کسی طرح اہلِ زبان کی طرف منسوب نہیں ہو سکتے بلکہ یہ اشعار کسی قاعدے سے بھی درست نہیں۔ اس مطلب کو وہ لوگ بہتر جان سکتے ہیں جو فنِ عروض میں فی الجملہ مہارت رکھتے ہیں علی الخصوص مصرع "یا طول حزنی و قلبی فیک افکار" کا ضحکہ شواکل ہونا محتاجِ بیان نہیں اس لئے کہ لفظ افکار جو کلمۂ فارسیہ ہے کسی عرب اہلِ زبان کا کام نہیں۔

(۱) اس داستان میں زوجہ قاسم کا تمام اہل بیت کے سامنے قاسم کے دامن کو پکڑ لینا جانب میدان جانے سے مانع ہونا ان کے فراق میں جزع و فزع کرنا۔ یوم حشر کی معرفت کے لئے قاسم کا قطعہ آستین کو ان کے حوالہ کر دینا اور اہل بیت کا اس فعل کے بعد بشدت گریہ وزاری کرنا مذکور ہے مگر ایسے افعال کا سب بزرگوں کے سامنے فاطمہ بنت الحسین اور قاسم ابن الحسن دونوں بزرگواروں کی جلالت قدر اور حیائے فطری کے بالکل منافی ہے۔

(۲) سید ہاشم بحرینی ہیں جنہوں نے اس قصہ کو مدینۃ المعاجز میں نقل کیا ہے لیکن وہ بھی منتخب سے لیتے ہیں چنانچہ لکھتے ہیں "قال الصغری روی انہ" چونکہ منتخب کے متعلق اوپر لکھا جا چکا ہے اس لئے ان کے بیان سے تعرض کی چنداں ضرورت نہیں۔

(۳) ملا محمد حسین قزوینی ہیں۔ انہوں نے بھی اس قصہ کو روضۃ الشہدا اور منتخب سے نقل کیا ہے مگر ان کی کتاب ریاض الشہادۃ جلد دوم صفحہ ۱۷۶ سے جو عبارت شروع ہوئی ہے وہ قابل غور ہے۔

"اما کیفیت آں واقعہ جاں سوز بس باید دانست کہ علمائے شیعہ در کتب مقتل و مورخین در تواریخ مختلف نقل کردہ اند و حکایت دامادی او را نیز فاضل مجلسی مذکور نساختہ و فرمودکہ حدیث آں بنظر نرسیدہ اما شیخ فخرالدین طریحی کہ از علمائے امامیہ است و مرد بزرگے است در فخری نقل و مستند بروایت نمودہ و ملا حسین کاشفی نیز در روضۃ الشہدا از کتب مقتلہا و تواریخ ایراد نمودہ و مکرر مذکور شد کہ سخن مورخین در امثال ایں امور خالی از اعتبار نیست بلکہ از بعضے احادیث بہتر است و وثوق و اعتماد بآں بیشتر است بہماں طریق کہ در آں دو کتاب بنظر رسیدہ نقل می شود کیفیت آں۔ بایں نسبت است کہ چوں نوبت شہادت برادرزادگان آں جناب

رسید قاسم بن الحسن کہ دراں وقت بحد تکلیف نرسیدہ بود، دوازدہ یا سیزدہ سال بیشتر از عمر شریفش نگذشتہ بود چوں دید"

آگے چل کر لکھتے ہیں۔

چوں شاہ شہیداں آں مکتوب را دید۔ آہ حسرت از دلِ پردرد برکشید وزار زار گریست۔ وگفت اے جان عم ایں وصیتے کہ برادرم بتو کردہ است دوبارہ من، وتو می خواہی کہ بوصیتِ او عمل نمائی۔ مرا نیز دربارہ تو وصیتی نمود می خواہم آں را بجائے آورم۔ و وصیت او ہمیں آنست کہ فاطمہ دختر من کہ پدرت او را نامزدِ تو کردہ بود، بعقد تو درآورم و بتو دہم۔ پس دستِ قاسم را گرفت و او را باندرونِ خیمہ برد۔ و برادرِ خود عباس وعون را طلبید خطبہ در نہایت فصاحت و بلاغت ادا فرمود و فاطمہ را بمہرِ شہادت بقاسم عقد کرد"

آگے کہتے ہیں۔

"پس زنانِ حرم فاطمہؑ را زینت نمودند"

پھر آگے لکھتے ہیں:۔

"مادر قاسم چوں ازیں قضیہ اطلاع بہم رسانید سیلابِ اشک از دیدۂ خونبار بارید وزار زار گریست و بخدمتِ شاہ شہیداں آمد"

لیکن قصۂ مذکور کے ثبوت میں صاحب ریاض الشہادت کے کلام سے استدلال کرنا بچند وجوہ درست نہیں۔

(۱) صاحبِ ریاض نے قاسم کا عقد فاطمہ بنت الحسین کے ساتھ ہونا بیان کیا ہے۔ حالانکہ حضرت کی اولاد میں فاطمہ صرف ایک ہی تھیں اور ان کا عقد قبلِ واقعہ کربلا۔ مدینہ منورہ میں حسن مثنٰی کے ساتھ ہو چکا تھا۔ اسی طرح فاطمہ بنت الحسین اور حسن بن حسن کا کربلا میں

کمعیت جناب سید الشہدا موجود ہونا اور حسن بن حسن کا رہائی پاکر مدینہ کو مراجعت کرنا علمائے فریقین کی تصریحات سے ثابت ہے بلکہ خود صاحب ریاض نے واقعہ کربلا کے بعد تدت دراز زندہ رہنا تحریر کیا ہے چنانچہ ریاض الشہادۃ جلد دوم صفحہ ۲۱۷ میں مرقوم ہے:-

"حسن زخم بسیارے درجہاد بر داشت و بے ہوش در معرکہ افتاد تا آں کہ نزاع منقضی شد آں وقت او را اسیر نمودہ بردند واو ماند عمرے بسیار کرد و اولاد بسیار از وے بہم رسید"

(۲) صاحب ریاض نے اس روایت کو روضہ اور منتخب سے نقل کیا ہے اور ان کی تردید اوپر کی جا چکی ہے۔

(۳) صاحب ریاض نقل روایت میں امین نہیں بلکہ اپنی طرف سے کچھ اور اضافہ کرنے والے ہیں ان کی عبارت منقولہ کے فقرہ "لہذا بہماں طریق کہ دراں دو کتب بہ نظر رسیدہ نقل می شود" میں قصۂ مذکورہ کے روضۃ الشہدا و منتخب سے بدون تصرف اور بے کم و کاست نقل کرنے کا اظہار کیا ہے، درحالیکہ ان کی عبارت میں کئی ایسے امور ہیں جو روضہ اور منتخب میں بالکل مذکور نہیں مثلاً وصیت امام حسن میں فاطمہ کا بالتخصیص نام درج ہونا حالانکہ روضہ اور منتخب میں کسی بیٹی کا نام نہیں خصوصاً روضۃ الشہدا میں وصیت مذکورہ کا دوسرے مقام پر بھی اجمالاً تذکرہ ہوا ہے۔ مگر وہاں بھی دختر مشار الیہا کا کوئی نام نہیں بیان کیا گیا چنانچہ روضۃ الشہدا مطبوعہ بمبئی باب ششم فضائل حضرت امام حسن صفحہ ۲۳۲ میں یہ عبارت درج ہے:-

"نقلے ہست کہ ام کلثوم را گفت اے خواہر یادگار من و یادگار مادر بزرگوار من فرزندم قاسم را حاضر گرداں۔ ام کلثوم بفرمود تا قاسم را حاضر آوردند حسن او را در بر گرفت و روئے بر روئے وے نہادہ بہائے ہائے بگریست بعد ازاں دست قاسم بگرفت و بدست حسین داد و گفت اے برادر فلانہ دختر ترا نامزد پسر خود قاسم کردم چوں وقت آید گوئے سپاری"

امام حسینؑ کا قبلِ عقد خطبہ پڑھنا حالانکہ روضہ اور منتخب میں خطبہ پڑھنے کا قطعاً ذکر نہیں ہے عقدِ مذکور کا مہر شہادت پر واقع ہونا بتانا حالانکہ روضہ اور منتخب میں اس عجیب و غریب مطلب کا کوئی وجود نہیں اس کے علاوہ اس مطلب کی لغویت اس قدر ظاہر ہے کہ شریعت مطہرہ میں مہر شہادت پر عقد درست نہیں پھر اس کو حضرت کی طرف منسوب کرنا کس قدر بے ادبی اور جسارت ہے۔ مادر قاسم کا وقتِ عقد موجود نہ ہونا اور بعد وقوع اس کی اطلاع پانا حالانکہ روضہ اور منتخب میں مادر قاسم کا عند العقد موجود ہونا مذکور ہے۔ زنانِ حرم کا فاطمہ کو زینت کرنا اس کا بھی روضہ اور منتخب میں اصلاً تذکرہ نہیں ہے۔ اس مطلب کو بھی صاحب ریاض نے دوسرے مطالب کی طرح اپنی طرف سے ستزاد کیا ہے۔ بہرحال وجوہِ مذکورہ پر نظر کرنے سے صاحب ریاض الشہادۃ کے کلام کا ساقط از اعتبار ہونا کسی طرح مخفی نہیں رہ سکتا۔

اس کے علاوہ روضۃ الشہدا اور منتخب طریحی کی عبارتوں پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس قصہ میں جناب امام حسنؑ کا جناب سید الشہدا کی بنی صاحبزادی کو حضرت قاسم سے نامزد کرنے کا ذکر ہوا ہے وہ صاحبزادی حضرت امام حسنؑ کے زمانۂ حیات میں موجود تھیں چنانچہ روضۃ الشہدا کے باب ششم کی عبارت منقولہ کا فقرہ:-

دگفت اے برادر فلانہ دختر ترا نامزد پسر خود قاسم کردم چوں وقت آید

بوئے سپاری"

اس مطلب پر بصراحت دلالت کرتا ہے اور منتخب کی عبارت " وسمت بیدابنۃ انتی کانت مسماۃ للقاسم" سے بھی ان صاحبزادی کا حضرت امام حسن کی حیات میں موجود ہونا اور آنحضرتؑ کا ان کو قاسم سے نامزد کرنا مستفاد ہوتا ہے۔ حالانکہ خود صاحبِ روضۃ الشہدا کی عبارت سے جناب سید الشہدا کی اولاد میں کوئی صاحبزادی ایسی نہیں معلوم ہوتیں جو حضرت امام حسنؑ کے عہد میں قاسم سے نامزد ہونے کی صلاحیت

رکھتی ہو۔ اس مطلب کی توضیح یہ ہے کہ صاحب روضہ نے اپنی کتاب کے خاتمہ میں جناب سید الشہدا کی اولادِ دختری کو صرف دو صاحبزادیوں میں منحصر کیا ہے جن سے فاطمہ اور سکینہ مراد ہیں۔ ان دونوں صاحبزادیوں میں سے فاطمہ کا عقد حسن مثنیٰ کے ساتھ ہونا خود صاحب روضۃ الشہدا نے کئی مقام پر بیان کیا ہے اور سکینہ بنت الحسینؑ کا عقد عبداللہ بن حسن کے ساتھ واقع ہونا آئندہ مذکور ہو گا۔ چونکہ حسن مثنیٰ اور عبداللہ دونوں کا معرکۂ کربلا میں موجود ہونا مسلّم و محقق ہے لہٰذا فاطمہ یا سکینہ کا قاسم سے نامزد ہونا محض بے معنے ہے۔ اس کے علاوہ سکینہ کے قاسم سے نامزد ہونے کا کوئی مورخ قائل نہیں بلکہ فاطمہ بنت الحسینؑ کا حضرت امام حسنؑ کی حیات میں موجود نہ ہونا ثابت ہوتا ہے اس لئے کہ فاطمہ بنت الحسین کی مادرِ گرامی ام اسحٰق ہے جنہیں حضرت امام حسنؑ کی زوجیت کا شرف حاصل تھا اور حضرت امام حسینؑ نے بڑے بھائی کی شہادت کے بعد حسب وصیت عقد کر لیا تھا۔ اس حساب سے امام حسنؑ کی شہادت سے فاطمہ کی ولادت کا کم سے کم دس مہینہ دس روز یا تیرہ مہینہ دس روز بعد واقع ہونا ثابت ہوتا ہے جب یہ صورت ہے تو حضرت امام حسنؑ کا ان کو قاسم سے نامزد کرنا کیونکر درست ہو سکتا ہے۔ اور چونکہ سکینہ بنت الحسین فاطمہ سے چھوٹی تھیں اس لئے امام حسنؑ کا ان کو نامزدِ قاسم کرنا بدرجۂ اولیٰ قبول نہیں ہو سکتا۔ بہرحال ان دونوں صاحبزادیوں کا حضرت امام حسنؑ کی حیات میں قاسم سے نامزد ہونا کسی طرح درست نہیں۔

صاحب روضۃ الشہدا نے کتاب مذکور کے باب اول میں حضرت کی ایک دختر ہفت سالہ کا بحالت بیماری مدینہ میں رہ جانا بھی نقل کیا ہے۔ چنانچہ روضۃ الشہدا مطبوعہ بمبئی باب اول صفحہ ۲۲ میں مرقوم ہے۔

"در اخبار آمدہ کہ چوں شہزادہ حسینؑ از مدینہ بیروں آمدہ عزیمت کوفہ نمود اورا دخترے بود ہفت سالہ و بجہت رنجوری کہ اورا عارض شدہ بود

نتوانست کہ با خود ہمراہ برد ۔ درخانۂ ام المومنین ام سلمہ رضی اللہ عنہا بگذاشت ۔"

اس کے بعد غراب کی حکایتِ غریبہ بیان کی ہے، بہر حال اگر روایتِ روضۃ الشہدا کے سقم و فساد سے قطع نظر کی جائے تب بھی اس دخترِ ہفت سالہ کو نامزد قاسم کرنا دو وجہ سے درست نہیں ہو سکتا، اول یہ کہ دختر مذکورہ کی ولادت تقریباً ۵۴ھ ہجری میں قرار پاتی ہے جو کہ بنا پر ان کا سن و قت ۶۱ھ بوقت ہفت سالہ قرار پا سکتا ہے حالانکہ حضرت امام حسن نے ۵۰ھ ہجری میں رحلت فرمائی تھی۔ خود صاحبِ روضہ نے بھی حضرت کی شہادت ۵۰ھ ہجری میں واقع ہونا تحریر کیا ہے چنانچہ کتابِ مذکور کے خاتمہ مقصد اول صفحہ ۲۴۲ میں مرقوم ہے۔

" وفاتش شب شنبہ بست دہم صفر سن خمسین من الہجرت "

اس حساب سے دختر مذکورہ کی ولادت کا زمانہ حضرت کی وفات کے زمانہ سے تقریباً چار سال بعد قرار پاتا ہے۔ لہذا دختر مذکورہ کا امام حسن کی حیات میں موجود ہونا اور حضرت کا ان کو قاسم سے نامزد کرنا امر فاسد ٹھہرا۔ دوسرے یہ کہ صاحبزادی موصوفہ حسب تصریح صاحبِ روضۃ الشہدا مدینہ میں تھیں تو ان کا عقد کربلا میں روزِ عاشورہ کیونکر صحیح ہوگا۔

ملا کاشفی نے کنز الغرائب سے ایک اور دختر چہار سالہ کا جناب سید الشہداء کی اولاد میں ہونا نقل کیا ہے چنانچہ کتاب روضۃ الشہداء کے صفحہ ۲۱۲ میں مرقوم ہے۔

"در کنز الغرائب آوردہ کہ یزید اہل بیت را در درونِ کوشکِ خود جائے مقید ساختہ بود و امام حسین دخترے داشت چہار سالہ و بسیار او را دوست داشتے ۔

صاحب منتخب نے بھی اس روایت کو نقل کیا ہے لیکن انہوں نے اس صاحبزادی کی عمر

تین سال کی لگی ہے بہرحال یہ صاحبزادی بھی حضرت امام حسن کی حیات میں موجود نہ تھیں
صاحب روضۃ الشہداء نے ان چار صاحبزادیوں کے علاوہ اور کسی صاحبزادی کا حضرت [illegible] اس مختصر بیان سے بھی قصہ دامادی کا بے اصل محض ہونا ثابت ہوتا ہے

[illegible] انہوں نے اس قصہ کے اثبات میں بہت سے مہملات و مزخرفات کو تحریر کیا ہے جو بالکل [illegible] رہا ہیں اور ان ہی کو صاحب مخزن الانوار نے دلائل [illegible] کے ساتھ [illegible] ہے فاضل موصوف کے دلائل حسب ذیل ہیں

(۱) اہل بیت رسول اللہ کے مصائب جلیلہ اس قصہ کے واقع ہونے کے مقتضی ہیں [illegible] فوراً [illegible] ہو جانا بھی ایک مصیبت عظمیٰ ہے۔ کربلا میں تمام مصائب عظیمہ نازل ہوئیں لہٰذا اس مصیبت کا واقع ہونا بھی ضروری ہے لیکن یہ خیال بالکل فضول [illegible] مصائب واقع ہوئے وہ اگرچہ عظیم اور شدید تر ہیں لیکن [illegible] واقع ہونا لازم نہیں آتا۔ اور درحقیقت ایسا ہوا [illegible] چاہنا اپنے دل سے گھڑ کر واقعہ عظیمہ کی صورت میں ان ذوات قدسی آیات سے منسوب کر دینا کس قدر جسارت ہے۔

(۲) ذاکرین اس قصہ کو ہر زمانہ میں علماء اور صلحا کے سامنے بیان کرتے رہتے۔ مگر ان لوگوں نے نہ کبھی ان ذاکرین کو منع کیا اور نہ اس واقعہ کو کذب وافترا کی طرف منسوب کیا۔ یہ استدلال بھی سراسر مہمل اور واہی ہے اس لئے کہ واقعہ کربلا کے بعد سے ملا [illegible] کاشفی کے زمانہ تک کسی ذاکر کا اس قصہ کو [illegible] علماء و صلحا [illegible] اور اگر اسے تسلیم بھی کر لیا جائے تو بھی علماء کا اس کو کذب وافترا کی طرف منسوب نہ کرنا قابلِ قبول نہیں کیونکہ جس زمانہ سے اس قصہ کا چرچا ہوا اسی زمانہ سے علماء نے اس کی مخالفت بھی شروع کر دی ہے۔ فرض کرو کسی وجہ سے [illegible] حاضرین نے ذاکرین

کو منع نہ کیا ہو لیکن اس سے اس قصہ بے سروپا کا قابل اعتماد ہونا کس طرح ثابت ہو گیا۔ کیا علماء زمرۂ مسامحین متعصبین سے خارج ہیں۔ فاضل دربندی کے ہم مذاق بھی بعض علماء گزرے ہیں جن کی وجہ سے بہت سی بے سروپا روایتوں اور مہمل و مزخرف حکایتوں کو رواج ہو گیا ہے ایسے لوگوں کا شکوہ قابل سند نہیں۔

(۳) ہر ملک کے شعرا کا ہر زمانہ میں اس قصہ کو نظم کرنا۔ یہ کلام بھی حلیہ صحت سے عاری ہے، اس لئے کہ صاحب روضۃ الشہداء سے قبل اس قصہ کا کسی شاعر نے ذکر نہیں کیا اور اگر اسے مان بھی لیا جائے تو ان کا قول محل اعتماد نہیں، نہ شعراء کی نظم کو کسی واقعہ کی صحت و عدم صحت کے لئے تاریخی شہادت مانا جا سکتا ہے۔

(۴) اس قصہ کے بیان اور شبیہات کے قائم کرنے پر رسم شبیہ کا جاری ہونا یہ امر بھی بے معنے ہے اور اس رسم کا قدیم ہونا کسی طرح قابل تسلیم نہیں۔ ورنہ کتب قدیمہ میں اس کا تذکرہ ضرور ہوتا جس کو اس کے قدیم ہونے کا دعویٰ ہو وہ کسی ایک کتاب قدیم میں ہی اس کا تذکرہ دکھائے۔

(۵) متاخر المتاخرین اور ارباب مقاتل و مورخین میں سے ایک جماعت کثیرہ نے اس کے واقع ہونے کی تصریح کی ہے حتیٰ کہ صاحب کتاب بحر الانساب نے زفاف کے واقع ہونے اور فاطمہ کے حمل اور ولادت فرزند کا بھی ذکر کیا ہے۔ اور لکھا ہے کہ مولود کے اقربائے مادری نے اس کا نام قاسم مثنیٰ قائم کیا تھا۔ اور یہ وہی مولود ہے جس کو بنی امیہ نے بے دردی سے قتل کیا۔ اور ان کی قبر مشہور اور زیارت گاہ جمہور ہے یہ منجملہ قرائے شعرانات کسی قریہ میں واقع ہے اور یہ قاسم بلقب شاہزادہ مشہور ہیں لیکن فاضل مذکور کا یہ کلام بھی سراسر کذب و افترا سے مملو ہے کیونکہ کسی واقعہ تاریخی کو فریقین کے قدما و متاخرین میں کسی شخص کا بالکل ذکر نہ کرنا اس کے بے اصل محض ہونے کی بین دلیل ہے۔ اگر متاخرین میں سے کوئی شخص لکھ بھی دے تو وہ دلیل ہیچ اور لغو ہے۔ اور

بغیر کسی معتبر تاریخی شہادتوں کے ہرگز قابل تسلیم نہیں۔ صاحب کتاب بحرالانساب جس سے فاضل دربندی نے فاطمہ کا حاملہ ہونا وغیرہ وغیرہ نقل کیا ہے۔ ایک شخص مجہول الاسم نہایت جری علی الکذب بلکہ شبیہ بہ مجنوناں ہے اور اس کی کتاب نہایت درجہ مہمل اور ایسی بیہودہ اور لچر مطالب سے بھری ہوئی ہے۔ جو مستند مورخوں کی تصریحات کے بالکل خلاف اور قابل ضحکہ ہیں ایسے مجموعہ خرافات سے استدلال کرنا تو کجا وہ اس قابل بھی نہیں کہ اسے نظر توجہ سے دیکھا جائے۔ اس شخص نے حضرت سید الشہدا کی اولاد دختری میں تین صاحبزادیاں نقل کی ہیں سکینہ۔ فاطمہ۔ زبیدہ بعد ازاں قاسم کے عقد کو زبیدہ کے ساتھ اور ایک نسخہ میں سکینہ کے ساتھ تجویز کیا ہے۔ جو بالیقین تمام مورخین ونسابین کی تصریحات کے خلاف ہے۔ پھر فاطمہ بنت الحسین کے عقد کا حسن مثنیٰ کے ساتھ واقع ہونا تحریر کیا ہے جو بین الفریقین متفق علیہ ہے اور جناب سکینہ کی بابت لکھا ہے کہ انہوں نے زندان شام میں انتقال کیا۔ پھر زبیدہ کا قاسم ثانی کے ساتھ حاملہ ہونا بیان کیا گیا ہے اور زبیدہ کو ان کے حال پر چھوڑ دیا ہے اور کسی نسخہ میں فاطمہ سے قاسم کا عقد اور فاطمہ کا حاملہ ہونا ذکر نہیں کیا چنانچہ کتاب مذکور کے صفحہ ۲۶ میں لکھا ہے:

"و دختران آں سید مظلوماں چنانچہ درسابق مذکور گردید۔ فاطمہ را در مدینہ بحبالہ نکاح حسن مثنی درآورد و زبیدہ کہ مادرش شہربانو معروف بہ شاہ زناں بود بموجب وصیت امام حسنؑ در صحرائے کربلا بحبالہ نکاح مرا جنت نمودہ شہربانو و زبیدہ خاتون بر ذوالجناح سوار شدند و اہل بیت را وداع نمودہ رو براہ آوردند و آں مرکب برق رفتار ہمچوں نور دلے طریق کردتا بولایت ... زبیدہ در نواحی رے کوہے پر شکوہ و غاری دراں بہ نظر شہربانو درآمد مرکب را بسوئے آں کوہ راندند۔ چوں

نزدیک غار رسید نالید وچوں ابرِ بہاری بگریست و عرض کرد۔ الہا۔ ملکا پروردگارا تو میدانی کہ بعد از حضرتِ امام حسین دیگر زندگی نمی خواہم از تو مسئلت می کنم کہ مرا درایں غار بجرمِ عمیم خود پناہ دہی و درکنف وحفظ خود نگہداری کہ از شرِمخالفان محفوظ و در امان تو باشم۔ درساعت بہ امر الٰہی آں غار شگافتہ گردید و درے پیدا شد۔ شہر بانو خواست کہ در غار رود زبیدہ خاتون دامنش بگرفت و گفت اے مادر مرا بجے می گذاری غریب وتنہا۔ آخر ترحم مادری کجا رفت۔ شہربانو گفت لے جانِ مادر تو امانت دار قاسمی ترا رخصت نیست کہ ہمراہِ من بیائی۔ آں گاہ شہربانو زبیدہ خاتون را وداع نمودہ داخل غار شد۔ چوں زبیدہ خاتون تنہا بماند۔ روئے بہ شہر رَے آورد و در آں جا ماند تا زمانے کہ فرزند او متولد گردید و نام آں مولود را قاسم ثانی گذاردند"

یہی شخص اس کتاب کے دوسرے نسخہ میں لکھتا ہے:۔

"اما حضرت امام حسنؑ برادر خود امام حسینؑ را وصیت کردہ بود کہ دختر خود سکینہ خاتون را بہ عقد قاسم در آوری"

پھر آگے چل کر تحریر کرتا ہے:۔

"آں کہ امام حسینؑ بفرمود تا سکینہ را بہ صورتِ عروسان بیاراستند و دست وے را بدست قاسم داوند حضرت امام حسینؑ نگذاشت کہ آں روز قاسم بہ حرب رَود۔ قاسم یک شب بحرمِ خود بماند و با جفت خود صحبت داشت بتقدیرِ خدائے عزوجل فرزندے در رحم مادر بند شد"

اِس کے بعد حضرت کے شہید ہو جانے پر شہر بانو اور سکینہ کا رَے کی طرف جانا شہر بانو کا غار میں پوشیدہ ہونا سکینہ کا تنہا رہ جانا اور ان کے بطن سے قاسم ثانی کا پیدا ہونا

بیان کیا ہے اس کے بعد اور بہت سی فضول اور عجیب و غریب باتیں لکھی ہیں جن پر نظر کرنے سے صاحب کتاب کے مجنون مفتری کاذب اور جاہل ہونے میں ذرا بھی شبہ نہیں رہتا اور یہ بہتان بندی ہرگز اس قابل نہیں کہ اس پر توجہ کی جائے تاہم چند باتیں قابلِ غور ہیں۔

(۱) صاحب بحر الانساب نے زبیدہ کو حضرت کی اولادِ دختری میں شمار کیا ہے حالانکہ کسی عالم کسی مورخ کسی نساب نے زبیدہ کو حضرت کی اولاد میں شمار نہیں کیا۔

(۲) سکینہ کا زندان شام میں وفات پانا درآنحالیکہ جناب سکینہ سنہ ۱۱۷ھ تک زندہ رہیں اور اسی پر کتبِ تواریخ و سیر کا اتفاق ہے۔

(۳) سکینہ کے شوہر عبد اللہ بن حسن معرکہ کربلا میں موجود تھے پھر سکینہ کا عقد قاسم کے ساتھ کس طرح ہو سکتا تھا۔

(۴) باتفاقِ مورخین سکینہ کی والدہ حضرت رباب تھیں مگر اس شخص نے جناب شہربانو کو ان کی والدہ تحریر کیا ہے۔

(۵) جناب شہربانو کا حضرت کی شہادت کے بعد گھوڑے پر سوار ہو کر کسی پہاڑ کی طرف چلا جانا حالانکہ شہربانو اس وقت زندہ بھی نہ تھیں، چنانچہ خود فاضل دربندی نے بھی اس کی صراحت کی ہے اور کتاب اکسیر العبادات کی مجلس شانزدہم میں لکھتے ہیں :- فانَّ اُمَّ الامامِ قد ماتت فی النفاس فی ولادۃ الامامؑ

(۶) زبیدہ یا سکینہ کا قاسم بن حسنؑ سے حاملہ ہونا درآنحالیکہ علماء و مورخین قاسم کے نابالغ ہونے کی تصریح کرتے ہیں اور اسی میں لم یبلغ الحلم کا لفظ موجود ہے۔ اس کے علاوہ تمام علمائے انساب کا اس پر اتفاق ہے کہ حضرت امام حسنؑ کی اولادِ امجاد میں زید بن حسنؑ اور حسن بن حسنؑ کے سوا تمام بزرگوار لاولد ہے فاضل دربندی نے اپنی دلائل میں ایک دلیل یہ بھی قائم کی ہے کہ بعض بزرگوار

نے خواب میں حضرت سید الشہدا، کی زیارت سے مشرف ہو کر اس واقعہ کے متعلق سوال کیا تو آپ نے اس کی تصدیق فرمائی۔ مگر فاضل موصوف کا یہ کلام بھی اضغاث احکام سے زیادہ وقعت نہیں رکھتا کسی واقعہ کے ثبوت میں خواب و خیال سے استدلال کرنا حیرت انگیز امر ہے۔ معلوم نہیں کہ آقائے موصوف پر ایسے پریشاں خواب کی صداقت کس طرح منکشف ہو گئی۔

اسی قسم کے واقعات فاضل دربندی نے جواہر الایقان اور اسرار الشہادت میں بھی لکھے ہیں اور عجیب غریب باتوں اور مزخرف و مہمل روایتوں کے نقل کرنے میں ذرا بھی نہیں چوکے۔ جب فاضل موصوف بحر الانساب جیسی لغو کتاب کو اپنی روایات کا ماخذ اور من گڑھت کہانیوں کو قابل اعتنا قرار دیں تو ان کا قول کیونکر قابل استناد ہو سکتا ہے۔ ایسی مجموعۂ خرافات کتاب پر اعتماد کرنا اور اس سے ایسی قصص اور حکایات کو اپنی کتاب میں جگہ دینا جو علمائے فریقین کی کسی کتاب میں موجود نہیں اور ان کو کسی مورخ یا محدث نے تحریر نہیں کیا کس قدر حیرت انگیز اور مضحکہ خیز ہے لطف یہ ہے کہ فاضل مذکور نے اس کتاب سے نقل کرنے پر ہی اکتفا نہیں کیا بلکہ اس کو تاریخ کی کتب معتبرہ میں شمار کیا ہے اس سے صاف ظاہر ہے کہ فاضل دربندی فن تاریخ سے نا آشنائے محض ہیں اور قصہ کہانی اور واقعات تاریخی میں بالکل امتیاز نہیں کر سکتے۔

تحفۂ عروسی کے مؤلف سید العلما سید میرن صاحب کی اس عبارت سے بھی استدلال کرتے ہیں جو جناب علیین مکان نے مجالس مفجعہ کے صفحہ ۱۲۵ پر تحریر کی ہے اس کی نقل یہ ہے

در روایت تزویج القاسم لم یذکر فی اکثر الکتب المعتمدۃ ولھذا ترکھا مولانا المجلسی ولکن ذکرھا فخر الدین فی جامعہ وکان ماخذہ تاریخ	"شادی قاسم کی روایت اکثر معتبر کتابوں میں نہیں ہے اسی لئے اس کو مولانا مجلسی نے چھوڑ دیا ہے۔ البتہ فخر الدین طریحی نے اپنی جامع میں اس کا ذکر کیا ہے اور ان کا

الحسین الکاشفی وحیث ان العمدة
فی امثال هذا هو نقل هذا السیر
فان شیخنا المفید کثیرا یا یذکره
فی الارشاد حاکیا عن الکلینی المدائنی
وروایات مقتل ابی مخنف الصامن
هذا القبیل فلا باس بذکر هذه
القصة ولذا ذکره صاحب الفضل
المعاصر صاحب ریاض الشهادة لکن
منه من هذه الحکایة مع شذوذها
میما یستغرب وقوعها بهذا النمط
فی مثل هذه المعرکة ان عظم هذه
المصیبة والنظوائها علی ما ینطوعلیه
غیرها من غرائب الامور وعجائبها
الدهور مما یجوز الوقوع ومجرد
الاستبعاد لا یدفع به الروایة
والمسامحة فی ادلة السنن
تقتضی عدم الاعراض عن
مثلها فلذا اجبنا ایراد القصة
اعانة علی البکاء علی عظیم البلاء
وان کان اجود هو الاقتصار علی
الروایة المذکورة فی البحار "

ماخذ ملا حسین کاشفی کی تاریخ روضۃ
الشہدا ہے) بات یہ ہے کہ عموماً ایسے
مقام پر اہل سیر و تاریخ کا نقل کرنا ہے
جو اکثر روایت لکھی ہے کلینی اور مدائنی
سے حکایت کی ہے بلکہ روایات مقتل ابی
مخنف بھی اسی قبیل سے ہیں اس لئے اس
قصہ کے ذکر میں کوئی مضائقہ نہیں اسی
سبب سے اس قصہ کو ہمارے ہم عصر
صاحب علم و فضل مؤلف ریاض الشہادت
نے ذکر کیا ہے لیکن یہ روایت شاذ ہے
اور اس اصول پر مشتمل ہے جن کا وقوع غرابت
کا درجہ رکھتا ہے کہ یہ واقعہ اس طرح پر
ایسے معرکہ میں واقع ہوا ہو۔ لیکن مصائب
امام مظلوم اعظم ترین مصائب ہیں ان
مصائب کا ایسے امور پر جو اوروں کے
مصائب میں نہیں پائے جاتے بلکہ ایسی
باتیں جو غرابت رکھتی ہیں اور تمام جہان
کے حوادث سے زیادہ دردناک بے مثال
ہونا اسی قبیل سے ہے کہ اس واقعہ کے
وقوع کا بھی جواز ظاہر ہوتا ہے۔ اور
محض خلاف قیاس ہونا اس کا مقتضی نہیں

کہ اس روایت کو مرفوع کر دیا جائے اور ادلہ السنن میں سہل انکاری کا جائز ہونا اس کا مقتضی ہے کہ ایسے قصوں سے اعراض نہ کیا جائے اس ہی وجہ سے اس قصہ کا بیان کرنا میں نے پسند کیا کہ کربلائے عظمیٰ پہ معین گریہ واکا ہو اگر یہ بہتر ہی ہے کہ اس روایت پر اکتفا نہ کیا جائے جو کتابوں میں مذکور ہے "

لیکن جناب علیین مکان کے اس کلام سے قصۂ مذکورہ کے ثبوت پر استدلال کرنا بھی بچند وجوہ صحیح نہیں ہو سکتا ۔

(۱) انہوں نے اِس قصہ کو بیانِ حال کے طور پر منتخب سے نقل کیا ہے جس کے بعد وہ اس کی صحت کے ذمہ دار نہیں ہو سکتے ۔ اس لئے کہ حوالہ منقول عنہ اور بیان حال کے بعد ناقل بری الذمہ ہو جاتا ہے اور اس کے وقوع وصحت کی ذمہ داری اصل راوی پہ عائد ہوتی ہے ایسی صورت میں سید العلماء کا قصۂ مذکور کو محض نقل کر دینا اور اس کو بعنوان مذکور اپنی کتاب میں جگہ دینا اس کے غیر موقوع الصدور بلکہ بے اصل و موضوع ہونے کے منافی نہیں ہو سکتا اور محض ان کی نظر میں قصۂ مذکورہ کے محتمل الوقوع ہونے سے اس کا وقوع لازم نہیں آتا ۔

(۲) قصۂ مذکورہ کو خود جناب علیین مکان کے کلام سے بھی غیر موقوع الصدور اور مظنون الکذب ہونا ثابت ہوتا ہے ۔ کیونکہ نہ تو کتب متعددہ میں کہیں اس کا تذکرہ ہے اور وہ بھی اس کو شاذ اور مستبعد الوقوع کہتے ہیں ۔

اس کے علاوہ ملا محمد تقی برغانی صاحب مجالس المتقین ۔ حاجی ملا محمد صالح برغانی صاحب مخزن البکاء ملا محمد مہدی نراقی ۔ محرق القلوب ۔ محمد بن سلیمان تنکابنی صاحب اکلیل المصائب شیخ جعفر نجفی صاحب خصائص ۔ تاج العلماء سید علی محمد صاحب رسالہ قاسمیہ کی تصریحات اور مفتی محمد عباس صاحب کی مثنوی بیت الحزن کے ایک شعر پر بھی استدلال کیا جاتا ہے مگر ان بزرگواروں میں سے آقائے دربندی کے

سوا کسی شخص نے بھی اس قصہ کا ثبوت وقوع کا دعویٰ نہیں کیا بلکہ محض نقل پر اکتفا کی ہے
اور حسب مقولہ "دروغ برگردنِ راوی" اس کے بارِ ثبوت کو راوی کے ذمہ رکھا ہے اس
کے ماسوا یہ لوگ مذہبی عالم اور دینیات کے ماہر تھے۔ فن تاریخ نہ تو داخل دینیات ہے۔
بلکہ فلسفۂ تاریخ پر عبور علمائے دین کے لئے فرض نہ یہ لوگ معصوم تھے نہ ان کی کتابیں
صحیفۂ آسمانی۔ عیب و ہابس ہر عالم کی کتاب میں موجود ہے۔ اس سے صاحب کتاب
کی علمی جلالت پر حرف نہیں آتا۔ مگر یہ سمجھ لینا کہ جو کچھ اس نے لکھ دیا ہے وہ یقیناً صحیح ہے
اور اس میں چون و چرا کرنا اس عالم کی توہین و تذلیل ہے محض خیالِ باطل ہے معلومات
وخیالات سب کے یکساں نہیں غلطی اور سہو میں سب انسان برابر ہیں۔ مدارج
تالیفات ترقیِ معلومات کے ساتھ بدلتے رہتے ہیں آج کسی مؤلف نے اپنی کتاب
میں کسی مسئلہ پر بحث کی چند روز کے بعد اس کی معلومات میں اضافہ ہو کر اس کی تصریحات
خود اس کی تحریر میں مختلف ہو جاتی ہیں۔ کوئی مانیف ابتدائے زمانہ تعلیم کی ہے کوئی
انتہائے زمانۂ تکمیل کی جس قدر عمر اور کثرتِ مطالعہ کے لحاظ سے وسعتِ معلومات کو رفتہ
رفتہ ترقی ہوتی جاتی ہے اسی قدر تالیفات کا رتبہ بھی رفتہ رفتہ اور بلند و رفیع ہوتا
جاتا ہے۔ لہٰذا ان دینی علم کے مؤلفوں کا ہر ہر لفظ سے متفق ہونا قانونِ قدرت کے
خلاف ہے اور نہ زہد و ورع و تقدس تبحر فی العلوم اور کثرتِ تالیفات سے یہ لازم
ہے کہ جو کچھ انہوں نے سمجھی اور لکھا وہ حتماً درست اور صحیح ہے۔

بہرحال اس قصۂ عروسی کا واقع ہونا۔ فاطمہ کبریٰ یا زبیدہ کے جناب سید
الشہداء کی اولاد میں معدود ہونے اور واقعۂ کربلا میں موجود ہونے پر مبنی ہے لیکن علماء
فریقین اور ائمہ تاریخ و سیرت کے بیانات پر نظر کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت
کی اولاد میں کوئی صاحبزادی فاطمہ کبریٰ یا زبیدہ نہ تھیں بلکہ محققینِ فن کی تصریحات
سے فقط ایک فاطمہ کا حضرت کی اولاد میں موجود ہونا ثابت ہوتا ہے جو فاطمہ صغریٰ کے

نام سے مشہور اور واقعہ کربلا میں حضرت کے ساتھ موجود تھیں اور ان کا عقد ان کے ابن عم جناب حسن مثنّیٰ سے ہوا تھا اور خود حسن مثنّیٰ بھی معرکہ کربلا میں موجود تھے جو کربلا سے بچکر مدینہ واپس آئے اور ایک مدت تک زندہ رہے ان کے صُلب اور فاطمہ بنت الحسین کے بطن سے کئی فرزند پیدا ہوئے ایسی صورت میں جناب قاسم کے ساتھ عقد کا واقع ہونا کیونکر معقول ہوسکتا ہے ان مطالب کی تصریح ذیل میں کی جاتی ہے۔

امر اوّل جناب سید الشہدا کی اولاد میں فقط ایک فاطمہ کا موجود اور کتب تواریخ و انساب کا فاطمہ کبریٰ اور زبیدہ کے ذکر سے خالی ہونا۔ اس مطلب کی توضیح و تشریح کے لئے بعض علمائے کرام اور مورخین عظام کی عبارات و افادات کی نقل ضروری ہے مگر ہم بخوف طوالت بعض فقرات پر اکتفا کرتے ہیں جو شخص چاہے اصل کتابوں کو دیکھ سکتا ہے۔ ان میں علما و مورخین اہل تشیع۔

(۱) علامہ شیخ مفید ہیں جن کے کلام کا اس باب میں تمام علما اور مورخین کے کلام پر مقدم ہونا محتاج بیان نہیں وہ جناب کتاب ارشاد میں حضرت کے چار بیٹوں کا ذکر کرکے ارشاد فرماتے ہیں۔

وسکینة بنت الحسین وامها الرباب بنت امرء القیس بن عدی کلبیة معدیة وھی ام عبد اللہ بن الحسین وفاطمة بنت الحسین وامھا ام اسحٰق بنت طلحة بن عبید اللہ تمیمیة	اور سکینہ بنت حسین ان کی والدہ رباب بنت امراء القیس بن عدی کلبیہ معدیہ ہیں اور یہی عبد اللہ بن حسین کی بھی والدہ گرامی ہیں (۲) فاطمہ بنت حسین ہیں انکی والدہ ام اسحاق بنت طلحہ بن عبید اللہ تمیمیہ تھیں۔

(۲) علامہ طبرسی ہیں ان کی کتاب اعلام الوریٰ کی عبارت یہ ہے۔

وسکینة بنت الحسین امّھا	سکینہ بنت حسین کی والدہ رباب بنت

الرّباب بنت امراء القیس بن عدی بن اوس وھی ام عبد اللہ ایضاً وفاطمۃ بنت الحسین امھا امّ اسحاق بنت طلحۃ بن عبد اللہ تیمیہ	امرء القیس بن عدی ہیں اس ہیں وہی عبد اللہ کی بھی والدہ ہیں (۲) فاطمہ بنت حسین ہیں ان کی والدہ ام اسحٰق بنت طلحہ بن عبد اللہ تیمیہ ہیں ۔

(۳) محمد بن علی اربلی ہیں جنہوں نے کشف الغمہ میں عبارات ابن طلحہ ابن خشاب ابن اخضر اور شیخ مفید کو نقل کیا ہے۔ جن سے جناب سید الشہداء کی اولاد اناث میں صرف ایک فاطمہ کا ہونا ظاہر ہوتا ہے۔ عبارت شیخ مفید اوپر لکھی گئی۔ باقی عبارتیں آگے مذکور ہوں گی۔

(۴) محمد بن علی بن شہر آشوب ہیں چنانچہ اس کی کتاب مناقب مطبوعہ بمبئی کے صفحہ ۹۲ میں مرقوم ہے۔

وبناتہ سکینۃ امھا الرّباب بنت امراء القیس الکندیہ وفاطمۃ امھا امّ اسحٰق بنت طلحہ بن عبد اللہ.	آپ یعنے حضرت سید الشہداء کی بیٹیاں (۱) سکینہ ہیں جن کی والدہ رباب بنت امراء القیس کندیہ تھیں (۲) فاطمہ جن کی

مادرِ گرامی ام اسحٰق بنت طلحہ ابن عبد اللہ ہیں۔

(۵) فخر الدین طریحی ہیں جنہوں نے باوجودیکہ منتخب میں قصۂ عقد قاسم کو نقل کیا ہے۔ مگر حضرت کی اولاد میں صرف دو ہی صاحبزادیوں کا ذکر کرتے ہیں۔ ایک سکینہ دوسری فاطمہ صغرٰے چنانچہ منتخب کے جزو ثانی کی مجلس اول میں لکھتے ہیں، وکان البین بنتان سکینۃ وفاطمۃ الصغری +

(۶) علامہ مجلسی ہیں جنہوں نے بحار میں عبارت ارشاد شیخ مفید مناقب ابن شہر آشوب اور کشف الغمہ اربلی کو نقل کیا ہے ان میں صرف ایک فاطمہ کا ذکر ہے۔ فاطمہ کبریٰ و زبیدہ کا بالکل تذکرہ نہیں اور جلاء العیون میں قول شیخ مفید کو جس میں حضرت کی

دو صاحبزادیاں فاطمہ وسکینہ مذکور ہیں اظہر واشہر درمیان علمائے شیعہ فرمایا ہے ۔
(۷) علامہ عبداللہ بن نوراللہ صاحب عوالم ہیں جنھوں نے مقتل عوالم میں وہی عبارتیں نقل کی ہیں جنھیں فاضل مجلسی نے بحار میں تحریر کیا ہے ۔
(۸) سلطان العلما سید محمد صاحب رضوان مآب ہیں جنھوں نے جدولِ چہاردہ معصومین میں جناب سیدالشہدار کی اولاد کے متعلق لکھا ہے کہ :۔
"اولادِ آنحضرت چہار پسر ودو دختر۔ علی السجاد، علی الاکبر عبداللہ مشہور بہ علی اصغر و جعفر کہ در حیات آنحضرت وفات یافت وسکینہ و فاطمہ"۔
(۹) علامہ میرزا ابوالفضل طہرانی ہیں جنہوں نے کتاب شفاء الصدور فی شرح زیارت العاشور میں حضرت کی اولاد کے متعلق متعدد اقوال نقل کئے ہیں مگر کسی میں فاطمہ کبریٰ یا زبیدہ کا ذکر نہیں اور آخر میں علامہ ممدوح نے شیخ مفید کے قول کو تمام اقوال عالم پر ترجیح دی ہے۔
(۱۰) میرزا شہر کاشانی ہیں جنھوں نے ناسخ التواریخ میں صاف لکھا ہے کہ :۔
"وآنحضرت را از دو دختران افزون بود نخستیں فاطمہ وآں دیگر سکینہ"

علماء و مورخین اہل سنّت

علما و مورخین اہل سنت میں جن بزرگواروں نے جناب سیدالشہدار کی اولاد امجاد میں صرف دو بیٹیوں فاطمہ اور سکینہ کو شمار کیا ہے ان کی فہرست یہ ہے ۔
(۱) ابو محمد عبداللہ بن مسلم بن قتیبہ دینوری صاحب کتاب معارف
(۲) ابو جعفر محمد بن جریر طبری صاحب ذیل المذیل۔
(۳) ابو بکر المعروف بہ ابن ابی ثلج صاحب تاریخ اہل بیت۔
(۴) ابو محمد عبداللہ بن احمد بن خشاب صاحب مرتجل۔

(۵) علامہ ابن جوزی صاحب صفوۃ الصفوۃ۔

(۶) حافظ ابو محمد عبد العزیز بن اخضر جنابذی صاحب معالم العترہ

(۷) کمال الدین محمد ابن طلحہ شافعی صاحب مطالب السئول۔

(۸) سبط ابن جوزی صاحب تذکرہ خواص الامۃ۔

(۹) علامہ یحییٰ ابن شرف نووی صاحب تہذیب الاسماء واللغات۔

(۱۰) جمال الدین حسینی صاحب عمدۃ الطالب۔

(۱۱) علامہ محب الطبری صاحب ذخائر العقبیٰ۔

(۱۲) خواجہ محمد پارسا بخاری صاحب فصل الخطاب۔

(۱۳) یحییٰ ابن ابی بکر کانی عامری صاحب ریاض مستطابہ۔

(۱۴) احمد بن عبد القادر عجیلی شافعی صاحب ذخیرۃ المآل۔

(۱۵) محمد بن علی صبان مصری شافعی صاحب اسعاف الراغبین۔

(۱۶) سلیمان بن ابراہیم بلخی قندوزی صاحب ینابیع المودۃ

(۱۷) ملا محمد مبین فرنگی محلی صاحب وسیلۃ النجات۔

(۱۸) سید مومن بن حسن شبلنجی مصری نور الابصار۔

البتہ ان میں سے ابن خشاب۔ ابن طلحہ۔ ابن ابی ثلج اور ابن عبد الواحد نے تیسری بیٹی کا نام زینب لکھا ہے۔ باقی سب نے صرف دو بیٹیوں فاطمہ و سکینہ سے زیادہ کسی کا نام تحریر نہیں کیا بہرحال حضرت کی اولاد دختری میں فقط ایک فاطمہ تسلیم کئے جانے اور کسی دوسری فاطمہ یا زبیدہ کے موجود نہ ہونے پر جملہ مورخین اور اہل سیر نے اتفاق کیا ہے۔ مگر ان لوگوں کے نزدیک حضرت کی اولاد دختری میں کوئی زینب یا دوسری فاطمہ بھی موجود ہوتیں تو ان کو بھی ضرور شمار کرتے [illegible]

ابن قتیبہ دینوری۔ ابو جعفر طبری۔ ابن جوزی۔ ابن [illegible]

علامہ بوذی محب طبری، خواجہ پارسا، جمال الدین حسنی شیرانی، مناوی، مرزا محمد بدخشی، صبان مصری، سلیمان بلخی وغیرہ وغیرہ جلیل القدر محققین فریقین نے حضرت کی اولاد دختری میں صرف فاطمہ اور سکینہ ہی کو ذکر فرمایا ہے، اگر ان کے علاوہ تیسری صاحبزادی اور ہوتیں تو ان کا نام قلم انداز کرنے کی کوئی وجہ نہ تھی ایسی حالت میں محض قصۂ شادی کی اصلاح و درستی کے لئے حضرت کی اولاد میں فاطمہ کبریٰ یا زبیدہ کا فرض کرلینا کیونکر درست ہوسکتا ہے۔

امر دوم میں وہ عبارتیں قابل غور ہیں جن کی وجہ سے فاطمہ کبرا کے حضرت کی اولاد میں ہونے کا توہم ہوسکتا ہے ان میں ا۔

(۱) عبارت مناقب ابن شہر آشوب سے۔ چنانچہ کتاب مذکور کے صفحہ ۱۳۰ احوال سید الساجدین میں کہتے ہیں۔

ان الحسین لما حضرہ الذی حضرہ دعا ابنتہ فاطمۃ الکبریٰ فدفع الیھا کتاباً ملفوفاً و وصیتہ ظاھرۃ الخبر	حسین علیہ السلام نے جس وقت وہ واقعہ پیش آیا جو پیش آیا یعنی شہادت تو آپ نے اپنی بیٹی فاطمہ کبریٰ کو سامنے طلب فرمایا اور ان کو ایک لکھا ہوا کاغذ لفافہ بند جو وصیت نامہ تھا سپرد کیا۔

(۲) عبارت بحار الانوار۔ (۳) عبارت ناسخ التواریخ کہ ان میں بھی "دعا ابنتہ فاطمۃ الکبریٰ" لکھا ہے وجہ توہم یہ ہے کہ ان عبارتوں میں لفظ فاطمہ موصوف اور کبریٰ اس کی صفت ہے۔ حاصل مراد یہ کہ حضرت سید الشہدا نے اپنی شہادت کے قریب اپنی صاحبزادی فاطمہ کبریٰ کو طلب کیا اور صحیفہ ملفوفہ اور وصیت کو ان کے سپرد فرمایا اور جب سید الساجدین کو صحت حاصل ہوئی تو فاطمہ کبریٰ نے اس امانت کو حضرت کے حوالے کر دیا۔ اس سے جناب سید الشہدا کی اولاد میں فاطمہ کبریٰ کا موجود ہونا ثابت ہوتا ہے لیکن درحقیقت لفظ کبریٰ جو ان عبارتوں میں مذکور

صفت فاطمہ کی نہیں بلکہ لفظِ ابنتہ کی صفت ہے معنے یہ ہیں کہ حضرت نے اپنی بڑی صاحبزادی فاطمہ کو طلب کیا اور یہ امر بالکل درست اور صحیح ہے اس لئے کہ فاطمہ کا سکینہ سے بڑا ہونا قابلِ انکار نہیں۔

حقیقتِ حال یہ ہے کہ ان عبارات میں لفظِ کبریٰ بعد لفظِ فاطمہ اشتباہاً بہ سبب غلطی کاتب واقع ہو گیا ہے والا درحقیقت اس کو بعد لفظِ ابنتہ اور قبل لفظِ فاطمہ ہونا چاہیئے کیونکہ ان عبارات میں یہ حدیث مذکور ہے اس کو اکابر علماء محدثین نے اسی طرح روایت کیا کہ اس میں لفظِ کبرے بعد لفظِ ابنتہ واقع ہے۔ چنانچہ شیخ اجل ابوجعفر محمد بن حسن القمی جو امام حسن عسکری ؑ کے اصحاب میں شمار کئے جاتے ہیں۔ اپنی کتاب "بصائر الدرجات" میں کہتے ہیں۔

"حدثنا محمد بن احمد عن محمد ابن الحسین عن ابن سنان عن ابی الجارود عن ابی جعفر قال ان الحسین لما حضرہ دعا ابنتہ الکبریٰ فاطمۃ فدفع الیہا کتابًا ملفوفًا ووصیۃ ظاہرۃ ووصیۃ باطنۃ وکان علی ابن الحسین مبطونًا لا یرون الا انہ لمابہ فدفعت فاطمۃ الکتاب الی علی ابن الحسین"۔

ثقۃ الاسلام ابوجعفر محمد ابن یعقوب الکلینی بھی کتاب کافی میں دوسرے راویوں کی سنادات سے اسی حدیث کو نقل کرتے ہوئے "دعا ابنتہ الکبریٰ فاطمۃ بنت الحسین فدفع الیہا کتابًا ملفوفًا" تحریر فرماتے ہیں اور شیخ جلیل علی بن الحسین المسعودی نے کتاب اثبات الوصیت میں اس حدیث کو اسی طرح روایت کیا ہے۔ علیٰ ہذا القیاس ملائے مجلسی بحار میں اور آقائے دربندی اکسیر العبادات میں اسی طرح ناقل ہوئے ہیں۔

اب بھی یہ بات کہ باعتبار عمر فاطمہ بڑی تھیں یا سکینہ تو گو اس امر کا تصفیہ عبارات

کتب سے ثابت ہو جاتا ہے تاہم مورخین نے صاف الفاظ میں اس کی صراحت کر دی ہے چنانچہ تاریخ رسل وملوک ابوجعفر محمد ابن جریر طبری کی جلد آٹھ صفحہ ۱۳۸ میں مرقوم ہے " مقالت فاطمہ بنت الحسین وکانت اکبر من سکینۃ یہی عبارت تاریخ کامل ابن اثیر جزری مطبوعہ مصر جلد ۴ صفحہ ۳۵ میں اور فصول المہمہ ابن صباغ مالکی مطبوعہ ایران صفحہ ۲۰۵ اور نور الابصار سید مومن شبلنجی مطبوعہ مصر صفحہ ۲۲۱ میں موجود ہے لہذا یہ سمجھنا کہ ان کو فاطمہ کبریٰ کہنے کے صحیح نہیں ہو سکتا بلکہ حقیقت یہ ہے کہ وہ اپنی جدہ ماجدہ جناب فاطمہ کبریٰ کے ہم نام ہونے کی وجہ سے بنام فاطمہ صغریٰ مشہور تھیں چنانچہ علامہ طبرسی نے احتجاج میں سید ابن طاؤس نے لہوف میں فخر الدین طریحی نے منتخب میں علامہ مجلسی نے بحار میں اور علامہ عبداللہ نے مقتل عوالم میں علی بن عیسیٰ نے کشف الغمہ میں نورالدین سمہودی نے جواہر العقد میں علامہ مزی نے تہذیب الکمال میں ولی الدین خطیب نے رجال مشکوٰۃ میں فاطمۃ الصغریٰ بنت الحسین ہی تحریر کیا ہے۔ جب حضرت کی اولاد دختری میں صرف ایک ہی فاطمہ ہیں تو وہی فاطمہ کبریٰ اور وہی فاطمہ صغریٰ کیسے ہو سکتی ہیں بلکہ ان کا حسب صراحت علمائے مذکور الصدر فاطمہ صغریٰ ہونا ہر طرح ثابت ہوتا ہے فاطمہ بنت الحسینؑ کے مقابلہ میں سیدہ عالم کو فاطمہ کبریٰ جن لوگوں نے اپنی کتب میں لکھا ہے ان میں بحار الانوار جلد عاشر صفحہ ۳۵۔ کشف الغمہ صفحہ ۱۷۳۔ صحیح ترمذی مطبوعہ دہلی صفحہ ۶۰ مشکوٰۃ المصابیح مطبوعہ دہلی کہ ان سب میں جناب سیدۃ النساء سے حدیث نبوی کو فاطمہ بنت الحسین کی زبانی بیان کرتے ہوئے "عن فاطمۃ بنت الحسین عن فاطمۃ الکبریٰ" تحریر کیا ہے۔ اسی طرح کتاب الدلائل محمد بن جریر طبری امامی کی عبارت میں لفظ "عن شیبہ بن نعامہ عن فاطمۃ الصغریٰ عن فاطمۃ" اور جواہر العقد میں نورالدین

سمہودی کی عبارت میں "در روایۃ فاطمۃ الصغریٰ من الکبریٰ وان کانت مرسلۃ۔ ابوالحجاج نسیاتی ماتقوی بہ" اور تہذیب الکمال مزی کی عبارت میں "حمیدہ روی عنہا انس بن مالک الیٰ ان قال وفاطمۃ الصغریٰ بنت الحسین بن علی بن ابی طالب مرسلا" اور اسماء الرجال مشکوٰۃ کی عبارت میں عنوان "فاطمۃ الصغریٰ ھی فاطمۃ الصغریٰ بنت الحسین کا مطلب اس پر دلالت کرنا بالکل صاف اور واضح ہے۔

امر سوم :۔ فاطمہ بنت الحسین کا عقد حسن مثنیٰ کے ساتھ قبل واقع کربلا مدینہ میں ہو چکا تھا یہ واقعہ ایسا ظاہر اور آشکار ہے کہ ناظرین کتب سیر و اخبار کو اس پر آگاہ کرنے کی حاجت نہیں چنانچہ شیخ مفید کتاب ارشاد میں کہتے ہیں "ان الحسن بن الحسن خطب الی عمہ الحسین احدی ابنتیہ فقال لہ الحسین اختر یا بنی احبہما الیک فاستحییٰ الحسن ولم یحر جوابا فقال لہ الحسین فانی قد اخترت لک ابنتی فاطمہ ھی اکثرھما" یہی عبارت کسی قدر تغیر الفاظ کے ساتھ علامہ طبرسی کی کتاب اعلام الوریٰ علامہ علی بن عیسیٰ اربلی کی کشف الغمۃ علامہ مجلسی کی بحار الانوار علامہ ابوالفرج اصفہانی کی مقاتل الطالبین علامہ جمال الدین کی عمدۃ الطالب علامہ ابن صباغ مالکی کی فصول المہمۃ علامہ عبدالحق دہلوی کی اسماء الرجال، مشکوٰۃ علامہ میرزا محمد بن معتمد خاں بدخشی کی مفتاح النجا علامہ عجیلی کی ذخیرۃ المآل محمد صبان مصری کی اسعاف الراغبین سید مومن شلنجی کی کتاب نور الابصار اور شیخ حسن عدوی کی مشارق الانوار میں درج ہے۔ میرزا سپہر کاشانی ناسخ التواریخ کی پانچویں جلد صفحہ ۲۸۹ میں کہتے ہیں :۔

حسن بن حسن بن علی بن ابی طالب کہ اور احسن مثنیٰ گویند در خبر است

حسن بن حسن خواست دختر امام حسین را از بہر خود تزویج کند چوں ایں

خبر بسید الشہداء رسید او را طلب فرمود وگفت اینک فاطمہ وسکینہ دختران من اند ہریک را خواہی با تو کابین بندد حسن بن حسن سلام اللہ علیہما را شرم مانع آمد چیزی گوید سر فرود داشت وسخن نکرد امام حسین فرمود دختر خود فاطمہ را کہ با مادرم شبیہ تر است با تو کابین بستم "

امر چہارم :۔ جناب حسن مثنیٰ کا واقعہ کربلا میں حضرت سید الشہداء کے ہمرکاب حاضر رہنا اور باوجود جدال و قتال زندہ بچنا اس واقعہ کے متعلق بھی تمام علمائے تاریخ و سیر کا اتفاق ہوا اور کسی شخص نے حسن مثنیٰ کے واقعہ طف میں موجود ہونے اور ان کے زندہ بچ رہنے میں اختلاف نہیں کیا چنانچہ شیخ مفید کتاب ارشاد میں لکھتے ہیں۔

وکان الحسن بن الحسن حضر مع عمہ یوم الطف فلما قتل واسر الباقون من اھلہ جاء اسماء بن خارجۃ فانتزعہ من بین الاسارٰی وقال واللہ لا یوصل الی ابن خولۃ ابدًا فقال عمر بن سعد دعوا لابی حسان ابن اختہ ویقال انہ اسر وکان بہ جراح قد اشفی منہا

حسن مثنیٰ فرزند امام حسن علیہ السلام روز عاشورہ اپنے چچا کے ساتھ تھے جب اقربا و اصحاب امام قتل ہو چکے اور اہل بیت کے باقیماندہ لوگ قید کر لئے گئے تو اسماء بن خارجہ حسن مثنیٰ کے پاس آیا۔ ان کو قیدیوں سے جدا کیا اور کہا خدا کی قسم خولہ کے بیٹے کو کبھی کوئی گزند نہیں پہونچے گا ابن سعد نے لشکریوں سے کہا ابی حسان کی روایت سے اس کی بہن کے فرزند کو چھوڑ دو بعض کہتے ہیں کہ حسن مثنیٰ قید کر لئے گئے تھے اور زخمی تھے مگر شفایاب ہو گئے تھے۔

یہی عبارت علی بن عیسیٰ اربلی نے کشف الغمہ میں اور علامہ مجلسی نے بحار میں ارشاد سے نقل کی ہے سید ابن طاؤس لہوف میں کہتے ہیں۔

والحسن بن الحسن وکان قد ذہب عمہ واسامر فی الصبر علی ضرب السیوف وطعن الرماح واکا ادنث وقد اثخن بالجراح وروی مصنف کتاب المصابیح ان الحسن بن الحسن المثنی قتل بین یدیہ عمہ الحسین فی ذالک الیوم سبعۃ عشر لفظ واصابہ ثمانیۃ عشر جراحۃ فوقع ناخذہ خالہ اسماء بن خارجہ فحملہ الی امکرفتہ وداواہ حتی برو وحملہ الی لمدینۃ +

حسن بن حسن نے اپنے چچا اور امام کا ساتھ دیا۔ نیزہ و شمشیر کھانے میں صبر اختیار کیا سخت زخمی ہوجانے کے بعد جاں بلب میدان جنگ سے اٹھالائے گئے درحالیکہ زخموں سے چور تھے۔ اور کتاب المصابیح کے مصنف نے روایت کی ہے کہ حسن مثنیٰ بن حسن نے اپنے چچا امام حسین کے سامنے سترہ آدمیوں کو قتل کیا ان کے بھی اٹھارہ زخم لگے۔ یہانتک کہ گر گئے لیکن ان کے ماموں اسمار بن خارجہ نے ان کو چھڑالیا اور کوفے گیا۔ علاج کرایا جب شفایاب ہوگئے تو مدینہ بھجوادیا۔

اس عبارت کو فاضل دربندی نے اسرار الشہادت میں اور نیز صاحب موا‌ئج حسینیہ نے لہوف سے نقل کیا ہے اور ابو حاتم بن صبان نے کتاب الثقات میں لکھا ہے :- "وجرح فی ذالک الیوم الحسن بن علی بن ابی طالب جراحۃ سال بذ حتی جلوہ ثم عاس بعد ذلک"

ناسخ التواریخ کی جلد پنجم صفحہ ۲۹۰ میں مرقوم ہے۔

"وحسن مثنیٰ در یوم طف ملازمت رکاب عم خود حسین را داشت روز عاشورہ زخم فراواں یافت و درمیان کشتگان درافتاد کہ سر شہدا را از تن دور کردند خواستند تا سر او را نیز برگیرند ہنوز رمقے در تن بود اسمار بن خارجہ بن عتبہ بن حصین بن حذیفہ

بدر الفرادی گفت او را بجائے گزار ید و ایں سخن از بہر آں گفت کہ مادر حسن مثنیٰ خولہ دختر قبیلہ را زقبیلہ قرارہ بود بالجملہ اسما کہ کینتی بابو حسان بود حسن مثنیٰ را بجوفہ آوردہ بداوا کرد تا صحت یافت واز آں جا روانۂ مدینہ شد۔

اسی مضمون کو علامہ ابن حجر عسقلانی نے تہذیب التہذیب میں جمال الدین حسینی نے عمدۃ الطالب میں ابن صباغ مالکی نے فصول المہمہ میں میرزا محمد بن معتمد خاں نے مفتاح النجا ابن شیخ محمد صبان مصری نے اسعاف الراغبین میں سید مومن شبلنجی نے نور الابصار میں علامہ اشرف علی نے ریاض الجنان میں اور مفتی اکرام الدین دہلوی نے سعادۃ الکونین میں بہ تغیر الفاظ بیان کیا ہے۔

ام پنجم فاطمہ بنت الحسین کے بطن سے حسن مثنیٰ کے تین صاحبزادے عبداللہ محض ابراہیم اور حسن مثلث کا پیدا ہونا یہ مضمون ناظرین تاریخ وسیر پر آفتاب عالمتاب سے زیادہ روشن ہے اور اس کی شہادتیں اس قدر کثرت سے موجود ہیں کہ ان کا احاطہ کرنا دشوار ہے جو ما نحن فیہ پر مطابقتاً یا التزاماً دلالت کرتی ہیں۔ علمائے انساب کے علاوہ جو اس پر متفق ہیں شیخ مفید نے ارشاد میں علی بن عیسیٰ نے کشف الغمہ میں علامہ مجلسی نے بحار الانوار میں محمد بن محمد الحسینی العشیانی نے کتاب اثنا عشریہ میں میرزا سپہر کاشانی نے ناسخ التواریخ میں محمد بن سعد کاتب الواقدی نے طبقات میں ابو حاتم بستی نے کتاب الصقات میں ابو الفرج اصفہانی نے مقاتل الطالبین اور اغانی میں ابو الحجاج مزی نے تہذیب الکمال میں خواجہ محمد [illegible] نے فصل الخطاب میں ابن حجر عسقلانی نے تہذیب التہذیب میں سید [illegible] نے [illegible] الابصار میں مرزا محمد بدخشی نے مفتاح النجا میں ملا محمد مبین فرنگی [illegible] میں اس کی صراحت کی ہے۔

امر ششم :- حضرت حسن مثنیٰ کا بعد واقعہ کربلا ایک مدت تک زندہ رہنا، زمانہ ولید بن عبدالملک یا سلیمان بن عبدالملک میں رحلت فرمانا۔ اس پر تو سب کا اتفاق ہے کہ حسن مثنیٰ بعد واقعہ کربلا عرصہ دراز تک زندہ رہے۔ البتہ اس میں اختلاف ہے کہ ان کا انتقال کس عمر اور کس عہد میں ہوا شیخ مفید ارشاد میں علامہ طبرسی اعلام الوریٰ میں علی بن عیسیٰ کشف الغمہ میں علامہ مجلسی بحار میں میرزا سپہر ناسخ التواریخ میں ابن اثیر جزری جامع الاصول میں جمال الدین حسینی عمدۃ الطالب میں شیخ عبدالحق دہلوی رجال مشکوٰۃ میں حضرت حسن مثنیٰ کا ۳۵ سال کی عمر پاکر ولید بن عبدالملک کے عہد میں اور علامہ ذہبی کاشف میں ابن حجر عسقلانی تہذیب التہذیب وتقریب التہذیب میں صفی الدین خزرجی تذہیب میں مرزا محمد بدخشی مفتاح النجا میں اور مفتی اکرام الدین، سعادت الکونین میں آپ کا ۷۵ سال کی عمر میں بعہد سلیمان بن عبدالملک اور ابن صباغ نے فصول المہمہ میں حسن مثنیٰ کا بچاسی سال کی عمر پاکر رحلت فرمانا تحریر کیا ہے البتہ ان میں قول اول صحیح ہے۔

امر ہفتم :- حضرت فاطمہ بنت الحسین کا اپنے شوہر حسن مثنیٰ کی وفات تک موجود ہونا اور ان کی قبر پر ایک سال تک مقیم رہنا اس کے متعلق شیخ مفید نے ارشاد میں ابن شہر آشوب نے مناقب میں علی بن عیسیٰ نے کشف الغمہ میں علامہ مجلسی نے بحار الانوار میں ابن اثیر جزری نے جامع الاصول میں ابن ابی الحدید نے شرح نہج البلاغہ میں ابوالحجاج مزی نے تہذیب الکمال میں ابن حجر نے تہذیب التہذیب میں ابن صباغ نے فصول المہمہ میں ولی الدین خطیب نے اسماء رجال مشکوٰۃ میں صفی الدین خزرجی نے تذہیب میں محبلی نے ذخیرۃ المآل میں مومن شبلنجی نے نور الابصار میں اشرف علی نے ریاض الجنان میں امام بخاری نے کتاب الجنائز میں ابن حجر نے فتح الباری شرح صحیح بخاری میں بدرالدین عینی نے عمدۃ القاری شرح صحیح بخاری میں قسطلانی نے ارشاد

الساری شرح صحیح بخاری میں ملا یعقوب بنباری نے خیر جاری شرح صحیح بخاری میں مرزا سپہر نے ناسخ التواریخ میں اور مفتی اکرام الدین خاں نے سعادت الکونین میں صاف صراحت کی ہے کہ جب حسن مثنیٰ کا انتقال ہوا فاطمہ بنت الحسین نے ان کی قبر پر بمقام بقیع خیمہ استادہ کرایا اور ایک سال تک وہیں مقیم رہیں یہ تمام زمانہ شب و روز عبادت میں بسر کیا دن کو روزہ رکھتیں اور رات بھر نماز پڑھتیں۔

المختصر اس تمام تحقیق و تنقید سے علماء فریقین اور ائمہ تاریخ و سیر کے نزدیک حضرت سید الشہداء علیہ السلام کی اولاد دختری میں صرف ایک فاطمہ کا جو فاطمہ صغریٰ کے نام سے مشہور ہیں موجود ہونا ان کا عقد قبل حادثۂ کربلا حسن مثنیٰ کے ساتھ کیا جانا ان دونوں بزرگواروں کا واقعہ کربلا میں جنابِ سید الشہداء کے ہمرکاب حاضر و موجود ہونا بعد معرکہ کربلا دونوں کی جانب مدینہ مراجعت ان کے تین بیٹے اور دو بیٹیاں پیدا ہونا حسن مثنیٰ کا ایک عرصہ کے بعد رحلت فرمانا فاطمہ بنت الحسین کا اپنے شوہر کی وفات کے وقت موجود ہونا اور ان کی قبر شریف پر سال بھر تک مقیم رہنا روز روشن کی طرح واضح اور آشکار ہو گیا۔ تو اب عقدِ قاسم بن حسن کے قصہ کا بے سروپا از قبیل خرافات و اباطیل اور ارباب تحقیق و تنقید کی نصوص صریحہ کے مخالف ہونے میں کیا شک شبہ باقی رہا۔ جب قدماء کی کتابیں اس سے خالی ہیں تو اس کے سوا اور کیا سمجھا جا سکتا ہے کہ متاخرین میں سے کسی کذاب مفتری نے اس داستان کو وضع کیا اور عوام کالانعام جن کو نیک و بد کی تمیز نہیں اس کو رواج دینے میں ساعی ہوئے جنہیں خواص نے بھی حقیقت حال کی تفتیش کئے بغیر اس قصہ کو اپنی تالیفات میں جگہ دیدی جو کسی طرح سند نہیں اور بلا شبہ یہ قصہ بے اصل و واہی اور سراسر باطل و موضوع بلکہ بہتان و افترا ہے فافہم وتدبر۔

اگرچہ تاریخی واقعات کو خواہ وہ سیاسی ہوں یا مذہبی بحیثیت فن علماء اور

مجتہدین کے فتوؤں سے کچھ تعلق نہیں۔ ہم مجتہدین کے محتاج ہیں بھی تو حدیث وتفسیر وفقہ میں جن کا تعلق مذہب سے ہے۔ تاریخی واقعات اوران کے متعلقات کو دینیات اوراجتہاد فی الدینیات سے کچھ سروکار ہے۔ نہ علاقہ۔ ہمارے لئے کسی تاریخی واقعہ وقوع اور عدم وقوع اوراس کے صحت و عدم صحت کا معیار صرف تاریخی شہادت اوراصولِ مقررہ ہیں۔ نہ یہ کہ فلاں قبلہ یہ فرماتے ہیں اور فلاں مولانا کا یہ ارشاد ہے۔ قصۂ مذکور کے جواز وعدم جواز کی بحث اُس وقت کارآمد ہوسکتی ہے۔ جب اس کی کچھ اصلیت بھی ہو۔ پہلے تو یہ دیکھنا مقدم ہے کہ یہ واقعہ ہوا بھی ہے یا نہیں اور ہوا تو اس کا ثبوت کیا ہے یہ تو بعد کی بات ہے کہ اس کا ذکر جائز ہے یا نہیں۔ اور علمائے مذہب نے اس کے پڑھنے اور سننے کی مخالفت کی ہے یا نہیں تاہم جہاں تک مجتہدینِ عراق ولکھنؤ کے فتوے ہماری نگاہوں سے گذرے کسی نے بھی اِس بے اصل روایت کی تصدیق تائید نہیں کی۔

آقا سید محمد طباطبائی یزدی فرماتے ہیں :۔

"وقوعِ ایں قضیہ معلوم نیست ہرچند دربعض کتب بدون سند معتبر مذکور باشد"

آقا شیخ عبداللہ مازندرانی کا ارشاد ہے۔

"الی الآن مستندے کہ بتواں اعتماد نمود درباب وقوع ایں قضیہ بدست نیامد"

آقا شیخ حسین مازندرانی کا فتوے ہے۔

"اما اصل ایں قضیہ پس ہنوز بدرجۂ تحقیق وثبوت ویقین نرسیدہ بلکہ عدمش محقق است"

آقا سید اسمٰعیل صدر تحریر فرماتے ہیں۔

"ذکر عروسی قاسم درکتب معتبرہ دیدہ نشدہ۔ کتاب منتخب نیز منقولات غیر معتبرہ راذکرمی فرماید"

آقا سید ابوتراب موسوی النجفی لکھتے ہیں :۔

"این حکایت صادق نیست بلکہ معلوم الکذب است۔"

آقا سید ریحان اللہ موسوی الطہرانی ارقام فرماتے ہیں۔

"ظاہر این ست کہ عقد قاسم با فاطمہ واقع نہ شدہ بلکہ بتواں ادعائے قطع بعد وقوع او نمود۔"

آقا سید ناصر حسین مجتہد لکھنؤ فرماتے ہیں۔

"قصۂ عقدِ قاسم بن حسنؑ بے اصل محض ہے۔"

ان کے ماسوا اور بہت سے فتوے علما عراق کے موجود ہیں اسی طرح اس بے اصل قصہ کے پڑھنے کو بوجہ اس کے کہ کذب صریح ہے یہ حضرات جائز نہیں سمجھتے۔

آقا سید محمد کاظم طباطبائی کا ارشاد ہے۔

"خواندنِ آں باظہار جزم و عدم جزم بوقوع مشکل است۔"

آقا شیخ حسین مازندرانی فرماتے ہیں:۔

"بنحو احتمال وجزم وقطع خواندنش مشکل بلکہ حرام است۔"

آقا غلام حسین اصفہانی تحریر کرتے ہیں:۔

"خواندنِ آں مقداری کہ در منتخب مذکور است بانسبتِ ہماں کتاب ہم غیر جائز است بدون شبہ و ریب۔"

بڑے تعجب کی بات ہے کہ حضرت امام حسنؑ نے زید اور حسن مثنیٰ اور عبداللہ یا کسی دوسرے بیٹے کے لئے تو عقد کی وصیت نہ کی اور قاسم کے عقد کے واسطے جو اپنے والد کی وفات کے وقت بہت ہی صغیر سن تھے۔ وصیت فرمائی اس سے زیادہ حیرت انگیز یہ کہ جن عقدوں کی بابت وصیت نہ تھی ان کو حضرت نے مدینہ میں کر دیا اور جس عقد کے واسطے وصیت تھی اس کو تعویق میں ڈالے رکھا۔ سب سے زیادہ قابلِ غور یہ بات ہے کہ اگر فاطمہ کے عقد کی قاسم کے ساتھ وصیت

ہوتی تو حضرت ان کا عقد حسن مثنیٰ کے ساتھ کیسے کر دیتے۔ پھر ایک شوہر کی موجودگی میں دوسرا عقد کیسا کس قدر حیرت افزا اور افسوسناک بات ہے کہ پڑھنے والے اور اس کی تائید کرنے والے یہ نہیں سوچتے کہ اس توہین آمیز افترا کا ذکر انظماً یا نثراً گستاخی اور بے ادبی کی کس حد تک پہنچا ہوا ہے، اس کے علاوہ یہ امر بھی کس قدر قابل افسوس ہے کہ اس واجب الاحترام طبقہ نے جس کو مداحیٔ اہل بیت کا فخر حاصل تھا اس کے تلخ اور زہرآلود نتائج پر غور کئے۔ بغیر اپنی پُر زور اور مؤثر اور دلآویز نظم کے جادو سے عالم اور جاہل بوڑھے اور بچے مرد اور عورت سب کو ایسا مسحور کیا کہ اس بے بنیاد اور بے اصل قصہ کو سنتے سنتے ان کے دل و دماغ میں حق الیقین سے بھی بڑھ کر درجہ حاصل ہو گیا، لطف یہ کہ جب اس کی ابطال و تردید کی جاتی ہے تو براہِ کج بحثی یہ جواب دیا جاتا ہے کہ کیا میر انیس جاہل تھے یا میرزا دبیر کو اتنی بھی خبر نہیں تھی وغیرہ ذالک بلکہ بعض اوقات اس حد سے بھی تجاوز ہوتا ہے جس کی تائید ذیل کے واقعہ سے جو میں نے ایک ثقہ شیعہ بزرگوار کی زبان سے سنا ہے ہوتی ہے۔

مولانا سید ابو الحسن عرف ابو صاحب اعلی اللہ مقامہ کے مکان پر لکھنؤ میں مجلس عزا تھی نواب محمد حسین خاں لکھنؤ کے ایک سربرآوردہ امیر جو میر مونس کے شاگرد تھے وہ بھی شریک مجلس تھے۔ سید ابو صاحب نے سید محمد جواد سے جو ایک محتاط بزرگوار تھے ہدایت کر دی تھی کہ آج آپ ممبر پر جا کر پڑھیں اور اثناء ذکر میں قصۂ عروسی کا ابطال نرم اور مناسب الفاظ میں کر دیں۔ سید محمد جواد نے سید ابو صاحب کے حکم کی تعمیل کی اور ممبر پر جا کر اس روایت کی تردید کرتے ہوئے کہا کہ اس توہین آمیز روایت کا ذکر کرنا قبالۂ جہنم ہے ان کا اتنا کہنا تھا کہ نواب محمد حسین خاں نے ٹانگ پکڑ کر کھینچ لی ان کو ممبر سے گھسیٹ لیا، اور بھرے مجمع میں سخت و سست الفاظ کہے۔ یہ کیوں! صرف اس وجہ سے کہ نواب محمد حسین خاں کے استاد نے اپنے

متعدد مرثیوں میں اس موضوع روایت کو بڑے آب و تاب سے نظم کیا ہے ۔ اس سے بڑھ کر یہ ہے کہ ساتویں محرم کو مہندی کے متعلق خاص طور پر اہتمام کیا جاتا ہے بفرضِ محال اگر وصیت کا اظہار اور اس پر عمل ہوا بھی تو دسویں کو قریب دوپہر ہوا، ساتویں کو مہندی چہ معنی دارد۔ اس کے علاوہ یہ رسمیں بہت سی سانچی وغیرہ وغیرہ ہندوستان کے مسلمانوں نے اپنی ہمسایہ قوموں سے لی ہیں ۔ عرب میں جہاں اب بھی یہ باتیں نہیں ہیں آج سے تیرہ سو برس پہلے ہونا کس قدر بعید از عقل بالتخصیص ہندوؤں کی ایک رسم کو خاندانِ رسالت کی طرف منسوب کرنا مسلمانوں کے لئے کس قدر شرمناک اور لائقِ حرکت ہے ۔

حضرت قاسم کے واقعات میں قصّۂ عروسی کی طرح ارزق شامی اور اس کے چار بیٹوں کی معرکہ آرائی نہایت مشہور اور دلچسپ ہے جس کو شعرائے ہند نے بڑے آب و تاب اور دلکش پیرائے سے نظم کیا ہے لیکن تاریخ کی تمام قدیم و مستند کتابیں اس واقعہ کے بیان سے بھی قطعاً خالی ہیں ۔ داستانِ عروسی کی طرح ارزق کی جنگ بھی روضۃ الشہدا جیسی کتابوں ہی میں پائی جاتی ہے ۔ ملائے کاشفی نے اپنی عادت کے موافق اس لڑائی کو کسی سند یا حوالے سے نہیں لکھا۔ پھر کوئی وجہ نہیں کہ اس کو بھی قصّۂ عروسی کی طرح بے اصل و موضوع نہ مانا جائے ۔ روایتاً کوئی سند نہ ہونے کے علاوہ درایتاً بھی اس کی صحت مشکوک و ناقابلِ اعتبار ہے، کیونکہ اس معرکہ میں سوائے عراقیوں کے ایک بھی شامی یا حجازی شریک نہ تھا ۔

ابومخنف لوط ابن یحییٰ ازدی جن کی نسبت بیان کیا جاتا ہے کہ اس زمانہ میں بمقام کوفہ موجود تھے اپنے مقتل میں صاف لکھ رہے ہیں " فکان العسکر ثمانون الف فارس من اهل الكوفة ليس منهم شامی ولا حجازی "

(۱۰) یہ امر بھی تنقیح طلب ہے کہ علی اکبر کون تھے سید سجاد یا علی الشہید حضرت زینبؑ

کا شہادتِ علی اکبر کے وقت خیمہ سے نکل آنا قصۂ دختر بادشاہ حلب علی اکبر کی بابت عام طور پر یہ مشہور ہے کہ وہ حضرت سید الشہدا کے منجھلے صاحبزادے ہیں اور شہادت کے وقت ان کی عمر اٹھارہ برس سے زائد نہ تھی۔ لیکن یہ صحیح نہیں ہے اس تحقیق کی بابت علماء اور مورخین مختلف الخیال اور مختلف البیان ہیں بعض کہتے ہیں کہ علی الشہید ہی علی اکبر ہیں بعض کا خیال ہے کہ سید سجاد علی اکبر اور علی الشہید علی اوسط ہیں۔ مگر ہمارے اجتہاد اور تحقیق میں پہلی رائے صحیح اور درست ہے اس کے متعلق ہم اس کتاب کے دوسرے حصہ میں کسی قدر تفصیل سے بحث کریں گے انشاء اللہ۔ البتہ مختصر اتنا عرض کیا جا سکتا ہے کہ گو کتاب ارشاد اور شرح الاخبار وغیرہ میں سید الساجدین کو علی اکبر اور علی الشہید کو علی اوسط بیان کیا گیا ہے لیکن دوسرے تمام مشہور و معتبر مورخ اور نساب برخلاف ازیں اسی قول کی تائید کرتے ہیں کہ علی الشہید ہی جناب سید الشہدا کے خلفِ اکبر تھے۔ نہ کہ سید الساجدین چنانچہ ابن قتیبہ دینوری معارف میں محمد بن جریر طبری ذیل المذیل میں ابو بکر بن ثلج تاریخ اہل بیت میں ابن الاخضر جنابذی معالم العترہ میں۔ محمد ابن طلحہ شافعی مطالب السئول میں سبط ابن جوزی تذکرہ خواص الامۃ میں محب طبری ذخائر عقبیٰ میں خواجہ محمد پارسا فصل الخطاب میں جمال الدین حسینی عمدۃ المطالب میں یحییٰ بن ابی بکر ریاض مستطابہ میں احمد بن عبد القادر عجیلی ذخیرۃ المآل میں محمد بن صبان مصری اسعاف الراغبین میں سلیمان بن ابراہیم قندوزی ینابیع المودۃ میں سید مومن شبلنجی نور الابصار میں ملا محمد مبین لکھنوی وسیلۃ النجات میں اور ابن شہر آشوب مناقب میں ایسا ہی کہتے ہیں۔ جب یہ صورت ہے تو علی اکبر کی عمر شہادت کے وقت اٹھارہ سال کی کسی طرح نہیں ہو سکتی۔ کیونکہ سید الساجدین کا سن شریف اس وقت ۲۲ سال آٹھ مہینہ کا تھا علی اکبر آپ سے بڑے ہیں تو جیسا کہ بعض نے ۲۸ سال یا ابن شہر آشوب نے پچیس سال کی

عمر لکھی ہے اس کو تسلیم کرنا پڑیگا۔

مرثیہ گو حضرات کی بدولت عموماً لوگوں کے یہ بھی ذہن نشین ہو گیا ہے کہ حضرت علی اکبر کی شہادت کے وقت جناب زینب بیتاب ہو کر خیمہ سے نکل آئی تھیں لیکن حرم سرا سے اس طرح باہر نکل آنا کہ نامحرموں کی نظر پڑ سکے ۔ دختر سیدۃ النساء کی شان رفیع سے بہت بعید بلکہ ایسا خیال اور ایسا ذکر ان معظمہ کی توہین ہے ہم آئندہ ایک موقعہ پر اس کے متعلق کسی قدر تفصیل سے بحث کرینگے ۔

جناب علی اکبر کے واقعات میں بادشاہ حلب کی بیٹی کا قصہ بھی نہایت مشہور ہے جس کو روضہ خواں بڑی شد و مد سے بیان کیا کرتے ہیں کہ آپ کے حسن و جمال کا شہرہ سُن کر بادشاہ حلب نے اپنی بیٹی کا عقد کرنا چاہا تھا لیکن وہ اور اس کی بیٹی اس وقت کربلا میں پہنچے کہ جب آپ شہید ہو چکے تھے مگر اس داستان بے اصل کی لغویت محتاج تشریح نہیں اور اس پر وہی یقین کر سکتا ہے جو علم تاریخ سے ناآشنائے محض ہے ۔ حلب نہ کسی مستقل حکومت و سلطنت کا پایہ تخت تھا نہ وہاں کوئی خاندان برسر حکومت تھا حلب کی چھوٹی سی سلطنت ولادت مسیح سے ۴۲ برس مارک انیٹونی کے ہاتھوں جو رومۃ الکبریٰ کا مشہور سپہ سالار اور رکن اعظم تھا برباد ہو چکی تھی اس زمانہ سے یہ علاقہ بھی روم کی وسیع شاہنشاہی کا ایک حصہ تھا ۔ جب اس عظیم الشان سلطنت کے دو حصے ہو کر شہر قسطنطنیہ ایسٹرن رومن ایمپائر کا دار الخلافہ ہوا تو تمام مشرقی صوبے قیصر قسطنطنیہ کے حصہ میں آئے یہاں تک کہ سنہ ۱۶ ہجری مطابق سنہ ۶۳۷ء میں تمام شاہی علاقے مع حلب کے مسلمانوں نے فتح کر لئے اور اب یہ سب ملک امیر معاویہ کے بعد یزید کے زیر حکومت تھے جب وہاں کوئی سلطنت ہی نہ تھی بلکہ اس پر خاندان بنی امیہ کا ایک عامل حکومت کر رہا تھا تو حلب کا کوئی بادشاہ ہوتا کیونکر ممکن ہو سکتا ہے اس لئے یہ قصہ محض بے وجود

اور کسی وضاع جاہل کا گھڑا ہوا ہے۔ مولانا سید ناصر حسین صاحب قبلہ مجتہد لکھنؤ بھی ایک استفسار کے جواب میں ارشاد فرماتے ہیں کہ:۔

"قصۂ مذکورہ غلط محض اور دروغ بے فروغ ہے اور ادنے متتبع کتب معتبرہ تاریخ وسیر پر ظاہر ہے کہ حلب عہد خلافت ثانیہ میں فتح ہوا۔ اور وہ ملک شام میں واقع ہے شام کی حکومت عہد خلافتِ ثانیہ سے امیر معاویہ بن ابی سفیان کو حاصل رہی ہے۔ حلب بھی دوسرے بلادِ شام کی طرح اسی کے تصرف میں تھا۔ اور اس کی طرف سے حسبِ دستور وہاں بعض حکام وعمّال رہا کرتے تھے یہی کیفیت حلب کی آخر زندگی امیر معاویہ تک رہی تا ایں کہ یزید برسر حکومت ہوا۔ پس وہ بادشاہِ حلب کون تھا جس کی دختر کے ساتھ عقد حضرت علی اکبر کا قرار پائے بالجملہ یہ قصہ افترا محض ہے۔ ہدایاتِ ناصریہ صفحہ"

حضرت زینب کا بھائی کو گھوڑے پر سوار کرنا

(۱۱) حضرت سید الشہدا کی رخصت آخری کے وقت حضرت زینبؑ کا بھائی کو گھوڑے پر سوار کرانا اس واقعہ کو بھی نظماً ونثراً نہایت کثرت کے ساتھ بیان کیا جاتا ہے اس وقت کی مجبوری وبیکسی پر خیال کرتے ہوئے یہ بات آسانی سمجھ میں آجاتی ہے اور اپنے دردناک اور جگر خراش منظر کے لحاظ سے نہایت مؤثر اور گریہ آور ہے لیکن اول تو اس واقعہ کے اسباب کے لئے کوئی تاریخی شہادت نہیں دوسرے ہم اس کو درایتاً یوں تسلیم نہیں کرتے کہ حضرت سید الشہدا جیسے غیور کی حمیت کبھی اس کی اجازت نہیں دے سکتی تھی کہ آپ کی خواہرِ گرامی کسی ایسے موقعہ پر جہاں نامحرموں کی نظر پڑے خیمے سے باہر تشریف لے آئیں۔ اس میں

شک نہیں کہ خیمے ہلال نما حلقہ میں ایک دوسرے سے پیوستہ نصب کئے گئے تھے مگر سپاہ مخالف کی صف بندی اس حلقہ کے عین سامنے ہی تھی اور سراپردۂ حرم کے باہر ذراسی نقل وحرکت بھی ان سے پوشیدہ نہیں رہ سکتی تھی یہ یقیناً کہا جا سکتا ہے کہ زنانے خیموں کے سامنے قناتیں ضرور تھیں ممکن ہے کہ آپ ایسے موقعہ پر سوار ہوئی ہوں جہاں قنات کی آڑ ہو لیکن اول تو بیان کرنے والے اس واقعہ کو اس صورت سے بیان نہیں کرتے۔ دوسرے ان لوگوں کے لئے جو گھوڑے کی سواری کے مشاق اور شہسوار ہیں سوار ہوتے وقت دوسرے کی امداد کی حاجت ہے تو ہم ایسی روایت کو جو حضرت زینب کی شان میں منقصت پیدا کرنے والی ہو باور ہی کیوں کریں اور کیوں نہ دوسرے موضوعات کی طرح اس کو بھی غلط سمجھیں۔

(۲۱) زعفر بن راحیل بادشاہِ جنات کا مع فوج حضرت کی مدد کو آنا

روز عاشورہ کے واقعات میں جب کہ حضرت کے تمام انصار و اقربا درجۂ شہادت پر فائز ہو چکے تھے، زعفر جن کا حضرت کی کمک کو حاضر ہونا ذاکرین بڑے آب و تاب سے بیان کرتے ہیں لیکن یہ واقعہ متقدمین و متاخرین کی کسی مستند تاریخ میں نہیں پایا جاتا۔ ملائے کاشفی نے اس واقعہ کو نور الائمہ سے بحوالۂ علامہ جار اللہ زمخشری نقل کیا ہے۔ تاہم اس کی اصلیت بھی یقیناً اسی طرح بے بنیاد اور بے وجود ہے جس طرح قصۂ عروسیٔ قاسم کی۔ منتخب طریحی وغیرہ میں جو یہ قصہ نقل کیا گیا ہے۔ غالباً ان کا ماخذ روضۃ کاشفی ہے۔ صاحب ناسخ التواریخ نے منتخب سے اس کو نقل کیا ہے۔ چونکہ متقدمین کی تمام کتابیں اس ذکر سے خالی ہیں اور متاخرین میں جن لوگوں نے لکھا ہے انہوں نے کوئی قابل اطمینان سند نہیں بیان کی اس لئے یہ واقعہ بے وجود اور غلط ہے اور اس کی صحت کا کوئی ثبوت نہیں

(۱۳) حضرت اور آپ کے رفقا کے ہاتھ سے مقتولین کی تعداد

فوج مخالف کی تعداد میں بعض علماء شیعہ نے حیرت انگیز مبالغہ کیا ہے بعض نے پانچ لاکھ بعض نے نو لاکھ مگر سب سے بڑھ چڑھ کر آقائے دربندی نے چھ لاکھ سوار اور دو کروڑ پیادے تحریر فرمائے ہیں اور مطلق اس کے لوازم پر خیال نہ کیا۔ آقائے موصوف جو ایسے مبالغوں میں سب سے آگے ہیں۔ اسرار الشہادت میں یہ بھی لکھتے ہیں کہ حضرت کے ہاتھ سے تین لاکھ، حضرت عباس کے ہاتھ سے ۲۵ ہزار اور دوسروں کے ہاتھ سے ۲۵ ہزار اس طرح کل ساڑھے تین لاکھ کوفی قتل ہوئے ہم نہیں سمجھ سکتے کہ ان فضول اور لغو مبالغوں سے آقائے موصوف نے کیا نتیجہ خیال کیا تھا۔ کیا حضرت کی شجاعت کا اظہار بغیر ان لغویات کے نہیں ہو سکتا اگر آپ نے ان حوصلہ شکن صدمات اور ناقابل برداشت بھوک پیاس میں سو دو سو آدمی بھی قتل کئے تب بھی آپ اشجع الناس قرار پاتے ہیں۔ دیکھئے جبس کارکرن نے حضرت اور انصار حضرت کی شجاعت کو تمام دنیا کے شجاعوں پر کس خوبی کس متانت اور کس حجت قاطع کے ساتھ فائق ہونا ثابت کیا ہے اور ایسی محکم اور استوار دلیل پیش کر دی ہے جس کے سامنے اس یاوہ سرائی اور تار عنکبوت کی ضرورت ہی نہیں۔ شجاعت ثابت قدمی اور قوت قلب کا نام ہے، نہ ایسی بیہودہ روایتوں کے اسناد کا۔ یہ بھی بیان کیا جاتا ہے کہ حضرت نے ستر اسی حملے کئے اور ہر حملہ میں دس دس ہزار لاشیں بچھا دیں۔ بھلا اس مبالغہ کا کچھ ٹھکانا ہے۔ اسی طرح علامہ ابو اسحٰق اسفرائنی نور العین میں مقتولین کوفہ کی تعداد تیس ہزار بیان کرتے ہیں۔ مگر یہ بھی مبالغہ سے خالی نہیں کیونکہ کل سپاہ مخالف ۳۰ ہزار سے زائد نہیں تھی اس میں شک نہیں کہ کئی ہزار آدمی کھیت رہے مگر ان کا شمار چار پانچ ہزار سے زیادہ نہ تھا۔ ابن

شہر آشوب اور محمد ابن ابی طالب اپنی تحقیق میں ان مقتولین کی تعداد جو صرف حضرت کے ہاتھ سے مارے گئے ایک ہزار نو بچاس لکھتے ہیں جو بالکل قرین قیاس ہے۔

اتنے آہن پوش لوگوں کا ایک ہی شخص کے ہاتھ سے درحالیکہ وہ بھوک اور پیاس سے جاں بلب ہو۔ تمام انصار و اقربا اس کی آنکھوں کے سامنے قتل ہو چکے ہوں ان بوہ مصائب اور روحانی و جسمانی صدمات نے جس کے تمام قوا کو مضمحل و بیکار کر دیا ہو، اس پر آلام و نوائب کا پہاڑ ٹوٹ پڑا ہو، آغشتہ بخون و غمناک ہو جانا ایسا حیرت انگیز کارنامہ ہے جو انسانی طاقت سے بالاتر ہے اور جنگی تاریخ میں ایسا شاندار اور زرین واقعہ ہے جس کی نظیر پیش کرنے سے اولین اور آخرین کے بہادرانہ افسانے قطعاً و حتماً معذور ہیں ع واللہ کہ اے حسین کاری کردی۔

(۱۴) فاطمہ صغریٰ کا آنا

(۱۴) ان ہی موضوع روایات میں فاطمہ صغرےٰ بنت الحسین کے قاصد کا اس وقت کہ جب آپ بالکل تنہا رہ گئے تھے کربلا میں آنا بہت مشہور ہے جس کو محض بکا و ابکا کے لئے وضع کیا گیا ہے اس مسئلہ پر ہمیں زیادہ بحث کرنے کی اس وجہ سے ضرورت نہیں کہ ہم پہلے ثابت کر چکے ہیں کہ فاطمہ صغریٰ حضرت کے ہمراہ کربلا میں موجود تھیں اور آپ نے اپنی کسی بیٹی کو مدینہ میں نہیں چھوڑا۔ اس کے علاوہ تاریخ و سیر کی تمام مستند کتابیں اس ذکر سے خاموش ہیں جب اس واقعہ کی کچھ اصلیت ہی نہیں تو قاصد صغریٰ کا کربلا میں آنا محض بے اصل و بے بنیاد ہونے میں کیا شبہ باقی رہ سکتا ہے۔

(۱۵) حضرت جبرئیل کا میدان کربلا میں نزول

(۱۵) یہ امر مسلمہ ہے کہ حضرت سید الشہدا علیہ السلام کے مرتبۂ عالی کا احصاء

انسانی طاقت سے باہر ہے۔ زمانہ جناب ختمی مآب صلے اللہ علیہ وآلہ میں آپ کے دونوں نواسوں کی خدمتیں جو جبریل یا دوسرے ملائکہ نے کیں ان کے متعلق متعدد واقعات کتب فریقین میں موجود ہیں ملائکہ مقربین کا فرزند خاتم الانبیاء کی خدمت کو آنا یا مدد کو آنا کوئی تعجب خیز امر نہیں اور ہم کو اس میں چون وچرا نہ کرنا چاہیے۔ شیخ عبدالقادر جیلانی جو روز عاشورہ کو روز عید قرار دیتے ہیں وہ بھی غنیۃ الطالبین (مطبوعہ مطبع اسلامیہ لاہور صفحہ ۵۸۵) میں لکھتے ہیں۔

اخبرنا ابونصر عن والدہ باسنادہ عن ابی اسامہ عن جعفر بن محمد قال ہبط علیٰ قبر الحسین بن علی یوم اصیب سبعون الف ملک یبکون علیہ الیٰ یوم القیامۃ۔

ہم کو ابونصر نے اپنے باپ اور انہوں نے ابی اسامہ اور انہوں نے جعفر بن محمد کے استاد سے خبر دی ہے کہ روز قبر حسین بن علی پر ستر ہزار فرشتے نازل ہوئے اور وہ ان پر قیامت تک روتے رہیں گے۔

لیکن دیکھنا یہ ہے کہ حضرت جبریل کے اسوقت نزول کی کوئی سند بھی ہے یا نہیں یہ سند ہم کو عام راویوں سے نہیں پہونچ سکتی۔ اگر ممکن ہے تو صرف آئمۂ اہلبیت سے۔ مگر ہم علماء امامیہ کی تمام مستند کتابوں میں سے کسی ایک میں بھی اس واقعہ کو نہیں پاتے۔ متقدمین ومتاخرین میں سے کسی نے اس کا ذکر کیا اشارہ تک نہیں کیا۔ اگر ہے بھی تو صرف معمولی کتابوں میں یا مرثیوں میں جو تاریخی نقطۂ خیال سے قابل تسلیم نہیں۔

(۱۶) عبداللہ بن حسن کی شہادت اور ان کی عمر

(۱۶) مورخوں نے عموماً اس واقعہ کو لکھا ہے کہ جب حضرت گھوڑے سے گرے اس وقت ایک خوبصورت لڑکا آپکی طرف دوڑا۔ ہر چند بیبیوں نے

روکنا چاہا۔ مگر نہ رکا۔ ابحر بن کعب تمیمی حضرت پر تلوار کا وار کرنا چاہتا تھا کہ وہ بچہ چلایا۔ او جہنم نصیب کیا میرے چچا کو قتل کریگا اور اپنے دونوں ہاتھ حسینؑ پر پھیلا دئے تلوار چلی، اور دونوں چھوٹی چھوٹی کلائیاں کٹ کر گر پڑیں۔ ابھی چچا نے اچھی طرح گود میں نہ لیا تھا کہ حرملہ بن کاہل کا تیر لگا۔ اور بچہ وہیں ٹھنڈا ہو گیا۔ اس بچہ کا نام عبداللہ الاصغر بن حسن بیان کیا گیا ہے چنانچہ صاحب ناسخ التواریخ لکھتے ہیں۔

"ایں وقت عبداللہ بن حسن علیہ السلام کہ درمیان زنان میزیست و
ہنوز از حلم خبرے نداشت و مراہق نبود۔ چوں عم خویش را دریں حال
نگریست تاب و تواں از وے برفت در آہنگ ملازمت خدمت
کرد و از خیمہ بیروں دوید"

ممکن ہے کہ ایسا ہوا ہو لیکن تعجب خیز یہ امر ہے کہ بعض ذاکر اس لڑکے کی عمر تین سال کی بیان کرتے اور اس کا خیال نہیں کرتے کہ حضرت امام حسنؑ کی شہادت کو جو ۲۸۔ صفر ۵۰ھ کو واقع ہوئی روز عاشورہ ۱۰ محرم ۶۱ھ تک دس سال دس ماہ دس یوم کا زمانہ گذر چکا تھا۔ پھر حضرت امام حسنؑ کے کسی بیٹے کی عمر تین سال بیان کرنا کس قدر ناواقفیت اور جہالت پر مبنی ہے اور کس حد تک گستاخی اور بے ادبی ہے۔ اگر ہم اس واقعہ کو صحیح مان لیں کہ حضرت امام حسن کا کوئی لڑکا اس طرح شہید ہوا تو اس کی عمر کسی طرح دس سال سے کم نہیں ہو سکتی۔

(۱۷) حضرت زینبؑ کا سر برہنہ مجمع عام میں نکل آنا

(۱۷) یہ امر یقینی ہے کہ حضرت کی شہادت خیمہ گاہ کے عین سامنے اور بہت ہی قریب واقع ہوئی تھی ممکن ہے کہ مخدراتِ حرم اس ہوش رُبا اور مصیبت انگیز خونی منظر کو قنات سے دیکھ رہی ہوں۔ عورتیں فطرتاً دل کی کمزور اور جذبات رنج و

الم سے بہت جلد متاثر ہونے والی ہوتی ہیں یہ ہولناک اور قیامت خیز نظر رہ
نساء تھا کہ ان کے ستم رسیدہ قلوب کو بےچین و بے قرار نہ کر دیتا۔ جناب زینب
جو حضرت سید الشہداء کے بعد باعتبار عمر سب سے بزرگ اور اپنے بھائی سے بے حد
محبت رکھنے والی تھیں ان کے صدمہ اور انتشار کا اندازہ کرنا زبان اور قلم کی
طاقت سے باہر ہے یہ جو کچھ قلق و اضطراب تھا۔ انسانی فطرت کا تقاضا تھا۔
حضرت جس وقت خیمہ گاہ کے سامنے گھوڑے سے گرے اور دشمنوں نے بارادہ
قتل نرغہ کیا اس وقت سپہ سالار فوج عمر سعد بھی موجود تھا۔ اور افسران سپاہ
کو حضرت کے قتل کی ترغیب دے رہا تھا خیام حرم اس قدر قریب تھے کہ وہاں کی
آواز اس مجمع تک آسکتی تھی ممکن ہے جناب زینب بے قرار ہو کر قنات کے پاس تا باہر
آگئی ہوں جہاں آپ نے آواز دی۔ واخاہ واسیداہ واہل بیتاہ ابیت
السماء طبقت علی الارض، ولیت الجبال تدکدکت علی السیل
کاش آسمان زمین پر پھٹ پڑتے، کاش پہاڑ پاش پاش ہو جاتے اور عمر سعد کو جو
قریشی اور رشتہ دار بھی تھا ملامت کی یا عمر بن سعد یقتل ابو عبد اللہ و
انت تنظر الیہ ”؛ عمر سعد! ابو عبداللہ قتل کئے جا رہے ہیں اور تو کھڑا تماشا دیکھ رہا ہے۔
یہاں تک تو ہم کو اس واقعہ کے قبول کرنے میں تامل نہیں لیکن یہ بیان کہ آپ
بے تابانہ یا سر و پا برہنہ مجمع عام میں آگئیں یا حضرت کی عین شہادت کے وقت عمر
کے پاس آکر اس کی منت و سماجت کی ہرگز مان لینے کے قابل نہیں۔ بے شک
عورت کا دل نازک ہوتا ہے خصوصاً جس پر مصیبتوں کا پہاڑ ٹوٹ پڑا ہو جس کے حضرت
بھائی کا حادثہ قتل اعلیٰ درجہ کی سفاکی اور بے رحمی کے ساتھ اس کی آنکھوں کے سامنے واقع
ہوا ہو اس پر جو اضطراری کیفیت لاحق ہو وہ تھوڑی ہے مگر ہم کو دختر خاتون محشر کی
حالت دنیا کی دوسری معمولی عورتوں کی حالت پر قیاس نہ کرنی چاہیئے۔ اس ثانی سیدہ

الغرض خاتون معظمہ کے وقار و تحمل اور قوتِ برداشتِ مصائب کو دنیا کی دوسری عورتوں سے کوئی نسبت نہیں انہوں نے تمام جانکاہ مصائب کو جو مشیتِ ایزدی سے اُن پر نازل ہوئے ایسے صبر و تحمل تسلیم و رضا سے برداشت کیا کہ عالم میں ہمیشہ یادگار رہے گا ان کے نفسِ مطمئنہ اور ان کی قوتِ ارادی کو اضطرار و انتشار کے جذبات مغلوب کر ہی نہیں سکتے تھے بلکہ فولاد اس کی سختی اور پہاڑ اس کے وزن کو نہیں پہنچ سکتا۔ بہن بھائی نے اس انبوہِ مصائب کا جو تاریخِ عالم میں عدیم المثال ہیں نہایت خوشی اور حیرت انگیز ثابت قدمی سے مقابلہ کیا اسی کی وہ بہن تھیں اگر مردوں میں محمدی وقار اور استقلال کا نمونہ ہونے کی حیثیت سے حسینؑ کا ثانی روئے زمین پر نہ تھا تو زینب بھی عورتوں میں اُن ہی اوصاف کا نمونہ ہونے سے دنیا میں اپنا نظیر نہ رکھتی تھیں۔ اگر رسول خداؐ کا آغوش مبارک حسنؑ حسینؑ کا گہوارہ تربیت رہ چکا تھا تو اسی آغوش مقدس میں زینبؑ وام کلثوم نے پرورش پائی تھی۔ سیدۂ عالم جیسی ماں کے دودھ سے اگر حسنؑ و حسینؑ کے گوشت و پوست کا نشوونما ہوا تھا تو وہی شرف زینب وام کلثوم کو حاصل تھا۔ ان میں رسول اللہؐ کا وقار فاطمہ کا صبر علی کی غیرت حسنؑ کی بردباری اور حسینؑ کا استقلال سب موجود تھے جس ماں کی غیرت اور حیا نے اپنا جنازہ دن کو اٹھایا جانا گوارا نہ کیا اس کے قدم بقدم چلنے والی زینبؑ وام کلثوم تھیں ان مخدراتِ عظمےٰ نے ان جادۂ استقلال سے ڈگمگا دینے والی مصیبتوں کا ایسے وقار متانت ثابت قدمی اور تسلیم و رضا سے مقابلہ کیا جن میں سے بعض کو حسین بھی برداشت نہیں کر سکتے تھے حسینؑ ان کو وصیت کر چکے تھے کہ دیکھو تمہاری بے صبری منزلت کو نقصان نہ پہونچائے اور دشمنوں کو شماتت اور خوشی کا موقعہ نہ ملے حسین اگر وصیت نہ بھی کرتے۔ تاہم زینب وام کلثوم یا دوسری مخدراتِ عصمت سے کوئی ایسی بات سرزد ہونا جو ان کے مرتبہ ان کی شان اور ان کے خاندانی وقار کے خلاف ہو۔ ہمارے خیال میں قطعی محال اور ناممکن ہے اور

کوئی ایسی حرکت جو صبر و رضا کے منافی ہو قولاً یا فعلاً تو درکنار اشارتاً کنایتہ بھی ان سے وقوع میں نہیں آسکتی تھی۔

جس طرح مردوں میں سب کے قوائے جسمانی و دماغی یکساں نہیں اسی طرح عورتوں میں بھی سب عورتیں یکساں نہیں ہوتیں بعض عورتوں کی قوتِ قلب قوتِ ارادہ قوتِ استقلال ایسی حیرت انگیز دیکھنے میں آتی ہے کہ بڑے بڑے اولوالعزم مردِ متحیر و مبہوت رہ جاتے ہیں تو ہم کیسے مان لیں کہ وہ عالی مرتبت مخدرات جو نساء اولین و آخرین کی فخر ہوں جن کی قوتِ ارادی قوت صبر و تحمل اور جذباتِ وقار و حیا کی مثال طبقۂ نسواں تو درکنار مردوں میں بھی ملنی دشوار ہو۔ وہ بے تابی اور بے صبری سے ایسی متاثر ہو جائیں کہ ان کو اپنے ذاتی وقار اور خاندانی عظمت کا بھی خیال نہ رہے مرزا دبیر حضرت کی شہادت کے وقت جناب زینب کے آنے کا حال بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں سے

نامحرموں کا ہوش نہ پردہ کا ہوش ہے ؎ یہ سب لہو کا جوش ہے الفت کا جوش ہے

مگر نہیں ایسا ہرگز نہیں ہوا۔ اور نہ ہو سکتا تھا کہ سیدۃ النساء العالمین کی بیٹی اور دنیا میں پردہ قائم کرنے والے کی نواسی اپنے اختیار سے نامحرموں کے مجمع میں آجائیں۔ ایسا خیال اور ایسا بیان دنیائے اسلام کی اُن خورادیوں کی سراسر توہین ہے۔ اور جو لوگ خاندانِ رسالت کے ان ممتاز اور ان عالی جاہ خواتینِ معظمات کے حرکات و سکنات خیالات و جذبات کو اپنے گھروں کی عورتوں کی طرح خیال کرتے ہیں وہ یقیناً سخت اور خطرناک غلط فہمی کے ارتکاب کے مجرم ہیں۔

(۱۸) حضرت شہر بانو کا ری کی طرف چلا جانا

ان ہی غلط موضوع اور بے بنیاد روایات میں یہ قصہ بھی نہایت مشہور

ہے کہ حضرت کی شہادت کے بعد جب آپ کا گھوڑا در خیمہ پر آیا تو جناب شہر بانو سوار ہو کر رے کی طرف چلی گئیں راستہ میں ان کا بھائی شہریار جو کمک کے واسطے لشکر لئے ہوئے آرہا تھا ان سے ملا اور اس وجہ سے کہ واقعات شہادت ہو چکے تھے آپ کو اپنے ساتھ لے کر واپس چلا گیا فاضل دربندی نے جیسا کہ ہم اوپر بیان کر چکے ہیں۔ اکسیر العبادات میں شہریار کا آنا تو نہیں لکھا مگر یہ ضرور بیان کیا ہے کہ جناب شہر بانو فاطمہ یا سکینہ یا زبیدہ زوجہ قاسم بن حسن کو اپنے ساتھ لے کر گھوڑے پر سوار ہو کر رے کی طرف چلی گئیں اور وہاں کوہ شمران کے ایک غار میں پوشیدہ ہو گئیں لیکن یہ روایت سراسر لغو اور کذب محض ہے اور اس میں حسب ذیل امور تنقیح طلب ہیں۔

(ا) کیا شہر بانو اس وقت تک زندہ اور واقعہ کربلا میں موجود تھیں۔

(ب) کیا یہ ممکن تھا کہ شہر بانو تمام اہل بیت اور اپنی اولاد کو اس مصیبت میں چھوڑ کر محض اپنے تحفظ کے لئے اس طرح علیحدگی اختیار کر لیتیں۔

(ج) کیا ان کا کوئی بھائی مسمی شہریار موجود تھا۔ اگر تھا تو کیا شہریار کو کسی ملک کی سلطنت حاصل تھی اگر تھی تو ملک کی۔

(د) کیا جناب سید الشہداء نے ان کو رے کی طرف جانے کی اجازت دیدی تھی۔

(ہ) اگر یہ شہر بانو والدہ سید الساجدین نہ تھیں تو کیا کوئی دوسری عجمی شہزادی تھیں اگر تھیں تو حضرت نے ان سے عقد کب کیا تھا امر اول کی نسبت عموماً محققین کا اتفاق ہے کہ شہر بانو واقعہ کربلا کے وقت زندہ ہی نہ تھیں بلکہ اس واقعہ سے ۲۲ سال پہلے ان کا انتقال ہو چکا تھا۔ چنانچہ ملا محمد حسن قزوینی ریاض الشہادۃ میں لکھتے ہیں

"از احادیث ظاہر می شود کہ شہر بانو مادر امام زین العابدین در شہر کربلا حاضر نبود بلکہ آنچہ مستفاد می شود از اخبار اینست کہ در وقت وضع حمل از دنیا رفت و آں مصائب و وقائع را ندید۔"

ملائے مجلسی جلاء العیون میں ابن بابویہ سے بہ سند حضرت امام رضا علیہ السلام تحریر فرماتے ہیں۔

"حضرت امام زین العابدین علیہ السلام از دیلم رسید و چوں آنحضرت از وے متولد شد او برحمت الٰہی واصل باشد۔"

محمد بن سلیمان تنکابنی اکلیل المصائب میں ارقام فرماتے ہیں:۔

"و قول دیگر در شہربانو کہ در کربلا ہمراہ بود و اسیر شدہ۔ ایں نیز ضعیف است و محل اعتنا نیست و از غیر ایں کہ شہربانو یہ و خواہرش کہ زوجۂ امام حسن بود۔ حاملہ شدند و ہر دو متولد شدند و ہر دو در ایام نفاس وفات یافتند و آں کودکے کہ از شہربانو یہ متولد شد۔ حضرت سید سجاد بود۔ کہ او را بعضے از کنیزکان سید الشہدا کہ ام ولد بودند کفیل شدند و شیر دادند پس در کربلا ہمراہ بنود و بر وفق ہمیں قول کہ اختیار کردیم صدوق علیہ الرحمہ کہ المحدثین است حدیثے در کتاب۔ عیون اخبار الرضا در مجلد ثانی ذکر فرمودہ و ارباب مقاتل معتبرہ مانند صدوق در امالی ابن نما در مثیر الاحزان شیخ مفید در ارشاد سید رضی الدین ابن طاؤس در لہوف و مجلسی در بحار و اخوند ملا حسن یزدی در مہیج الاحزان و ابو مخنف و غیر آنہا از مقاتل معتبر ذکر نہ کردہ اند کہ شہربانو یہ در کربلا۔ در میان اسیران بود۔"

میرزا محمد حسن خان اعتماد السلطنت خیرات حسان میں لکھتے ہیں۔

"مادر حضرت شہربانو چنانکہ در اخبار معتبرہ رسیدہ است بحال نفاس در گذشت"

اور پرنس فرہاد مرزا قمقام ذخار میں تحریر کرتے ہیں۔

"آنچہ از کتب معتبرہ و روایات محدثین شیعہ بہ نظر رسیدہ شہربانو در نفاس وفات یافت و کفالت و حضانت امام سجاد را یکے از امہات اولاد حضرت

سید الشہدا علیہ السلام ہمی نمود"

اور اس کی سند میں حدیث عیون اخبار الرضا ارقام کی ہے۔

سپہر کاشانی ناسخ التواریخ میں لکھتے ہیں:۔

"چہ شہر بانو در ہنگام ولادت علی ابن الحسین وداع جہان گفت و در سفر کربلا۔ ملازمتِ خدمتِ سید الشہدا را نداشت۔"

مولانا سید حبیب حیدر صاحب کا ارشاد ہے۔

"جن روایتوں سے جناب شہر بانو کا واقعہ کربلا میں تشریف رکھنا معلوم ہوتا ہے وہ زیادہ اعتماد کے لائق نہیں ہیں اور مجہول الاسانید ہیں اور ان معظمہ کا حضرت امام زین العابدینؑ کی ولادت کے ساتھ وفات پانا اقوی اور اظہر ہے۔"

مولانا سید ناصر حسین صاحب ایک استفتاء کے جواب میں تحریر فرماتے ہیں۔

"کتاب العیون اخبار الرضا سے واضح ہوتا ہے کہ حضرت شہر بانو والدہ ماجدہ امام زین العابدین نے قریب ولادت سید سجاد انتقال فرمایا"

خود فاضل دربندی جنہوں نے شہر بانو کے رے کی طرف جانے کا طومار باندھا ہے۔

اکسیر العبادت میں لکھتے ہیں۔

فلابد ان یکون ھذہ المرأۃ غیر شاہ زنان التی ھی بنت الملک یزدجرد ام الامام سید الساجدین فان ام الامام قد ماتت فی النفاس فی ولادۃ الامام۔

ضرور ہے کہ یہ معظمہ حضرت شاہ زنان دختر بادشاہ یزدجرد والدۂ امام سید الساجدین کے علاوہ ہیں کیونکہ امام سجاد کی والدہ حضرت کی ولادت کے وقت وفات پا چکی تھیں۔

اسی طرح اور بہت سے علما اور مورخین کے اقوال ہیں جن کو بخیال طوالت چھوڑا جاتا ہے۔

امر دوم :- اگر اس روایت کو تسلیم کر لیا جائے تو اس سے شہربانو کی نسبت کئی شبہات وارد ہوتے ہیں

(ا) انہوں نے ایسی قیامت خیز مصیبت کے وقت رسول اللہ کی نواسیوں اور خاتون محشر کی بیٹیوں اور بہوؤں کا ساتھ چھوڑ کر ایک بڑی اخلاقی کمزوری کا اظہار کیا۔

(ب) انہوں نے اپنی عزت کو دختران سیدۃ النساء العالمین کی عزت پر مقدم سمجھا

(ج) خاتون بنی ہی اولاد کے لئے کیونکر ایسی دردناک مصیبت میں چھوڑ کر مادری شفقت اور فطری ہمدردی کو خیرباد کہہ دیا۔

آپ کی ذات گرامی سے کبھی یہ امید نہیں کی جا سکتی کہ اپنے تحفظ کی خاطر ایسے فعل کو جو ہمدردی اور روفاداری اور مروت سے خلاف ہے۔ گوارا فرمایا ہو۔

امر سوم :- ہمارے پاس کوئی ایسی تاریخی شہادت نہیں ہے کہ یزدجرد پدر جناب شہربانو کا کوئی بیٹا بنام شہریار موجود تھا۔ بالفرض اگر ہو بھی تو یزدجرد کے کسی بیٹے کا مسلمان ہونا یا کسی حصہ ملک کی سلطنت حاصل کرنا کسی مورخ نے نہیں لکھا۔ متقدمین اور متاخرین کی تمام معتبر و مستند کتابیں دیکھنے سے کہیں اشارتاً و کنایتاً بھی اس کا ذکر نہیں پایا جاتا کہ زوال سلطنت کے بعد شہریار پسر یزدجرد یا کسی دوسرے کسرائی شہزادے کو آج تک پھر سلطنت خواہ کسی چھوٹے سے ملک کی ہی حاصل ہوئی ہو۔ جب شہریار اور اس کی سلطنت یا ریاست کا وجود ہی نہیں تو اس کا لشکر لے کر حضرت کی کمک کو آنا کس قدر لغو اور بے سر و پا ہے۔

مولوی ناصر حسین صاحب بھی ایک سوال کے جواب میں تحریر فرماتے ہیں وہ شہریار کا قصہ قطعاً کتب معتبرہ میں نہیں اور اس کا نقشہ جس طرح روضہ خواں پڑھتے ہیں وہ بالکل غلط اور سراسر خلاف واقعات مسلمہ مورخین فریقین ہے۔ ایک یہ امر بھی قابل غور و لحاظ ہے کہ نبی یا امام کے مامور من اللہ ہونے کے وقت اس کے والدین

بعقید حیات نہوں ورنہ ان پر بھی بیٹے کی اطاعت فرض ہوجائے گی۔ اس کلیہ یا عقیدہ کے موافق یہ بھی پر علماء امامیہ کا اتفاق ہے جناب سیدالشہداء کی رحلت کے وقت جناب شہربانو کا زندہ ہونا تسلیم نہیں کیا جاسکتا کیونکہ سیدالساجدین اسی وقت امام مفترض الطاعت منجانب اللہ ہوگئے تھے۔

امر چہارم کی نسبت صاف ظاہر ہے کہ علماء و مورخین کی تمام مستند کتابیں اس سے خالی ہیں کہ حضرت نے شہربانو سے ایسا فرمایا ہو کہ تم گھوڑے پر سوار ہوکر چلی جانا گھوڑا تم کو وہاں پہنچا دے گا جہاں خدا کا حکم ہوگا۔ فاضل دربندی کا اکسیر العبادت میں یہ لکھنا کہ:-

وفی بعض کتب التواریخ المعتبرۃ ان شہربانویہ التی کانت فی کربلا ھی ام زوجۃ القاسم وقد اوحی بہا سیّدالشہداء اوحی لہا الفدا بان ترکب جوادہ بعد الشہادۃ فھو یوصلہا الی الارض المقدرۃ لہا۔

بعض کتب تواریخ معتبرہ میں بیان ہوا ہے کہ شہربانو جو کربلا میں موجود تھیں وہ زوجۂ قاسم کی والدہ تھیں اور جناب سیدالشہداء نے ان کو وصیت کی تھی کہ میری شہادت کے بعد گھوڑے پر سوار ہوجانا وہ تم کو اس زمین پر پہنچا دے گا جہاں کے لئے حکم خدا ہوگا۔

ہرگز قابل اعتنا نہیں فاضل موصوف نے فی کتاب ملتواریخ معتبرہ تو لکھ دیا لیکن کسی کتاب یا سند کا حوالہ تحریر کرنے کی تکلیف گوارا نہ کی جب ان کے خیال میں تحفۃ الشہداء اور بحرالانساب جیسی کتابیں تاریخ کی کتب معتبر میں شمار کرنے کے قابل ہیں تو وہ واقعات صحیح اور غیر صحیح میں کیا امتیاز کرسکتے ہیں۔ یہ واقعہ انہوں نے بحرالانساب سے نقل کیا ہے اور یہ کتاب مہملات ولغویات سے جیسی بھری ہوئی ہے محتاج تشریح نہیں۔ پھر ایسی حالت میں اس قصہ کے مہمل اور لغو ہونے میں کیا کلام ہوسکتا ہے۔

اِس کے علاوہ شہربانو کے ساتھ اِس حکم کی کوئی خصوصیت بھی نہیں پائی جاتی حضرت نے اپنی دوسری ازواج لیلےٰ، رباب اور ام اسحٰق کو ایسا حکم کیوں نہیں دیا بالخصوص رباب کو جن سے آپ سب سے زیادہ مانوس تھے۔ کہا جاتا ہے کہ شہربانو نے اپنی دوسری اسیری کی ذلت کا خوف ظاہر کیا تھا مگر جب حضرت کو معلوم تھا کہ میرے بعد سب اہل بیت کا یہی حال ہونے والا ہے اور خود آپ کی بہنیں جو دین و دنیا کی شہزادیاں اور آپ کی ازواج سے عظمت و منزلت میں زیادہ ہیں اسی بلا میں گرفتار ہونے والی ہیں تو فقط شہربانو کی اسیری کا ایسا خیال و پاس کوئی وجہ نہیں رکھتا تھا اس کے علاوہ حضرت ان کو گھوڑے پر سوار ہونے کی کیونکر اجازت دیتے، درحالیکہ شرع محمدی میں عورتوں کو گھوڑے کی سواری سے منع کیا گیا ہے۔

امر پنجم: آقائے دربندی نے اپنی عادت کے موافق یہ بھی اک قیاسی تجویز کی ہے کہ زبیدہ کی والدہ اور سید سجاد کی مادر گرامی قدر دونوں حقیقی بہنیں تھیں اور حضرت سید الشہدا نے بعد وفاتِ والدِ سید سجاد ان کی خواہر سے عقد کر لیا تھا اور یہی معظمہ حسب وصیتِ سید الشہدا گھوڑے پر سوار ہو کر گئیں تھیں۔ چنانچہ آپ کتاب جواہر الانفال میں ارشاد فرماتے ہیں۔

"مخفی نماند کہ ایں مخدرۂ مظلومہ وسیدۂ طاہرہ طیبہ یعنے شہربانو دختر بادشاہ یزدجرد زوجہ سید الشہدا روحی لہ الفدا و مادر زبیدہ عروس قاسم غیر شاہ زناں دختر یزدجرد و مادر سید الساجدین است زیرا کہ مادر آں خلیفۃ اللہ در ایام نفاس برحمتِ خدا پیوست و ایں شہربانو بہ خالۂ آنحضرت خلیفۃ اللہ بودہ است و ایں را جناب سید الشہدا در حبالہ عقد در آورد۔ درحالیکہ بیوہ بود"

گویا فاضل دربندی اس کو تو تسلیم کرتے ہیں کہ والدہ سید الساجدین آپ کی ولادت کے

وقت رحلت فرما چکی تھیں اوران کا نام شاہزنان تھا لیکن اس کے ساتھ یہ بھی تحریر کرتے ہیں کہ شہربانو جو کربلا سے رے کی طرف گئیں وہ شاہزنان کی بہن اور حضرت سید السجاد کی خالہ تھیں اوران کا نام شہربانو تھا مگر یہ بھی فاضل مذکور کا ایک ذاتی اجتہاد اور قیاسی فیصلہ ہے جوانہوں نے بحرالانساب کی نقل پر کیا ہے حالانکہ متقدمین اور متاخرین کی کتابیں اس ذکر سے خالی ہیں اگرچہ بعض روایات میں یزدجرد کی دو بیٹیوں اور بعض میں تین بیٹیوں کا وارد مدینہ ہونا بیان کیا گیا ہے لیکن ایک سے زیادہ کا داخل زوجیتِ سیدالشہداء ہونا کسی روایت میں نہیں پایا جاتا۔ تو محض قیاسی اور احتمالی بیان اثباتِ واقعہ کے لئے کافی نہیں ہوسکتا اور یہ لغو و بیہودہ خیال ہرگز قابل تسلیم نہیں۔ بلکہ جمہور کے خلاف ناموں کا الٹ پھیر بھی فاضلِ موصوف کی جدت طرازی یا صاحب بحرالانساب کی قوتِ اختراعی کا نتیجہ ہے۔

اس سے بھی بڑھ کر وہ روایت ہے جس کو علامہ ابن شہرآشوب نے تحریر کیا ہے آپ کتاب مناقب میں تحریر فرماتے ہیں:۔ وَحاذ بالحرہ اسارى الا شهرسانویہ فانہا التقفت نفسہا فی الفرات جس سے پایا جاتا ہے کہ جناب شہربانو دریائے فرات میں ڈوب کر مرگئیں۔ ہم حیران ہیں کہ ابن شہرآشوب جیسے بزرگوار نے ایسی روایت کو اپنی کتاب میں کس طرح جگہ دی اور کیا ایسا ممکن تھا کہ زوجہ امام اور مادر امام خودکشی کے فعل کی جو شرعاً حرام ہے مرتکب ہوتیں۔ تعذیر خودکشی کی تصریح قانون الٰہی (قرآن) میں ان الفاظ کے ساتھ کی گئی ہے۔

لَا تَقْتُلُوا أَنْفُسَكُمْ إِنَّ اللّٰهَ كَانَ بِكُمْ رَحِيمًا وَمَنْ يَفْعَلْ ذٰلِكَ عُدْوَانًا وَظُلْمًا فَسَوْفَ نُصْلِيهِ الخ	اپنے نفسوں کو خود قتل نہ کرو (یعنی خودکشی نہ کرو) کیونکہ خدا ضرور تمہارے حال پر مہربان ہے اور جو شخص ایسا جور

وظلم اخود کشی کریگا۔ یاد رہے کہ ہم بہت جلد اس کو آگ میں جھونک دیں گے اور یہ بات اللہ کے لئے آسان ہے (پارہ ۵ سورۃ النساء آیہ ۲۹۔

وہ گھر جو مہبط قرآن سرچشمۂ علم اور منبع ہدایت تھا اور اس کا ہر فرد۔ مرد و عورت بوڑھا بچہ احکام قرآنی سے باخبر اور یکساں عامل تھا کیا ایسے گھر کی ایک ممتاز خاتون کو جو امام کی بہو۔ امام کی بھاوج۔ امام کی بی بی اور امام کی ماں تھی اس تہدید الٰہی کی خبر نہ تھی کہ خودکشی کرنے والے کا ٹھکانہ جہنم ہے۔

اس کے علاوہ یہ روایت سوائے ابن شہر آشوب کے کسی نے نہیں لکھی صاحب مقام الذخار اس روایت پر بحث کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ "منافی با جمیع روایات فریقین است"۔

(۱۹) تاراجی خیام۔ تاراجی لباس، پامالی نعش

(۱۹) خیام اہل بیت کا مع چادرہائے مخدرات عصمت تاراج کیا جانا۔ حضرت کے جسد مطہر سے لباس کا اتارنا اور آپ کی نعش مقدس کا پامال سُم اسپاں ہونا ایسے مشہور واقعات ہیں کہ ان سے انکار کرنا مشکل ہے اور عموماً متقدمین اور متاخرین کی کتابیں ان اذکار سے بھری ہوئی ہیں۔ مخالفوں کی شقاوت اور قساوت اور بے غیرتی و بے حیتی کو دیکھتے ہوئے اس قسم کی کمینہ اور شرمناک حرکات کچھ تعجب خیز نہیں، درحقیقت ان دشمنان شرافت و انسانیت نے جن کو شریف سمجھنا۔ شرافت کی توہین ہے اور انسان کہنا انبیاء نوع کی تحقیر ہے اپنی وحشیانہ سفاہت اور ابلیسانہ شرارت میں کوئی کمی نہیں کی ان کے دل پتھر سے زیادہ سخت اور ان کے بہیمانہ جذبات درندوں سے زیادہ خطرناک تھے۔ انہوں نے ایک حاکم کی خوشامد میں اپنی ملکی خصوصیت اور قومی حمیت کو خیرباد

کہ گراں ہولناک مظالم کا ارتکاب کیا جن کی مثال پیش کرنے سے تمام قوم کی تاریخیں معذور ہیں۔ دنیا کے تمام ظالموں اور سفاکوں کی بے رحمیاں ان کے سامنے گرد ہیں ایسے شیطان سیرت اور ناپاک سرشت انسانوں سے اس طرح کی قابل نفرت حرکات کچھ بھی بعید نہیں نہ ان پر حیرت و استعجاب کی کوئی وجہ معلوم ہوتی ہے۔

اگرچہ یہ واقعات جن کی روایتیں حد تواتر تک پہونچی ہوئی ہیں درایتاً کسی تنقید کی گنجائش نہیں رکھتے لیکن شاید ہمارا یہ قیاس بے معنے نہ ہو کہ ایک ایسی سرکار کی لوٹ جہاں امیرانہ جاہ وجلال تو درکنار، فقیرانہ ساز و سامان کی بھی یقیناً کمی تھی۔ اور جو ضروریات زندگی سے زیادہ ہونے کے علاوہ بالکل ہی سادہ اور محض معمولی تھا۔ ہزاروں آدمیوں کے جم غفیر کو کیا لالچ دلا سکتی تھی اگر عوام کو چھوڑ کر خواص کی طرف خیال کیا جائے تو افسران فوج خود رؤسائے قوم اور سرداران قبائل تھے۔ ان کو اس تاراجی سے کیا نفع حاصل ہو سکتا تھا۔ کہا جا سکتا ہے کہ حضرت کے ساتھ وہ خزانہ یا اس کا معتد بہ حصہ مع تحائف و نفائس موجود تھا جو آپ مکہ سے چل کر منزل تنعیم پر یمن سے آتا ہوا لے لیا تھا۔ اور جس کو ابن خلدون اور ابن طاؤس یمن کے بیان عامل یمن کا یزید کی طرف بھیجا ہوا قیمتی زیور پارچہ جات اور سامان لکھتے ہیں چنانچہ آپ نے محمد بن بشیر حضرمی کو ان کے بیٹے کی گرفتاری کے فدیہ میں ہزار روپیہ کے کپڑے دئے تھے۔ اس کے علاوہ یہ بھی خیال ہو سکتا ہے کہ آپ کے ساتھ جس قدر جماعت تھی وہ بھی کئی سو سے کم نہ تھے اگر آپ بالکل خالی تھے۔ تو ان کے مصارف کیونکر پورے ہو سکتے تھے۔ ہم اس کو تسلیم کرنے پر آمادہ ہیں۔ مگر گفتگو صرف اس میں ہے کہ ایک مذہبی پیشوا اور روحانی سردار جو محض ہدایت امت کا بیڑہ اٹھا کر گھر سے نکلا ہے جس کا نصب العین سلطنت و حکومت نہیں اس کے گھر کو۔ درہم و دینار کے توڑوں۔ گراں بہا کپڑوں اور طلائی و نقرئی زیورات سے

کیا علاقہ۔ اور الفقر فخری فرمانے والے کے فرزند کو اس ساز وسامان سے کیا تعلق جس کا تمنائے امتیاز فقر و فاقہ اور ترک دنیا ہو۔ اسے دنیاوی شان سے کیا سروکار۔ مدینہ کا آیا ہوا سامان خواہ وہ نقد روپیہ ہو یا اس کے ساتھ قیمتی تحائف آپ نے اسی وقت تقسیم کر دیا تھا اس میں سے کس قدر آپ کے تصرف میں رہا اس کے متعلق ہمارے پاس کوئی تاریخی شہادت موجود نہیں ہے۔ تاراجی خیام کے وقت جو واقعات بیان کئے گئے ہیں ان میں بعض روایتیں ایسی ہیں جن میں مخدرات عصمت کے پاس سونے چاندی کا زیور ہونا پایا جاتا ہے۔ بے شک عورتوں کو ایسے زیور رکھنے کی اسلام نے اجازت دی ہے مگر جب بانیٔ اسلام کی بیٹی نے اس قسم کے تکلفات کبھی نہیں کئے جس کی چادر میں کپڑے کے بدلے لیفِ خرما کے پیوند ہوتے تھے۔ تو کیونکر قیاس میں آسکتا ہے کہ اُسی معظمہ کی بیٹیاں اور بہوئیں دنیوی آرائش کو پسند فرماتی ہوں جب دشمن جانتے تھے کہ حسینؑ کے پاس مال دنیا اور اسبابِ دنیا سے کوئی ایسی شے نہیں جو تاراج کے قابل ہو تو ان کا ایسا ارادہ بے سود امر تھا اور ہم نہیں سمجھ سکتے کہ اس فقیرانہ سامان اور ان فقیرانہ کپڑوں کی لوٹ اور مخدرات عصمت کو بے پردہ کر دینے سے ان کو کیا مالی فائدہ پہونچ سکتا تھا۔ کیا عجب ہے کہ یہ لوٹ صرف مردانے خیموں تک محدود رہی ہو۔ اس سے ہم ملائے کاشفی کی اس تحریر سے۔

"اما بعد از قتل آنحضرت شمر مردود با جمعے مطرود روی بخیمہ امام انس و جان نہادند۔ دہر متاعی کہ دیدند بغارت و تاراج بردہ کردہ عورات نگردیدند"

متفق ہیں جس کی تائید ملائے موصوف کے اس عبارت سے بھی ہوتی ہے۔

"القصہ عمر سعد گفت تا منادی کردند کہ بخیمہ زنان درمیایند و متعرض

ابن حبی ا سید سجاد امشوید۔ و دست از غارت بدار ید و آنچہ بردید باز دہید۔ ایں سخن را کسے التفات نکرد و ہیچ چیز باز ندادند اما دیگر غارت نکردند"

اس طرح جسد مطہر سے لباس اتارے جانے کی بابت ہم کو اس وجہ سے تامل ہے کہ اول تو وہ کوئی قیمتی نہ تھا دوسرے جب ہنہار دوں کے صدہا زخم جسم پر پہونچے تھے۔ تو وہ کپڑے بھی جسم کے ساتھ پارہ پارہ ہو چکے تھے۔ ان کو کوئی لیتا بھی تو کیا کرتا کیونکہ بعض مورخ آپ کے جسم مقدس پر بہتر بعض تیروں کے علاوہ ۳۴ زخم نیزوں کے اور ۳۴ زخم تلواروں کے بعض علاوہ تیروں کے ستر بعض تین سو بیس اور بعض ایک ہزار دوسو، بعض ایک ہزار نوسو اکاون زخم بیان کرتے ہیں جب کپڑے زخموں کے ساتھ اس قدر کٹ چکے تھے تو انہیں قابل پوشش کیونکر سمجھا جا سکتا ہے۔ علامہ مجلسی نے جلاء العیون میں نقلاً عن شیخ مفید مفید دو بند ہی میں تاراجی سامان کی تصریح کی ہے۔

"جامہ ہائے آنحضرت کہ قیمتی داشت مانند جبۂ خز و عمامہ خز۔ غارت کردند"

دوسرے سب کپڑوں کو نہیں لکھا لیکن یہ بھی علامت ان قابل استعمال کب رہے تھے اسلحہ و ہتھیاروں کے متعلق جن لوگوں کے نام لئے گئے وہ صحیح معلوم ہوتے ہیں۔

پامالی لاش حضرت سید الشہدا کی بابت علما مختلف البیان ہیں گو اس واقعہ کو تسلیم کیا جاتا ہے بعض کہ اس میں تامل ہے جیسا کہ علامہ کلینی نے کافی میں اس سے انکار کیا ہے اور علامہ نہبی بحار میں لکھتے ہیں والمعتمد عندی ماسیاتی فی روایۃ الکافی انشاء اللہ تعالیٰ یعنی میرے نزدیک کتاب کافی کی روایت میں معتبر یہ ہے کہ پامالی نہیں ہوئی۔

(۲۰) اہل بیت کا سر برہنہ کیا جانا

(۲۰) مخدرات عصمت کا مکشوف الوجوہ شتران بے کجاوہ و عماری پر سوار کرنا۔ سید الساجدین کو خدمت ساربانی دیا جانا اور شہر بشہر تشہیر۔ ان واقعات کی نسبت بھی اکثر مورخوں نے یہی لکھا ہے لیکن بعض علما اس کے خلاف ہیں چنانچہ علامہ مجلسی جلا ءالعیون میں لکھتے ہیں۔

"پس ام کلثوم دختر دیگر حضرت سیدۃ النسا صدا بگریہ بلند کرد۔ و از ہودج محترم ندا کرد"

پھر آگے مسلم جصاص کی روایت لکھ کر اس کی زبانی تحریر کرتے ہیں۔

"ناگاہ دیدم کہ نزدیک بجبل کجاوہ و محمل پیدا شد۔ گفتند حرم محترم سید الشہدا و فرزندان فاطمہ زہرا دریں محمل ہا یند"

پھر آگے چل کر فرماتے ہیں :-

"زنان اہل کوفہ از مشاہدۂ احوال آں مقربان ذوالجلال می گریستند ام کلثوم چوں صدائے گریۂ ایشاں راشنید از میان محمل صدا زد"

اس کے بعد لکھتے ہیں

"چوں زینب خاتوں رانظر بر سر آں سرور افتاد سر خود را بر چوب محمل زد"

ان ہی واقعات کو اسی طرح ملائے موصوف نے کتاب بحار میں بھی تحریر کیا ہے۔ مرزا سپہر کاشانی ناسخ التواریخ جلد ششم صفحہ ۲۰۶ میں اس واقعہ کو ایک دوسرے پیرایہ سے لکھتے ہیں۔

"دختران پیغمبر را مکشفات الوجوہ بے مقنعہ و خمار بر شتران بے وطاء وہودج سوار کردند و بعضے را در محمل ہا و ہودج ہا بے پردہ و پوشش

جائے دادند"

فاضل دربندی نے اسرار الشہادۃ میں ایک تیسری صورت بیان کی ہے کہ حضرت زینب و اُم کلثوم مکشوفۃ الرؤس والوجوہ نہ تھیں بلکہ کنیزیں خدمت گاریں اور اطفال اس حال میں تھے۔ صاحب طراز مذہب مظفری صفحہ ۱۰۱۳۱ اور ۵۸ ۴ میں میں لکھتے ہیں۔کہ:-

"اگر مکشفات الوجوہ بھیں تو بنات غیر بالغہ اور نسوان غیر معظمہ یعنی کنیزیں اور خدمت گاریں"

بہرحال ان مقامات سے اتنا ضرور پایا جاتا ہے کہ اہل حرم شتران بے کجاوہ و عماری پر سوار نہ تھے بلکہ یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ محملوں کے اندر پردوں میں تھے۔ چنانچہ ملا کاشفی بحوالہ ابو حنیفہ دینوری صاف لکھتے ہیں کہ:-

"صباح روز سوم خواتین اہل بیت را فرمود۔ تا جامہ ہا پوشیدہ در دہا بر لبستہ بر شتراں سوار شوند"

پھر آگے چل کر لکھا ہے کہ

"ابو الفوائد آوردہ کہ اہل کوفہ در حوالی محامل اہل بیت غلو کردہ می گریستند حضرت زینب علیہا السلام از درون ہودج خود آواز داد"

کوفہ جناب امیر کا دار السلطنت رہ چکا تھا باوجود کوفیوں کی اس قدر بے وفائی اور غداری کے اب بھی وہاں ہزاروں ہوا خواہان اہل بیت موجود تھے۔ جو خوف جان و مال و آبرو سے کسی قسم کی جنبش نہ کر سکے۔ مگر ایک ایسی کارروائی جو خاندان رسالت کی توہین اور تذلیل کو انتہائی حد تک پہنچانے والی تھی۔ ضرور ان کے لئے اشتعال انگیز اور ہنگامہ عظیم پیدا کرنے والی تھی اور کوئی مدبر اور سیاست داں ایسی فاش اور خطرناک غلطی کا جو عام جذبات کو ہیجان میں لانے والی ہو ارتکاب نہیں

کرسکتا اس لئے ملائے کاشفی کا یہ لکھنا کہ "نساء و جواری امام حسین علیہ السلام او رخلعت نشاندہ می بودند و آنکہ در بعضے کتب نوشتہ اند کہ سر برہنہ بر شتران بے جہاز نشاندہ بردند قولِ ضعیف است و بصحت نرسیدہ بلکہ بر ہر دو جہ کہ بردندآں نیز نسبت با اہلبیت اہانت بود چہ ایشاں پردگیان حرم عصمت و ستر داران حریم عفت بودند، آفتاب جہاں تاب بر فرقِ مبارک ایشاں سایہ نیند اختہ بود و باد عالم گرد گرد حجرہ پاکیزہ ایشاں ما ختہ۔ راستی و صداقت پر مبنی معلوم ہوتا ہے اور ہم بھی اس سے اتفاق کرتے ہیں کیونکہ خاندان نبوت کی عورتوں اور خاتونِ محشر کی بیٹیوں کو جو دین و دنیا کی شہزادیاں تھیں قیدیوں کی طرح ماخوذ کرکے کوفہ اور دمشق تک لے جانا اور بھرے درباروں میں ان کی رُوبکاری کیا تھوڑی ذلت اور اہانت ہے۔

اِس واقعہ کی بابت جو واہمہ بیان کئے جاتے ہیں ان کا قول ہے کہ اہل حرم کے ساتھ دشمنوں نے دُرّوں اور تازیانوں سے بے ادبی کی، دوسرے حضرت سیدنا سجاد زین العابدین کو باوجود علالت اس گلے ہوئے قافلہ کے اونٹوں کا ساربان بنایا۔ اور آپ کربلا سے کوفہ اور کوفہ سے دمشق تک پا پیادہ گئے لیکن یہ دونوں واقعات سراسر بے اصل و بے بنیاد ہیں جن کا تاریخی کتابوں میں کہیں تذکرہ نہیں پایا جاتا۔

رہی تشہیر بیشک اہل بیتِ اطہار کو قیدیوں کی طرح نامحرموں کی حراست میں کوفہ سے دمشق تک متعدد شہروں اور قریوں میں ہوکر جانا پڑا لیکن وہ اثنائِ راہ کے مقامات تھے فاتحانہ تشہیر کوئی سہل کام نہ تھا۔ ملک کے حصۂ اعظم میں شورش ہو جاتی جیسا کہ بعض مقامات کے باشندے بمقابلہ پیش آئے اور اس دستہ فوج کو جوان اسیروں کے ساتھ تھا بھاگنا پڑا۔ بہر حال یہ باتیں مبالغہ آمیز اور ناقابل اعتبار ہیں۔

(۲۶) قصہ اُمّ حبیبہ خادمہ جناب سیدہ علیہا السلام

اکثر روضہ خوانوں کی زبانی ام حبیبہ کی روایت بہ کثرت بنی جاتی ہے صورت اس کی یہ بیان کرتے ہیں کہ زنان قریش نے ایک موقعہ پر ام حبیبہ کو جناب سیدہ کی خدمت مبارک میں ہدیۃً بطور کنیز پیش کیا تھا بعد ازاں اس کا عقد ایک شخص باشندہ کوفہ سے کر دیا گیا۔ بعد واقعہ شہادت داخلہ کوفہ کے وقت اہل حرم کے اونٹ اتفاق سے ام حبیبہ کے مکان کے نیچے ہو کر نکلے۔ وہ بھی دوسری تماشائی عورتوں کی طرح کوٹھے پر موجود تھیں اس وقت جناب سکینہ بہت پیاسی تھیں۔ ام حبیبہ کو رحم آیا۔ پانی حاضر کیا اور دعا کے لئے ملتجی ہوئی۔ آخر میں جناب زینب نے اُمّ حبیبہ کو اور اس نے اپنی مخدومہ کو پہچان لیا۔ اور وہ غش کھا کر کوٹھے سے گری اور انتقال کر گئی۔ لیکن اس کے متعلق نہ کوئی تاریخی شہادت ہے نہ کوئی معتبر سند جن معمولی اور غیر مستند کتابوں میں اس کی موضوع اور بے سرو پا روایتیں بھری ہوئی ہے مثلاً بحور الغمہ اور بحر المصائب وغیرہ اُن میں ہم اس روایت کو بھی بکثرت پاتے ہیں۔ جو تاریخی حیثیت سے کوئی وقعت نہیں رکھتے۔ علامہ مجلسی نے جلاء العیون میں اتنا ضرور ذکر کیا ہے

"چوں اہل بیت رسالت نزدیک کوفہ رسیدند۔ بیشتر مردمان اہل کوفہ بنظارہ بیروں آمدند پس زنے از زنان اہل کوفہ پرسید کہ شما از کدام اسیرانید گفتند مائیم اسیران آل محمد آں زن چوں ایشاں راشناخت بسرعت از بام خانہ بزیر آمد و آنچہ در خانہ داشت از چادر و مقنعہ برائے ایشاں آورد کہ خود را بایشاں پوشاند"

لیکن نہ تو اس عورت کا نام ہے نہ اس قصہ کو اس قدر طوالت دی ہے۔ جیسا کہ

ذاکرین بیان کرتے ہیں یہ قافلہ جو بازار میں ہوتا ہوا دارالامارۃ کی طرف جا رہا تھا۔ اور لے جانے والے اپنی کارگزاری اور خوشامد کے اظہار میں حتی الوسع جلد پہنچانے کی کوشش و فکر میں تھے۔ اس کا قدم قدم پر اس طرح ٹھہرایا جانا۔ قیاس میں نہیں آسکتا۔ اور یہ روایت یقیناً موضوع و بے اصل ہے۔

(۲۲) قصۂ جناب شیریں کنیز جناب شہربانو

روضۃ الشہدا نے شیریں کا واقعہ اس طرح بیان کیا ہے کہ جب جناب شہربانو حضرت سیدالشہدا کے عقد میں آئیں تو ان کے ساتھ ایک سو عجمی کنیزیں تھیں عقد کے دوسرے روز انہوں نے پچاس کنیزوں کو آزاد کرا دیا۔ ۴۰ کو اس وقت حکم آزادی سنایا جب سیدالساجدین پیدا ہوئے۔ دس باقی رہیں۔ ایک روز حضرت کی زبان سے شیریں کے حسن کی تعریف سن کر اس کو ہدیتاً خدمت میں حاضر کیا آپ نے شہربانو کے خیال کو سمجھ کر اسی وقت راہ خدا میں آزاد فرما دیا۔ تاہم شیریں نے خاندانِ رسالت کا ساتھ نہ چھوڑا۔ یہاں تک کہ بعد واقعۂ کربلا دمشق کے راستہ میں متصل حلب ایک پہاڑ کے نیچے فوج کے محافظ دستہ کا پڑاؤ ہوا اس پہاڑ پر ایک قافلہ تھا جس میں یہودی آباد تھے۔ اور عزیز بن ہارون اُن کا سردار تھا۔ وہاں کے بُنے ہوئے ریشمی کپڑے دور دور مشہور تھے۔ شیریں جناب شہربانو کے لئے کپڑا خریدنے گئیں۔ عزیز ایک خواب دیکھ کر منتظر تھا۔ وہ بڑے اخلاق سے پیش آیا۔ اور صبح سیدالساجدین کی خدمت میں حاضر ہوا۔ اور دینِ اسلام قبول کیا آپ نے شیریں کا عقد اس کے ساتھ کر دیا۔ بعض اس واقعہ کو اس طرح بیان کرتے ہیں کہ حضرت نے مدینہ ہی میں شیریں کا عقد ایک شخص سے کر دیا تھا۔ اور وعدہ فرمایا تھا کہ ہم تیرے گھر آ کر مہمان ہوں گے اب اثنائے راہ میں وہ قلعہ آیا

جس میں شیریں کا مکان تھا اس کو خبر لگی اور وہ حاضر ہوئی تو یہ ہولناک منظر دیکھا۔
لیکن اس روایت کے دونوں پہلو روایتاً اور درایتاً کمزور ہیں اور سراسر لغو اور باطل ہیں اول تو اس کی کوئی معتبر سند نہیں اور اسی وجہ سے مورخین علماء نے اس جعلی اور فرضی قصہ کو اپنی کتابوں میں جگہ دینے کے قابل نہ سمجھا۔ دوسرے حضرت شہربانو اس وقت زندہ ہی نہ تھیں۔ مولانا سید ناصر حسین صاحب قبلہ کا ارشاد ہے کہ:-

شیریں کنیز جناب شہربانو کا حال مطلقاً کتب معتبرہ میں نہیں ہے اور اور یہ قصہ جس طرح مراثی ہند میں نظم ہے وہ بالکل غیر معتبر ہے۔ اور صاحب روضۃ الشہداء نے جس طرح اس کو لکھا ہے وہ بھی معتبر نہیں ہے (ہدایات ناصریہ صفحہ ۶)

(۲۳) زندان شام سکینہ کا حبس میں وفات پانا۔ واقعہ کربلا کے وقت آپ کی عمر

اہل بیت رسالت کون سی تاریخ کو دمشق پہنچے۔ کب تک وہاں رہے اور کس تاریخ کو دارالسلطنت سے روانہ مدینہ ہوئے۔ افسوس ہے کہ تمام تاریخیں ان تاریخوں کے تعین میں خاموش ہیں اور ہمکو کوئی روایت قابل اطمینان ایسی نہیں ملی جس پر حتمی فیصلہ کیا جا سکے۔ صاحب روضۃ الشہدا اور صاحب مہیج الاحزان کا قول ہے کہ جب اہل بیت کی روبکاری یزید کے سامنے ہوئی اور اس کو تمام واقعات معلوم ہوئے تو وہ ایسا متاثر ہوا کہ اسی وقت رہائی کا حکم ... سے کربا عزاز واکرام پیش آیا۔

ملائے مجلسی سید ابن طاؤس اور ابن بابویہ وغیرہ کا ارشاد ہے کہ اہل حرم ایک ایسے مکان میں ایک ماہ تک قید رہے جہاں سردی اور گرمی سے کوئی بچاؤ نہ

تھا۔ محمد بن جریر طبری اپنی تاریخ میں لکھتے ہیں کہ یزید نے ان کو دس روز تک اپنے مکان میں ٹھہرایا بعد ازاں ان کو مدینہ جانے کی اجازت دیدی۔

بعض کہتے ہیں کہ ۶ مہینہ اور بعض کا خیال ہے کہ سال بھر تک اہل بیت قید خانہ میں رہے (عام طور پر جیسا کہ ذاکرین اور مرثیہ خوان بیان کرتے ہیں) یہ مشہور ہے کہ یزید نے اہل بیت رسالت کو ایسے محبس میں قید کیا تھا۔ جہاں نہ سایہ تھا۔ اور نہ روشنی اور صرف یہی نہیں بلکہ وہ مکان نہایت تنگ و تیرہ و تاریک شکستہ اور قریب بہ انہدام تھا گو ہم کوئی نص قطعی موجود نہ ہونے سے حتمی رائے نہیں دیتے تاہم جہاں تک قرائن سے کام لیا جاتا ہے ان سے یہی ظاہر ہے کہ اہل بیت کا قیام زیادہ عرصہ تک دمشق میں نہیں رہا۔ ممکن ہے کہ اہل بیت اطہار چند روز کسی معمولی مکان میں نظر بند رہے ہوں بعد ازاں یزید کے خیالات میں تغیر پیدا ہو کر بالارادہ یا مصلحتاً۔ شاہی محل کے کسی حصہ میں ٹھہرایا گیا ہو۔ لیکن جس طرح ہم اس روایت کو تسلیم کرنے پر آمادہ نہیں کہ یزید روز اول سے ہی باعزاز و مدارات پیش آیا ویسی ہی اس روایت کو بھی قبول نہیں کرتے کہ اہل بیت کو ایک شکستہ خرابہ میں مہینوں تک مقید رہنا پڑا۔ اس میں شک نہیں کہ دربار یزید میں اہل بیت کے ورود کی کیفیات کو ارباب مقاتل نے بے ترتیبی سے بیان کیا ہے اس لئے وہ لوگ جن کو کتب اخبار میں تتبع تام نہیں ہے ان تمام واقعات کا وقوع ایک ہی موقعہ پر خیال کرتے ہیں بلکہ یہاں تک گمان کیا جاتا ہے کہ یزید نے روز اول ہی اہل بیت کو رہائی دے کر مجلس عزا برپا کرنے کی اجازت دے دی حالانکہ عقل سلیم ہرگز اس امر کی تصدیق نہیں کرتی۔ کیونکہ پہلے دن یزید سے سوائے خشم و ستیز اور کچھ ظاہر نہیں ہوا۔ اور اس وقت تک وہ لوگوں کے جوش و خروش سے مطمئن تھا۔ مگر جب سب طرف سے لے دے ہوئی تو وہ گھبرایا اور اس کا خیال پلٹا اور تلافی مافات میں کوشاں ہوا لیکن یہ مختلف واقعات

مختلف اوقات میں رونما ہوئی چھ مہینہ یا سال بھر تک منعقد رہتا۔ ضرور داخل مبالغہ ہے اور ہم علامہ مجلسی ابن بابویہ شیخ بہائی اور ان کے ہم خیال حضرات کے اس بیان کو کہ اہل بیت نبوت ایک ماہ تک نظربند رہے اور اس کے بعد سات روز اور قیام فرما کر راہئ مدینہ ہوئے اور سب اقوال پر ترجیح دیتے ہیں۔ اور ہمارے خیال میں اہل بیت اطہار کا چھ مہینہ یا سال بھر تک قید رہنا غیر معتبر اور غلط ہے کیونکہ ہم کو اس کی تائید میں کوئی مستند تاریخی شہادت نہیں ملتی۔

اِس سے بھی زیادہ مشہور مگر سراسر کذب وافتراء وہ روایت ہے جس میں درد انگیز پیرایہ سے بیان کیا جاتا ہے کہ جناب سکینہ نے زندان شام میں رحلت کی حالانکہ تمام مورخین و علمائے انساب کا اتفاق ہے کہ آپ عرصہ دراز تک زندہ رہیں اور واقعہ کربلا سے ۷۰ برس کے بعد ۱۱۷ھ میں وفات پائی۔ آپ کا عقد واقعہ کربلا سے پہلے عبداللہ بن حسن کے ساتھ ہو چکا تھا جیسا کہ ناسخ التواریخ مجلس الابرار۔ ارشاد شیخ مفید۔ بحار الانوار اغانی کشف الغمہ سیر الائمہ عمدۃ المطالب۔ اعلام الوریٰ۔ قمقام ذخار۔ مرآۃ الجنان۔ اسعاف الراغبین وفیات الاعیان تاریخ کامل وغیرہم میں صاف درج ہے۔ ہنوز زفاف واقع نہ ہوا تھا کہ عبداللہ نے کربلا میں درجہ شہادت پر فائز ہوئے اور ان کا دوسرا عقد مصعب ابن زبیر کے ساتھ ہوا۔ بہرحال جناب سکینہ کا دمشق میں وفات پانا ایک ایسا لغو بے بنیاد اور کذب محض افترا ہے جس کی تردید کو فریقین کی تمام معتبر و مستند کتابیں موجود ہیں۔ ہم نے اس پر زیادہ بحث کی ضرورت بھی نہیں البتہ مولانا سید ناصر حسین صاحب مجتہد لکھنوی کا جو ارشاد جو ایک سوال کے جواب میں تحریر فرمایا گیا ہے اور لکھ دینا مناسب ہے۔

"جناب سکینہ کا زندان شام میں انتقال کرنا بالکل غلط ہے۔ اور طرق معتبرہ سے ثابت ہے کہ آپ بعد جناب سید الشہداء علیہ السلام ایک مدت

تک زندہ رہیں۔ البتہ کتاب منتخب فخرالدین بن طعزلی میں ایک روایت ایسی موجود ہے جس سے ظاہر ہوتا ہے۔ کہ امام حسین علیہ السلام کی ایک صاحبزادی نے جن کا سن تین سال کا تھا۔ زندان شام میں انتقال فرمایا اور چونکہ اس روایت میں صاحبزادی کا کوئی نام درج نہیں ہے۔ لہذا بالیقین نہیں کہا جا سکتا کہ ان کا نام کیا تھا۔ لیکن ممکن ہے کہ نام ان کا زینب ہو۔ بنا برایک قول کے جناب سید الشہدا کی تین صاحبزادیاں تھیں ایک فاطمہ دوسری سکینہ تیسری زینب اور چونکہ فاطمہ اور سکینہ کا بعد جناب سید الشہدا ایک مدت تک موجود رہنا ثابت ہے اور انکے بعض حالات طرق ... وارد ہیں۔ اور زینب بنت الحسین کا کوئی حال ثابت نہیں لہذا اقرین قیاس معلوم ہوتا ہے کہ جن صاحبزادی نے زندان شام میں انتقال کیا وہ زینب بنت الحسین ہیں اور کچھ عجب نہیں کہ شام میں جو روضہ حضرت زینب کا مشہور ہے۔ وہ یہی زینب بنت الحسینؑ ہوں۔ نہ حضرت زینب بنت علی علیہ السلام۔ کیونکہ زینب بنت علی کا بعد اسیری شام سے مدینہ کی طرف مراجعت کرنا ثابت ہے اور بار دیگر حسب المطلب یزید شام کی طرف جانا اور وہاں انتقال کرنا جیسا کہ بعض روضہ خوانوں نے بہ عنوانات مختلفہ افترا کیا ہے۔ محض غلط ہے اور بعض علمائے معاصرین اہل عراق نے جو یہ تحریر فرمایا ہے کہ کتاب منتخب میں روایت رقیہ بنت الحسین مذکور ہے۔ اور روضہ ان کا شام میں موجود ہے۔ عند التحقیق اشتباہ در اشتباہ ہے (ہدایات ناصریہ صفحہ ۵۶)

مرثیہ خوانوں اور ذاکرین مصائب جناب سید الشہدا نے عموماً لوگوں کے یہ ذہن نشین کر دیا ہے کہ واقعہ کربلا کے وقت جناب سکینہ تین برس کی ناسمجھ بچہ تھیں لیکن

اگر ذرا بھی غور و تحقیق سے کام لیا جائے تو صاف ظاہر ہو جاتا ہے کہ یہ محض غلط اور افتراء ہے
اس میں شک نہیں کہ حضرت سید الشہداء نے اپنی بیٹی سکینہ کا عقد حضرت عبداللہ بن حسن
سے کر دیا تھا اور ان کا سن اس وقت آٹھ نو برس سے کسی طرح کم نہ تھا کیونکہ ہم اوپر
ثابت کر چکے ہیں کہ فاطمہ بنت الحسین حضرت سکینہ سے بڑی تھیں۔ فاطمہ کی والدہ ام
اسحاق سے جو پہلے حضرت امام حسن کے عقد میں تھیں۔ جناب سید الشہداء نے اپنے بھائی
کی وصیت کے موافق عقد کر لیا تھا۔ حضرت امام حسن کا انتقال ۲۸ صفر ۵۰ھ کو ہوا۔
بعد ایام عدت غالباً آپ نے ماہ شعبان میں عقد کیا ہوگا۔ اگر فاطمہ کی ولادت جلد از جلد
ہوئی ہو۔ تو رجب ۵۱ھ میں ہوئی اور محرم ۶۱ھ میں فاطمہ کی عمر ۹ برس چھ ماہ
کی تھی۔ اگر سکینہ جن کی مادر گرامی قدر رباب تھیں۔ چند مہینے ہی فاطمہ سے چھوٹی ہوں
توان کی عمر اس وقت ۹ برس کی ہونی چاہیئے نہ کہ تین برس کی۔ یہ عمر ایسی تھی کہ
حضرت نے اپنے بھتیجے سے ان کا عقد کر دیا۔ البتہ اب اپنے شوہر کے گھر نہ جانے پائیں
تھیں کہ عبداللہ درجہ شہادت پر فائز ہوئے۔ بہرحال یہ خیال کہ جناب سکینہ
نے دمشق میں وفات پائی اور ان کی عمر تین سال کی تھی غلط اور سراسر بہتان ہے

(۲۴) ہندہ زوجہ یزید کا سر دربار نکل آنا

یا

زنداں میں ملاقات اہلبیت کیلئے جانا

(۲۴) اہل بیت رسالت کے قیام دمشق کے زمانہ میں ہندہ زوجہ یزید کے
متعلق دو روایتیں بہت مشہور اور قابل لحاظ ہیں۔ ایک یہ کہ اہل حرم جس خرابے
میں تھے وہ شاہی محل سے اس قدر قریب تھا کہ عورتوں اور بچوں کے رونے کی

آواز ہندہ کے کان تک جاتی تھی۔ آخر وہ ایک روز خود مجلس میں آئی۔ دوسرے یہ کہ یزید کے سامنے جب اسیران اہل بیت پیش کئے گئے اور ان کا جائزہ لے رہا تھا۔ ہندہ یہ کیفیت دیکھ کر بے تحاشا محل سے نکل آئی اور بے پردہ دربار عام میں آگئی۔ ان دونوں روایتوں کو مرثیہ گو شعرا نے مختلف عنوانات سے بڑے آب و تاب کے ساتھ نظم کیا ہے۔ اور روضہ خواں بھی اس کو گوناگوں رنگ آمیزی سے بیان کیا کرتے ہیں۔ صاحب ناسخ التواریخ نے ایک تیسری صورت بیان کی ہے۔ کہ ایک روز یزید نے حضرت کے سر مبارک کو اپنے محل کے دروازہ پر آویزاں کرنے کا حکم دیا اور ساتھ میں یہ بھی کہ مخدرات عصمت کو شاہی محل سرا میں بلا یا جائے۔ جب رسولِ خدا کی نواسیاں اور دوسری معظمات محل میں داخل ہوئیں یزید کی بی بیوں اور آل ابوسفیان کی دوسری عورتوں نے ان کی ایسی افسوسناک حالت دیکھ کر اپنے مکلف لباس اور زیور اُتار کر پھینک دئے اور بآواز بلند گریہ و زاری میں مشغول ہوئیں اور تین روز تک اہل بیت کے ساتھ عزاداری کا سلسلہ جاری کیا۔ ہندہ دختر عبداللہ بن عامر جو یزید کی منکوحہ تھی اور اس سے پہلے سید الشہدا کے شرف زوجیت سے مشرف رہ چکی تھی۔ اہل بیت کا یہ حال تباہ دیکھ کر

"از خود بیگانہ شد، و بے ہوشانہ از سرائے خویش بیرون دوید۔ و بے پردہ بمجلس یزید کہ خاص بمعارف و صنادید بود رفت و گفت۔ آیا ایں سر پسر فاطمہ دختر رسول خدا است کہ در آستانۂ سرائے من آویختہ۔ یزید چوں ایں بدید نا پرداسوئے اُو دوید و او را بزیر پوشش جامہ خود محفوظ داشت و گفت اے ہندہ چندکہ خواہی بر پسر دختر پیغمبر کہ خاص خالص قریش است بنال و بانگِ نالہ و عویل برآر۔ ابن زیادہ ملعون عجلت کرد او را کشت خدا اُش بکشد"

ملائے مجلسی بھی جلاء العیون میں اسی مطلب کو تحریر کرتے ہیں۔

ہند دختر عبداللہ بن عامر کہ دراں وقت زنِ یزید بود و پیشتر در حبالۂ حضرت امام حسین علیہ السلام بود۔ پردہ را دریدہ از خانہ بیروں دوید۔ و بمجلس آں ملعون آمد در وقتیکہ مجمع حاضر بود۔ گفت اے یزید سر مبارک فرزند حضرت فاطمہ زہرا دختر رسولخدا بر در خانہ من نصب کردہ۔ یزید برجست و جامہ بر سرِ او افگند و او را باز گردانید و گفت اے ہند زاری و نوحہ کن بر فرزند رسولخدا و بزرگ ترین قریش۔ پسر زیاد در امر او تعجیل کرد و من راضی بہ کشتن او نبودم۔ پس اہل بیت را در خانہ خود جا داد و بر چاشت و شام حضرت امام زین العابدین علیہ السلام را بر سرخوان خود می طلبید۔"

یہی امر آخوند موصوف نے بحار میں ادا کیا ہے۔

ابن اثیر کا بیان ہے کہ ہندہ نے سرِ دربار یزید کو لعنت و ملامت کی۔ اور پھر روتی ہوئی باہر نکل گئی لیکن ہم تینوں روایتوں کو اس وجہ سے تسلیم کرنے پر آمادہ نہیں کہ ہندہ کا مجلس میں آنا تو کسی معتبر کتاب میں مذکور ہی نہیں۔ رہی یہ روایت کہ ہندہ سرِ دربار بے پردہ نکل آئی۔ درایت کے اصول سے صحیح نہیں ہے عقل سلیم اس کو ہرگز قبول نہیں کر سکتی۔ کہ ایک شہنشاہ کی بی بی اس طرح بے حجابانہ مجمع عام میں نکل آئے۔ یزید اس وقت دنیا کا سب سے بڑا تاجدار اور سب سے وسیع سلطنت کا بادشاہ تھا۔ اسی طرح ہندہ بھی دنیا کی اُن شاہی بیگمات سے جن کو ملکہ آفاق کہلائے جانے کا شرف حاصل تھا۔ سب سے بڑی شہنشاہ بیگم تھی۔ یزید کے محلات بھی غالباً شاہی قاعدے سے بنے ہوئے تھے۔ متعدد ڈیوڑھیات اور ہر ڈیوڑھی پر خواجہ سراؤں اور محافظوں کا انتظام تھا۔ نہ اس طرح جیسے کہ ماہوشا کے مردانہ و زنانہ مکانات بالکل متصل یا

قریب قریب ہوتے ہیں۔ یزید کی تخت نشینی سے پہلے ہی وہ تمام شاہانہ اہتمام جو کسریٰ اور فغفور کے محلات اور ان کے انتظامات کے متعلق تھے۔ قائم ہو چکے تھے۔ پھر کیونکر قیاس میں آسکتا ہے کہ ہندہ باوجود شاہی انتظامات اور پہرہ چوکی کے اس طرح بے تحاشا اور بے پردہ بھرے دربار میں نکل آئی۔ ایسی حرکت جس کو کسی معمولی امیر کی بی بی نہیں کر سکتی۔ دنیا کے شہنشاہِ اعظم کی بی بی کیونکر کر سکتی تھی جن لوگوں نے اس روایت کو لکھا ہے انہوں نے غالباً ان شاہانہ اصولوں پر غور نہیں کیا۔ جس کا ہر ذی عقل بادنیٰ تامل خود تصفیہ کر سکتا ہے۔ ہمارے خیال میں ایسا ہونا قطعاً ناممکن۔ خلافِ قیاس۔ شاہانہ مراتب کے منافی اور یقیناً دروغ بے فروغ ہے۔ ہاں یہ ممکن ہے کہ ہندہ کو جب اس واقعہ کی اصلیت معلوم ہوئی ہو تو بوجہ اس کے کہ اس کو خاندان رسالت سے ایک خاص تعلق رہ چکا تھا اس نے یزید کو لعن وطعن کی ہو اہل بیت کو محبت سے شاہی محل میں بلوالیا ہو اور اس کے کہنے سننے سے یزید نے اہل بیت کی رہائی کا حکم دیا ہو۔ بہرحال جس طرح ہندہ کے متعلق واقعات مشہور کئے گئے ہیں وہ بوجہ اس کے کہ درایتاً ان کی صحت مشکوک ومشتبہ ہے۔ غلط اور وضعی معلوم ہوتے ہیں اور ناقابل تسلیم اور ناقابل اعتنا ہیں۔

(۲۵) واپسیٔ روز اربعین۔ دفن نعش ہائے شہداء

دفن سر مبارک

(۲۵) اہل حرم دمشق سے کربلا کو واپس آئے یا براہِ راست مدینہ کو روانہ ہوئے۔ ان کا یوم الاربعین کو کربلا میں آنا ہوا یا نہیں۔ چالیسویں روز دمشق سے ان کی واپسی ممکن تھی یا نہیں۔ ان سب امور کی نسبت ہم اپنے موقعہ پر مفصل بحث

بحث کر چکے ہیں اسی طرح لاش ہائے شہدا کی تدفین کا حال بھی لکھا جا چکا ہے۔ اور ہم اس غلط شہرت کا کہ سید الساجدین نے چالیسویں روز دمشق سے واپس آکر نعشہائے شہدا کو جو اس وقت تک بے گور و کفن پڑی ہوئی تھیں۔ سپرد زمین کیا بخوبی ابطال کر چکے ہیں اس لئے اُن کا مکرر اعادہ تحصیل حاصل ہے اب ہم صرف دفن سر مبارک کے لئے جو اختلافات ہیں ان کو دکھلا کر اپنی تحقیق و اجتہاد کا خلاصہ معرض تحریر میں لانا کافی سمجھتے ہیں۔

حضرت سید الشہداء علیہ السلام کے سر مبارک کے متعلق علمائے تاریخ میں بڑا اختلاف ہے اور کچھ پتہ نہیں چلتا کہ دمشق پہنچنے کے بعد کہاں گیا اور کس جگہ مدفون ہوا۔ ایک روایت میں ہے کہ یزید نے اس کی تشہیر کا حکم دیا۔ جب لوگ اس کو پھراتے پھراتے عسقلان میں لے گئے تو وہاں کے امیر نے اسے وہیں دفن کر دیا۔ چنانچہ حوانِ ضلیلی کے قریب مشہدِ حسینی اب تک موجود ہے۔ فتاوائے قرطبی میں لکھا ہے کہ یزید نے سر مبارک مدینہ میں عمر بن سعید بن عاص کے پاس بھجوا دیا۔ اور اس نے بمقام جنت البقیع حضرت سیدہ عالم کے پہلو میں سپرد زمین کر دیا۔ سید علی بن عبد اللہ مدنی خلاصتہ الوفا میں تحریر کرتے ہیں کہ حضرت امام حسن کے مزار کے پاس دفن کیا۔ ابن شہر آشوب ابن نما ابن بکار اور ہمدانی وغیرہم کا بھی یہی قول ہے اور کتاب کافی علامہ محمد ابن یعقوب کلینی سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے کہ حضرت کا فرقِ مقدس مدینہ طیبہ میں ہے۔ کتاب کامل الزیارۃ میں بہ سند یزید بن عمر بن طلحہ حضرت امام جعفر صادقؑ سے منقول ہے کہ آپ کا سر مبارک نجف میں ہم پہلوئے جناب امیر علیہ السلام دفن کیا گیا ہے۔ سید ابن طاؤس نے لہوف میں اور علامہ مجلسی نے تحفۃ الزائر میں اسی قول کو اختیار کیا ہے۔ تہذیب التہذیب اور صواعق محرقہ وغیرہ میں ہے کہ حضرت کا سر مبارک خزانہ یزید میں بھی رہا۔ جب سلیمان بن عبد الملک

یمن مروان تخت پر بیٹھا اور لوگوں نے اس کو سر مبارک کے خزانہ میں ہونے کی خبر دی تو اس نے جستجو کر کے منگایا، دیکھا کہ استخوانِ سر منور مجلا چاندی کی طرح چمک رہے ہیں یہ تھوڑی دیر اپنے پاس رکھا پھر کفن دیکر نہایت عزت و احترام کے ساتھ مسلمانوں کے قبرستان میں دفن کرا دیا۔ مگر جب عباسیوں کا دور دورہ ہوا۔ تو انہوں نے سر مبارک کو وہاں سے نکال کر بجانے کہاں پوشیدہ کر دیا۔ بعض کا قول ہے کہ جس جگہ سلیمان نے دفن کرایا تھا وہاں سے عمر بن عبدالعزیز بن کوان نے نکلوا کر کربلا میں بھجوا دیا۔ تہذیب میں یہ بھی لکھا ہے کہ جب عباسیوں کی فوج نے خزانۂ دمشق کو لوٹا۔ تو کسی سپاہی کو ایک تھیلی نظر پڑی اس نے کوئی گراں بہا چیز سمجھ کر اٹھا لیا۔ جب میدان میں لاکر کھولا تو سر مبارک ایک پارچہ حریر میں لپٹا ہوا نظر آیا۔ اور اس حریر پر لکھا ہوا تھا۔ یہ سر حسین ابن علی ہے (ہذا راس الحسین بن علی) اس سپاہی نے وہیں تلوار کی نوک سے زمین کو کھود کر دفن کر دیا۔ ابن جوزی اور بعض مورخ اس پر متفق ہیں کہ جب منصور بن جمہور نے خزانہ بنی امیہ پر قبضہ کیا تو اسے آپ کا سر مطہر ایک مقفل صندوق میں ملا اور یہ معلوم ہو جانے پر کہ فرزند رسول اللہ کا سر مقدس ہے اس نے متصل باب الفرادیس دمشق تیسرے برج سے جانب شرق دفن کرا دیا۔

عبوس منصوری نے زبدۃ الفکر میں تحریر کیا ہے کہ زمانہ بنی عباس میں سر مبارک کو دمشق سے عسقلان لے گئے عرصۂ دراز تک عسقلان میں دفن رہا۔ جب صلیبی لڑائیوں کے زمانہ میں اس شہر پر نصاریٰ کا غلبہ ہوا تو لوگوں نے وہاں سے اٹھا کر قاہرہ دارالسلطنت مصر میں پہنچا دیا۔ علامہ مقریزی خطط میں لکھتے ہیں کہ ۸ جمادی الاول ۵۴۸ھ ہجری ہوئی روز یکشنبہ کو سر مطہر قاہرہ میں لائے۔ اس وقت اس سے تازہ خون ٹپک رہا تھا اور مشک جیسی خوشبو آتی تھی۔ وہاں اب تک ایک

مسجد اسی نام سے مشہور رہی جو نہایت مکلف سامانوں سے آراستہ رہتی ہے۔ اور لوگ بکثرت زیارت کو آتے رہتے ہیں۔ صوفیائے کرام اپنے مکاشفہ سے اس کی تائید کرتے ہیں۔

دمشق سے عسقلان لے جانے کی وجہ یہ بیان کی جاتی ہے۔ کہ دمشق دشمنان خاندان رسالت کا مرکز تھا اور اندیشہ تھا کہ کسی وقت یہ لوگ بے ادبی نہ کریں اس لئے اس کو عسقلان منتقل کر دیا تھا۔ ۵۴۸ھ ۱۱۵۴ء میں جب کہ عاضد لدین اللہ آخری فاطمی خلیفہ مصر کا زمانہ تھا اس کے وزیر اعظم ملک صالح طلائع بن زریک نے جبکہ اس کو یہ پرچہ گذرا کہ صلیبی فوجیں عسقلان کی طرف بڑھی چلی جا رہی ہیں اس اندیشہ سے کہ مبادی النصاریٰ سر مطہر کو قبضہ کر کے دہ امیر الجیوش بدر الجمالی واقع عسقلان سے نکال لیں یا مرتکب بے ادبی ہوں مصر میں منتقل کرنا چاہا اور ایک مسجد کی تعمیر کا حکم دیا۔ جو بعد ازاں جامع صالح کے نام سے مشہور رہی مقصد یہ تھا کہ اس مسجد کے ایک خاص حصہ میں سر مقدس کو عسقلان سے لاکر دفن کر دیا جائے۔ ۸ جمادی الاول ۵۴۸ھ کو سر مقدس قاہرہ میں لایا گیا اور ۲۰ روز بھی نہ گذرے تھے کہ ۲۷ جمادی الثانی کو عسقلان پر فرنگیوں کا قبضہ ہو گیا۔ بوستان کافوری میں جہاں مسجد صالح تھی سر مطہر کو دفن کیا گیا اس پر عالی شان عمارت بنوا کر خوب تزئین و آرائش کی گئی۔ لیکن یہ مسجد باب زیلہ سے کسی قدر فاصلہ پر تھی۔ زائروں کو آمد و رفت میں تکلیف ہوتی تھی۔ اس لئے خلیفہ عاضد لدین اللہ نے سر مقدس کو مسجد صالح سے نکال کر قصر زمرد کے پاس جو خاص اس کے رہنے کا محل تھا۔ دفن کرا دیا اور اس پر عمارت بنوا کر نہایت آراستہ و پیراستہ کیا۔ ۶۴۰ھ ہجری میں اس مشہد مقدس کو آگ سے بہت نقصان پہنچا لیکن جلد ہی درستی کر دی گئی۔

ابن جبیر نے ۵۸۰ھ ہجری میں مصر کی سیاست کی وہ لکھتا ہے کہ قاہرہ میں مشہد

حسینی کی عمارت نہایت عجیب و غریب اور عمدہ بنی ہوئی ہے۔ سر مبارک ایک منقش تابوت میں مدفون ہے۔ مشہور سیاح ابن بطوطہ جس نے سنہ ۷۲۶ ہجری میں مصر کا سفر کیا تھا۔ لکھتا ہے کہ قاہرہ میں ایک مقدس مزار مشہد حسینؑ کی عظیم الشان عمارت ہے یہ عمارت نہایت مضبوط اور کواڑوں پر چاندی کے پتر جڑے ہوئے ہیں۔ اس مشہد مقدس کا جس قدر احترام کیا جائے کم ہے۔ کچھ عرصہ کے بعد خالد بن علاء الدین مغربی نے سنہ ۷۳۷ ہجری میں سفر کیا۔ اس نے اس مشہد کی بہت تعریف لکھی ہے۔ وہ کہتا ہے کہ اس مقصورہ کے چاروں طرف لکھڑ جھاڑ آویزاں دیکھے جن پر نہایت صنعت سے میناکاری کا کام تھا۔

امیر حسن کتخدا المتوفی نے سنہ ۱۱۲۳ھ میں مشہد مقدس میں توسیع کرائی آبنوس کی لکڑی کا تابوت بنوایا جس پر سیپ اور چاندی کا نہایت نفیس کام کیا گیا تھا اور اس پر حریر کا غلاف پڑا رہتا تھا۔ سنہ [illegible] ہجری میں امیر عبدالرحمٰن کتخدا کے حکم سے پھر تجدید ہوئی۔ پھر سنہ [illegible] ہجری میں مزید توسیع سید علی الوا الوازنی نے کرائی۔ مصر کے موجودہ خاندان حکمران میں جب عباس پاشا بن طوسون پاشا نبیرہ محمد علی پاشا حاکم مصر ہوا۔ تو اس نے توسیع کے لئے عمارات بنوانی شروع کیں لیکن وہ سنہ ۱۲۷۹ ہجری میں مرگیا اس کے بعد خدیو اسمٰعیل پاشا تجدید و تعمیر کی طرف متوجہ ہوا۔ اس ترمیم میں اسمٰعیل پاشا نے گنبد کو تو بحال رکھا مگر بقیہ عمارت کے لئے قسطنطنیہ میں ستون تیار کرائے اور اپنے صرف خاص سے عمارات مشہد کی تکمیل کی اور سنہ ۱۲۹۰ ہجری میں یہ عمارت پایۂ تکمیل کو پہونچی۔ تابوت پر زرتار غلاف چڑھایا گیا مشہور ہے کہ اس قبہ کے نیچے تہ خانہ ہے اس میں ایک صندوق کے اندر جو نہایت مزین و منقش ہے۔ سر مبارک رکھا ہوا ہے۔ سید محمود بلہاری سابق شیخ مشہد نے سنہ ۱۳۲۱ھ میں اس کا معائنہ کیا تھا۔ پہلے تہ خانہ میں

صندوق تابوت تک جا سکتے تھے لیکن نصاریٰ مصر نے ایک مرتبہ فرق مبارک کو نکال لے جانے کی کوشش کی تھی اس لئے حکومت مصر نے تہہ خانہ کا دروازہ بند کرا دیا۔ اب یہ مشہد مابین خان خلیلی و جامع ازہر واقع ہے۔ عمارت نہایت شاندار اور خوشنما ہے اس کے وسیع گنبد کے نیچے سنہری کٹہرہ ہے اور اس کے نیچے تہہ خانہ میں تابوت کا صندوق ہے۔ گنبد کے اندر نہایت نفیس سنہری نقش و نگار ہیں اور دیواروں کو کئی قسم کا رنگ دیا گیا ہے۔ مسجد اور تمام عمارات میں اعلیٰ درجہ کا فرش ہے۔ بیش قیمت شیشہ آلات اور جھاڑوں سے بھی آراستہ کیا گیا ہے۔ ہر وقت زائرین کا ہجوم رہتا ہے۔ صدہا مصری حفاظ اور قاری وغیرہ خوش الحانی سے تلاوت قرآن مجید میں اور دوسرے نمازی اوراد اور وظائف میں مصروف رہتے ہیں۔ بخصوصاً جمعہ کے روز بہت ہجوم رہتا ہے اور تبرکات نبوی کی زیارت کرائی جاتی ہے۔ اسی عمارت کے سلسلہ میں ایک کمرہ کے اندر محمل مصری جس کے اندر خانہ کعبہ کا غلاف ہوتا ہے۔ شہر میں گشت کرائے جانے کے بعد رکھا جاتا ہے۔ دستور یہ ہے کہ محمل مصری کا جلوس حجاز کو روانگی سے قبل تمام شہر میں بڑی دھوم دھام سے نکالا جاتا ہے فوج بھی ساتھ ہوتی ہے۔ راستے بھی سجائے جاتے ہیں اس کے بعد دو روز تک اس کو جامع حسین کے ایک مخصوص کمرہ کے اندر رکھا جاتا ہے۔ یہاں سے وہ سویز اور سویز سے بذریعہ جہاز جدہ کو روانہ ہوتا ہے۔ اس مشہد مطہر کی دیواروں میں دائروں کی شکل میں آیات قرآنی اور مختلف اشعار سنہری حروف میں لکھے ہوئے ہیں۔

سنہ ۱۳۱۶ ہجری میں بزمانہ خدیو عباس حلمی ان حروف پر پھر سنہرا رنگ چڑھایا گیا۔ قبہ کے چار دروازہ ہیں ایک کھڑکی جو باب الاخضر تک جاتا ہے اس کے کواڑ دو پرتا ہے کے باقی تین دروازوں پر چاندی کے پتر چڑھے ہوئے ہیں قبلہ کی طرف

دروازہ ہے اس سے متصل ایک مخصوص کمرہ میں چند تبرکاتِ نبوی رکھے ہوئے ہیں
(۱) آنحضرت صلعم کی قمیص مبارک کا ٹکڑا۔ (۲) آنحضرت کی سرمہ دانی (۳) اس کی سلائی
(۴) آنحضرت کے لبِ اقدس کے دو موئے مبارک (۵) عصائے مبارک کا ٹکڑا۔

صاحبِ قمقام کا قول ہے کہ علمائے امامیہ کا اتفاق ہے کہ سرِ منور جسدِ اطہر کے ساتھ ملحق ہے آنحضرت سید الساجدین نے اس کو دمشق سے لاکر نعشِ مقدس سے ملا دیا تھا۔

ان تمام واقعات کی پوری تفصیل قمقامِ ذخار تحفۃ الزائر کافی اور تہذیب میں ہے ہم بخیالِ طوالت چھوڑتے ہیں اور ان سب مختلف روایتوں کو دیکھتے ہوئے ہم قیاس اور اجتہاد سے کام لیتے ہیں ہمیں اقرب الی الصورت یہ معلوم ہوتا ہے کہ فرقِ منور جسد کے ساتھ ایک ہی مقام پر دفن ہے۔ نجفِ اشرف میں دفن کئے جانے کے متعلق یہ بیان کیا گیا ہے۔ کہ محبانِ اہل بیت میں سے ایک شخص نے اثنائے راہِ دمشق میں اس سر کو کسی تدبیر سے حاصل کر لیا۔ اور بمقام نجف حضرت جنابِ امیر کے پہلو میں سپردِ زمین کیا مگر یہ روایت اس وجہ کو مستند نہیں سمجھی جاتی کہ اول تو حضرت کے سرِ مبارک کا دمشق میں یزید کے پاس جانا مسلّمہ مورخینِ فریقین ہے دوسرے اس زمانہ میں جنابِ امیر کے مزارِ پُرانوار کا حال سوائے آئمہ اہل بیت کے اور کسی شخص کو معلوم نہ تھا۔ رہی وہ روایت جس میں یہ بیان ہوا ہے کہ فرقِ مطہر مدینہ میں دفن ہے یہ اسوجہ سے قرینِ قیاس نہیں کہ یزید کو مدینہ عمر بن سعید کے پاس بھجوانے کی کیا ضرورت تھی اگر اسے یہی منظور تھا تو سید الساجدین کو دیتا۔ یا کربلا میں بھجواتا عسقلان اور قاہرہ میں مدفون ہونے کے واقعات قابلِ تسلیم اور متفقہ نہیں جن بزرگواروں نے حضرت سید الساجدین کا کربلا میں آکر سرِ مبارک کو جسدِ مطہر سے ملانا درج کیا ہے۔ وہ یوں نہیں ہو سکتا کہ

سید الساجدین دوسری بار کربلا میں تشریف ہی نہیں لائے اس لئے ہم کو اس روایت کے کہ عمر بن عبدالعزیز نے آپ کے سر مبارک کو دمشق سے کربلا میں بھجوایا۔ ان لینے کے سوا اور کوئی چارہ نہیں۔ اسلام نے سات موقعوں پر قبر کھولنے کی اجازت دی ہے ان میں سے ایک موقعہ یہ بھی ہے کہ جسم کا کوئی ٹکڑا جس میں ہڈی ہو اگر باہر رہ جائے تو قبر کو کھول کر اس کو جسم سے ملا سکتے ہیں کیا عجب ہے کہ عمر بن عبدالعزیز کے حکم سے ایسا کیا گیا ہو اور سر مبارک جسد اطہر سے ملحق ایک ہی سرداب میں دفن ہو۔ دوسرے شہدائے کربلا کے سروں کے متعلق تمام تاریخیں خاموش ہیں اس لئے ہم کو بھی بجز خاموش رہنے کے چارہ نہیں۔

زیارت ناحیہ کی تنقید

علمائے مورخین امامیہ کی اکثر کتب مقاتل میں زیارت ناحیہ مقدسہ کی یا تو تمامہا نقل موجود ہے یا اسکے مختلف جملوں سے مواقع ضروری پر استناد کیا گیا ہے لیکن اس مشہور زیارت کے متعلق جو شکوک و شبہات پیدا ہوتے ہیں وہ بھی قابل لحاظ اور غور طلب ہیں اس زیارت کی نسبت بیان تاکہ حضرت ... کے سرداب مبارک سے ایک بزرگوار کو دستیاب ہوئی ہے۔ گویا اس کو حضرت کا کلام اور آپ کا عطیہ سمجھ کر ایک خاص وقعت و اہمیت دی جاتی ہے۔ اور تمام علماء مشاہیر اس کو بلاچون و چرا تسلیم کرتے چلے آئے ہیں۔ سب سے اول اس زیارت کا اظہار علامہ سید علی بن طاؤس کے قلم سے ہوا۔ چنانچہ آپ اپنی کتاب اقبال میں تحریر فرماتے ہیں۔

فصل فیما نذکرہ من زیارۃ الشہداء فی یوم عاشورہ روینا ھا	اس فصل میں ہم اس زیارت شہداء روز عاشورہ کا ذکر کریں گے جسے ہم نے

اسناد نالله جدی ابی جعفر بن حسن الطوسی رحمۃ اللہ قال حدثنا الشیخ ابو عبداللہ محمد ابن احمد بن عیاش قال حدثنی الشیخ الصالح ابو منصور بن عبد المنعم بن نعمان البغدادی رحمۃ اللہ قال خرج من الناحیۃ سنۃ اثنین وخمسین ومأتین علی ید الشیخ محمد بن غالب الاصفہانی حین وفات ابی رحمۃ اللہ و کنت حدیث السن وکتبت استاذن فی زیارۃ مولای ابی عبداللہ وزیارۃ الشہداء رضوان اللہ علیہم فخرج الی منہ +

اپنی ہی روایتوں سے کر لیا ہے اور جس کی سند ہمارے دادا ابو جعفر کہتے ہیں۔ کہ ہم سے شیخ ابو عبداللہ محمد بن احمد بن عیاش نے اور ان سے شیخ صالح ابو منصور بن عبدالمنعم بن نعمان البغدادی رحمۃ اللہ علیہ نے بیان کیا کہ ۲۵۲ھ میں شیخ محمد بن غالب اصفہانی کے ہاتھ پر میرے باپ کے مرنے کے وقت یہ زیارت ناحیہ مقدسہ سے برآمد ہوئی میں اس وقت نوعمر تھا میں نے ایک درخواست لکھی تھی جس میں حضرت امام حسین علیہ السلام اور دوسرے شہداء رضوان اللہ علیہم کی زیارت کی اجازت چاہتا تھا پس یہ زیارت میرے لئے سرداب میں سے نکلی۔

اسی کے لفظ بلفظ علامہ مجلسی نے بحار میں نقل کیا ہے اس کے علاوہ دوسری معتبر و مؤقر کتابوں میں بھی یہ عبارت اسی طرح بے کم و کاست پائی جاتی ہے۔ ان تمام کتابوں کی متفق علیہ عبارت سے صاف ظاہر ہے کہ زیارت ناحیہ ۲۵۲ھ میں سرداب سرمن رائے سے دستیاب ہوئی۔ حالانکہ علمائے حضرت صاحب العصر علیہ السلام کی تاریخ ولادت ۱۵ شعبان ۲۵۵ھ تاریخ امامت ۸ ربیع الاول ۲۶۰ھ تاریخ غیبت صغریٰ ۱۰ شوال ۲۶۲ھ اور تاریخ غیبت کبریٰ شعبان

۲۳۶ھ لکھی ہے۔ اس سے صاف اور کھلا ہوا شبہ یہ پیدا ہوتا ہے کہ جب حضرت صاحب الامر کی ولادت مبارک ۲۵۵ھ ہجری میں ہوئی اور ۲۶۰ھ میں آپ منصبِ امامت پر فائز ہوئے تو ۲۵۲ھ میں آپکی ولادت سے تین سال اور امامت سے دس سال پہلے ناحیہ مقدسہ سے اسکی دستیابی کیونکر ممکن تھا اور ایسی حالت میں اس کو قائم آلِ محمد کی طرف منسوب کرنا اور اسے خاص آپ کا کلام معجز نظام سمجھ لینا کہاں تک جائز ہو سکتا ہے۔

یہ اشکال دو حال سے خالی نہیں۔ یا تو ۲۵۲ھ میں دستیابی غلط۔ یا ۲۵۵ھ میں سال ولادت صحیح نہیں لیکن جب تمام مورخین و ارباب کتب کا اس پر اتفاق ہے کہ آپکی ولادت مبارک ۲۵۵ھ ہجری میں ہوئی ہے تو ہم اس سال کو غلط قرار نہیں دے سکتے۔ اگر غلط ہے تو سالِ دستیابی ممکن ہے کہ سالِ دستیابی ۲۶۲ھ یا ۲۷۲ھ ہو۔ اور سہوِ کتابت سے ۲۵۲ھ لکھ دیا گیا ہو۔ مگر جب ان تمام کتابوں میں جن کے جلیل القدر مولفوں نے اس زیارت کی سند کو نقل کیا ہے بلا تغیر و تبدل یہی عبارت موجود ہے تو اس کو سہوِ کتابت کیونکر سمجھا جا سکتا ہے۔ ہم حیران ہیں کہ ایسی فاش غلطی پر ان بزرگواروں میں سے کسی نے بھی خیال نہ کیا اور کیا علامہ ابو جعفر طوسی نے محض راوی کے بیان پر اعتبار کر کے اختلافِ سنین پر توجہ نہیں کی۔

اس سے قطع نظر کر کے اگر دیکھا جائے تو دو باتیں اور بھی قابل غور ہیں ایک یہ کہ اس میں صرف ان شہدا کے نام ہیں جو بروز عاشورہ شہید ہوئے۔ ان ہی میں قیس بن مسہر صیداوی کا بھی نام ہے۔ حالانکہ مورخین فریقین میں کسی نے ان کو شہدائے طف میں شامل نہیں کیا۔ بلکہ اکثر تاریخوں سے یہی پایا جاتا ہے کہ جناب سید الشہدا علیہ السلام نے منزل ثعلبیہ سے ان کو خط دیکر کوفہ روانہ کر دیا تھا۔ وہ وہاں اثنائے راہ میں بمقام قادسیہ گرفتار ہو کر عبید اللہ ابن زیاد کے

پاس بھیجے نہ گئے اور اسی کے حکم سے شہید ہوئے۔ اگر یہ کہا جائے کہ وہ بھی نصرت امام نہیں کر سکے تو اس میں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ عبداللہ بن یقطر کو بھی حضرت نے اپنی جانب سے خط دیکر کوفہ بھیجا تھا اور وہ بھی گرفتار ہو کر اسی طرح قتل ہو گئے جس طرح قیس ابن مسہر تو عبداللہ بن یقطر کا نام زیارت ناحیہ میں کیوں ہے اور مسلم بن عقیل اور ہانی بن عروہ کے نام اس زیارت کی فہرست میں ہیں حالانکہ ان دونوں بزرگواروں کی شہادتیں بھی واقعہ کربلا کی پیشین خیمہ تھیں۔

دوسرے یہ کہ اس زیارت میں جہاں شہدائے اہل بیت کے اسماء لکھے ہیں وہاں ان کے قاتلوں کو بھی ظاہر کیا گیا ہے۔ عبداللہ بن مسلم بن عقیل کی نسبت لکھتا ہے کہ

السَّلامُ عَلَى القَتِيلِ بنِ القَتِيلِ عبدِ اللهِ بنِ مسلمِ بنِ عقيلٍ ولعنَ اللهُ قاتلَهُ عمرَو بنَ صبيحٍ وقيلَ عامرَ بنَ صعصعةَ وقيلَ اسدَ بنَ مالكٍ۔

سلام ہو مقتول فرزندِ مقتول عبداللہ بن مسلم بن عقیل پر اور خدا کی لعنت ہو ان کے قاتل عمر بن صبیح پر اور کہا گیا ہے کہ وہ عامر بن صعصعہ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ اسد بن مالک تھا۔

کلامِ امام میں شک و شبہ کا کیا کام وہاں تو ہر چیز ہر بات اور ہر واقعہ کا یقینی علم ہے اور حضرت سے ہرگز پوشیدہ نہیں کہ عبداللہ ابن مسلم کا قاتل عمر ہے یا عامر یا اسد۔ یہ قیل اور قال جو شک اور تذبذب کو ظاہر کر رہا ہے کیا قولِ امام اور کلامِ حجت خدا ہو سکتا ہے۔ ہم نہیں کہہ سکتے کہ ایسی حالت میں اس زیارت کو کیونکر کلام امام اور عطیہ حضرت صاحب العصر علیہ السلام سمجھا جائے۔ ہم نے لکھنؤ کے ایک مجتہد صاحب کی خدمت میں عرضداشت بھیج کر ان شکوک کو

رجوع کرنا چاہتا تھا۔ لیکن افسوس ہے کہ وہاں سے کوئی شافی اور کافی جواب نہیں ملا۔ ہم ناظرین کرام کے اس خاص طبقہ سے جو زیارت کو عقیدتمندانہ وقعت سے دیکھتا ہے اپنی اس جسارت کی معافی چاہتے ہیں اور مذکورہ بالا حالات کو مدِ نظر رکھتے ہوئے ہم اپنا یہ خیال ظاہر کرنے سے معذور ہیں کہ اس زیارت کو حجتِ خدا کی طرف منسوب کرنا کیونکر صحیح ہو سکتا ہے اور ایک جویائے تحقیق کے اطمینان قلب اور ایک معترض کے جواب دینے کی کیا صورت ہے۔ اور کیا ان قرائن اختلافات کی بنا پر نقائص سے ہوتے ہوئے بھی جن کا سوائے تاویلات کے کوئی جواب نہیں ہے، برائے خوش اعتقادی محض ایک شخص کے اتنا کہہ دینے سے کہ میں نے اس زیارت کو سرداب شریف کے ایک کونہ میں رکھا ہوا پایا۔ بلا کسی حجت و برہان اور بغیر کسی ثبوت و اطمینان کے اس کو خاص حضرتِ صاحب الامر علیہ السلام کا کلام معجز نظام سمجھا جا سکتا ہے۔ فافہم و تدبر۔

چند شبہات و اعتراضات کے جواب

شبہ اول: یزید دوسرے سلاطینِ عالم کی طرح ایک دنیادار بادشاہ تھا اُس نے وہی تدبیریں اختیار کیں جو تحفظِ سلطنت کے لئے دنیا کے تمام تاجدار کرتے آئے ہیں حسین علیہ السلام کی مسلمانوں کی نظروں میں ایک خاص عظمت و وقعت اور آپ کا اس کی بیعت و اطاعت سے انکار خصوصاً ایسی حالت میں کہ آپ پیغمبرِ اسلام کے نواسے اور اسلامی خلافت کے اصلی و حقیقی وارث تھے ایک کھٹکتی ہوئی بات اور خوفناک مرحلہ تھا۔ ماہرانِ علمِ سیاست اور مدبرانِ امورِ سلطنت کسی ایسے وجود کی بقا کو جو سلطنت کے لئے خطرہ کا باعث ہو کبھی گوارا نہیں کرتے۔ یہ سیاستِ مدن کا مسلمہ مسئلہ ہے جس سے کسی کو انکار کی گنجائش نہیں۔ ایسے واقعات سے تمام قوموں کی

تاریخ میں بہت سی ایسی ورداتیں پیش آتی رہتی ہیں۔ حکومت و سلطنت تو بڑی چیز ہے۔ حقیقت اور ملکیت کے خفیف اور معمولی تنازعات میں بھائی بھائی سے، بیٹا باپ سے، عزیز عزیز سے، دوست دوست سے کیا نہیں کر گزرتا۔ یزید ہی پر کیا موقوف ہے اس کی جگہ جو کوئی ہوتا ایسا ہی کرتا۔ پھر یزید نے کیا برا کیا۔ بلکہ اصول ملک داری نے ایسا ہی کرنے پر مجبور کر رکھا تھا اور وہ اس کے سوا کر ہی کیا۔ دنیا کی تاریخ کو دیکھتے ہوئے یہ حادثہ کوئی نئی بات نہیں۔ چونکہ ملکی اور سیاسی جھگڑوں میں ایسا ہی ہوتا ہے بلکہ ہمیشہ سے ہوتا رہا ہے۔ اب ہو رہا ہے۔ اور آئندہ ہوتا رہے گا۔

جواب:۔ بے شک علم سیاست و ریاست کا یہ ایک مسلمہ اصول ہے۔ اور ہم کو اس کی معقولیت سے انکار نہیں۔ تحفظ سلطنت و حکومت کے لئے کسی تشدد کو تشدد اور کسی خوں ریزی کو خوں ریزی نہیں سمجھا جاتا۔ خود غرضی اور ہوا و ہوس انسانی فطرت میں داخل ہے، دنیا میں جب تک نسل انسانی قائم ہے۔ اس قسم کے واقعات ہمیشہ رونما ہوتے رہیں گے۔ مگر جو شخص اس اعتراض کو پیش کرے یا جس کے دل میں یہ شبہ پیدا ہو۔ اس کو تمام واقعات پر جو امیر معاویہ کے انتقال کے بعد یزید اور حضرت امام حسین کے درمیان روز ازل سے وقوع پذیر ہوئے ٹھنڈے دل سے غور کرنا چاہیئے۔ اس میں شک نہیں کہ یزید کی ولی عہدی کو تسلیم کرنے سے فرزند رسول اللہ کو روز ازل سے اکراہ و انکار تھا۔ مگر اس انکار میں تین سرداران حجاز اور دنیائے اسلام کے سربر آوردہ ارکان اور بھی شامل تھے ان میں سے عبد الرحمن بن ابی بکر کا انتقال امیر معاویہ کی زندگی ہی میں ہو چکا تھا۔ مگر یزید نے تخت نشین ہوتے ہی جو حکم نامہ گورنر مدینہ کے نام بھیجا اس میں گو عبد اللہ ابن عمر اور عبد اللہ ابن زبیر کے نام بھی تھے۔ تاہم حسین ابن علی کے نام نامی کو خصوصیت

سے جگہ دی گئی تھی اور کھلے الفاظ میں درج تھا۔ کہ یا تو ان سے فوراً بیعت لے لی جائے۔ ورنہ ان کا سر قلم کر کے ہمارے پاس روانہ کر دیا جائے۔ اس تخصیص کی وجہ قابلِ لحاظ اور لائقِ غور ہے۔ کہا جا سکتا ہے کہ ابن عمر اور ابن زبیر صرف صحابی زادے تھے۔ اور حسین فرزندِ رسول اللہ، ایسے وہ دونوں بزرگوار نہ تو مسلمانوں کی نظروں میں حسینؑ کے ہم پلہ ہو سکتے تھے۔ نہ ہم رتبہ۔ اگر وہ دونوں بیعتِ یزید کر بھی لیتے اور صرف حسین کو انکار رہتا۔ تو بھی یزید کے سیاسی خطرہ میں کمی نہ ہوتی اور اگر حضرت حسینؑ ہی اس کی بیعت کر لیتے تو اس کو نہ پھر ابن عمر کی بیعت کی ضرورت رہتی اور نہ ابن زبیر کی بیعت کی پروا لیکن یہ شکوک جو خیالِ باطل اور وہمِ لاحاصل سے زیادہ وقعت نہیں رکھتے۔ ان کی تردید کو خود واقعات کا سلسلہ موجود ہے سب سے اول ان تینوں بزرگوں کے انکارِ بیعتِ یزید کی نوعیت پر غور کرنا لازم ہے۔ عبداللہ ابن عمر کا انکار محض عارضی یا دکھاوے کا انکار تھا۔ کیونکہ انہوں نے واقعہ کربلا کے بعد ہی بہت جلد بیعتِ یزید کا شرف حاصل کر کے اس کی خلافت کو تسلیم کر لیا تھا اور صرف یہی نہیں بلکہ اس کے پُرجوش اور سرگرم حامی بن گئے تھے۔ اور انہماک کے ساتھ مخالفینِ یزید کو اس کی اطاعت پر ترغیب دیتے تھے چنانچہ صحیح بخاری۔ صحیح مسلم اور جامع الاصول ابن اثیر جزری میں ہے۔

عن نافع قال لما خلع اھل المدینۃ یزید ابن معاویۃ جمع ابن عمر حشمہ وولدہ فقال انی سمعت النبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم یقول ینصب لکل غادر لواء یوم القیامۃ وانا قد بایعنا ھذا	نافع سے مروی ہے کہ جب اہلِ مدینہ نے یزید ابن معاویہ سے خلع بیعت کیا تو حضرت عبداللہ ابن عمر نے اپنی اولاد اور متعلقین کو جمع کیا اور ان کو ہدایت کی کہ سنو میں نے رسول اللہ کو فرماتے ہوئے سنا ہے کہ ہر غدر کرنے والے کے لئے قیامت

الرجل على بيع الله ورسوله واني لا اعلم غدرا اعظم من ان يبايع رجل على بيع الله ورسوله ثم ينصب له القتال واني لا اعلم احدا منكم خلعه ولا تابع في هذا الامر الا كانت الفيصل بيني وبينه

کے روز ایک جھنڈا نصب کیا جائے گا۔ تم جانتے ہو کہ میں نے یزید کی بیعت حسب اطاعت واتباع خدا و رسول کی ہے اور میں نہیں جانتا کہ اس سے زیادہ کوئی غدر ہے کہ جس شخص کی اس طرح بیعت کی جائے پھر اس کے خلاف ہتھیار اٹھائے جائیں پس جو شخص یزید کی بیعت شکنی کریگا، اور میرا کہنا نہ مانے گا۔ میں اس سے بیزاری اختیار کروں گا۔

ان کے ارادہ اور خیالات میں اس تغیر عظیم کیوں ہوا۔ اس کی وجہ بظاہر یہی ہو سکتی ہے کہ وہ جنگ وجدال اور شور وشر سے برکنار اور ایک تارک لذتیں اور امن پسند بزرگوار تھے۔ ان کے کانشنس نے گوارا کر لیا کہ یزید کی بدافعالیوں سے قطع نظر کرکے اس کی خلافت کو تسلیم کرنے میں عام مسلمانوں کا ساتھ دیں۔ رہے عبداللہ ابن زبیر۔ وہاں مطلب سعدی دیگر بود۔ وہ خود خلافت کے خواہاں اور امیدوار تھے بلکہ یہ بھی سمجھے ہوئے تھے کہ یزید کی بدچلنی اور بداطواری سے تمام دنیائے اسلام آگاہ ہے اس لئے تقدس کی آڑ میں اپنا کام نکالنا چاہیئے۔ چنانچہ ان کو ایک حد تک کامیابی بھی ہوئی۔ البتہ حسینؓ ہی ایک ایسے بزرگوار تھے جن کا انکار سچا انکار۔ اور اسلامی حمایت پر مبنی تھا۔ اور باوجود قدم کو ڈگمگا دینے والی سختیوں کے جوں جوں تشدد بڑھتا گیا ان کے ارادہ عزم اور ثابت قدمی کو استحکام اور ثقل حاصل ہوتا گیا لیکن اس سے یہ نہ سمجھ لینا چاہیئے کہ حسینؓ کا انکار خطرہ کا پہلو لئے ہوئے تھا حسین طالب دنیا نہ تھے۔ اگر ان کو مجبور نہ کیا جاتا تو مدینہ یا مکہ میں اپنی زندگی خاموشی سے بنوٹرل طریقے سے بسر کر دیتے حسین کی زندگی مذہبی زندگی تھی نہ کہ سیاسی جس سے یزید

یا اس کی سلطنت کو خطرہ ہوتا۔ بقول مسٹر جان لونگ وہ یزید سے صرف اس لئے بیزار تھے کہ اس کا چال چلن شرع اسلام کے خلاف تھا ورنہ ان کو اس کی سلطنت وحکومت سے کچھ تعرض نہ تھا۔ اگر یزید حسین سے پرخاش نہ کرتا۔ تو حسین کی زندگی ایک خاموش اور بے ضرر زندگی تھی لیکن افسوس ہے کہ اس نے ایسا نہ کیا اور محض خیالی اور قیاسی شکوک پر خود چھیڑ چھاڑ کی ابتدا کی۔

تمام واقعات خود پکار کر کہہ رہے ہیں کہ حسین نے کسی وقت بھی قولاً اور فعلاً کوئی بات ایسی نہیں کی جس سے یہ پایا جائے کہ وہ تحصیل خلافت کے لیے یا یزید کی حکومت کو الٹ دینا چاہتے تھے۔ وہ کیا چیز حسین کے پاس تھی جس سے یزید کو خوف ہوتا۔ فوج جنگجو تھی نہ روپیہ پیسہ بھی نہ تھا البتہ حکومت قلوب باقی تھی لیکن حسین کی تذ[illegible] کسی کی کوشش کچھ اس بنا پر نہ تھی کہ وہ خلافت کے طالب ہوں گے۔ یا ان سے کسی قسم کی مخالفت کا اندیشہ تھا بلکہ تجربہ اس کا شاہد تھا کہ وہ ہرگز مخالفت نہ کریں گے اور خاموش رہیں گے۔ خوف ان کی کسی عملی مخالفت سے نہ تھا۔ بلکہ ان کا دنیا میں لوگوں کے سامنے رہنا ہی ارباب حکومت کے نزدیک خطرہ کی چیز تھی حسین کے پاس اس کا کوئی علاج نہ تھا۔ کہ وہ کیوں ایسے ہیں جس کے لئے وہ اپنی روش سے اطمینان دلا سکتے تھے۔ مگر حکومت کا اندیشہ دور کرنے کے لئے قومی اور دینی خودکشی نہ کر سکتے تھے حسین کے لئے یہ بات امکان سے باہر تھی کہ وہ ایک فاسق وفاجر کی علانیہ بیعت کر کے اس کو خلیفہ رسول تسلیم کر لیتے۔

اگر تمام واقعات پر نظر غائر ڈالی جائے تو خود بخود واضح ہو جاتا ہے کہ انکار بیعت کا بہانہ محض دھوکے کی ٹٹی اور اپنے موروثی عناد کا انتقام لینے کے لئے دنیا دکھاوے کی آڑ تھی۔ تمام حالات پکار کر کہہ رہے ہیں کہ یزید کو حضرت سے دلی کاوش اور خاندانی بغض تھا۔ اسے بغیر آپ کے قتل کئے چین ہی نہ تھا آپ کا وجود باوجود

اس کی مرتدانہ اور فاسقانہ کارروائیوں میں سخت حارج تھا۔ اگر اس کو صرف ملکی مصلحتوں سے قتل جناب سید الشہداء ہی منظور رہتا۔ تو آپ کے اہل حرم کے ساتھ جو اسی کے نبی کی ذریت اور آل تھی، ایسے گستاخانہ برتاؤ کا مرتکب نہ ہوتا ان کو سر دربار دربار ڈیوڑھی میں نہ بلاتا۔ رسول اللہ کی بہو بیٹیوں کو شہر بہ شہر نہ پھراتا۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ مصالح ملکی کا عذر ایک بہانہ یا حیلہ تھا۔ ورنہ درحقیقت اس کو خاندان کا استیصال اور اہانت و تذلیل منظور تھی۔ اور جو کچھ اس سے ہو سکا کمی نہ کی۔ اس کے عذریہ اور مافی الضمیر کا اظہار خود اسی کے اشعار سے ظاہر اور آشکار ہو جاتا ہے۔ چنانچہ جب حضرت کو سر مبارک اس کے سامنے لایا گیا تو اس وقت اس کے ہاتھ میں ایک چھڑی تھی اس کو بار بار لب و دندان مطہر پر لگا کر یہ اشعار پڑھتا جاتا تھا۔

لیت اشیاخی ببدر شهدوا	وقعة الخزرج مع وقع الاسل
لعبت هاشم بالملك فلا	خبر جاء ولا وحي نزل
لست من خندف ان لم انتقم	من بني احمد ما كان فعل
قد اخذنا من علي ثارنا	وقتلنا الفارس الليث البطل
وقتلنا القرن من ساداتهم	وعدلناه ببدر فاعتدل
فجزيناهم ببدر مثلها	وباحد يوم احد فاعتدل
لو راوه لاستهلوا فرحا	ثم قالوا يا يزيد لا تشل
وكذاك الشيخ اوصاني به	فاتبعت الشيخ فيما قد سئل

ترجمہ:- کاش میرے وہ بزرگ آج موجود ہوتے جو جنگ بدر میں تھے اور جنہوں نے خزرج و اسل کے مقتل و واقعات کو دیکھا تھا۔

"آل ہاشم (یعنے آل رسول اللہ) نے ملک کے ساتھ کھیل کھیلا نہ کوئی خبر آئی تھی۔ نہ وحی نازل ہوئی"

میں خندف سے ہوں۔ اگر بدلہ نہ لوں نبی احمد سے جو کچھ انہوں نے کیا تھا۔ کو
ہم نے علی سے اپنا انتقام لے لیا اور بہادر و جوانمرد سوار کو قتل کر ڈالا اپنے ہم
ہم نے ان کے بڑوں میں سے جواں مرد کو قتل کیا اور اپنے مقتولین بدر کے ساتھ برابری کر دی۔
ہم نے ان سے جنگِ بدر کے مقتولین کا بدلہ لیا اسی طرح اور جنگ اُحد کا اُحد کے دن کی طرح پس ہم اور وہ برابر ہو گئے۔
اگر آج وہ ہوتے تو مارے خوشی کے ان کی باچھیں کھل جاتیں۔ اور کہتے کہ یزید تیرے ہاتھ شل نہ ہوں۔
مجھ کو اسی طرح میرے شیخ باپ نے وصیت کی تھی پس قتلِ فرزند رسول میں میں نے اپنے باپ کی خواہش کی پیروی کی۔
(دیکھو روضۃ الاحباب۔ شرح نہج البلاغۃ۔ تاریخ مسعودی۔ تاریخ اعثم کوفی تاریخ طبری۔ تاریخ واقدی۔ مراۃ الجنان یافعی۔ فصول المہمۃ ابن صباغ مالکی صواعق محرقہ ابن حجر مکی۔ تذکرہ خواص الامۃ ابن جوزی وغیرہم)
علم السیاست نے صرف ان لوگوں کے استیصال کو اصولِ جہانبانی کا جزو اہم قرار دیا ہے جن سے تحریراً یا تقریراً۔ قولاً یا فعلاً سلطنت کو کوئی خطرہ ہو۔ جو بادشاہ یا گورنمنٹ کے خلاف ہتھیار اٹھائیں ان کی بڑھتی ہوئی طاقت ذاتی رسوخ اور عام اثر سے شورش و انقلاب کا احتمال ہو یا ایسے قرائن و اسباب موجود ہوں جن سے نقصِ امن کا اندیشہ کیا جا سکے۔ صرف قیاسات و احتمالات کسی کے تخریب و تعذیب کے لئے کافی نہیں ہو سکتے۔ بلا کسی وجہ موجہ کے کسی سفاکانہ تشدد کو تدبیر سے تعبیر نہیں کیا جا سکتا۔ مردم آزاری کا نام جہانداری نہیں ہے۔ وحشیانہ خونخواری اور بہیمانہ درندگی کو اصولِ سیاستِ مدن سے کیا علاقہ۔

جیسا کہ ہم اوپر تفصیل کے ساتھ بحث کر چکے ہیں۔ حضرت کی روش محض دفاعی تھی۔ نہ اس میں ... آپ کی ذات سے یزید کو کسی قسم کا خدشہ ہونے کی کوئی وجہ پائی جاتی ہے۔ ایسی حالت میں ان ظالمانہ سفاکانہ وحشیانہ اور انتقامانہ برتاؤ کو جو آپ کے ساتھ ... کیا ... ہی نقطۂ نگاہ سے دیکھنا ایک فاش غلطی اور تمام سلسلۂ واقعات سے دیدہ و دانستہ چشم پوشی نہیں تو اور کیا ہے۔ کہا جا سکتا ہے کہ حضرت نے ان لوگوں کی جو سلطنت کے خلاف شورش پر آمادہ تھے۔ سربراہی منظور فرما کر اول مسلم ابن عقیل کو بھیجا پھر خود کوفہ کو روانہ ہوئے اسی طرح آپ کی جانب سے پیشقدمی کا آغاز ہوا۔ تو اب سلطنت سوائے ان کارروائیوں کے جو اس نے کیں اور کیا کرتی۔ لیکن صورتِ معاملات ان توہمات کے برعکس ہے جن وجوہ سے حضرت کوفہ کی طرف نقل و حرکت پر مجبور ہوئے وہ بہت صاف ہیں اور ہم کو ان کے اس وقت تحریر کرنے کی ضرورت نہیں۔ حضرت کی طرف سے ابتدا ہرگز نہیں ہوئی بلکہ شروع ہی سے ان معاملات کی ذمہ داری کا بار یزید پر ہے یہ شبہ اس وقت صحیح ہو سکتا تھا کہ جب حضرت کے کسی قول و فعل سے عملاً ایسے رویہ کا کوئی ثبوت ملتا۔ چھیڑ چھاڑ کی ابتدا یزید کی طرف سے ہوئی اور وہ بھی (جیسا کہ خود اسی کے اشعار سے ثابت ہے) محض خاندانی عداوت اور موروثی عناد کی بناء پر نہ کہ کسی سیاسی ضرورت کی وجہ سے البتہ حضرت نے جو کچھ کیا بحالت مجبوری کیا کیونکہ آپ کو یقین کامل ہو چکا تھا۔ کہ میں قتل سے کسی طرح نہیں بچ سکتا - یہی سبب تھا۔ کہ بقول اعثم کوفی ... ابن عباس، ابن عمر، اور محمد حنفیہ سے صاف فرما دیا تھا کہ افسوس تو اس بات ... کہ یہ لوگ مجھ کو گھر بیٹھنے نہ دیں گے۔ مجھ سے الجھیں گے اور اگر میں ان ... کسی نامعلوم مقام پر بھی چلا جاؤں گا۔ تو بھی ڈھونڈھ نکالیں گے۔ اور ... کے لئے مجبور کریں گے۔ اور اگر انکار کروں گا۔ تو قتل کر ڈالیں گے ...

یزید نے جو کچھ کیا۔ سیاسی حیثیت سے نہیں کیا بلکہ محض خاندانی عناد کی وجہ سے خاندان رسالت کا استیصال منظور اور ان حضرات کی توہین و تذلیل مدنظر تھی لہذا ہم اس واقعہ کو قانونِ سیاست کی کسی دفعہ کے تحت نہیں پاتے، اور نہ دوسرے سلاطین عالم کی نظیر اس پر منطبق ہو سکتی ہے۔

شبہ دوم:۔ عبیداللہ ابن زیاد یا دوسرے لوگ جو ان مظالم و بے ادبیوں کے مرتکب ہوئے وہ محض یزید کو راضی کرنے یا خوشامد کی وجہ سے تھا۔ عبیداللہ حاکم تھا۔ اور یزید کی طرف سے اس مہم کی سرانجام دہی پر مامور تھا۔ ظاہر ہے کہ لما مور مجبور ورنہ ان لوگوں کو حضرت سے ذاتی کاوش نہ تھی۔ تمام حکومتوں کے ملازم اور ہوا خواہ ایسا ہی کرتے آئے ہیں۔

جواب۔۔ مانا کہ عبیداللہ اور دوسرے لوگوں نے حق نمک یا خوشامد سے طوعاً وکرہاً ایسا کیا لیکن کوئی شخص ایسی تاویلی حجت پر عظمۂ دنیا و آخرت سے بری نہیں ہو سکتا۔ جہاں تک تمام واقعات پر نظر ڈالی جاتی ہے اور تاریخی شہادتیں ہمارے سامنے موجود ہیں۔ ان لوگوں نے خود وہ زیادتیاں کیں کہ شاید یزید ان کی اجازت نہیں دیتا۔ وہ اپنے افعال کی پاداش میں عنداللہ اور عندالناس بے شک قابلِ مذمت ہیں۔ خصوصاً ابن زیاد اور شمر جیسوں نے جس طرح کی قساوت اور شقاوت کا اظہار کیا۔ شاید یزید کے خیال میں بھی یہ باتیں نہ آئیں۔ تو کیا اس خوشامد یا ادائے حق نمک اور تعمیل حکم حاکم کے حیلے سے وہ لوگ بری الذمہ قرار پا سکتے ہیں۔ ہرگز نہیں۔ یَعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ شَرًّا يَرَهُ۔

بے شک ان لوگوں نے براہِ تملق یا اپنی کارگزاری کا اظہار کرنے کو ظلم کا ارتکاب کیا لیکن جو جو سختیاں اور بے ادبیاں ان سے ظہور میں آئیں ان کا یزید کو کس حد تک ذمہ دار سمجھا جائے درانحالیکہ

جیسا کہ ہم اوپر تفصیل کے ساتھ بحث کر چکے ہیں ۔ حضرت کی روش محض دفاعی تھی ۔ نزاعی نہ تھی ۔ نہ آپ کی ذات سے یزید کو کسی قسم کا خدشہ ہونے کی کوئی وجہ پائی جاتی ہے ۔ ایسی حالت میں اس ظالمانہ سفاکانہ وحشیانہ اور انتقامانہ برتاؤ کو جو آپ کے ساتھ برتا گیا سیاسی نقطۂ نگاہ سے دیکھنا ایک فاش غلطی اور تمام سلسلۂ واقعات سے دیدہ و دانستہ چشم پوشی نہیں تو اور کیا ہے ۔ کہا جا سکتا ہے کہ حضرت نے ان لوگوں کی جو سلطنت کے خلاف شورش پر آمادہ تھے ۔ سربراہی منظور فرما کر اول مسلم ابن عقیل کو نیابتاً بھیجا ۔ پھر خود کوفہ کو روانہ ہوئے اسی طرح آپ کی جانب سے پیشقدمی کا آغاز ہوا ۔ تو اب سلطنت سوائے ان کارروائیوں کے جو اس نے کیں اور کیا کرتی ۔

لیکن صورتِ معاملات ان توہمات کے برعکس ہے جن وجوہ سے حضرت کوفہ کی طرف نقل و حرکت پر مجبور ہوئے وہ بہت صاف ہیں اور ہم کو ان کے اس وقت تحریر کرنے کی ضرورت نہیں ۔ حضرت کی طرف سے ابتدا ہرگز نہیں ہوئی بلکہ شروع ہی سے ان معاملات کی ذمہ داری کا بار یزید پر ہے یہ شبہ اس وقت صحیح ہو سکتا تھا کہ جب حضرت کے کسی قول و فعل سے عملاً ایسے رویہ کا کوئی ثبوت ملتا ۔ چھیڑ چھاڑ کی ابتدا یزید کی طرف سے ہوئی اور وہ بھی (جیسا کہ خود اسی کے اشعار سے ثابت ہے) محض خاندانی عداوت اور موروثی عناد کی بناء پر نہ کہ کسی سیاسی ضرورت کی وجہ سے البتہ حضرت نے جو کچھ کیا بحالت مجبوری کیا کیونکہ آپ کو یقین کامل ہو چکا تھا ۔ کہ میں قتل سے کسی طرح نہیں بچ سکتا ۔ یہی سبب تھا کہ بقول اعثم کوفی آپ نے ابن عباس ، ابن عمر ، اور محمد حنفیہ سے صاف فرما دیا تھا کہ افسوس تو اس بات کا ہے کہ یہ لوگ مجھ کو گھر میں بیٹھنے نہ دیں گے ۔ مجھ سے الجھیں گے اور اگر میں ان سے نکل کر کسی نامعلوم مقام پر بھی چلا جاؤں گا ۔ تو بھی ڈھونڈھ نکالیں گے ۔ اور بیعت یزید کے لئے مجبور کریں گے ۔ اور اگر انکار کروں گا ۔ تو قتل کر ڈالیں گے ۔ المختصر یزید

یزید نے جو کچھ کیا۔ سیاسی حیثیت سے نہیں کیا بلکہ محض خاندانی عناد کی وجہ سے خاندانِ رسالت کا استیصال منظور اور ان حضرات کی توہین و تذلیل مدنظر تھی ہم اس واقعہ کو قانون سیاست کی کسی دفعہ کے تحت نہیں پاتے، اور نہ دوسرے سلاطین عالم کی نظیر اس پر منطبق ہو سکتی ہے۔

شبہ دوم:۔ عبید اللہ بن زیاد یا دوسرے افسر جو ان مظالم یا بے ادبیوں کے مرتکب ہوئے وہ محض یزید کو راضی کرنے یا خوشامد کی وجہ سے تھا۔ عبید اللہ حاکم تھا اور یزید کی طرف سے اس مہم کی سرانجام دہی پر مامور تھا۔ ظاہر ہے کہ المامور معذور۔ ورنہ ان لوگوں کو حضرت سے ذاتی کاوش نہ تھی۔ تمام گورنمنٹوں کے ملازم اور ہوا خواہ ایسا ہی کرتے آئے ہیں۔

جواب:۔ مانا کہ عبید اللہ اور دوسرے کوفیوں نے حق نمک یا خوشامد سے طوعاً و کرہاً ایسا کیا لیکن کوئی شخص ایسی تاویلی حجت پر عنداللہ دنیا و آخرت سے بری نہیں ہو سکتا۔ جہاں تک تمام واقعات پر نظر ڈالی جاتی ہے اور تاریخی شہادتیں ہمارے پاس موجود ہیں۔ ان لوگوں نے خود وہ زیادتیاں کیں کہ شاید یزید ان کی اجازت نہیں دیتا، وہ اپنے افعال کی پاداش میں عنداللہ اور عندالناس بے شک قابل گرفت ہیں۔ خصوصاً ابن زیاد اور شمر جیسوں نے جس طرح کی قساوت اور شقاوت کا اظہار کیا۔ شاید یزید کے خیال میں بھی یہ باتیں نہ آئیں۔ تو کیا اس خوشامد یا ادائے حق نمک اور تعمیل حکم حاکم کے حیلے سے وہ لوگ بری الذمہ قرار پا سکتے ہیں۔ ہرگز نہیں۔ وَمَنْ یَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّۃٍ شَرًّا یَّرَہٗ ط

شبہ سوم:۔ بے شک ان لوگوں نے براہِ تملق یا اپنی کارگذاری کا اظہار کرنے کو عدیم المثال مظالم کا ارتکاب کیا لیکن جو جو سختیاں اور بے ادبیاں ان کی طرف سے ظہور میں آئیں ان کا یزید کو کس حد تک ذمہ دار سمجھا جائے ذرا اتحالیکہ

یزید کی جانب سے اس کے عامل کوفہ کے نام تفصیلی ہدایات کا آنا پایا نہیں جاتا۔ اس زمانہ میں گورنرانِ صوبہ جات کو ہر قسم کے ملکی و جنگی اختیارات تھے۔ وہ جس طرح مناسب سمجھتے صوبوں کا انتظام کرتے۔ یزید نے عبیداللہ کو گورنری کوفہ پر مامور کرتے وقت کوئی ایسا تفصیلی حکم نہ بھیجا تھا کہ حسینؑ کے ساتھ ایسا اور ایسا کرنا بلکہ اس کو صرف یہی حکم تھا کہ کوفہ میں جو انقلاب انگیز کوششیں کی جارہی ہیں۔ اور جو لوگ سلطنت کے خلاف ہتیار اٹھانے والے ہیں انہوں نے مسلم کے ہاتھ پر حسینؑ کی بیعت کرلی ہے۔ اور حسینؑ خود کوفہ کو آنے والے ہیں۔ اس شورش کا جس طرح ممکن ہو انسداد اور دفعیہ کردے۔ چنانچہ عبیداللہ نے ایسا ہی کیا۔ بلکہ اپنی ذاتی خباثت اور شقاوت سے حکم کی تعمیل اس طریقہ سے کی جو اپنی درندگی کے لحاظ سے تاریخ عالم میں نظیر نہیں رکھتا۔ ایسی حالت میں ان تمام مظالم کا بار یزید کے سر پر کیوں ڈالا جاتا ہے۔

جواب:۔ ہم اس کو تسلیم کرتے ہیں کہ یزید نے ایسے سفاکانہ احکام بالتفصیل نہیں بھیجے مگر وہ اس جرم سے یوں بری نہیں ہو سکتا کہ جو کچھ ہوا۔ اس کے حکم اور اس کی مرضی سے ہوا۔ میدانِ جنگ میں جو مواقع پیش آتے ہیں۔ اور ذمہ دار افسر جو جا و بے جا کارروائیاں کرگزرتے ہیں ان کے متعلق تفصیلی ہدایات مرکزی گورنمنٹ سے نہیں دی جاتیں لیکن ان کا بار ہمیشہ مرکزی گورنمنٹ پر پڑتا ہے۔ اگر یزید ایسا حکم خواہ وہ اجمالی ہی سہی نہ دیتا تو ان مظالم کی نوبت ہی کیوں آتی۔ ماموریکی کارروائیوں کی جوابدہی آمر ہی کو کرنی پڑتی ہے بلکہ ان تمام مظالم سے اس کی رضامندی صاف ظاہر ہے کہ وہ اپنے ماتحت افسروں کی کارگذاری سے بہت خوش ہوا۔ شاہانہ دربار آراستہ کیا۔ رسول اللہ کی ذریت اولاد کی نواسیوں کو دربار عام میں بلایا۔ رعونت اور خشونت سے پیش آیا۔ اور

اگر دنیا کے دکھاوے کے لئے اپنی بریت کی کوشش بھی کی تو صرف اتنا کہہ کر ٹال دیا کہ خدا ابن مرجانہ پر لعنت کرے کہ اس نے ایسے امر شنیع کا ارتکاب کیا۔ حبیب السیر میں لکھا ہے کہ:۔

"چوں یزید ملعون شنید کہ مردمان بر قتل امام حسین علیہ السلام نفرین ہمی کردند شمر و ہمراہانش بر حسب ظاہر خشونت در زید وگفت سوگند باخدائے در اطاعت شما بدون قتل حسین خوشنود لبودم لعنت بر پسر مرجانہ باد کہ با حسینؓ امر اقدام نمود"

لیکن یہ سب باتیں محض مکاری اور حیلہ جوئی کی تھیں۔ ابن اثیر تاریخ کامل میں لکھتے ہیں کہ:۔

"جب سر مبارک یزید کے پاس لایا گیا تو اس نے ابن زیاد کا مرتبہ بڑھایا اس کو انعام دیا اور اس کام سے بہت خوش ہوا"

اسعاف الراغبین اور صواعق محرقہ میں تحریر ہے کہ یزید نے صرف دنیا کے دکھانے حضرت امام حسینؓ کے حال پر اظہار ترحم کیا تھا۔ کیونکہ در پردہ اس کے خلاف اس سے باتیں ظہور میں آئیں کہ اس نے ابن زیاد کی تعظیم و ترفیع میں مبالغہ تام کیا حتیٰ کہ اس کو محلسرائے شاہی کے اس زنانہ حصہ میں۔ جہاں کوئی شخص نہیں جا سکتا تھا۔ بلوایا۔ یزید کا یہ کہنا کہ اگر میں حاضر ہوتا۔ تو حسینؓ کو معاف کر دیتا۔ براہ نفاق و فریب دہی عوام تھا ورنہ اس نے قاتلان حسینؓ سے کسی قسم باز پرس نہیں کی۔ صرف ایک شخص کو جس نے سر مبارک پیش کرتے ہوئے فخریہ اشعار پڑھے تھے قتل کرا دینا بیان کیا جاتا ہے مگر اس کی وجہ بھی یہ پائی جاتی ہے کہ اس نے حضرت کو خیر الناس کہا تھا۔ پھر ان مظالم کی ذمہ داری یزید پر عائد نہ ہوگی تو کس پر عائد ہوگی جبکہ شمر نے بھی سر دربار یزید کو ہی ملزم قرار دیا تھا۔

شبہ چہارم۔ جب بقول علمائے امامیہ خوف جان و خوف مال خوف آبرو کے وقت تقیہ ضروری ہے اور تمام انبیاء خصوصاً امیرالمومنین اور دوسرے ائمہ اہل بیت علیہم السلام نے ضرورت کے وقت ایسا کیا تو پھر کیا وجہ تھی۔ کہ امام حسین علیہ السلام نے جان و مال و آبرو تینوں کی بربادی و تباہی منظور فرمائی اور تقیۃً بیعت یزید کر کے کیوں اس بلا کو سر سے نہ ٹالا۔ جیسے کہ علی مرتضیٰؑ اور حسن مجتبیٰ سے کیا تھا۔

جواب:۔ یہ بات قابل غور ہے حسینؑ کی حالت کا موازنہ سابقہ حالتوں سے نہیں ہوسکتا کیونکہ یہ دونوں بزرگوار بیعت یزید پر مجبور نہ کئے گئے تھے نہ اس کا زمانہ تھا تک اسلام کا زمانہ تھا حسینؑ اگر تقیۃً بھی ایک فاسق و فاجر کی بیعت کر لیتے تو بھی اس بیعت کا وہی اثر دنیائے اسلام پر پڑتا۔ جو حقیقی بیعت کا پڑتا اور وہ اسلام کے لئے سم قاتل ہوتا۔ اگر یزید بیعت پر مجبور نہ کرتا تو حسینؑ کی زندگی اسی طرح بسر ہوتی جس طرح علیؑ اور حسنؑ کی ہوئی تھی۔ لیکن نہیں اب سلطنت کی پالیسی دوسرے ڈھانچہ میں ڈھلی ہوئی تھی علی مرتضیٰ اور حسن مجتبیٰ کے ہمعصر حکومتوں نے ظاہری تشدد کو خلاف مصلحت سمجھا تھا۔ لیکن یزید نے اپنے سابقین کی مصلحت سے قدم آگے بڑھایا۔ اس لئے حضرت کا وہ موقعہ نہیں رہا تھا۔ جو آپ کے برادر عالیمقدار کو رہا تھا۔ تاہم حسینؑ اپنے ہر عمل سے ظاہر کر رہے تھے۔ کہ ہم اپنے بزرگوں کی طرح خاموش رہیں گے۔ اگر ہمارے ساتھ بھی وہی مصلحت برتی جائے گی جو برتی جاچکی یعنی جس طرح انہوں نے بیعت کر کے خود کو حکومت کے افعال کا پیرو اور ذمہ دار بنانا قبول نہیں کیا اسی طرح ہم یزید کی بیعت کر کے اس کے افعال کو امت محمدیہ کی نگاہ میں مستند نہیں قرار دے سکتے گو اتنی آڑ کا ہونا اس وقت اسلامی روح کی ترقی کا باعث نہ بھی رہتا۔ ہم لوگ آپ کی عدم بیعت یا علیحدگی

سے اتنا ضرور خیال کرسکتے تھے کہ آخر کسی خاص وجہ سے اہل بیت رسول کا خلیفہ وقت کی نسبت ایسا خیال ہے۔ اسلام کی حقیقی روح کی اسی قدر بقا تھی۔ مگر حضرت کا بیعت کر لینا خواہ وہ تقیۃً ہی ہوتا اس روح کو فنا کر دینا تھا۔ جسے علی مرتضیٰ اور حسن مجتبیٰ نے امتحان خیز وقتوں میں قائم رکھا تھا اصلاب شامخہ اور ارحام طاہرہ کی توریث معروف و منکر کی تعلیم اپنے جد بزرگوار پدر نامدار اور برادر عالیمقدار کی تربیت کے بعد یہ کیونکر ہو سکتا تھا کہ حسینؑ یزید کے سامنے جھک کر ان تمام حاصول کو فنا کر دیتے اور اس بڑے اور کٹھن امتحان کے وقت خوف یا لالچ سے اصول وخاصہ کی قربانی منظور فرما لیتے حسین نے ایک روشن ضمیر مدبر کی طرح اپنے ارادہ کے نتائج کو تمام دنیا پہ ظاہر کر دیا۔ اور باوجود جان و مال وآبرو کے نقصان کا ہل کے اپنے علوئے نفس حمایتِ اسلام اور احقاقِ حق کی وہ شاندار اور تابناک نظیر قائم کی جس کے سامنے اولین وآخرین کے استقلال اور عزم کے افسانے گرد ہیں۔

شبہ پنجم جب جناب امیر نے امیر معاویہ سے مصالحت کر کے پنچائتی فیصلہ کو منظور کر لیا۔ اور حضرت امام حسنؑ نے خلافت سے بالکل ہی دست بردار ہو کر عرب و عراق اور فارس بھی بنی امیہ کے حوالے کر دئیے تو حضرت امام حسینؑ کو پھر اسی دعوے کو سرسبز کرنے کی کیا ضرورت تھی اور جب نہ ان کے پاس لشکر ہی تھا نہ سامان تو پھر ایسے شخص کے خلاف جس کی حکومت سرحدِ کوہستان ہندوکش سے قسطنطنیہ کی دیواروں تک اور بحر ہند سے بحر ظلمات تک پھیلی ہوئی تھی۔ جارحانہ کارروائی میں سوائے تباہی و بربادی کے کیا نتیجہ نکلا۔

جواب ۱۔ درحقیقت یہ خیال محض غلط ہے۔ حضرت نے ہرگز ایسی کوشش نہیں کی کہ یزید کی حکومت کو الٹ دیں۔ خلافت دراصل نیابتِ رسول اللہ کا نام ہے نہ کہ حکومت وسلطنت کا اور اگر یہی مانا جائے تو آپ جناب ختمی مآبؐ کے

نواسے اور بہ مقابلہ یزید ہر طرح خلافت و امارت کے اہل تھے۔ اور اس منصب جلیل کا وارث آپ کے سوا کوئی مستحق نہ تھا۔ اور نہ ہو سکتا تھا۔ اگر حضرت اپنے طلب حق کے لئے کوشش بھی کرتے۔ وہ ہر طرح جائز تھی۔ یزید کے باپ نے جب حضرت امام حسن سے معاہدہ کیا تو اس میں ایک شرط یہ تھی کہ امیر معاویہ اپنی زندگی تک خلیفہ رہیں۔ ان کے بعد امر خلافت پھر اپنے مرکز یعنے اہل بیت رسالت کی طرف عود کرے جیسا کہ ابن حجر عسقلانی نے فتح الباری شرح صحیح بخاری میں اور ابن عبدالبر نے استیعاب میں اس کی صراحت کی ہے۔ لیکن انہوں نے خلاف ورزی کر کے یزید کو اسلامی دنیا پر مسلط کر دیا۔ یزید کی حکومت غاصبانہ فاسقانہ بلکہ مرتدانہ تھی ایسی حالت میں کہ فرماں روائے وقت کی جو امیر المومنین اور خلیفۃ المسلمین کے لقب سے پکارا جاتا تھا بد مذاہب اور فاجرانہ حرکات و سکنات کا اثر بڑی تیزی کے ساتھ مسلمانوں میں اشاعت پذیر ہوتا جاتا تھا۔ ضرور تھا کہ ہادی عالم کا نواسہ اور وارث مستحق جس کے جد امجد نے بڑی جانفشانی سے دین برحق کی اشاعت فرمائی تھی۔ حق کو اپنے مرکز پر قائم کرنے کے لئے ساعی ہو۔ ہم نہیں سمجھ سکتے کہ اپنے حق کے لئے کوشش کرنا کس طرح ناجوازی کا مرادف و ہم معنے ہو سکتا ہے تاہم کبھی آپ نے خلافت ظاہریہ کے واسطے کوشش نہیں فرمائی لیکن مخالفین نے چین سے بیٹھنے نہیں دیا اس کے بعد جو کچھ آپ نے کیا بحالت مجبوری کیا اور اس کے محرک وہ اسباب تھے جن کو ناظرین ہمارے متعدد مضمونوں میں پڑھ چکے ہیں۔

شبہ ششم: جن لوگوں نے آپ کو براہ خیر خواہی اور ہمدردی روکنا چاہا یا صرف مکہ میں قیام کی صلاح دی۔ یا سفر عراق سے مانع ہوئے ان کے مشورہ پر آپ نے عمل نہ کیا۔ عبداللہ ابن عباس کی اس باوقعت رائے پر بھی کہ پہلے آپ اپنے دوستوں کو بذریعہ خطوط اطلاع دے کر اپنا ہمخیال بنائیں۔ یا کم سے کم یمن میں جہاں آپ کے ہوا خواہ بکثرت ہیں اول تشریف لے جا کر ان کی جمعیت کے ساتھ ارادہ

عراق فرمادیں۔ آپ متوجہ نہ ہوئے یہ تو دیدہ و دانستہ ہلاکت میں پڑنا تھا۔ اگر ایسا نہ تھا تو کیا تھا۔

جواب:۔ حرمین شریفین میں حضرت کا قیام ممکن نہ ہونے کے وجوہ پر ہم بحث کر چکے ہیں جب حرمین میں ایسے اسباب موجود تھے تو ابن عباس۔ ابن جعفر ابن عمر وغیرہم کا مدینہ واپس چلنے یا مکہ میں رہنے کی صلاح دینا سوائے محبت نیک نیتی اور ہوا خواہی کے اور کس امر پر محمول ہو سکتا ہے۔ لیکن یہ سمجھ لینا چاہیئے کہ مذکورۂ بالا بزرگوار یا تو واقعات سے ناواقف تھے یا ان سے چشم پوشی کر رہے تھے۔ کیا حسینؑ مدینہ سے جلا وطن ہو کر نہ آئے تھے۔ اور کیا مکہ میں ان کی گرفتاری کی تجویزیں نہیں ہو رہی تھیں حسینؑ بیعت ہرگز نہ کرتے۔ اور شہید ہوتے جہاں کہیں ہوتے البتہ یہ ان کے اختیار میں تھا کہ خانۂ کعبہ کی حرمت ضائع نہ کریں۔ چنانچہ آپ نے ایسا ہی کیا اور اپنی مجبوریوں سے ایسی نازک اور خطرناک حالت اختیار کر لی کہ حج سے ایک ہی دن پہلے مکہ کو چھوڑ دینے کے سوائے کوئی چارہ نہ رہا۔ موقع کی اس نزاکت کا احساس حسینؑ کو خوب تھا۔ مگر ابن عباس اور ابن عمر آپ کی حالت خوف اور یزید کی طرف سے نشدد ہونے کے قرائن سے واقف نہ تھے۔ بلکہ صاف کہہ رہے تھے کہ یزید سے بیعت کر کے اس بلا کو سر سے ٹالئے۔ ابن عمر کی بھی درخواست تھی کہ اگر آپ یہ چاہتے ہیں کہ یزید سے بیعت نہ کریں تو اس کے لئے ضرور آپ کو مجبور کیا جائے گا۔ دشمن وطن میں آپ کو اطمینان سے بیٹھنے نہیں دیں گے۔ تاوقتیکہ آپ بیعت نہ کریں۔ اگر معترضین کے نزدیک عقلمندی اور دانائی کا معیار یہی ہے کہ اپنے تحفظِ جان کے لئے ہر ذلیل فعل کے آگے سر جھکا دینا چاہیئے۔ تو علوئے نفس ایثار، حمیت اور کسی بڑی وجہ کے لئے قربانی یا شہادت کا شریف ترین مفہوم پامال ہیں۔ دنیا میں موجود نہ ہوتیں۔ حسینؑ نے اپنے علم و ارادہ سے عزت کی موت کو

ذلت کی زندگی پر ترجیح دی جن لوگوں نے آپ کو یہ صلاح دی تھی کہ یمن وغیرہ کو خطوط لکھ کر اپنے ہوا خواہوں کو اطلاع دیجئے ان کی یہ صلاح اس وقت قابل عمل ہوتی جب آپ کو یزید سے جنگ کرنا اور استحقاق خلافت کے لئے ہتھیار اٹھانا مقصود ہوتا کوفہ کا قصد آپ نے محض کوفیوں کے اصرار اور طلب ہدایت پر کیا تھا اور اس سے آپ کو صرف ہدایت خلق اور اصلاح اُمت جا منظور تھی - جو بحیثیت ہادی اسلام آپ کا اہم فرض تھا مسلم ابن عقیل کو کوفہ روانہ کرنے سے بھی یہی مدعا تھا اور یہی ان کو ہدایت کی گئی تھی کہ جمعہ وجماعت اور قضائے شرعی کا انتظام کریں حکومت کے عزل ونصب کے متعلق ان کو کوئی ہدایت نہیں کی گئی تھی جیسا کہ تمام واقعات سے آفتاب کی طرح روشن ہے -

حسین نے مکہ سے عراق وشام کا رُخ کیا کیونکہ یہی سرزمین تھی جسے بنی امیہ کے پروپگنڈے نے زیادہ زہر آلود بنا دیا تھا اور حسین کی پہلی توجہ کی مستحق تھی حسین کے اہل وعیال اور مخصوص احباب کے علاوہ کچھ اور لوگ بھی مکہ اور اثنائے راہ میں شریک ہو گئے تھے - مگر بار بار حسین کے اس اظہار خیال سے کہ میں اپنے مقتل کی طرف جا رہا ہوں راستہ سے ان کی تعداد کم ہوتی گئی حسین اپنا فرض سمجھتے تھے کہ میں اپنے ساتھیوں کے مغالطہ کو دور کر دیں اور وہ یہ سمجھ لیں کہ دولت وحکومت حسین کا انتظار کر رہی ہے یہ بھی حسینؑ کا انتہائی تدبر اور دور اندیشی تھی کہ کوفہ والوں کی متواتر درخواستوں پر اپنے چچا زاد بھائی مسلم کو کوفہ بھیج کر یہ دکھا دیا کہ تمہارے ارادے کس قدر بلند اور تمہاری ہمتیں کس قدر مضبوط ہیں - لیکن کوفہ والوں نے حکومت کی ذرا سی آنکھ دکھانے پر مسلم کا ساتھ چھوڑ دیا اور حسین کا تن تنہا سفیر نہایت بے دردی اور مکر وفریب کے ساتھ شہید کر دیا گیا حسینؑ جانتے تھے کہ ان کو کوفہ تک پہونچنے کا موقعہ نہیں دیا جائے گا اور کوفہ والوں کا

مطالبہ باقی رہ جائے گا لہذا آپ نے اپنے جان نثار بھائی کو بھیج کر کوفہ والوں کا حق اپنی گردن سے اُتار دیا، اور حجت تمام کر دی اب ان کو الزام دینے کی گنجائش نہ رہی لیکن ابھی دنیائے اسلام کا حق باقی تھا جس کو ادا کرنے کے لئے حسینؑ نے آگے قدم بڑھایا۔ اگر حسینؑ نے حکومت کی تمنا میں ترکِ وطن کیا ہوتا تو موقعہ تھا کہ شہادت مسلم کی خبر سے سبق حاصل کر کے اپنے ارادے سے باز رہتے اور مدینہ واپس ہو جاتے یا کسی اور طرف کا رُخ کرتے۔ یا مسلم کے قتل کی خبر اپنے ہمراہیوں سے پوشیدہ رکھتے ان کی ہمتیں بڑھاتے۔ سلطنت کے بڑے بڑے عہدوں کا لالچ دیتے مگر ایسا نہیں ہوا حسینؑ کا مقصد تو درجہ شہادت حاصل کر کے احیائے اسلام تھا نہ کہ حصول حکومت و سلطنت۔

شبہ ہفتم:۔ جناب سید الشہداء کو جس وقت مسلم بن عقیل کی شہادت کی خبر ملی تو کیوں نہ پلٹے اور کوفہ ہی کیوں روانہ ہوئے جہاں سے ایسی متوحش خبر ملی تھی۔

جواب:۔ بے شک حضرت کو شہادتِ مسلم کی خبر راہ میں ملی جس کو آپ نے صحیح باور فرمایا۔ لیکن "کیوں نہ پلٹے" کے لئے کہا جا سکتا ہے کہ کہاں پلٹتے۔ اگر اس سے مراد مکہ معظمہ یا مدینہ منورہ ہوں تو وہاں کے حالات اوپر بیان کئے جا چکے ہیں کیا یہاں سے دشمن سے مفر کی صورت تھی کسی ایسے شخص کے لئے جس کو آپ کی طرح مشکلات کا موقعہ پیش آتا۔ ان دونوں مقامات پر قیام ناممکن تھا اگر ان مقامات سے نکلنے میں ذرا بھی بے احتیاطی ہوتی تو گرفتاری یا قتل سے کوئی شے مانع نہ تھی مکہ اور مدینہ آخر تھے تو یزید کے ہی علاقے۔ اب حضرت کے لئے یہ بھی ممکن نہ تھا کہ کہیں اور چلے جائیں اس لئے آگے کے مقامات پر فوجیں پڑی ہوئی تھیں۔ تمام راستوں کی ناکہ بندی ہو رہی تھی۔ اور

یہ علاقہ نہر بہتا ہوا مکہ کی طرف آرہا تھا۔ جابجا مخبر چھوٹے ہوئے تھے۔ عام راستوں اور چشموں کے علاوہ حصین بن نمیر کی طرف سے ریگستانی مقام پر فوجی چوکیاں قائم کردی گئی تھیں۔ حضرت کسی طرف کو بھی رخ کرتے۔ دشمن سایہ کی طرح ساتھ لگے رہتے۔ اگر آپ کی نقل و حرکت اخفا کے ساتھ ہوتی تو یہ بھی ممکن نہ تھا کیونکہ حضرت تن تنہا نہ تھے بلکہ سو۔ سوا سو کے قریب عزیز ترین رفقا ساتھ تھے۔ اس لئے اتنے بڑے قافلہ کا دشمن سے بچنا بھی اس کے مسلح جماعت سے ممکن نہ تھا اب رہا یہ سوال کہ جانب کوفہ ہی کیوں روانہ ہوئے۔ تو کوفہ کو روانہ ہونے کی وجہ بجز اس کے کچھ نہ تھی کہ ایک غیر محفوظ مقام پر دوسرے غیر محفوظ مقام کو آپ نے اس سبب سے ترجیح دی کہ آپ نے اپنے موقعہ کے احساس کے لحاظ سے اس اختیار تمیزی کے صرف کا ایک اہم اور نازک موقعہ تھا خصوصاً اس حالت میں کہ بقول ابن اثیر جب مسلم کی شہادت کی خبر ملی اور سوال ہوئی کہ کہاں جائیں تو بعض اصحاب نے یہ بھی عرض کی کہ آپ مسلم نہیں لوگ آپ کی خود مدد کریں گے۔ اس سے ظاہر ہے کہ اگرچہ نصرت کا موقعہ اب امید اور یقین کے درجہ پر نہ تھا لیکن اس کے سوا کوئی چارہ کار ہی نہ تھا نہ یہ ممکن تھا کہ آپ درمیانی مقامات میں سکونت اختیار فرماتے اس لئے کہ عرب کے جغرافیائی موقع کے ماورا جس میں بے آبی کی وجہ سے ہر جگہ قیام ممکن نہیں۔ اور آبادیاں وہیں ہوتی ہیں جہاں کھانے پینے کی چیزیں دستیاب ہوسکتی ہوں اس کے ماسوا حفاظتی حیثیت سے بھی یہ امر احتیاط کے خلاف تھا کہ قیام کرنے سے آپ خود کو ایک خطرناک مقام پر رکھتے جس کے آگے اور پیچھے دشمنوں کی توپوں یا فولادی حلقہ میں گھر جاتے قطع نظر ان حالات کے حضرت کا بنو عقیل کے اس فیصلہ پر کہ مسلم کا عوض لیں گے۔ یا شہید ہوں گے آگے بڑھنا۔ ایک وجدانی اور اخلاقی تصفیہ تھا۔ بہرحال سوائے اس تصفیہ کے جو کیا گیا اور کوئی صورت ممکن نہ تھی اور آپ اس طرح گھر چکے

تھے کہ اب مامن و مفر کا کہیں ٹھکانہ نہ رہا تھا۔ کسی طرف جاتے نتیجہ وہی ہوتا۔ جو میدان کربلا میں ہوا۔

شبہ ہشتم:- بصورت متذکرہ صدر حُر سے ملاقات کے بعد کیوں مراجعت کا قصد کیا جب کوفہ کا عزم کر چکے تھے۔

جواب:- حُر بن یزید ریاحی اور حضرت سید الشہداء جو گفتگو ہوئی اس میں آپ کی تجویز ایک یہ بھی تھی کہ ہمیں جانے دو ہمارا جہاں جی چاہے۔ یا ہمیں مکہ واپس جانے دو۔ یا ہم جہاں سے آئے ہیں وہیں چلے جائیں مگر حُر اسے قبول نہ کر سکا۔ اور طے یہ ہوا کہ آپ ایسے راستے چلیں جو نہ حجاز کی طرف جاتا ہو اور نہ کوفہ کی طرف مگر حضرت اس سوال سے صرف اس امر کی تصدیق کرنا چاہتے تھے کہ حقیقتاً دشمن اس امر پر راضی ہیں یا نہیں کہ ہم ان کی نگرانی سے محفوظ رہ سکیں لیکن حر کے جواب اور انداز نے طے کر دیا کہ حضرت مکہ اور کہیں آزادی سے نہیں جا سکتے حر کو ابن زیاد کا اس کے سوا دوسرا حکم نہ تھا کہ حسین کو نہ چھوڑنا۔ یہاں تک کہ میرے پاس لے آئے اس کے بعد پھر وہی سوال تھا کہ یا تو بیعت کرو۔ یا لڑائی کے لئے تیار رہو۔ حضرت نے حُر کی مذکورۂ صدر رائے کو منظور فرما کر اس امر کا ثبوت دیا کہ ہم اس وقت تک جنگ کے لئے آمادہ نہیں۔ جب تک کہ بالکل مجبور نہ کر دئے جائیں اور جب یہ یقین ہو چکا تھا کہ ہم گھرتے جاتے ہیں تو کوفہ کے سامنے ہی کیوں نہ گھرتے۔ جہاں برائے نام ہی سہی لیکن کچھ تو امید تھی اور شہید ہونے کی حالت میں اپنے صادق الوعدی اور کوفیوں کے وعدہ خلافی کے اظہار کے علاوہ احقاق حق اور ابطال باطل کی ایک زریں مثال اور لاثانی نظیر قائم کرنی تھی۔

شبہ نہم:- نویں یا دسویں محرم کو عمر سعد سے واپسی کی اجازت کیوں

مانگی۔ درحالیکہ ایسی استدعا ان کے عزم و استقلال کے منافی تھی۔

جواب: اگرچہ بعض مورخوں نے لکھا ہے کہ حضرت نے عمر سعد سے دوران گفتگو میں یہ شرط بھی پیش کی تھی کہ واپس جانے دیے جائیں لیکن دراصل اس کی کچھ حقیقت نہیں۔ حضرت نے ہرگز ایسی کوئی درخواست نہیں کی۔ چنانچہ ابن اثیر اپنی تاریخ کامل مطبوعہ مصر جلد ۴ صفحہ ۲۲ میں لکھتے ہیں:۔

من عقبۃ بن سمعان انہ قال صحبت الحسین من المدینۃ الی مکۃ ومن مکۃ الی العراق و لم افارقہ حتی قتل وسمعت جمیع مخاطباتہ الناس الی یوم مقتلہ فواللہ ما اعطاھم مایتذاکر الناس من انہ یضع یدہ فی ید یزید ولا ان یسیروہ الی ثغر من ثغور المسلمین۔	"عقبہ بن سمعان کہتے ہیں کہ میں مدینہ کر مکہ اور مکہ سے عراق تک امام حسینؑ کے ساتھ رہا اور کبھی آپ سے جدا نہیں ہوا۔ آپ کی ہر بات سُنی مگر خدا کی قسم حضرتؑ نے کبھی وہ خواہشیں نہیں کیں جو لوگ بیان کرتے ہیں کہ حضرت نے یزید کے پاس جانے کو کہا۔ یا مسلمانوں کی کسی سرحد پر نکل جانا چاہا" اور اگر بالفرض ایسا ہوا بھی تو واپسی کا یہ سوال بلحاظ نوعیت حُر

اور عمر دونوں سے ایک حیثیت کا تھا۔ البتہ درجہ اور موقعہ میں فرق تھا۔ حُر صرف ایک دستہ کا افسر اور عمر تمام فوج کا سالار اعظم تھا اگرچہ ابتدا میں حُر کا منصب اس لحاظ سے کہ اس کی براہ راست ابن زیاد سے خط وکتابت تھی کسی کے ماتحت نہ تھا۔ تاہم حُر کا موقعہ ابن سعد جیسا نہ ہوسکتا تھا اس کے علاوہ یہ امر بھی تھا کہ عمر قبیلۂ قریش کے ایک ممتاز رکن۔ سادس الاسلام۔ فاتح عراق اور رسول اللہؐ کے ماموں زاد بھائی کا بیٹا تھا۔ موقعہ کا فرق یہ تھا کہ اگرچہ حر کو ابن زیاد نے حضرت کو روک لینے کا حکم دیا تھا مگر جنگ کی اجازت نہیں دی تھی۔ نہ حضرت کو اب تک

عملاً یقین تھا کہ بغیر جنگ اور کشت وخون کے ہماری دشمن کسی اور امر پر راضی نہیں ہیں۔ مگر اب کربلا میں یہ موقعہ نہ رہا بلکہ متواتر فوجوں کی آمد اور ابن سعد کے نام سخت احکام نے کوئی شبہ باقی نہ رکھا تھا کہ دشمن حضرت سے کیا چاہتے ہیں۔ حُر کے انداز سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ اسے اجازت نہ تھی کہ حضرت کی ایسی تجویز کو ابن زیاد تک پہونچا دے۔ برخلاف اس کے عمر سعد بحیثیت سپہ سالار لشکر امور کے متعلق سلسلہ مراسلت جاری کر سکتا تھا۔ اب جب کہ بظاہر بیعت یا جنگ کے سوا اور کوئی صورت باقی نہ رہی تھی اور آپ بائیس بائیس ہزار دشمنوں میں گھرے ہوئے تھے تو آپ کا یہ سوال بغرض رفع فساد صلح وامن کی ایک تحریک تھی۔ اس کے علاوہ اتمام حجت بھی مقصود تھا۔ بے شک اگر آپ بلا بیعت کئے جانے دیئے جاتے تو آپ کو نہ مخالفت تھی۔ نہ مزاحمت بلکہ آپ اسی نیوٹرل حالت پر عود کرتے جس میں سوال بیعت سے پہلے تھے اور جس پر آپ کے والد بزرگوار اور برادر عالی مقدار کار بند رہے تھے۔

شبہ دہم:- بنی امیہ پر ناحق الزام لگایا جاتا ہے۔ اہل بیت پر ظلم کرنے والے تو خود شیعیان علی تھے۔ جنہوں نے بنی امیہ سے بڑھ کر بے وفائیاں اور ظلم آرائیاں خاندان رسالت کے ساتھ کیں شیعوں نے ہی حضرت کو بلایا۔ شیعوں نے ہی بیعت کرکے مسلم بن عقیل کو تنہا چھوڑ دیا۔ اور ان کے قتل کا تماشہ دیکھا۔ شیعہ ہی آپ کے مقابل صف آرائے جنگ ہوئے۔ انہوں نے ہی بے وفائی کی۔ انہوں نے ہی آپ پر پانی بند کیا۔ شیعوں نے ہی ان کو شہید کیا۔ پھر لطف یہ کہ شیعہ ہی روتے چلاتے ہیں۔

جواب:- اس کا جواب ہم سلسلہ نظامیہ کے سرگروہ خواجہ حسن نظامی دہلوی کے ان الفاظ سے دینا کافی سمجھتے ہیں جو ممدوح نے محرم نامہ حصہ دوم کے صفحات ۳۱-۳۲ میں تحریر کئے ہیں (وھوہذا)

"اس میں شک نہیں کہ شیعیان کوفہ و عراق پر یہ الزام بالکل صادق آتا ہے۔ مگر اس سے شیعیت ملزم قرار نہیں پا سکتی۔ کیونکہ اگر کوئی مسلمان شراب پئے۔ یا چوری کرے تو ان گناہوں کے سبب سے اس کی ذات اور اس کا نفس مجرم ہوگا۔ مذہب اسلام پر دھبہ نہیں آئے گا اسی طرح محبِ اہل بیت کی صداقت اہلِ کوفہ کے اعمال سیئہ سے قابلِ الزام نہیں ہو سکتی۔ رہا یہ امر کہ بنی امیہ نے ایسا ظلم نہیں کیا۔ جیسا شیعیانِ کوفہ و عراق کے ہاتھوں سے ظاہر ہوا۔ اس کا جواب یہ ہے کہ اگر کوئی کسی کے تلوار مارے تو وہ تلوار کو اس زخم کا الزام دے گا یا مارنے والے کو ہم تو ایک کتے کو دیکھتے ہیں کہ جب اس کے پتھر مارا جائے تو وہ پتھر مارنے والے پر بھونکتا ہے۔ پتھر کو کچھ نہیں کہتا کیونکہ وہ جانتا ہے کہ پتھر تو بے اختیار تھا۔ قصور اس کا ہے جس نے پتھر کو مجھ پر پھینکا۔ مانا کہ اہل کوفہ کے ہاتھوں یہ بے حوانیاں اور سفاکیاں ہوئیں مگر ان کے کرانے والے تو بنی امیہ تھے۔ حکم تو ان کی زبانیں دیتی تھیں۔ تجویزیں تو ان کے دماغ سے نکلتی تھیں لہذا وہی ہر گناہ کے ملزم ہیں ان ہی پر ہر ظلم کا بوجھ ہے۔ اہل کوفہ کا قصور اتنا تھا کہ ان کے کمزور دل بنی امیہ کی پرزور بالیسی اور چالاکی سے دب جاتے تھے۔ اُن کے خیالات بنی امیہ کی ساحرانہ تقریروں سے آن کی آن میں آسمان سے زمین پر گر پڑتے تھے اور پھر وہ ان کے ہاتھوں کی تلواریں بن کر خود اپنے ہی وجود پر مارتے تھے۔ اور اپنے مقتداؤں کی شان کو بھول کر گستاخیوں سے پیش آتے تھے یہ ان کی قومی ذاتی۔ اور میں کہوں گا کہ عراقی سرزمین کی پیدا کردہ خصلت تھی اور وہ ہرگز ایسے محبِ اہل بیت نہ تھے جن کے دلوں کو تاثرات محبت نے مستحکم کر دیا ہو اور ان کے ارادے حقیقی شیعیت سے اتنے بلند ہو گئے ہوں کہ کسی مزر رساں اغوا کی رسائی بھی وہاں تک نہ ہو سکے"۔ یہ آگے فرماتے ہیں "اگرچہ میں شیعہ مذہب کے اصول کو تسلیم نہیں کرتا"۔ لیکن خاندانِ رسالت کی محبت ایک ایسی

چیز ہے جس میں میری اور ان کی شرکت ہے کوفہ کے اشرار سے مشابہت دینا ان صادق محبانِ اہل بیت کی توہین ہے جس کے دل سراپا صداقت ہیں کوفیوں کو شیعہ کہنا شیعیت کی بے حرمتی کرنا ہے (انتہی کلامہ)"

غم حسین علیہ السلام کا نشو ونما
عزاداری اور تعزیہ داری کی ابتدا

جب سے دنیا میں نسلِ انسانی کا نشو ونما ہوا۔ اِس وقت تک بے شمار ہولناک واقعات اور دردانگیز حادثات رونما ہو چکے ہیں اور آئندہ بھی ہوتے رہیں گے۔ حریص اور سنگ دل انسانوں نے اپنی ہی ابنائے نوع کو ایسی جلادانہ سفاکیوں کا تختۂ مشق بنایا ہے جس کو سن کر کلیجہ تھرا جاتا ہے جن کے خیال سے بدن کے رونگٹے کھڑے ہوتے ہیں اس قسم کی جفاکاریوں اور ظلم آرائیوں کا ایک لگاتار سلسلہ ہے۔ جو نسلِ انسانی کے ساتھ شروع ہوا ہے اور اس کے ساتھ ہی جاری رہے گا۔ تاریخ میں ایسی مثالیں بے شمار موجود ہیں کہ انسانی حرص وآز کی بدولت خاندان کے خاندان نیست ونابود کر دئے گئے۔ نمودار قومیں غارت ہوگئیں۔ سرسبز وشاداب ملک تباہ ہوگئے۔ لاکھوں ہستیاں آغشتۂ خون وخاک ہوئیں انسان تو انسان حیوان تک تلوار کے گھاٹ اتار دئے گئے۔ عظیم الشان شہر کھود کر پھینک دئے گئے۔ وسیع علاقے آگ اور تلوار کی نذر ہوگئے۔ یہ سب کچھ پہلے ہو چکا ہے اور آئندہ بھی ہوتا رہے گا۔ لیکن کیا کسی مصیبت کا ایسا عالم گیر اثر پڑا۔ جیسا کہ واقعہ کربلا کا اور کیا کسی غم انگیز واقعہ کو اس طرح یاد کیا جاتا ہے جس طرح حادثہ عاشورہ کو۔ یہ ایک ایسا سوال ہے کہ ہر شخص بہ آسانی اس کا جواب نفی میں دے سکتا ہے۔ آخر کیا وجہ

ہے کہ دنیا کے دوسرے الم انگیز واقعات تاریکی کے پردہ میں آگئے اور ان کا ذکر صرف تاریخی صفحوں میں محدود ہو کر رہ گیا مگر اس قاعدہ کلیہ کے برعکس حسینی واقعہ کا ذکر ہر طرح کی مزاحمتوں اور مخالفتوں کے ہوتے ہوئے بھی حیرت خیز سرعت کے ساتھ روز بروز بڑھتا رہا۔ یہ اس واقعہ کی حقانیت اور للہیت ہے۔ جو مقناطیسی جذب کا اثر دکھا رہی ہے۔ یہ خدائی قدرت کا ایک کرشمہ ہے جو دلوں کو تسخیر کر رہا ہے جس روز سے شہادت حسینی کا واقعہ پیش آیا۔ تیرہ سو برس گزر جانے پر بھی آج تک اسی طرح تازہ ہے اور ایک نامعلوم زمانہ تک یوں ہی تازہ رہے گا جس کا روکنا نہ کسی طاقت کے امکان میں ہے نہ کسی قوت کے۔ یہ وہ زخم ہے جو آج تک مندمل نہیں ہوا اور ہمیشہ ہرا رہے گا۔ جس میں حسینؑ کی محبت اور اسلام کی صداقت کی کچھ بھی جھلک ہے اس سے اس غم کا اثر کبھی محو نہیں ہو سکتا۔ یہی وہ غم ہے جس میں قبل از وقوع واقعہ حضرت خاتم الانبیا ہی نہیں بلکہ انبیائے سلف بھی روئے ہیں جس کی دلشہری نہیں شجر و حجر بھی متاثر ہوئے ہیں۔

بعد واقعہ سب سے زیادہ سید الساجدین علی ابن الحسین جنھوں نے اس خونی منظر کو آنکھوں سے دیکھا تھا اس سے متاثر ہوئے اور اپنی بقیہ حیات تک جس کا زمانہ ۳۴ برس کا ہے ہمیشہ روتے رہے۔ حضرت رباب بنت امرالقیس جو جناب سید الشہداء کی عزیز ترین بی بی تھیں۔ ایک برس تک چھت کے نیچے نہ بیٹھیں اور جب تک زندہ رہیں محزون و مغموم رہیں۔ اہل بیت برابر سوگ میں رہے اور کبھی اسباب راحت و تزئین پر التفات نہ کیا جب تک عبداللہ ابن زیاد کا سر مختار بن ابو عبیدہ ثقفی نے مدینہ میں نہ بھیجدیا۔

شیخ صدوق امالی میں بہ سند ابو عمارہ شاعر لکھتے ہیں کہ جس وقت حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام کے سامنے ذکر حسین ہوتا تھا شام تک کوئی حضرت

کو ہنستے نہ دیکھا تھا۔ آپ کے حضور میں جعفر ابن عفان، عبداللہ بن غالب ابو ہارون مکفوف وغیرہ مرثیہ پڑھتے تھے۔ حضرت اس کا بھی اہتمام فرماتے تھے کہ حرم محترم بھی سنیں اور کبھی یہ بھی ہوتا تھا کہ بس پردہ سے یا اَبَتَاہ کی آواز آجاتی تھی۔ حضرت امام رضا علیہ السلام کے دربار میں دعبل خزاعی مرثیہ پڑھتا تھا۔ اور آپ بھی اپنے جد بزرگوار کی اہتمام فرماتے تھے۔

صاحب ناسخ التواریخ لکھتے ہیں کہ سلطنت علوئین مصر کے زمانہ میں امیر سیف الملک اور قاضی مومن وغیرہ حضرت کے مرقد منور کی زیارت کو جایا کرتے تھے عاشورہ کے دن ملک فضل مجلس عزا برپا کرتا تھا دائیں بائیں علماء و قضات بیٹھتے تھے۔ روضہ خواں ایک دوسرے کے بعد پڑھتے تھے۔ لوگ روتے تھے۔ زوال کے وقت گریہ و بکا کی شدت ہوتی تھی۔ دوکاندار اپنی دوکانیں بند رکھتے تھے۔ ابو الفدا لکھتے ہیں کہ معز الدولہ دیلمی نے حکم دیا تھا کہ دسویں محرم کو لوگ غم حسین برپا کریں اور دوکانیں بند کر دیں۔ مرد و عورت بال پراگندہ کریں۔ اور کپڑے پھٹے ہوئے پہنیں۔

مجالس عزا کے قیام کی ابتدا کب اور کس طرح ہوئی اس کا جواب ہم کسی تاریخ میں نہیں پاتے۔ لیکن متفرق روایتوں کے دیکھنے سے اتنا ضرور پتہ چلتا ہے کہ جب اہل بیت اطہار کو حکم رہائی سنایا گیا تو سید الساجدین یزید سے اجازت لیکر تین روز تک مشغول عزاداری رہے اس طرح یہ پہلی مجلس تھی۔ جو دار السلطنت دہلی میں منعقد ہوئی دوسری مجلس بعد واپسی دمشق مدینہ منورہ میں ہوئی جس میں تمام مردوں اور عورتوں نے شریک ہو کر حضرت کا ماتم کیا۔ اس کے بعد باضابطہ مجلس کے انعقاد کی ہمارے پاس کوئی تاریخی شہادت نہیں ہے البتہ جیسا کہ ہم نے اوپر لکھا ہے آئمہ اطہار اور محبان اہل بیت ایک محدود پیمانہ پر مجالس عزا برپا کرتے رہے۔ یہاں تک کہ

سلطنت بغداد کے ضعف پر دیلمی خاندان کو عروج ہوا۔ تو ۳۵۲ھ ہجری میں معزالدولہ دیلمی کے حکم سے بغداد میں حسین مظلوم کا علانیہ ماتم منایا گیا۔ اور یہ پہلا موقع تھا کہ اس سلطنت بہ تغیر نوعیت آزادانہ مجلس عزا قائم ہوئی۔ یہ رسم بغداد میں کئی برس جاری رہی دیلمیوں نے علم رکھنے کا طریقہ بھی جاری کیا جو اب تک ایران اور افغانستان میں قائم ہے۔ یہاں مجلسوں میں ممبر پر دو علم ہوتے ہیں اور بس جوں جوں زمانہ گزرتا گیا۔ مجالس عزا کو فروغ ہوتا گیا۔ جیسا کہ اب ہم دیکھ رہے ہیں اسی معزالدولہ نے حکم جاری فرمایا تھا کہ یکم محرم سے دسویں تک سوائے غم حسینؑ کے کوئی کام نہ ہو! ور دسویں کو تمام کاروبار بند رہیں۔

اب رہی تعزیہ داری اور نقل ضریح مبارک کا بنایا جانا اس کا باوجود تلاش و تجسس آج تک صحیح پتہ نہ چلا کہ اس کی ابتدا کب سے اور کیونکر ہوئی عام طور پر اس کی ابتدا اور رواج کے متعلق امیر تیمور صاحبقران کا نام لیا جاتا ہے۔ اور زبان زد خاص و عام یہی ذکر ہے کہ جب صاحبقران اعظم نے دہلی پر قبضہ کیا تو بوجہ اس کے کہ اسی اثنا میں عشرۂ محرم آگیا تھا اور اس کو عزاداری جناب سیدالشہدا سے کمال شغف تھا۔ نقل ضریح بنوا کر یہاں بھی عزاداری کی اسی سال سے ہندوستان میں لوگوں نے بھی نقل روضۂ مبارک بنوانی شروع کر دی۔ رفتہ رفتہ نقل مطابق اصل کے بدلے نئی نئی طرز اور تراش کے تعزیہ بننے لگے۔ مگر یہ خیال اس وجہ سے صحیح نہیں ہو سکتا کہ امیر تیمور عشرہ محرم ختم ہو جانے کے بعد ۱۲ محرم سنہ ۸۰۱ھ کو ہندوستان کی سرحد میں داخل ہوا تھا۔

۶ ربیع الاول کو میدان فیروزآباد میں سلطان ناصرالدین تغلق بادشاہ دہلی کو شکست ہوئی اور صاحب قران اعظم ۸ ربیع الاول کو دہلی میں داخل ہوا دو ہفتہ شہر میں قیام کیا اور ۲۲ ربیع الاول کو یہاں سے کوچ کر دیا۔ ۲۹ جمادی الثانی

سنہ ۸۰۱ھ ہجری کو سرحد ہندوستان سے باہر چلا گیا اس حساب سے اس نے عشرہ محرم ہندوستان کا نہیں کیا۔ اس کے علاوہ یہ بات بھی قابل غور ہے کہ عراق کو اس نے سنہ ۸۰۳ھ میں فتح کیا تھا۔ گویا فتح ہندوستان سے تین چار سال بعد اگر اس نے نقل ضریح بنوائی ہوگی تو بعد فتح عراق اس کی اولاد میں بابر نے پھر ہندوستان میں تیموری حکومت کو قائم کیا جس کا سلسلہ (باستثنا چند سال) بہادر شاہ تک رہا لیکن ہم کسی تاریخ میں نہیں پاتے کہ امیر تیمور کی اولاد میں کسی نے ہندوستان میں اس رسم کی تجدید کی ہو۔ پھر کیونکر مانا جا سکتا ہے کہ امیر تیمور اس کا بانی اور مُروِج ہے اور اس کی وجہ سے ہندوستان میں تعزیوں کا رواج ہوا۔ ہندوستان کو فتح کر کے نہ وہ یہاں رہا نہ اس نے اپنے تسلط کا باقاعدہ انتظام کیا۔ بلکہ بعد تسخیر یوں ہی چھوڑ کر چلا گیا۔ اگر ایسا ہی ہوتا تو جن ملکوں میں اس کی حکومت کو قیام ہوا۔ وہاں اس کے رواج سے کون سی شے مانع تھی۔ دنیا کے پانچوں براعظم اور تقریباً تمام بڑے بڑے جزیروں میں مسلمان پھیلے ہوئے ہیں۔ ممکن ہے کہ فرزند رسول اللہ کا ماتم مختلف صورتوں سے کم و بیش سب جگہ بنایا جاتا ہو۔ مگر یہ تعزیہ جس طرح ہندوستان میں ہوتے ہیں کہیں بھی نہیں ہوتے۔ یہاں تک کہ ایران جو شیعوں کا خاص گھر ہے۔ وہاں بھی اس کا رواج نہیں۔ ہندوستان کے طول و عرض میں ہر جگہ تعزیے بنائے جاتے ہیں کچھ شیعوں پر ہی منحصر نہیں بلکہ سنی بھی۔ اور سنی ہی کیا۔ بلکہ ہندو بھی اس رسم میں شریک ہیں۔ آخر اس کی ابتدا کب سے ہوئی اور کس نے کی اور کیوں ہوئی افسوس ہے کہ اس سوال کے جواب میں تاریخ خاموش ہے، زبانی روایتیں غیر موثق ہونے کی وجہ سے قابل اطمینان و لائق اعتبار نہیں۔

امیر صاحبقران کے ایک پوتے مرزا حیدر شکوہ [illegible] ولد میرزا سلیمان شکوہ خلف شاہ عالم بادشاہ دہلی نے رسالہ علم حیدری میں اپنے جد امجد صاحبقران

اعظم کے تزک سے جو عبارت نقل کی ہے اس کا خلاصہ یہ ہے۔

"مسجد تائیدات ربانی جس سے میں مؤید ہوا۔ ایک یہ ہے کہ ۷۷۱ھ میں بادشاہ روم نے چار لاکھ فوج جمع کر کے مجھ پر حملہ کا ارادہ کیا میں بھی صف آرائی میں مشغول ہوا۔ میں اپنے دائیں بائیں دیکھ رہا تھا یکایک میں نے دیکھا کہ سادات کربلا و نجف کی فوج عراق و عرب کی طرف سے چلی آتی ہے۔ اس فوج کے سردار سید محمد فتاح تھے، وہ میری مدد کے لئے آئے تھے ان کے ساتھ ایک سفید علم تھا۔ میں نے ان کے حاضر ہونے کا حکم دیا۔ سید محمد جو اس لشکر کے علم بردار تھے۔ انہوں نے مجھ سے عرض کیا کہ جناب اسد اللہ الغالب علی ابن ابی طالب علیہ السلام کو ہم نے خواب میں دیکھا حضرت نے فرمایا ہے کہ علم بیضا اخ الترک کے پاس پہنچا دو۔ اصحاب نجف کی رائے ہوئی کہ اخ الترک امیر تیمور ہے۔ میں نے خدا کا شکر کیا اور وہ علم لے کر لڑائی کی طرف گیا۔

ایک بشارت جس سے میں مستبشر ہوا یہ ہے کہ :-

نواحی کوفہ میں مجھ کو خبر ملی کہ اس سرزمین میں فرزند رسولخدا ابو عبداللہ الحسین کو سپاہ کوفہ و شام نے بحکم یزید شہید کیا ہے۔ ان شہیدوں میں حُر بن یزید ریاحی گنج شہیداں سے جدا مدفون ہیں ان کے بازو پر حضرت امام حسینؑ نے جناب سیدہ کا رومال باندھ دیا تھا۔ بعض لوگوں نے عرض کی کہ قبر اکھاڑ کر بطریق تبرک اس رومال کو لے لیجئے۔ میں نے علمائے حاضر الوقت سے دریافت کیا۔ سب نے نبش قبر کے حرام ہونے کا فتویٰ دیدیا اور میں نے خلاف ادب جان کر اس پر جسارت نہ کی۔ اس وقت سید مدنی نے جو ملا حسین کے نام سے مشہور رہیں مجھ سے

کہا کہ مدینۂ منورہ میں شیخ زید ہاشمی کے پاس ایک چادر ہے۔ وہ جناب
سیدہ کے ہاتھ کے کاتے ہوئے سوت سے بنوائی گئی ہے۔ مجھے اس
کا بے حد شوق پیدا ہوا۔ ایک آدمی کو شیخ ہاشمی کی طلب کے لئے بھیجا
وہ مع چادر آئے اور مجھے وہ دی میں نے اس کو سر پر لپیٹا۔ اس کے بعد
میں نے سید الشہداء کی قبر مطہر کی زیارت کا شرف حاصل کیا۔ وہاں
کے ساکنان نے خاکِ پاک کربلا کا علَم بطور ہدیہ مجھے دیا۔ میں نے سر
اور آنکھوں پر رکھا۔ حضرت کی زیارت کے وقت ایسی رقت مجھ پر
طاری ہوئی کہ تین روز تک مجھے امورِ سلطنت اور حالِ لشکر سے خبر
نہ رہی۔ میرا دل کربلا سے مفارقت کو گوارا نہ کرتا تھا اور اس مزار
فائض الانوار کی دوری اور جدائی پر راضی نہ تھا۔ میرے امرائے
رکاب طرح طرح کے حیلوں اور حکایتوں سے اس بقعۂ مبارکہ
کی جدائی کی تکلیف دیتے تھے۔ تب اہل کربلا نے میری تسکین اور
ہر روز کی زیارت کے لئے ایک ضریح خاک شفا کی مجھے دی۔ اس
کو دیکھ کر پھر مجھے بے حد رقت طاری ہوئی اور میں شدتِ گریہ سے بے ہوش
ہوش ہو گیا۔ رات کو اس ضریح سے گریہ وزاری کی آواز آتی تھی جس نے
وہ آواز سنی غش کھا کر گر گیا۔ چونکہ اس ضریح سے یہ معجزہ ظاہر ہوا۔ میں نے
اس کا نام ضریحِ معجزہ رکھا۔ سفر و حضر میں اس کو ساتھ رکھتا ہوں۔ اور
عشرۂ اول محرم میں اس ضریح کو ایک مقام پر رکھ کر بمشورہ سید مدنی تعزیہ
داری کرتا ہوں اور امام مظلوم کے مصائب کی روایات سن کر روتا ہوں۔

مگر تعجب ہے کہ تزک تیموری قلمی محررہ ۱۲۳۳ھ ہجری جو اس وقت ہمارے پیش نظر ہے
ہم اس میں ان واقعات کا مطلق ذکر نہیں پاتے۔ تزک سے صرف اتنا پایا جاتا ہے کہ

امیر صاحب قرآن نے دوسرے مزاراتِ مقدسہ کی طرح مصارف روضۂ مبارک جناب سید الشہداؑ کے لئے کربلا اور بغداد کی اراضی وقف کردی تھی۔ اور بس۔ خیر ایسا ہوا ہی۔ تو فتحِ عراق کے بعد تو پھر اس کا رواج ہندوستان میں کس طرح ہوا۔ افسوس ہے کہ ہم اس کا ذکر کسی تاریخی کتاب میں نہیں پاتے۔ صرف خافی خان نے عہدِ عالمگیری میں برہان پور کا ایک واقعہ لکھا ہے کہ وہاں کے شیعوں نے تابوت (تربت) عشرۂ محرم میں بنایا تھا اور اس کو گشت کرانا چاہتے تھے۔ اہلسنت نے روکنا چاہا۔ اس تضیئہ کی خبر بادشاہ تک پہنچی۔ تو اس نے ایک فرمان جاری کیا۔ کہ تابوت بنانے اور رکھنے میں حرج نہیں البتہ گشت نہ کرانا چاہیئے۔ اس تربت کو قبرِ شریف کی نقل کہنا بیجا نہ ہوگا ممکن ہے کہ امیر تیمور کے وقت میں یا اس کے بعد صرف تربتوں کا رواج ہوگیا کیونکہ اس وقت عمارت روضہ منورہ کی یہ شان نہ تھی۔ جواب ہے۔ یہ عظمت وشان ویالمہ کے وقت سے ہوئی۔ گنبد دار تعزیہ کا رواج غالباً لکھنؤ سے شروع ہوا ہے بعض سن رسیدہ لوگوں سے سنا گیا ہے کہ آغاز زمانہ نواب آصف الدولہ بہادر میں اول ایک سبزی فروش نے بانس اور کاغذ کا تعزیہ بنایا تھا۔ جب وہ سبزی فروش مرگیا تو وہاں میر باقر نے ایک امام باڑہ بنوا دیا اس کے بعد ویسے ہی تعزیوں کا رواج ہوا۔ رفتہ رفتہ ارکینِ خاندانِ سالار جنگ نے گنبد دار تعزیوں کو رواج دیا۔ اور لطافت وزینت روز بروز بڑھتی گئی۔ شدہ شدہ تمام ہندوستان میں اس کا عام رواج ہوگیا اور شیعوں کے علاوہ سنی بلکہ ہندو بھی اس میں حصہ لینے لگے۔ کیا عجب ہے کہ یہ روایت صحیح ہو اور ہم کو اسکے ماننے کے سوا چارہ نہیں۔

یوں تو تعزیہ داری ہندوستان کے طول وعرض میں ہر جگہ ہوتی ہے لیکن فی زمانہ جیسا شغف اور اعتقاد ریاست گوالیار کے فرماں روائے سابق ہز ہائی نس مہاراجہ مادھوراؤ سندھیا بہادر کو تھا اس کی نظیر ہم دوسری جگہ نہیں پاتے لیکن

روضہ مبارک کی نقل صرف ہز ہائی نس نواب حامد علی خاں بہادر فرماں روائے رامپور کے حکم سے بنائی جاتی ہے جو ہو بہو نقل مطابق اصل ہوتی ہے جس کو جناب مرحوم ہر سال بڑے اہتمام سے تیار کراتے تھے۔ اور اب بھی تیار ہوتی ہے۔

غم حسین میں گریہ و بکا

جیسا کہ ہم پہلے بھی کئی بار بیان کر چکے ہیں کہ دنیا میں کوئی قوم ایسی نہیں ہے جس کی تاریخ میں شہدا ایسی کسی علی خیال پر اپنی جان و مال آبرو کے فدا کرنے والے نہ گزرے ہوں۔ انہوں نے انتہائی سختیاں نہ جھیلی ہوں۔ نہایت بیکسی کے ساتھ قتل نہ ہوئی ہوں اور نہایت استقلال و بہادری کے ساتھ مصائب و آلام کو برداشت نہ کیا ہو۔ صرف افراد ہی انتہائی امتحانات میں ثابت قدمی کے لئے مشہور نہیں بلکہ پورے خاندان اور قبائل مافوق التصور سختیاں اور مصائب بے رحم اور سفاک جابر کے ہاتھوں برداشت کر جاتے ہیں جس کے تصور سے ہی انسان سناٹے میں آجاتا ہے اور بدن کے رونگٹے کھڑے ہوتے ہیں۔ تاریخ عالم ایسے دل سوز جگر خراش اور ہوش ربا واقعات سے پر ہے جن کو پڑھ کر ہمیں اپنی اخلاقی ہستی ان کے مقابلہ میں ہیچ معلوم ہوتی ہے۔ ہر قوم ان واقعات کی یاد کو تازہ رکھتی ہے اور اسی پر ان کی قومی حیات کا انحصار ہے۔ لیکن کیا تاریخ عالم میں کوئی ایسا ظلم کا واقعہ گذرا ہے جس پر باوجود ہر قسم کی سختیوں اور رکاوٹوں کے اقوام و قران نے ماتم کیا ہو اور اس ماتم سے کبھی دل سیر نہ ہوتا ہو جس قدر اشک کے قطرے اسوقت تک حسین کے غم میں گرائے جا چکے ہیں وہ اگر جمع ہوں تو بلاشبہ ایک دریا بہہ سکتا ہے محرم کا چاند افق پر نمودار ہوا۔ اور ایک عام ہیجان نے قلوب پر بجلی کا سا اثر پیدا کیا ہزار مخالفت کرتے ہیں۔ کفر کے فتوے دیتے

ہیں کوئی نہیں سنتا ایک پکار ہے کہ مچی ہوئی ہے کہ اِس خدائی پکار کو کون روک سکتا ہے اس واقعہ کی اہمیت سے اِس ہیجان کی توکافی توجیہ ہو جاتی ہے۔ لیکن پھر بھی ایک سئلہ رہتا ہے۔

(۱) کیا یہ اِس وجہ سے ہے کہ واقعۂ کربلا سخت ہی ایسا دردناک کہ دوسرے غم انگیز واقعات اِس کے مقابلہ میں ہیچ ہیں اور اِس وجہ سے ہم اِس پر بےساختہ رُو دیتے ہیں بے شک تمام عالم کے مظالم کو بالتفصیل پڑھا جائے تو کوئی واقعہ ایسا سخت اور دردناک نہ ملے گا مگر یہ وجہ ہو نہیں سکتی۔ رونا تصور پر منحصر ہے۔ جن وجوہ سے یہ واقعہ دوسرے واقعات سے زیادہ ممتاز اور دردناک کہا جا سکتا ہے۔ ان کو ہم سُن تو لیتے ہیں لیکن تصور نہیں کر سکتے۔ ہم اسی قدر تصور کر سکتے ہیں جتنا ہم محسوس کر چکے ہیں ہم تصور ہی نہیں کر سکتے، کہ ایک شیر خوار بچہ کی دو تین دن کی پیاس میں کیا حالت ہوگی۔ ہم تصور ہی نہیں کر سکتے کہ آنکھوں کے سامنے اولاد کے قتل ہو جانے سے ماں باپ پر کیا اثر ہوتا ہے ہم تصور ہی نہیں کر سکتے کہ تیروں سے چھدا ہوا جسم زمین پر کھینچا جائے تو اس پر کیا گزرتی ہوگی سچ تو یہ ہے کہ ہم معرکہ کربلا کے کسی جزو کا بھی کماحقہ تصور نہیں کر سکتے جو ہیجان تصور کے شروع میں پیدا ہوتا ہے وہ خود خیال کے قائم رہنے سے مانع ہے تو پھر گریہ کیونکہ ممکن ہے۔

(ب) کیا گریہ اس وجہ سے ہوتا ہے کہ ہمارا تعلق امام حسین علیہ السلام سے ایسا ہے جیسا کہ اپنے محبوب ترین عزیز سے ہوتا ہے۔

(۱) خدا کرے ایسا ہی تعلق ہو لیکن افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ ایسا نہیں ہے اِس ناگوار امر کی تفصیل کی ضرورت نہیں ورنہ نہایت حیا سوز امور پیش ہو سکتے ہیں۔

(۲) اولاد سے بڑھ کر کوئی عزیز نہیں ہو سکتا۔ فطرت نے جو تعلق اولاد کے ساتھ

پیدا کیا ہے۔ وہ دوسرے کے ساتھ ممکن نہیں لیکن اولاد کے مرنے پر بھی گریہ دو چار دس دن سے زیادہ نہیں ہوتا۔ ایک مدت کے بعد کوشش سے بھی گریہ نہیں آتا جو کچھ گریہ ہوتا ہے وہ بھی زیادہ تر دوسرے اسباب سے جس میں اپنی ذات کو بہت کچھ دخل ہے۔

(۳) بالآخر آنکھوں سے دیکھنے اور کانوں سے سننے میں کچھ فرق ہونا چاہیئے عیسائی تو تاثر کی غرض سے عیسےٰ علیہ السلام کی شہادت کا تعیہ تک بناتے ہیں لیکن کیا اثر ہوتا ہے، کچھ بھی نہیں۔

(۴) جن لوگوں کو ایسا تعلق نہیں ہے جیسے ہنود وغیرہ ان کے گریہ کی کیا وجہ ہو سکتی ہے وہ بھی ایک بار نہیں، ہر بار۔ حالانکہ ان کو اپنے تاریخ کے دردناک واقعات پر یہ اثر نہیں ہوتا۔

(ج) کیا یہ گریہ اس وجہ سے ہوتا ہے کہ مذہب میں اس کا حکم ہے۔ جو شخص علم النفس کی مبتدیات سے بھی واقف ہے وہ سمجھ سکتا ہے کہ ایسا ہونا محال ہے۔ حکم اور گریہ ایسا ہی ہے کہ کسی کے حکم سے ہم کسی پر عاشق ہو جائیں حکم اور فرض کے خیال کے ساتھ تو آتا ہوا گریہ بھی بند ہو جاتا ہے۔ کیونکہ سخت جذبے اور نرم جذبے کبھی ایک وقت میں مجتمع ہو نہیں سکتے۔

(د) کیا یہ اس وجہ سے ہے کہ یہ واقعہ اس قدر مذہبی اخلاقی۔ تاریخی اور تمدنی اہمیت رکھتا ہے بے شک اس واقعہ کو ہر قسم کی انتہائی اہمیت حاصل ہے جو دنیا میں اور کسی واقعہ کو حاصل نہیں مگر ہم نہیں سمجھ سکتے کہ یہ اہمیت گریہ کی کیونکر معین ہو سکتی ہے علاوہ ازیں عوام تو ان خاص امور کو جانتے بھی نہیں۔

(لا) کیا ان سب کے مجموعہ سے اس قدر گریہ ہو جاتا ہے اگر ان میں سے ہر ایک جزو کسی حد تک ازدیاد گریہ میں مفید ہو سکتا ہے تو ضرور ان کا مجموعہ کچھ معقول اثر

رکھتا۔ لیکن ہم کو کسی طرح اِس واقعہ پر دوسرے واقعات سے زیادہ متاثر ہونے کی شک وجہ معلوم نہیں ہوتی۔ خلاف اِس کے جو امور اس گریہ کے بقا اور دوام کے خلاف ہیں ان کو ملاحظہ فرمائیے۔

(۱) علم النفس میں جذبات کے متعلق یہ اصول ہے کہ خوشی کے جذبات اپنے کو باقی رکھنے کی کوشش کرتے ہیں اور تکلیف کے جذبات اپنے کو کم کرنے کے۔ اسی پر زندگی کا دارومدار ہے۔ فرحت ممد حیات ہے۔ اِس وجہ سے اس کو باقی رہنا چاہیئے۔ الم ابقائے حیات کے لئے مضر ہے اِس سبب سے ان کا فنا ہونا ضروری ہے لہذا یہ قطعی امر ہے کہ کوئی صدمہ دیرپا نہیں ہو سکتا یہ کیسا الم ہے کہ تیرہ سو برس ہو چکے پھر بھی کسی طرح کم نہیں ہوا۔ بلکہ ہر سال ترقی ہی کرتا جاتا ہے۔

(۲) علم النفس کا اصول ہے کہ کسی شے یا امر کے متعلق کوئی جذبہ دوبار یکساں نہیں ہو سکتا۔ بلکہ کم ہوتا رہتا ہے۔ ہاں اگر طویل مدت کا فصل ہو جائے۔ تو فرق کم محسوس ہوگا۔ لیکن اگر جلد جلد اور کئی بار وہی جذبہ پیدا کیا جائے تو نمایاں فرق محسوس ہوگا اور جلد بالکل ہمیشہ کے لئے فنا ہو جائے گا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ محسوسات میں کوئی امر ایسا نہیں ہے جس کے احساس کے ساتھ نظام نر دی میں جس کا مرکز دماغ ہے کسی قسم کی تحریک نہ ہوتی ہو یہ نر دیں جاندار ہیں۔ بار بار متحرک ہو جانے سے تھک جاتی ہیں اور پھر تحریکات جو پیدا ہوتی ہیں وہ ضعیف ہوتی ہیں ہاں اگر دو تحریکوں کے درمیان میں فصل کافی دیدیا جائے تو پھر اپنی قوت کے ساتھ متحرک ہو سکتی ہیں لیکن پھر بھی اور اسباب سے کچھ فرق رہیگا۔ مثال کے طور پر کسی شاعر کی نئی غزل لیجئے۔ جو لطف پہلی بار آئے گا۔ وہ دوسری بار نہیں آسکتا۔ اب اس غزل کو ہر دوسرے تیسرے روز پڑھا کیجئے۔ تو

چند روز میں اثر بالکل جاتا رہیگا کسی عالی شان خوش نما عمارت کو دیکھئے۔ پہلی مرتبہ اس کو دیکھ کر آپ متحیر رہ جائیں گے مگر بار بار دیکھنے سے فرحت اور استعجاب کا اثر قطعاً رخصت ہوجائیگا یہی حالت غم والم کے جذبہ کی ہے کسی دردناک قصہ کا واقعہ کسی تاریخ میں پڑھئے جو اثر اس کا پہلی مرتبہ قلب پر ہوگا، وہ دوبارہ نہ ہوگا، اگر روز وہی قصہ پڑھئے یا سنئے تو کچھ بھی اثر نہ ہوگا اب ان مجالس کو ملاحظہ فرمائیے وہی قصہ ہے کہ پھر پھر کر دوہرایا جاتا ہے، ایام محرم میں روز بلکہ دن رات میں دس دس مرتبہ اور یوں بھی سال بھر میں بار باران ہی معلومہ واقعات کو سنتے ہیں اور روتے ہیں اسکی کیا وجہ ہوسکتی ہے؟ کہا جاسکتا ہے کہ ہم واقعات کو اول بدل کرسکتے ہیں بے شک یہ امر کسی قدر ممکن ہوسکتا ہے مگر پھر بھی واضح ہے کہ ہم اس قدر جلد ان ہی واقعات کو سنتے ہیں کہ کچھ بھی اثر نہ ہونا چاہئے۔

نرم جذبات تو بہت بے حد نازک ہوتے ہیں ان کا فنا ہوجانا کوئی بات ہی نہیں تکرار اور اکثار وہ بلا ہے کہ جسمانی تکلیف اور درد جس پر جان کا انحصار ہے۔ وہ بھی یہ تکرار ہونے سے کم محسوس ہوتا ہے اور مزمن ہو جانے سے بالکل زائل ہوجاتا ہے بہر حال ہم کو اس وقت تک علم النفس کے چار اصول ایسے ملے ہیں۔ جس کو یہ گریہ صاف باطل کر دیتا ہے۔

(۱) محض کافی تصور کا اس زمانہ میں محال ہونا جو اور واقعات سے زیادہ اس پر گریہ کے واسطے مفید ہوگا۔

(۲) بقا اور دوام کسی تکلیف کے جذبہ کا محال ہے

(۳) تکرار پر کوئی جذبہ خوشی کا ہو والم کا باقی نہ رہنا چاہیئے۔

(۴) اکثر حالات میں کسی نہ کسی سخت جذبہ کا تصادم لازمی ہے جس کو گریہ کا مانع ہونا چاہیئے۔

اگر قوانین فطرت میں کسی ایک کا بھی فرق ہو جائے تو اسے معجزہ کہیں گے۔ یہاں چار مختلف قوانین کا فرق اپنی آنکھوں سے دیکھتے ہیں اس کو معجزہ نہ کہیں تو کیا کہیں کیا اصول علم النفس۔ قوانین فطرت نہیں ہیں، عوام اگر اس میں اور دوسرے قوانین فطرت میں فرق نہ کریں تو کریں مگر ایک شخص جو علم النفس سے واقف ہے اس کو اس گریہ اور احیائے اموات میں فرق کرنے کی مطلق گنجائش نہیں۔

اس سے قبل کہ اس بحث کو ختم کیا جائے ان امکانات پر بھی نظر کرنا چاہیئے جن پر ایک مخالف امید لگا سکتا ہے۔

(۱) اوولیوشن (ارتقا) کی بنا پر یہ گمان ہو سکتا ہے کہ شاید روتے روتے نوع میں ایک قسم کی استعداد گریہ پیدا ہو گئی ہے مگر یہ بالکل لغو ہے کیونکہ قبل اس کے کہ ایسی عادت نوع میں متوارث ہو سکے ایک طویل مدت تک رونے کا عادی ہونا لازمی ہے۔ مگر قوانین علم النفس اس قدر مخالف ہیں کہ ایک انسان کی زندگی میں بھی رونے کی عادت ہو جانا محال ہے۔ جو لوگ علم الارتقا اور علم الحیات سے واقف ہیں وہ جانتے ہیں کہ کسی عادت کے متوارث ہونے کے لئے کس قدر طویل مدت کی ضرورت ہے۔ تیرہ سو برس اس کے لئے ایک لمحہ کے برابر ہیں اس کے علاوہ اگر کوئی استعداد پیدا ہو گی تو گریہ کی۔ نہ یہ کہ صرف حسین پر گریہ کی ورنہ اسی کے ساتھ حسین کا نام اور واقعہ شہادت کا علم بھی متوارث ہونا چاہیئے ایسا محقق اوولیوشن کبھی نہیں دیکھا گیا اس سے معلوم ہوا کہ اوولیوشن کو اس میں کچھ دخل نہیں ہے۔

(۲) ظاہری عنوانات عزاداری مجلس ماتم سوزخوانی۔ تعزیہ داری وغیرہ معین ہو سکتی ہیں لیکن اوپر ہم دکھا چکے ہیں کہ خود نفس میں ایسی قوی فطری اسباب موجود ہیں کہ اس کو یا کم سے کم اس کی بقا اور دوام کو محال ہی کر دیتے ہیں اُن کی

موجودگی پر خارجی محرکات کا کیا اثر ہو سکتا ہے۔

(۳) یہ کہا جا سکتا ہے کہ چونکہ اس گریہ کی مذہب میں سفارش ہے۔ اس وجہ سے جو کشش گریہ کو روکنے اور خیالات کے منتشر کرنے کی عام صدمات میں پائی جاتی ہے وہ اس میں نہیں ہوتی لیکن ہم پوچھتے ہیں کہ اگر کسی سبب سے رونا آہی نہ سکتا ہو تو یہ مذہبی سفارش کہاں سے پیدا کر دیگی۔ جب ہم اپنی قوم سے نکل کر دوسرے اقوام کو دیکھتے ہیں تو صرف لائے حیرت ہوتی ہے ان کے واسطے نہ تو کوئی مذہبی سفارش ہے نہ اور کوئی محرک بیشک وہ ہماری طرح گریہ کے مواقع تلاش نہیں کرتے۔ مگر جب کبھی وہ ہمدردی کے ساتھ ان واقعات کو سنتے ہیں روتے ضرور ہیں۔ گریہ کا ضبط کرنا ایک اخلاقی صفت ہے۔ جس طرح عزائے حسین کو ہم نے ایک مستثنیٰ قرار دی رکھا ہے انہوں نے نہیں کیا ہے۔ تعجب ہے کہ وہ ہماری تاریخ کے ان مظالم پر تو روتے ہیں۔ حالانکہ اپنی تاریخ کے دردناک واقعات سے اس طرح متاثر نہیں ہوتے۔

ہندوؤں کو اگر دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ قدیم مذہبی اور تاریخی روایات نے ان کے جذبات کو اس طرح رنگ دیا ہے کہ فتح۔ شجاعت کامیابی وغیرہ کے جذبات سے تو خوب متاثر ہوتے ہیں لیکن مظلومیت اور شہادت وغیرہ کے واقعات کا کم اثر لیتے ہیں ایسی قوم بلا وجہ ایک دوسری (اور وہ بھی ایک کمزور اور پسپا) قوم کے ماتم میں شریک ہو جائے کیا یہ معجزہ نہیں ہے کیا کوئی ایسی دوسری نظیر بھی تاریخ عالم میں مل سکتی ہے۔

یہ بھی کہا جاتا ہے کہ جو لوگ مقتول فی سبیل اللہ ہیں۔ وہ بموجب نقل قرآنی زندۂ جاوید ہیں ان کو مردہ خیال نہیں کیا جا سکتا اگرچہ ان کے اجساد خاکی۔ خاک ہی ہو گئے ہوں۔ کلام مجید میں صاف ارشاد ہے۔ لَا تَحْسَبَنَّ الَّذِيْنَ قُتِلُوْا

فی سبیل اللہ امواتا بل احیاء عند ربہم یرزقون جب یہ حکم شہدا کے لئے ہے تو حسینؑ کو جو سید الشہدا اولین وآخرین اور ان کے رفقا مقتولین فی سبیل اللہ کے سرتاج ہیں ان کے زندۂ جاوید ہونے میں کیا شک ہوسکتا ہے۔ اور جب وہ زندہ ہیں تو ان پر رونا اور ماتم کرنا کیا معنے رکھتا ہے۔ کیا زندہ پر رونے اور ماتم کرنے کو عقل سلیم تسلیم کرسکتی ہے چنانچہ ایک صاحب جو مولوی شبلی نعمانی کے عزیز ہیں فرماتے ہیں ؎

روتے ہیں جو قائل ہیں ممات شہدا کے ؎ ہم زندۂ جاوید کا ماتم نہیں کرتے

بظاہر یہ ایک پتہ کی بات ہے مگر اس کا جواب بھی صاف ہے۔ ہم یہ کہہ سکتے ہیں ؎

قائل نہیں ہم بھی تو ممات شہدا کے ؎ ہم جان کے مردہ انہیں یہ غم نہیں کرتے
روتے ہیں مصائب پہ شہیدان جفا کے ؎ ہم زندۂ جاوید کا ماتم نہیں کرتے

جس سے جس کو ایک خاص تعلق اور تولائے صادق کا رابطہ ہوتا ہے خواہ وہ زندہ ہی کیوں نہ ہو اس کے مصائب و تکالیف کو سننے یا خیال کرنے سے ہمدردی کا جوش قلب و دماغ پر ایک خاص ہیجان پیدا کرتا ہے اور اس کے جذبات الفت برانگیختہ ہوکر رونے پر بھی مجبور کردیتے ہیں البتہ جو لوگ رقت قلب اور احساس ہمدردی سے محروم ہیں اُن پر اثر نہیں ہوسکتا حسین کا غم وہ غم ہے جس پر ملائکہ انبیا جن وانس محزون ومغموم ہوئے ہیں خود سید الانبیا جبکہ حسینؑ زندہ اور آپ کی آغوش میں تربیت پارہے تھے بلکہ حسینؑ کی ولادت کے وقت بھی آئندہ زمانہ میں ہونے والی خبر شہادت سُن کر اشکبار ہوئے ہیں حسینؑ اور انصار حسینؑ بے شک زندۂ جاوید ہیں، یہ رونا اور ماتم کرنا ان کی شہادت پر نہیں۔ بلکہ ان مصائب اور شدائد پر ہے جو ایک مسلمان بادشاہ کے حکم سے مسلمانوں ہی کے ہاتھوں رسول اللہ کی ذریت اور اولاد پر عمل میں لائے گئے اور کوئی دقیقہ ایذادہی اور توہین کا باقی نہ رکھا گیا۔ گویا ان لوگوں

ہی نے جو نمازوں میں محمد و آل محمد پر درود پڑھتے تھے ۔ آل محمد پر انتہائی مظالم و شدائد کو ایک فریضہ سمجھ کر ان کا نام و نشان ہی ۔ دنیا سے مٹا دینے کا تہیہ کر لیا تھا ۔ مظالم اور توہین کا یہ ارتکاب جو امتیوں کی طرف سے عمل میں آیا ۔ اگر نظر حقیقت سے دیکھا جائے تو خود آنحضرت کی ہی ایذا دہی اور توہین تھی ۔ یہ مصائب ہی ایسے پر اثر اور درد انگیز ہیں جن کو سن کر اپنے تو اپنے غیروں کے قلوب بھی متاثر ہوتے ہیں ۔ ہائے حسین پر مظلوم اور اس کے نام لیوا ۔ لوگوں پر جن کے قلوب پتھر جیسے سخت ہیں حسینی ہمدردی کا اثر اس وقت نہ ہوا ۔ نہ اب ہے ۔ نہ آئندہ ہوگا ۔

جو لوگ حسینی ہمدردی کرتے ہیں ماتم تو ۔ لیکن جو پیدا ہی ہیں وہ کچھ غم نہیں کرتے ہماری مراد ماتم سے سینہ کوبی نہیں ۔ بلکہ مصائب حسینی پر گریاں اور اشکبار ہونا ہے ۔ یا کم سے کم حزن و ملال کا اثر لینا ۔

اس سے قطع نظر کر کے ان عورتوں اور بچوں کو دیکھئے جنہیں نہ واقعات کی پوری خبر ہے اور نہ مصائب و آلام کے تصور کا احساس ، نہ مذہبی سفارش کا علم لیکن زار و قطار روتے ہیں خلاصہ ۔ یہ ہے کہ عزائے حسین سے زیادہ کوئی اور حیرتناک حقیقت علم النفس اور انسان کی تاریخ میں نہیں ہے اور یہ وہ بھید ہے کہ جس کی تہ تک پہنچنا ناممکن اور ہم اس کو سوائے معجزہ اور کیا کہہ سکتے ہیں ۔

گریہ حسین کا اخلاقی اثر

کسی شریعت اور ملت کا مقصود اصلی کیا ہے ؟ اس کا جواب ہر شخص بآسانی دے سکتا ہے کہ ملل اور شرائع کا مقصد اصلی اور علت غائی روحانی اور اخلاقی تعلیم ہے اس میں دنیا کے تمام مذاہب تقریباً یکساں حیثیت رکھتے ہیں ۔ کون نہیں جانتا کہ کذب ، کبر ، کینہ ، بخل ، زنا ، چوری ، خصائل ذمیمہ سے احتراز لازم ہے

سخاوت، تواضع، حلم، شجاعت، عفت، ہمدردی، خصائل حسنہ کا خوگر ہونا تکمیل انسانیت ہے ہر مذہب ان باتوں کی تعلیم دیتا ہے لیکن یہ عقلی فیصلہ ہے کوئی ایسی بڑی بات نہیں جس کے واسطے ربانی معلموں کی ضرورت ہو۔ نہ ان کی تعلیم سے یہ خصائل ذمیمہ انسانی افراد سے کلیتاً دور ہو سکتے ہیں کیونکہ انسانی فطرت نہیں بدل سکتی شریعت کا خاص کام یہ ہے کہ ایسے عبادات اور فرائض مقرر کرے جن سے خود بخود فطری اصول پر خصائل حسنہ پیدا ہوں اور خصائل ذمیمہ کا ازالہ ہو جائے خمس و زکوٰۃ دینے دیتے فطری بخل دور ہو جاتا ہے۔ نماز با جماعت خصوصاً ایام حج میں امیر الامراء کو غریب الغرباء کے ساتھ ایک ساتھ ایک حالت میں بلا امتیاز رہنا پڑتا ہے۔ اس کے ساتھ نفس میں کبر و غرور باقی نہیں رہتا خشوع خضوع یوں پیدا نہیں ہوتا، ارکان نماز اور تلاوت قرآن کسی نہ کسی حد تک اس کو پیدا کر ہی دیتے ہیں بہر حال تمام مذہبی احکام کی غرض صرف اعلیٰ اخلاق کا نشو ہے لیکن تمدنی اخلاق کی تعلیم سے زیادہ ضروری وہ تعلیم ہے جس کا تعلق روحانیات سے ہے فضائل حسنہ میں ایک صفت ایسی بھی ہے جو روحانی اور اخلاقی دونوں پہلوؤں پر حاوی ہے۔ وہ صفت کیا ہے "رقت قلب" جس کو ایک حد تک کل خوبیوں کا سرچشمہ اور راس رئیس کہنا چاہیئے۔

علم النفس کے اصول پر رقت قلب کے پیدا کرنے کا بہترین ذریعہ گریہ حسینؑ ہی ہو سکتا ہے گویا اس صفت خاص کی نشو و نما کا مکمل انتظام حسینؑ پر گریہ کے عبادت ہونے میں قرار دیا گیا ہے ایک دردناک واقعہ پر روتے روتے قلب میں دوسرے دردناک واقعات کا پورا اثر لینے کی صلاحیت پیدا ہو جاتی ہے۔ اور ہونا بھی چاہیئے کیونکہ گریہ بلا کسی تاثر کے ناممکن ہے جس قوت کو بار بار صرف کیجئے وہ ضرور ترقی کرے گی، اگر ہمدردی اور رقت قلب کی صفت کسی ملت

ہیں محض مذہبی تعلیم سے ہوسکتی تو سب سے اول۔ عیسائیوں میں جو فخر کیا کرتے ہیں کہ ہمارا مذہب رحم اور محبت کا مذہب ہے۔ مگر افسوس اور تعجب ہے کہ اُن کی تمام تاریخ بے گناہوں کے خون سے رنگی ہوئی ہے، بے شمار آدمی سحر کے بہانے قتل کردیئے گئے، بے شمار کو الا مذہبی کے حیلہ سے مار ڈالا۔ یہودیوں وہ ظلم کئے کہ عیاذاً باللہ۔ امریکہ کے اصلی باشندوں کو انسان ہی نہ جانا اور درندوں کی طرح ہلاک کیا یہاں تک کہ ملک کے ملک صاف کردئے گئے۔ درحقیقت جتنا خون اس محبت اور رحم کے مذہب نے بہایا ہے، تمام اقوام عالم نے مل کر بھی نہ بہایا ہوگا ہم نے مانا کہ موجودہ زمانہ میں یہ لوگ تہذیب و تمدن کے علمبردار ہیں اور یہ سب نعمتیں ان کو علوم مختلف بالخصوص سائنس کی تحصیل کی برکت سے حاصل ہوئی ہیں۔ تعلیم نے ان کو اقوام عالم سے ممتاز کیا۔ تعلیم نے ان کے دل و دماغ کو روشن بنایا۔ اور ان کے قوائے عملی کو ترقی عطا کی لیکن صرف تعلیم سے کام نہیں چل سکتا جب وقت تک کہ نفس کی تربیت بھی نہ کی جائے، اس رقتِ قلب کی تربیت کا بہترین ذریعہ گریۂ حسینؑ ہی ہے کیونکہ رقت قلب ہی باعث گریہ ہوسکتی ہے، اور گریہ اس کی مصیبت پر آتا ہی جس سے محبت کا لگاؤ ہو محبت ایسا قوی جذبہ ہے کہ اگر خالص ہو تو پیروی اور تاسی پر مجبور کرتا ہے حسینؑ اخلاقِ حسنہ کے بہترین نمونہ تھے جن کو ان سے محبت ہے وہ حسینی اخلاق کی تاسی میں حتی الوسع کوشاں رہتے ہیں۔ بلاشبہ ذکر مصائب حسین جس کے واقعہ میں اخلاق کا کوئی نہ کوئی پہلو نمایاں ہے اور وہ بھی اس اعلیٰ اور ارفع شان پر جس سے مافوق ممکن نہیں، ہر حیثیت سے عام اخلاق پر اثر ڈالنے والا بلکہ اس کا مکمل ہے۔

اب دیکھنا یہ ہے کہ کیا مجالس عزا کا اصل مقصد صرف گریہ وزاری اور سینہ کوبی ہی ہے جیسا کہ عام دماغوں میں یہی خیال مرکوز ہوگیا ہے۔ اور آلِ مجلس

فقط رقت گریہ اور شدت سینہ زنی کو سمجھا جاتا ہے اگر سامعین کو زیادہ رقت ہو تو مجلس مقبول اگر کم ہو یا نہ ہو۔ تو مجلس نامقبول۔ اگر دو چار کو غش آجائے۔ تو پھر سبحان اللہ کہنا ہی کیا ہے۔ اگر کوئی ذاکر گریہ خیز واقعات بیان کر کے خواہ وہ غلط اور موضوع ہی کیوں نہ ہوں، حسب منشائے بانیٔ مجلس کافی طور سے حاضرین کو رلانے تو اپنی سعی میں کامیاب ورنہ ناکام اور "ثواب" "ذاکری" سے محروم۔ یہ قابل غور بات ہے۔ موجودہ زمانہ کی طرز مجالس عنوان ذاکری ان کے مقاصد واغراض سامعین کے جذبات وحسیات اور خیالات کو دیکھتے ہوئے۔ یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ آیا فی نفس الامر ایسا ہی ہے۔ جیسا کہ عام طور پر ذاکرین او سامعین اپنے ذہن میں سمجھے ہوئے ہیں کیا اس شہادت عظمٰی اور اس مقدس ذاکری کی علت غائی، رونے رلانے انواع واقسام سے ماتم کرنے۔ یہاں تک کہ زنجیروں اور تلواروں سے سر و پشت زخمی کر کے ایک وحشیانہ اور دہشت انگیز سانحہ دکھانے اور خود ساختہ رسوم کو فرائض مذہبی یا ایک اہم جزو قرار دینے تک ہی محدود خیال کر لینا درست ہے۔ اس کے جواب میں ہم نہایت ادب کے ساتھ اتنا عرض کریں گے کہ یہ خیال ایک حد تک ضرور اصلاح طلب ہے۔ حسینی شہادت اس لئے نہیں ہوئی کہ چند ایسے آدمیوں کا گروہ تیار ہو جائے جو عورتوں کی طرح گریہ و بکا کو اپنا دائمی مشغلہ اور فوجی اصول کی بد ید پر سینہ زنی کو اپنا مستقل شیوہ قرار دیدے۔

حسینی مصائب جیسے اہم واقعہ کی اتنی ہلکی غرض سمجھ لینا اس شہادت کبریٰ کی لطافتوں کو بے اعتنائیوں کا آماجگاہ بنا دینا ہے، اچھی طرح سمجھ لو کہ گریہ و زاری سینہ زنی۔ علم۔ تربیتیں، روشنی سبیلیں، نذر و نیاز کوئی ایسی چیز نہیں جو بالذات کسی اتنے عظیم الشان اور کثیر النتائج واقعہ کی غرض بن سکیں ممکن ہے کہ موقعہ کی

خصوصیت گریہ و بکا کو استحسان کے دائرہ میں لے آئے لیکن اگر ان عوارض سے قطع نظر کرلی جائے تو پھر رونا بہر حال افراد کی کمزوری اور جماعت کی بے دست و پائی کے اظہار کا ذریعہ ہے حسین جیسے اولوالعزم روحانی پیشوا کے متعلق یہ خیال قائم کرلینا کہ وہ ۱۰ محرم ۶۱ھ کو جا کر بیک پرخون کے دریا میں اس لئے نہائے کہ ان کے غم میں صرف مجلس عزا منعقد کرلیجائے کچھ سطحی اور عجیب ذاکری کرلی جائے ضعیف اور موضوع اور بے سر و پا روایات پر خواہ وہ توہین کی حد تک کیوں نہ پہنچیں آنسو بہائے جائیں اس امر کا ثبوت دیتا ہے کہ نہ ہم نے حسینؑ کی شان رفیع کو پہچانا۔ نہ ان کی شہادت کے رموز و مصالح کو سمجھا۔ بلکہ عام خیالات کی تقلید کرتے ہوئے سطحی اور نمائشی باتوں کو ذریعہ نجات قرار دے لیا ہے اگر شہادت کی غرض صرف گریہ و بکا کے نظام کا وسیع بنیاد پر قائم کرنا ہے تو خدارا یہ تو بتایئے کہ اس گریہ و بکا سے ہم کونسا اخلاقی فائدہ حاصل کرسکتے ہیں اس کے رواج نے ہم میں انسانیت کس حد تک پیدا کی۔ اگر شہادت کی صرف یہی غرض ہے تو ظاہر ہے کہ یہ پوری ہوئی اور خوب پوری ہوئی۔ ہر کامیاب مجلس میں آنسوؤں کی مقدار اچھی خاصی جمع کی جاسکتی ہے۔ لیکن ہمیں افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ اس کے باوجود ہم رونے والوں میں مجموعی حیثیت سے کوئی خاص اخلاقی کیفیت نہیں پاتے، کیا ان میں یہ قوت ہے کہ سچائی کی حمایت آخری سانس تک کرسکیں کیا ان میں ایثار و قربانی کا وہ جذبہ موجود ہے جس کے انتہائی نمونہ میدان کربلا میں دیکھے جاچکے ہیں مشہد مقدس اور جنت البقیع میں جو واقعات پیش آچکے ہیں ہم نے ان کے لئے کیا کیا ہے نا کہ چند مجلسوں کا اور اضافہ کرلیا ان میں بیٹھ کر عورتوں کی طرح آنسو بہائے اور آگے بڑھے تو گاجے باجے کے ساتھ علم نکال لئے اس سے زیادہ ہمت کی تو چند رضا کاروں کے دستے مرتب کرکے ظاہری نمائش کرلی۔ اور اس بے جا اقدام اور بے نتیجہ سعی پر دوسری قوموں

کو نظر انداز کر دیا گیا ان قوموں کی جو اخلاقی منزلت کے کسی نہ کسی درجہ پر فائز ہوتی ہیں۔ یہی طریقے ہوتے ہیں ان کے ہم آزمائشی موقعوں پر ایسے ہی ضبط کا اظہار ہوا کرتا ہے اگر ہم نے شہید کربلا کے فلسفہ شہادت کو عارفانہ نگاہوں سے دیکھا ہوتا اور کوشش کی ہوتی کہ ان اصول کو اپنی سیرت کا جزو بنالیں جن کو قائم کرنے کے لئے حسین نے خون کا ہر قطرہ بہا دیا تو ایسے دلخراش مناظر دیکھنے میں نہ آتے۔ صرف رونا اور خود ساختہ رسموں کی اداکاری اس شہادت عظمیٰ کے اصلی مقصد ہرگز نہیں۔ یہ تو ضمنی باتیں ہیں جن کو ہم نے اپنی کوتاہ بینی اور ایمانی کمزوری سے اصلی اور حقیقی غرض سمجھ لیا ہے۔

یہ واقعات ہی اس نوعیت کے ہیں کہ ان کو سن کر ہم تو ہم غیروں کے بھی آنسو نکل آتے ہیں۔ خود کوفی و شامی ظلم کرتے جاتے تھے۔

جس وقت حضرت گھوڑے سے گرے اور وہ آپ کا کام تمام کرنے کے تاکیدی حکم دے رہا تھا اس کے بھی آنسو جاری تھے، بعض روایتوں کے موافق خود یزید بھی ان واقعات کو سن کر آبدیدہ ہوا۔ اس صورت میں انصاف کیا جائے کہ اگر شہادت سے ہم بھی صرف اسی قدر متاثر ہوئے کہ آنکھوں سے آنسو بہائے۔ کچھ فیشن کے طور پر ماتم کی نمائش کر لی۔ تو ہم میں اور اغیار میں کیا فرق رہا۔ کیا وہ لوگ جو حسین علیہ السلام کی سچی محبت اور حقیقی معرفت کا دعوے کرتے ہیں اس سرسری غرض کو پورا کر کے اپنے فرائض سے عہدہ برآ ہونے کا اطمینان حاصل کر سکتے ہیں۔

ہم رونے کے مخالف نہیں بلکہ ہمارا خیال ہے کہ وہ لوگ جو ان واقعات کو سن کر سنگدلانہ متانت و وقار کے ساتھ بیٹھے رہتے ہیں قابل ملامت ہیں یقیناً مصائب حسین پر رونا ہمارا ایمان ہے۔ مگر رونا صرف رونے کی حیثیت سے ہونا چاہیئے ہم اس کی جسارت نہیں کر سکتے۔ کہ حسینی شہادت جیسی عظیم المرتبت قربانی

وایثار کا مقصود اصلی صرف رونے کو قرار دے لیں۔ مجالس کا اصلی منشا ہم رونے کا سامان مہیا کرنا کبھی نہیں سمجھ سکتے، ہمارا خیال ہے اور غالباً تمام فہمیدہ دنیا اس خیال میں ہماری ہم نوا ہوگی کہ مجلس ایک نہایت ہی مفید تبلیغی انسٹی ٹیوشن ہمارے سامنے ہے۔ اس کے ذریعے سے قوم میں اُن اصول کی عملی وقعت پیدا کرنی چاہیئے جن کے لئے حسین علیہ السلام نے اپنی بہتر ساتھیوں کی قربانی گوارا کی۔ اگر ہم نے اس شہادت سے یہ فائدے نہیں اُٹھائے تو اس کے دوسرے معنے یہ ہوئے کہ یہ شہادت افادی حیثیت سے ہمارے لئے کم سے کم بے کار رہی۔ روئیے اور خوب رولائیے لیکن یہ گریہ ان لوگوں کا گریہ ہو جن کو حسینؑ کی صحیح معرفت حاصل ہے۔ جو ان اصول کا عملی احترام کرنے کے لئے ہر وقت تیار رہتے ہیں جن کی حفاظت کے لئے حسین نے خونی کفن پہنا تھا۔ ان حدیثوں کا احترام اور ان پر عمل ہمارا فرض ہے جنھیں ہمارے ائمہ معصومین نے مصائبِ حسینی پر رونے کو مختلف عنوانوں سے اہم قرار دیا ہے۔ لیکن احادیث سے یہ کسی طرح مستنبط نہیں ہوتا کہ مظلومِ کربلا کی شہادت کا اصل اور مقصود بالذات منشا صرف گریہ و بکا تھا اور اس لئے مجالس میں صرف اسی منشا کو پیش نظر رکھنا چاہیئے، کہ خوب گریہ و بکا ہو۔ خواہ جھوٹے موضوع اور لغو روایات کرنے سے بھی کیوں نہو، دوسرے مقاصد سے ذاکر کو اور کوئی خاص ربط نہ ہونا چاہیئے۔ بے شک حدیث "مَنْ بَکیٰ اَوْ اَبْکیٰ وَتَباکیٰ وَجَبَتْ لَہُ الجنۃ" یا دوسری احادیث میں رونے پر زور دیا گیا اور یہ زور دینا اس وقت کے لحاظ سے قطعاً حق بجانب اور نہایت ضروری تھا، اموی اور عباسی مظالم نے دوستدارانِ اہل بیت کے لئے دُنیا تنگ کر دی تھی۔ خانوادۂ رسالت کے افراد کا عزت سے تذکرہ تک جرم تھا اس کی کوششیں جاری تھیں کہ دنیا کی نگاہیں اس ظالمانہ سیاست کے ذریعہ سے ان بزرگواروں کی طرف سے پھیر دی جائیں۔ ضرورت تھی کہ دانشمندی کے ساتھ اس عیارانہ سیاست کی جڑ

پر کاری ضرب لگائی جائے اس کی بہتر تدبیر یہی تھی کہ ایسے اجتماعات پر زور دیا جائے جو ایسے مواقع پر فطری تعلقات کے اظہار کی فطری صورت ہوں اور اس لئے مخالفین کی نگاہوں میں ان سے کبھی مضرت کا اندیشہ نہ تھا۔ اس وقت اسی حق کا قائم کرلینا بڑی کامیابی تھی ان واقعات کو زیادہ زمانہ نہ گزرا تھا۔ ان کی ایک ہلکی یادگار سے بھی انسانی توجہ ادھر مبذول ہوسکتی تھی، مگر اب آپ ابتدائی اصول پر قائم رہنا اور اس شہادت اور ذکر شہادت کے حقیقی مقصد سے چشم پوشی اور بے اعتنائی عمل میں لانا ان احادیث اور ان کی منشا سے روگردانی کرنا ہے وہ درحقیقت دوسرے اہم فوائد حاصل کرنے کا اس وقت کے لحاظ سے ضروری ذریعہ تھا۔ اب آگے بڑھنے کی ضرورت ہے احادیث ہمیں اس بات سے نہیں روکتیں کہ ہم ان مجالس سے دوسرے فائدے نہ اٹھائیں، بلکہ ان کو ضمنی اہمیت دیتے ہوئے ہم کو ان مجالس سے وہ اسباق حاصل کرنے چاہئیں جس کی ہمارے مصلح اعظم محسن عالم نے خود عملی نمونہ بن کر تعلیم دی ہے۔ ہم ہر سال محرم کا پہلا عشرہ یا پورا مہینہ یا اس سے زیادہ عرصہ تک واقعات کربلا کو یاد کرکے روتے بھی ہیں اور رلاتے بھی ہیں امام باڑوں کی آرائش، روشنی، شیرینی، چا، شربت، حقہ پان۔ نذر ذاکرین اور دوسرے رسوم میں روپیہ بھی صرف کرتے ہیں لیکن یہ تو بتائیے کہ محمدی مشن اور حسینی مشن کا کون سا کام کرتے ہیں۔ قطعاً کچھ نہیں۔ ہمارے سارے کام یزیدی، ہمارے سارے افعال یزیدی۔ کیا ایسی حالت میں ہم کو دربار محمدی یا سرکار حسینی سے کسی انعام کی امید رکھنا چاہیئے محض رونے پیٹنے اور رسوم ظاہری ادا کردینے سے روحِ محمدی در روحِ حسینی ہرگز ہرگز خوش نہیں ہوسکتی جب تک کہ حسینی مشن کی تکمیل نہ کریں، نہ یہ کہ فقط رسمی اور سطحی طور پر رولئے اور بس۔

شیعوں کو عالم طفولیت سے اس امر کا عادی بنا دیا جاتا ہے کہ وہ رونے کو تاں دین و دنیا سمجھیں اسی تربیت کا اثر ہے کہ جب ان پر کوئی مصیبت نازل ہوتی ہے تو وہ گریہ کے دامن میں پناہ لیتے ہیں۔ روسیوں نے حضرت علی بن موسیٰ علیہ السلام کے روضۂ مطہر پر گولہ باری کی شیعوں نے اس مذہبی اور قومی ذلت کا دفعیہ آنسوؤں کی فوج سے کرنا چاہا۔ ابن سعود نے جنت البقیع کی مقدس قبروں کو زمین کے برابر کر دیا شیعوں سے اور کچھ نہ ہو سکا تو ان ظالمانہ بدعتوں پر رونے کے لئے یہ تدبیر اختیار کی کہ وہ ہر شہر میں مجلسیں قائم کر کے عورتوں کی طرح رو دیئے گئے۔

اس میں شک نہیں کہ ایسے حالات میں جہاں انسان کی تدبیر کا زور چل نہیں سکتا سوائے اس کے اور کوئی طریقہ اظہار عتاب انتقام کا نہیں ہو سکتا۔ اور جب جب انسان انتقام و غضب کے جوش میں مجبور ہو جاتا اور کچھ نہیں کر سکتا وہ گریہ وزاری کرتا ہے ہم بھی اسی طرح روتے ہیں۔ کیسا اچھا ہوتا کہ یہ ہماری گریہ وزاری معرفت پر مبنی ہوتی اور اس کا کوئی صحیح منشا معین کیا جاتا۔ ہماری آہ و بکا۔ خود نمائی اور ریاکاری اور ناآشنائے حقیقت ہونے کی اسپرٹ ہونے کا نتیجہ ہے۔ اصلیت یہ ہے کہ شیعہ قوم گریہ وزاری کی بہت عادی ہونے کی وجہ سے رقیق القلب ہو گئی ہے اور اس کی طبیعت سے غیرت زائل ہو چکی ہے۔ ورنہ کارکنان جنت البقیع کی بھرتی کا جب طوفان برپا تھا تو ہمیں حیرت تھی کہ اس شور و شغب کا منشا کیا ہے کیا یہ مجبور و معذور لوگ جا کر سلطان نجد کو وہاں سے نکال دیں گے۔ اگر ایسا نہیں ہو سکتا اور یقیناً نہیں ہو سکتا تو ان لایعنی حرکات سے سوائے جگ ہنسائی کے اور کیا نتیجہ نکلے گا۔ مگر شیعوں کے بعض قومی لیڈروں کا قومیت کی حرارت غریزی کو قائم رکھنے کے لئے تحریک معماران جنت البقیع کو میدان عمل میں لانا ضرور تھا۔ سیکڑوں آدمیوں نے بڑے جوش و خروش سے رضاکاروں میں اپنے نام لکھوائے

اور اپنی جان و مال قربان کر دینے پر آمادگی ظاہر کی لیکن یہ سب وقتی جوش تھا۔ ایک آندھی تھی جو آئی اور نکل گئی ملت گریہ کن سے کوئی کام ہوا بھی ہے۔ اس حمام میں شیعہ و سنی دونوں ایک ہی رنگ میں ڈوبے نظر آتے ہیں ہماری باتیں ہی باتیں ہیں۔ کام کرنا کچھ نہیں آتا۔ جھوٹے آنسو بہانے کے مرد ہیں لیکن آزمائشی مقامات پر ہم سے بڑھ کر کوئی بزدل نہیں۔ ان تحریکوں کے اٹھانے میں ایک فوری اور عارضی جوش تھا لیکن خلوص غائب تھا۔ کیسے بڑے بڑے دعوے تھے۔ ابن مسعود پر حملہ کی تیاریاں ہو رہی تھیں، حج کے التواء کا اعلان بڑے زور و شور سے کیا گیا لیکن ہوا کیا۔ اس داستان کو نہ پوچھئے، کچھ کہیں گے تو زبان کاٹ دی جائے گی کفر کے فتوے شائع ہوں گے، کوئی کتنا ہی جوش دلائے۔ ان تلوں سے تیل نکلنے والا ہی نہیں ایسی رسوائی کبھی نہ ہوئی تھی، جو لوگ صرف رو لینے کو تارک دین و دنیا سمجھتے ہوں جن میں مذہبی و قومی سوز ہائے کے احساس کا فقدان ہو وہ اس کے سوا اور کس بات کے مستحق ہو سکتے ہیں۔

مرثیہ گوئی

اور

مرثیہ خوانی

مرثیہ جس میں متوفی کے فضائل و محامد اور اس کے وفات پر اظہار رنج و غم کیا جاتا ہے۔ اس کا رواج عرب میں قدیم زمانہ سے پایا جاتا ہے آنحضرت صلعم کی بعثت سے پہلے کسی مصیبت و تعزیت کے وقت جو کوئی شاعر یا مردہ کا وارث یا رشتہ دار مرثیہ کہتا اس میں بعض نامناسب امور بھی نظم کر دیتا حضرت کا زمانۂ نبوت

جس وقت آیا تو آپ نے اُمور نامناسب کے نظم کی ممانعت فرما دی. مگر مُردہ کے حالات و مضامین تعزیت اور غم والم کا نظم کرنا جائز رہا آپ کے اصحاب میں سے حسان بن ثابت اور کعب بن مالک نے شہدائے بدر و اُحد کے لئے مرثیے لکھے۔ خاندانِ رسالت کے شہیدوں میں حضرت حمزہ بن عبدالمطلبؓ حضرت عبیدہ بن حارث بن عبدالمطلبؓ حضرت جعفر بن ابی طالبؓ بن عبدالمطلبؓ کے واسطے مرثیے لکھے گئے۔ یہ سب مرثیئے کتب تاریخ میں درج ہیں یہ تو حضرت کے روبرو کا حال تھا۔ جب آپ نے وفات پائی تو مدارج النبوۃ میں لکھا ہے۔

"ہر کدام از اہل بیت آنحضرتؐ و صحابۂ عظام مرثیہ در وفات آنحضرتؐ در سلک نظم کشید نداول ایشاں فاطمہ زہرا بود کہ چوں بعد از دفن پدر بزیارت قبر شریف رفت۔ خاکے ازاں جا بر داشت و بدیدہ غم دیدہ نہاد و گریہ کرد و اشعار انشا و نمود۔"

یہ اشعار مدارج النبوت میں لکھے ہیں۔ تاریخ طبری میں ہے کہ جناب سرور کائناتؐ کی وفات کے بعد آپ کی پھوپھی حضرت صفیہؓ نے بہت مرثیئے کہے۔ حضرت ابوبکر صدیق اور حسان بن ثابت نے بھی کہے ان مرثیوں کے اشعار طبری نے لکھے ہیں اصحاب کے بعد تابعین اور آئمہ مذاہب وغیرہ کا بھی یہی عمل رہا کہ سب نے سید الشہداء کی مصیبت میں مرثیئے نظم کئے چنانچہ جواہر العقدین سمہودی اور استیعاب ابن عبدالبر ینابیع المودۃ میں فاضل قندوزی میں سلیمان ابن قتیبہ کا مرثیہ اور جواہر العقدین میں۔ امام شافعی کا لکھا ہوا مرثیہ تحریر ہے۔

شاہ عبدالعزیز صاحب سر الشہادتین میں لکھتے ہیں۔

ثم لما وقعت وشہر امرها بانقلاب	واقعہ شہادت مظلوم مٹی کے خون ہو
التربۃ دماو امطار السماء دماً	جانے سے آسمان سے خون برسنے

السماء وھتف الھواتف بالمراثی ونوح الجن وبکائھم	اور عالم غیب اور جنات کے مرثیوں اور نوحوں کی آواز سننے سے مشہور ہوا

اس عبارت سے ثابت ہے کہ عالم غیب اور جنات سے بھی مرثیے سنے گئے۔ اس عبارت کا ماحصل شاہ صاحب کے شاگرد مولوی کرم احمد صاحب نے یہ لکھا ہے:

"فرزندگان آوازمی دادند از عالم غیب بمرثیہ ہائے آنحضرت بلکہ شہرت بخشید او سبحانہ تعالےٰ واقعۂ شہادت را بدیں وجوہ و در قلوب مردم صغیر و کبیر بکا و حزن مستمر انداخت کہ ہمیشہ حزوں و گریاں می باشند و گاہے ایں اندوہ کہنہ نمی گردد و ایں واقعۂ ہائلہ جانکاہ ہمیشہ در امت رسول مذکور می شود بخواندن کتابہا و مرثیہ ہا مشعر حالات و روایات سیحہ واقعہ امام حسین و ایں عزا روز قیامت باقی خواہد ماند، و در آسمان و زمین ہا و در حاضران و غائبان و در خلق ناطق کہ زبان دارند۔ و در خلق صامت کہ خاموش و بے زبانند"

یہ حال قریب قریب ان کل زبانوں کا ہے جو مسلمانوں میں مستعمل ہیں حضرت شہید کربلا کے مرثیے پائے جاتے ہیں۔ ہر ایک نے اس عبرت خیز واقعہ کو اپنی وسعت نظر اور درد کے جذبات کے موافق نظم کیا ہے۔

مسلمانوں کی آبادی اب بھی دور دور پھیلی ہوئی ہے مختلف زبانوں کے استعمال پر ادعا کرنا اور مشرق میں چین سے لے کر مغرب میں امریکہ تک مسلمان کم و بیش آباد ہیں دنیا کی تمام زبانیں بولتے اور لکھتے ہیں لیکن ان میں سب سے پہلے عربی مرثیے قابل لحاظ ہیں اور وجہ اس کی یہ ہے کہ حضرت عرب تھے قاتل عرب تھے زمین و آسمان عرب تھے اس کے لئے عرب کی ہی شاعری موزوں تھی کہ وہ واقعات اور

جذبات غم کی مصوری کرنے ہم ان عربی مرثیوں کو جو کتب تاریخ میں لکھے گئے ہیں مجبوراً بوجہ طوالت چھوڑتے ہیں فارسی زبان کے جس قدر مرثیے ہماری نظر سے گذری ملا محتشم کے اس مشہور مرثیئے سے جس کے چند اشعار ہم آگے لکھیں گے کوئی زگا نہیں کھاتا لیکن اس امر خاص میں سب سے زیادہ حصّہ ہماری اردو زبان نے لیا کیونکہ جس قدر کثرت سے مرثیے اردو میں لکھے گئے ہیں کسی دوسری زبان میں تحریر نہیں ہوئے ہیں۔ یہ ملک کے مرثیہ گو طبقہ میں میر انیس[1] اور مرزا دبیر آسمان شاعری تو سخن سنجی کے آفتاب و ماہتاب ہوئے

---

[1] میر ببر علی صاحب انیس: میر خلیق صاحب خلیق کے بڑے بیٹے میر غلام حسن صاحب حسن کے پوتے میر غلام حسین صاحب ضاحک کے پرپوتے موروثی اہل زبان اور خاندانی شاعر تھے اس خاندانی کمال میں باپ کے شاگرد تھے۔ لکھنؤ میں تعلیم و تربیت پائی اور ضروریاتِ فن سے آگاہی حاصل کی۔ ابتدا میں غزل کہتے تھے پھر مرثیہ گوئی اختیار کی اور اس میں ایسا کمال پیدا کیا کہ زمین شعر کو آسمان تک اونچا کر دیا فصاحت و سلاست کے دریا بہائے جس روش کو اختیار کیا اس میں وہ گل بوٹے لگائے کہ دیکھنے والوں کو محو حیرت بنا دیا حق یہ ہے کہ میر صاحب کے مقابلہ میں کسی دوسرے کو اردو کی شاعری کا دعوے کرنا محض منہ چڑانا ہے۔ میر صاحب کا مرتبہ اردو زبان میں وہی نسبت رکھتا ہے جو ہومر کو یونانی بیانات کو سنسکرت اور فردوسی کو فارسی زبان میں حاصل ہے۔ صفائی کلام حسن بیان لطف محاورہ سلاستِ الفاظ خوبی بندش میر صاحب کا خاص حصّہ ہے جس طرح آپ کا کلام لاجواب دیکھتے ہو۔ اسی طرح پڑھنا بھی بے مثال تھا ان کی آواز ان کا قد و قامت ان کی صورت کا انداز ان کے پڑھنے کی متانت و سنجیدگی غرض ہر شئے زیبِ ممبر ہونے کے لئے ٹھیک اور موزوں واقع ہوئی تھی اس کے ساتھ ہی اعلےٰ درجہ کے پابندِ وضع و پرہیزگار تھے اور سپاہی منش بھی۔ میر صاحب نے

ان دونوں بزرگواروں نے مداحیٔ اہل بیت میں عمر بھر ریاضت کی اور قبولیت عامہ کا جو تمغائے امتیاز حاصل کیا وہ برائے دوام فخر واعزاز کے لئے کافی ہے۔ تاہم اتنا ضرور کہا جائے گا کہ مرثیہ گوئی کی قدیم سادگی اور دردانگیز تحریک جو مرثیہ کی حقیقی روح ہے اور دلگیر خلیق ضمیر۔ افسردہ وغیرہ کے کلام میں پائی جاتی ہے۔ زائل اور فنا ہو گئی۔

گذشتہ سے پیوستہ: ستر برس سے زائد عمر پاکر ذی قعدہ ۱۲۹۱ھ ہجری میں انتقال فرمایا۔ ان کے فیض تعلیم اور فیضان موروثی سے سارا گھر ایسا ہی ہوا ان کے دو بھائی میر نواب صاحب مونس اور میر مہر علی صاحب انس اور بڑے بیٹے میر خورشید علی صاحب نفیس اور میر ہادی صاحب وحید خلف میر انس سب اپنے اپنے رنگ اور اپنے اپنے طرز میں صاحب کمال ہوئے اور اس فن کی استادی کو ایسا نباہا کہ اس سے مافوق متصور نہیں میرزا سلامت علی صاحب دبیر خاندانی شاعر نہ تھے مگر مرثیہ گوئی کے شوق نے شاعری کے عرش الکمال تک پہونچا دیا۔ میر مظفر حسین ضمیر کے شاگرد تھے اور جو کچھ استاد سے پایا اسے انتہا سے زیادہ بلند اور روشن کر دکھایا تمام عمر میں کسی اتفاقی سبب سے کوئی غزل یا شعر کہا ہو ورنہ مرثیہ گوئی کے فن کو لیا اور اس درجہ تک پہنچا دیا جس سے آگے ترقی کا راستہ بند ہو گیا ابتدا سے اسی شغل کو اجر آخرت کا سامان سمجھا اور نیک نیتی سے اس کا ثمرہ لیا طبیعت بھی ایسی گداز پائی تھی جو اسی فن کے لئے نہایت موزوں اور مناسب تھی ان کی سلامت روی پرہیزگاری مسافر نوازی زہد اور سخاوت نے صفت کمال کو اور بھی زیادہ چمکا دیا تھا جس طرح میر انیس صاحب صفائی کلام لطف زبان چاشنی محاورہ خوبی بندش حسن اسلوب مناسبت مقام طرز ادا اور سلسلہ کی ترتیب میں جواب نہیں رکھتے ویسے ہی مرزا صاحب شوکت الفاظ کثرت مضامین اس میں جا بجا غم انگیز اشارے درد خیز کنائے دلگداز انداز جو مرثیہ کی جان ہیں ان صنعتوں میں بادشاہ ہیں۔

مجلسِ غم نے محفلِ مشاعرہ کا رنگ اختیار کر لیا۔ آہ آہ میں واہ واہ بھی شامل ہو گئی لہٰذا تراش خراش، مبالغہ اور رنگ آمیزی نے موجودہ طرزِ مرثیہ گوئی کو اس کے قدیمی اور

گزشتہ سے پیوستہ:- حق یہ ہے کہ میر صاحب اور مرزا صاحب آسمانِ شاعری کے آفتاب و ماہتاب ہیں۔ ان دونوں باکمالوں نے ثابت کر دیا کہ:- حقیقی و تحقیقی شاعر ہم ہیں اور وہ ہم ہی ہیں کہ ہر رنگ کے مضمون ہر قسم کے خیال کا اپنے الفاظ کے جوڑ بند سے ایسا طلسم باندھ دیتے ہیں کہ چاہیں رُلا دیں چاہیں ہنسا دیں چاہیں تو حیرت کی مورت بنا کر بٹھا دیں۔ یہ دعوے بالکل درست تھے کیونکہ مشاہدہ کی تصدیق کو ہر وقت موجود تھا دلیل کی حاجت نہ تھی سکندر نامہ جس کی تعریف میں لوگوں کے لب خشک ہیں اس میں صرف چند میدان ہیں رزم زنگبار جنگِ دارا جنگِ روس جنگ فور جنگ فغفور اسی طرح بزم کی چند تمہیدیں اور جشن شاہنامہ کے ساٹھ ہزار شعر فردوسی کی عمر بھر کی کمائی ہیں ان دونوں صاحبوں نے تو ایجادِ مضامین کے دریا بہا دئے ایک مقررہ مضمون کو سیکڑوں نہیں ہزاروں رنگ سے ادا کیا ہر مرثیہ کا چہرہ نیا آمد نئی رزم جدا بزم جدا اور ہر میدان میں مضمون اچھوتا تلوار نئی نیزہ نیا گھوڑا نیا انداز نیا مقابلہ نیا اور اسی پر کیا منحصر ہے صبح کا عالم دیکھو تو سبحان اللہ نور کا ظہور آفتاب کا طلوع، مرغزار کی بہار، شام ہوئی تو شامِ غریباں کی اداسی کبھی اندھیری رات کا سناٹا کبھی تاروں کی چھاؤں کو چاندنی اور اندھیری کے ساتھ رنگ رنگ سے دکھایا ہے۔ مختصر یہ کہ جس حالت کو لیا ہے اس کا وجد انگیز سماں باندھ دیا ہے آمدِ مضامین کی بھی کوئی انتہا نہ رہی جن مرثیوں کے بند چالیس پچاس ۵۰ سے زیادہ نہ ہوتے تھے وہ ڈیڑھ سو کی گذر کر دو سو سے بھی نکل گئے تخمینہ ہے کہ مرزا صاحب نے کم سے کم دس ہزار مرثیئے لکھے ہوں گے سلاموں کا شمار نہیں رباعیاں تو باتیں تھیں۔

اصلی دائرہ سے باہر کر دیا مضمون آفرینی کے ساتھ واقعات آفرینی بھی ہونے لگی گو یہ سیا
طرز ایسا عام پسند ہوا کہ ان دونوں صاحبوں کے علاوہ ان کے خاندان والے اور شاگرد
بلکہ لکھنؤ سے باہر دوسرے شہروں کے مرثیہ گو سب آج کی تقلید کرتے ہیں اور کر رہے
ہیں حتیٰ کہ خیال آفرینی کے ساتھ رنگ تغزل اور اس کے ساتھ ساقی نامے[1] لوازمہ

[1] کچھ عرصہ سے ہمارے مرثیہ گو شعرا مرثیہ میں ساقی ناموں کی آمیزش کو لازمی جزو خیال کرتے لگے ہیں اور اس بدعت پر نازاں ہیں میر صاحب اور میرزا صاحب کے مرثیہ گوئی میں رزم و بزم کو داخل کرنے سے وہ اصلی سادگی جو مرثیہ کی جان ہے رخصت ہو گئی تھی مگر ان دونوں بزرگواروں نے اس کو با اعتبار فن شعر معراج کمال پر پہنچایا تاہم دائرۂ ادب و احترام سے قدم آگے نہ رکھا اور ان محدود واقعات مواقع اور مناظر کو سیکڑوں طریقوں سے بیان کیا اور حسن کلام اور ادائے مطالب میں وہ جدتیں پیدا کی ہیں کہ ان کا فوق متصور نہیں جن کا ساتھ قبولیت عام ہے اور آئندہ مرثیہ گویوں کے لئے ایسی شاہراہ تیار کر گئے کہ کسی کو ان کے نقش قدم پر چلنے کے سوا چارہ نہیں لیکن پچھلے شعرا نے جن کو مداح اہل بیت بننے کا شوق ہے اُن کی تقلید چھوڑ کر صرف واہ واہ کا شور مچوانے کے لئے ایک نئی روش اختیار کی جوا بجا د بندہ اگرچہ گندہ کی مصداق ہے ان کو اس کے سوا اور کوئی رستہ نظر آیا کہ مرثیوں میں فضائل و مصائب کے ساتھ ساقی ناموں کا اضافہ کریں اب عموماً مرثیہ گو شعرا اسی بلا میں مبتلا ہیں محافل میلاد ہوں یا مجالس عزا قصیدہ ہو یا مرثیہ شراب اور ساقی کے ذکر سے خالی نہیں کوئی ان حضرات سے پوچھے کہ ان کو مرثیہ یا قصائد لغت و منقبت سے کیا ربط اور کیا تعلق ہے نہ یہ داخل فضائل نہ شامل مصائب آخر اس غیر متعلق حشویات و زوائد کو کس مد میں شمار کیا جائے اور اس جدت و جودت کا مقصد اصلی کیا ہے۔ ذوات قدسی کے مراثی اور قصائد کے ساتھ اس کی آمیزش ہمارے خیال میں تو صرف مرثیہ گوئی ہی کی نہیں بلکہ ذات قدسی کی بھی

۔ ثیہ گوئی میں داخل ہو گئے مگر اب یہ افراط وتفریط قابل اصلاح ہے اگر آئندہ مرثیہ گو آگی
قدیم سادگی اور نجات، اسخن لینے کے ثواب اور رونے رلانے کو ملحوظ رکھ کر آپ

گذشتہ سے پیوستہ:۔ یہی توہین ہے بعض شعرا اور ذاکر جو شراب اور ساقی کا تذکرہ کرتے ہوئے میکدہ کی پوری تصویر کھینچ دیتے ہیں اور مستانہ انداز سے اس طرح جھوم جھوم کے پڑھتے ہیں کہ یہ معلوم ہوتا ہے کہ ایک رند بیخوار سر ممبر نشہ میں جھوم رہا ہے۔ اگر یہ کہا جائے کہ یہ تو سامعین کے گرمانے کے لئے صرف استعارات سے کام لیا جاتا ہے۔ ورنہ تلخ اور بدبودار رقیق کا معاذ اللہ خیال بھی نہیں آتا حُبِ اہل بیت یا ایسے ہی کسی دوسرے مفہوم کو استعارتاً لفظِ شراب سے بیان کیا جاتا ہے۔ قرآن مجید میں بھی متعدد مقامات پر لفظ شراب آیا ہے تو ہم کہیں گے کہ لغت عرب میں ہر پینے کی چیز کو شراب کہتے ہیں (شراب آشامیدن وخوردن مایات کمافی الصراح) پانی کو بھی شراب کہا گیا ہے ملاحظہ ہوں قرآن مجید اور فرقان حمید کی آیات ذیل :۔

لتکئین فِیۡہَا یَدۡعُوۡنَ فِیۡہَا بِفَاکِہَۃٍ کَثِیۡرَۃٍ وَّ شَرَابٍ ۔ پارۂ ۱۳۔ سورۂ ص۔	یہ لوگ (بہشتی) وہاں تکئے لگائے بیٹھے ہوں گے وہاں (خدام بہشت سے) کثرت سے میوے اور پینے کی چیزیں منگوائیں گے۔
ارکض برجلک ھذا مغتسل باردٌ وَّشَرَاب پارہ ۱۳۔ سورۂ ص۔	(حضرت ایوب سے خطاب) اپنے پاؤں سے زمین کو ٹھکرا دو تمہارے نہانے اور پینے کے لئے ٹھنڈا پانی موجود ہے۔
یخرج مِنۡ بطونہا شراب مختلف الوانہ فیہ شفاءٌ لِلنَّاس ۔ پارۂ ۱۴ سورۂ نحل	مکھی کے پیٹ سے پینے کی ایک چیز نکلتی ہے (یعنے شہد) جس کے رنگ مختلف ہوتے

دوسرا قالب اختیار کریں واقعات کی صحت و تحقیق کا خیال رکھیں تلوار اور گھوڑے کی بقول مصوری اور نقاشی سے دست کش ہو کر ان اخلاقی جذبات کی ترجمانی کریں جو بلنی شہادت کے ہر واقعہ سے وابستہ ہیں تو نہایت مناسب ہوگا کیونکہ مجلس عزا اور

گذشتہ سے پیوستہ ۔ جن لوگوں کی بیماریوں کی شفا ہے۔

ھُوَ الَّذِیْ اَنْزَلَ مِنَ السَّمَاءِ مَاءً لَکُم مِّنْهُ شَرَابٌ وَّمِنْهُ شَجَرٌ فِیْهِ تُسِیْمُوْنَ پارہ ۱۴ سورہ نحل

وہ خدا ہے جس نے تمہارے لئے پانی برسایا آسمان سے جس سے تم پیتے ہو اور اس سے درخت شاداب ہوتے ہیں۔

وَاَنْهَارٌ مِّنْ مَّاءٍ غَیْرِ آسِنٍ وَاَنْهَارٌ مِّنْ لَّبَنٍ لَّمْ یَتَغَیَّرْ طَعْمُهٗ وَاَنْهَارٌ مِّنْ خَمْرٍ لَّذَّةٍ لِّلشّٰرِبِیْنَ وَاَنْهَارٌ مِّنْ عَسَلٍ مُّصَفًّی پارہ ۲۶ سورہ محمد

اس میں (بہشت میں) پانی کی نہریں جن میں ذرا بو نہیں اور اس میں دودھ کی نہریں جن کا مزا نہیں بدلا اور شراب کی نہریں جو پینے والوں کے لئے لذت ہیں اور صاف شفاف شہد کی نہریں ہیں۔

صرف پچھلی آیت میں لفظ خمر آیا لیکن اس کا مفہوم کیا ہے یہ ہم نہیں سمجھ سکتے اور ہمارے عقل و ادراک سے بالاتر ہے۔ آخری آسمانی کتاب میں کسی استعارہ کو ایسی ہیئت و صورت سے بیان کیا گیا ہے جیساکہ شعراء شراب خانہ کا ستانہ نظارہ اور خمار کا نقشہ کھینچتے ہیں شراب اور ساقی تو غزلیات اور دوسری ہزلیات کے ہی لئے موزوں ہے فضائل و مصائب کے ساتھ وضع الشئے فی غیر محلہ ۔ کا مصداق نہیں تو کیا ہے۔ ہماری سمجھ میں نہیں آتا کہ ہاں ساقیا ۔ یا ۔ ساقی تو کدھر ہے کہ الفاظ سے اُن کا مخاطب صحیح کون ہوتا ہے اگرچہ وہ فرضی ہی سہی اس خبط کو یہاں تک ترقی ہوئی ہے کہ بعض شعراء کو یہ کہتے ہوئے سنا گیا ہے کہ جس میں ساقی نامہ نہ ہو وہ مرثیہ ہی نہیں۔

اور مرثیہ کی اصلی رُوح اور علتِ غائی بھی یہی ہے کہ
اس مرثیہ گوئی اور مرثیہ خوانی کی بدولت جیسی کہ ہندوستان میں رائج ہے ،
تین باتیں اصولی حیثیت سے قابل اعتراض بھی پیدا ہوگئی ہیں ۔

گذشتہ سے پیوستہ :- اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّا اِلَیْهِ رَاجِعُوْنَ ۔ کاش خدا ان لوگوں کو توفیق خیر عطا فرمائے کہ وہ اہل بیت طاہرین کے متبرک اذکار کے ساتھ ایسے غیر ضروری اور رکیک اشعار کو اس کا لازمی جزو قرار نہ دیں اور چند منٹ کی واہ واہ اور سبحان اللہ کے لئے اس وبال کو اپنے سر نہ لیں اس کے ساتھ ہی سامعین کی بدمذاقی بھی قابل ماتم ہے کہ وہ اس رمز کا خیال کئے بغیر اس نامناسب مضمون آفرینی کی داد دیتے ہوئے چھت کو سر پر اٹھا لیتے ہیں ۔ مرثیوں میں جو ساقی نامہ ہیں ان میں سے چند اشعار ملاحظہ ہوں ؎

ساقی کدھر ہے لا مئے اطہر کا جام لا ٭ گل کے ایاغ میں گل احمر کا جام
جس میں ہو خوں کا رنگ وہ احمر شراب دے ٭ آنی ہیں اب جمائیاں بھر کر شراب دے
ساقیا ساغر صہبائے خوش انجام پلا ٭ ساقیا دم ہے لبوں پر مئے گلفام پلا
ساقیا کب سے تڑپتا ہے یہ ناکام پلا ٭ ساقیا جام پلا جام پلا جام پلا

سر پہ احسان ترا دل میں تری یاد رہے
تو رہے اور ترا میکدہ آباد رہے

ساقیا خوب پلا آج مئے ناب مجھے ٭ جس سے باقی نہ رہے ہوش خور و خواب مجھے
جام پر جام عنایت ہو بس جام شراب ٭ خوب جھک جاؤں جو ہو دست بدست جام شراب

یہ اشعار تو پھر بھی معمولی ہیں لیکن اس موضوع پر بڑی بڑی طبع آرائیاں کی گئی ہیں جن کو ہم بخوف طوالت قلم انداز کرتے ہیں ۔

(۱) اول یہ کہ مجلس عزا کو جس کا مقصد اصلی صرف فضائل و مصائب کا بیان کرنا ہی محفل شاعرہ بنا دیا ہے اتنا مصائب پر گریہ نہیں ہوتا۔ جتنا حسن کلام اور رعایت لفظی اور جدت مضامین کی شور و غل کے ساتھ داد دی جاتی ہے۔

(۲) غلط یا طبعزاد واقعات کی اشاعت بچوں عورتوں اور جاہلوں سے گذر کر لکھے پڑھے لوگوں پر بھی اپنا اثر ڈالے بغیر نہیں رہ سکتیں جن کو سنتے سنتے حق الیقین کا درجہ حاصل ہو جاتا ہے اور یہی غلط فہمیاں رفتہ رفتہ عام قلوب پر نقش کالحجر ہو جاتی ہیں۔

(۳) سب سے بڑھ کر اور قابل غور بات یہ ہے کہ معصومینؑ کے ارشادات اور بیانات جو ان کی زبان مبارک سے نہیں نکلے مختلف عنوانوں کے ساتھ سند و بلا سند قلمبند کئے جاتے ہیں حالانکہ ان کا موجد شاعر کا دماغی سانچہ ہوتا ہے۔

مذہب امامیہ اثنا عشریہ میں قول معصوم جو کچھ بھی ارشاد ہوا ہو حدیث ہے اور یہ کسی کو حق حاصل نہیں کہ اس میں ایک لفظ کی کمی یا اپنی طرف سے اضافہ کر سکے۔ محدثین کو ارشادات معصومین سے جو کچھ پہنچا ہے انہوں نے بڑی عرق ریزی سے اس کی تنقید و تحقیق کی ہے احادیث کے مدارج مقرر کئے ہیں اور راویوں کے ثقہ اور غیر ثقہ ہونے کی جانچ کے واسطے علم الرجال مدون کیا ہے۔ ایسی صورت میں شعراء اس جسارت کے کیونکر مجاز ہو سکتے ہیں کہ اپنی طبیعت کی جودت اور دماغ کی مشین سے جو کچھ چاہیں گھڑیں اور اس کو کسی معصوم کی طرف منسوب کر دیں کہ یہ فرمایا اور وہ فرمایا۔

اسی طرح ان افعال و اعمال کو جو ان ذوات قدسی آیات کی طرف سے ظہور پذیر نہیں ہوتے خود ضبط نظم میں لانا اور ان کی طرف منسوب کرنا کہاں تک جائز ہو سکتا ہے اور اس اہم اور نازک مسئلہ پر غور کرتے ہوئے جس میں سخت احتیاط

کی ضرورت ہے اور ذرا سی لغزش کذب وافترا کی حد تک پہونچا دیتی ہے مذہب اور عقل کیونکر آزادئی تخیل کی اجازت دے سکتے ہیں۔

ہم کو شاعری کی عام حیثیت سے اس جگہ بحث نہیں بلکہ ایک خاص حیثیت یعنے مرثیے سے اس میں معیارِ شاعری یہ نہ ہونا چاہیئے کہ شاعر کہاں تک زمین و آسمان کے قلابے ملا سکتا ہے یا ہمیں مضمون آفرینی میں کہاں تک ملکہ حاصل ہے یا رعایت لفظی کس حد تک ہے جس کی افراط سے اصل مرثیت ہی معدوم ہو جائے بلکہ صدق و واقعیت کا وہ نمونہ ہونا چاہیئے جسے سن کر دل خود اقرار کرے کہ یہ واقعہ ہے۔ صحیح جذبات کا اظہار زمین و آسمان کے قلابے ملانے سے نہیں ہوسکتا۔ مرثیہ میں سب سے ضروری چیز خصائل نگاری ہے ہم اپنے زمانہ کے شعرا سے امید کرتے ہیں کہ وہ آئندہ کے لئے ایک ترقی خیز نظام اور اصول قائم کریں۔ اور اسلام کے نفوسِ قدسیہ کی مدح اور مرثیہ میں متذکرہ صدر اصول کا لحاظ رکھیں۔ وقت جاچکا کہ عوج بن عنق کی جانب اور ہاتھی گھوڑے کی غیر ضروری مصوری میں دلچسپی کی امید کی جائے مجلس عزائے حسین کے واقعاتِ عظیم کے تذکرے کی جگہ ہے حسینؑ کے واقعات میں قوم گری اور خصائل سازی کی بہترین صلاحیت موجود ہے اس لئے یہ سمجھ لینا چاہیئے کہ کوئی ترکیب یا نوعیت جو اس میں مدد دیتی ہو وہی مفید و کارآمد ہوسکتی ہے اور جو نوعیت اس معیار پر پوری نہ اترے وہ بلاشبہ نظرثانی کی چیز ہے یاد رکھو کہ ہم مجلس میں کسی شخص کو اس کی شخصی قابلیت کی داد نہیں دیتے جاتے جو مجلس حسینؑ کے مفہوم کے خلاف ہے بلکہ اس لئے کہ ہم دیکھیں کہ حسین اور واقعاتِ حسینؑ کو شاعر کہاں تک سمجھا ہے البتہ اس کی اس مخصوص کوشش کی کامیابی میں ضمنی داد یہی ہے کہ ہم ایک نفسِ عظیم کے خصائل سے سبق اور اثر لیتے جاتے ہیں اور ہم ان صحیح اثرات پر داد دے سکتے ہیں نہ کہ اس کے خلاف اگر کوئی شخص اس کے برعکس حسینؑ کو کسی اور طرح صرف کرنا چاہیئے۔ تو وہ نہ صرف ایک شے کی نوعیت کو تبدیل کر رہا ہے بلکہ ہماری قومی فوائد کو روک کر

اس میں ناقص یا غیر متعلق چیزیں شامل کرنا ہے۔

ہمارے مرثیوں کی صورت میں رخصت اور شادی بیاہ کی امید اور بچہ پاس کو بہت ... اور پھر شہادت کے بعد میں ایک نتیجہ ہے یہ اس لئے ہے کہ رخصت میں عورتوں کی بزم دلی اور شادی بیاہ میں ماں کے حوصلوں کی بڑی سمائش ہے ہم اسے نہیں ... کہ جذبۂ غم میں ہیجان نہ پیدا کیا جائے مگر جذبۂ غم کی ایسی مصوری نہ ہونی چاہئے جو صائب کے سمجھانے میں غلطی کرتی ہو ہم اس کو بہتر نقروں میں نہیں سمجھا سکتے کہ وہ مخدرات جو شہدائے کربلا کی مائیں اور بیبیاں تھیں فضائل نگاری میں انصاف کی خواہاں ہیں یہاں جذبۂ غم کے یہی معنی نہیں کہ کوئی شخص بدحواسی کی جگہیں مار کر روئے بلکہ اظہار غم کے موقعہ پر ضبط اور بےچینی پر صبر ہی سب سے بڑا مرثیہ ہے واقعات کی غلط نگاری اور جذبات کی غلط مصوری نے سب سے زیادہ ضرر رساں نقصان یہ پہنچایا کہ واقعات وخصائل کے متعلق غلط فہمی پھیل گئی حتیٰ کہ اہل بیت اور شہدائے کے صحیح حالات اور صحیح جذبات کا علم بہت ہی محدود ہو گیا۔ غلط بیانی مبالغہ اور طبع زاد مضامین کے ساتھ طبع زاد واقعات طبع زاد بیانات اور طبعزاد جذبات پہلو بہ پہلو چلنے لگے اس کی ہمارا مطلب یہ نہیں کہ ہم مرثیہ گو حضرات کے کام کو سبک سمجھ رہے ہوں یا ان کی سعی ہمارے نزدیک قابل قدر نہیں لیکن امر حق کا اظہار کئے بغیر نہیں رہ سکتے مجلس ایک ایسا انسٹی ٹیوشن ہونا چاہئے جو قومی حیثیت سے مفید ہو ہمیں اپنے اس جلسہ کی صحیح حیثیت کا لحاظ لازمی ہے جو اثر مجلس کا ہماری قوم پر ہے اگر اس میں کسی کا غیر صحیح میلان یا قومی عنصر کا غلط اندازہ شامل ہے تو قوم کو بازپرس اور اصلاح کا حق حاصل ہے۔

یہ بحث تو مرثیہ گوئی کے متعلق تھی اب مرثیہ خوانوں کو لیجئے اکثر دیکھا جاتا ہے کہ رزم بزم اور بین کے موقعہ پر صورت حال دکھانے کے لئے مرثیہ خوان ایسا طرز بیان

اختیار کرتے ہیں کہ تہذیب متانت و آداب مرثیہ خوانی اور آداب مجلس کے سراسر خلاف ہوتا ہے۔ بعض تو ممبر کی چولیں تک ڈھیلی کر دیتے ہیں۔ یہاں تو فضائل و مصائب اہلبیت کا حال بیان کرنا ہے، سنجیدگی اور ادب سے سنانا چاہیے نہ کہ فضول ہاتھ پاؤں ہلانے اور منہ بنانے سے۔

ہم اس موقعہ پر آگے نہیں بڑھتے ہیں جب تک کہ محتشم کے ان مشہور اور یادگار مرثیہ کے کچھ بند نہ یہاں لکھ لیں۔ حق یہ ہے کہ اس مرثیہ کے بے مثل اشعار ہیں۔ اور عام قبولیت ان کا حق [illegible] رہا ہے۔ ان [illegible] سب الفاظ اس سے لطیف تر سخن اور بر آمد خیال ہے۔

باز این چه شورش است که در خلق عالم است — باز این چه نوحه و چه عزا و چه ماتم است

گر خوانمش قیامت دنیا بعید نیست — این رستخیز عام که نامش محرم است

جن و ملک بر آدمیان نوحه می‌کنند — گویا عزای اشرف اولاد آدم است

خورشید آسمان و زمین نور مشرقین

پرورده کنار رسول خدا حسین

ای چرخ غافلی که چه بیداد کرده‌ای — وز کین چها درین ستم آباد کرده‌ای

کام یزید داده‌ای از کشتن حسین — بنگر که را به قتل که دلشاد کرده‌ای

بهر خسی که خار درخت شقاوت است — در باغ دین چه با گل و شمشاد کرده‌ای

حلقی که سوده لعل لب خود نبی بر آن — آزرده‌اش به خنجر بیداد کرده‌ای

با دشمنان دین نتوان کرد آنچه تو — با مصطفی و حیدر و اولاد کرده‌ای

ترسم ترا دمی که به محشر در آورند

از آتش تو دود به محشر بر آورند

کشتی شکست خوردهٔ طوفان کربلا — در خاک و خون فتاده بمیدان کربلا

از آب ہم مضائقہ کردند کوفیاں　　خوش داشتند حرمت مہمانِ کربلا
بودند دیو و دد ہمہ سیراب و می مکید　　خاتم ز قحطِ آب سلیمانِ کربلا
آہ از دمے کہ لشکرِ اعدا نکردہ شرم　　کردند رو بہ خیمۂ سلطانِ کربلا

آندم فلک بہ آتشِ غیرت سپند شد
کز خوفِ خصم در حرم افغاں بلند شد

کاش آں زماں سرادقِ گردوں نگوں شدے　　ویں خرگہ بلند ستوں بے ستوں شدی
کاش آں زماں کہ پیکرِ او شد درونِ خاک　　جانِ جہانیاں ہمہ از تن بروں شدی
کاش آں زماں کہ کشتیِ آلِ نبی شکست　　عالم تمام غرقۂ دریائے خوں شدی
آں انتقام گر نفتادے بروزِ حشر　　با ایں عمل معاملۂ دہر چوں شدی

آلِ نبی چو دستِ تظلم برآورند
ارکانِ عرش را بہ تزلزل درآورند

بر خوانِ غم چو عالمیاں را صلا زدند　　اول صلا بہ سلسلۂ انبیا زدند
نوبت بہ اولیا چو رسید آسماں طپید　　زاں ضربتے کہ بر سرِ شیرِ خدا زدند
وانگہ سرادقے کہ ملک محرمش نبود　　کندند از مدینہ و در کربلا زدند
اہلِ حرم دریدہ گریباں کشادہ مو　　فریاد بر درِ حرمِ کبریا زدند

روح الامیں نہادہ بزانو سرِ حجاب
تاریک شد ز دیدنِ او چشمِ آفتاب

چوں خوں ز حلقِ تشنۂ او بر زمیں رسید　　جوش از زمیں بذروۂ عرشِ بریں رسید
نزدیک شد کہ خانۂ ایماں شود خراب　　از بس شکستہا کہ بارکانِ دیں رسید
باد آں غبار چوں بمزارِ نبی رساند　　گرد از مدینہ بر فلکِ ہفتمیں رسید
پر شد فلک ز غلغلہ چوں نوبتِ خروش　　از انبیا بحضرتِ روح الامیں رسید

گرد ایں خیال وہم غلط کار کاں غبار | تا دامن جلال جہاں آفریں رسید

ہست از ملال گرچہ بری ذات ذوالجلال
او در دل است و ہیچ دلے نیست بے ملال

روزے کہ شد بہ نیزہ سر آں بزرگوار | خورشید سر برہنہ بر آمد ز کوہسار
جمعے کہ پاس محمل شاں داشت جبرئیل | گردند بے عماری محمل شتر سوار
باآں کہ سرزد ایں عمل از امت رسول | روح الامیں ز روح نبی گشت شرمسار
برحربگاہ چوں رہ آں کارواں فتاد | شور نشور در ہمہ کون و مکاں فتاد
ہرجا کہ بود آہوئے از دشت پاکشید | ہرجا کہ بود طائرے از آشیاں فتاد
شد وحشتے کہ شور قیامت بگرد رفت | چوں چشم اہل بیت بر آں کشتگاں فتاد
ناگاہ چشم دختر زہرا دراں میاں | بر پیکر شریف امام زماں فتاد
بے اختیار نعرہ ہذا حسین ازد | سرزد چناں کہ آتش ازاں در جہاں فتاد

پس با زبان پر گلہ آں بضعۃ الرسول
رو کرد در مدینہ کہ یا ایہا الرسول

ایں کشتۂ فتادہ بہ ہامون حسین تست | ویں صید دست و پا زدہ در خون حسین تست
ایں خشک لب فتادہ ممنوع از فرات | کز خون او زمیں شدہ جیحوں حسین تست
ایں قالب طپاں کہ چنیں ماندہ بر زمیں | شاہ شہید ناشدہ مدفون حسین تست
ایں غرقہ محیط شہادت کہ روئے دشت | از موج خون او شدہ گلگوں حسین تست

پس روسوئے بقیع و بہ زہرا خطاب کرد
وحش از زمین و مرغ ہوا را کباب کرد

کائے مونس شکستہ دلاں حال ما ببیں | ما را غریب و بیکس و بے آشنا ببیں
در خلد بر حجاب دو کون آستیں فشاں | واندر جہاں مصیبت ما بر ملا ببیں

شد نے در آ چو ابر خروشان بکربلا — طغیان سیل فتنہ و موج بلا ببیں
تنہائے کشتگاں ہمہ در خاک و خوں نگر — سرہائے سروراں ہمہ بر نیزہا ببیں
آں سر کہ بود بر سر دوش نبی مدام — یک نیزہ اش ز دوش مخالف جدا ببیں
واں تن کہ بود پرورشش در کنار تو — غلطاں بخاک معرکہ کربلا ببیں

یا بضعۃ الرسول ز ابن زیاد داد
کو خاک اہل بیت رسالت بباد داد

واقعہ خوانی

ہم اس کو تسلیم کرتے ہیں اور نہ اس میں شک و شبہ کی گنجائش ہے کہ مصائب مظلوم کربلا پر گریہ و بکا باعث اجر جزیل و ثواب عظیم ہے اور آئمہ اہل بیت علیہم السلام کی متعدد حدیثیں جو حد تواتر کو پہونچی ہوئی ہیں اس پر شاہد ہیں چنانچہ آئمہ طاہرین اور ان کے بعد دوسری بزرگان دین کے وقت میں یہ طریقہ جاری تھا کہ مصائب کربلا نظماً و نثراً بیان کئے جاتے تھے اور سامعین گریہ کرتے تھے یہاں تک کہ مُلّا حسین واعظ کاشفی نے ۹۰۸ھ ہجری میں کتاب روضۃ الشہداء تالیف کی اور اس کتاب کو بوجہ قبولیت عام ایسا رواج ہوا کہ تمام مجالس عزا میں پڑھی جانے لگی جو لوگ خصوصیت کے ساتھ اس کو پڑھنے کے مشتاق تھے وہ روضہ خوان کے لقب سے مشہور ہو گئے یعنے خوانندہ کتاب روضۃ الشہدا بعد ازاں رفتہ رفتہ اس کے مضامین دوسری کتابوں میں نقل ہونے لگے بعض لوگوں نے اس کو محض حافظہ کی یادداشت پر پڑھنا شروع کیا اور بتدریج اس طریقہ میں ترقی ہوتی گئی اور چونکہ اصلی مقصود رونا اور رلانا تھا اس لئے اب ذکر مصائب کے ساتھ

جدت پسند طبائع کو راغب کرنے کے لئے تمہید میں قصے حکایتیں اشعار فضائل اور مسائل ذریعہ وغیرہ بیان ہونے لگے یہاں تک کہ ایک مستقل فن ہوگیا اور اس فن میں علما اور دوسرے معمولی لیاقت کے آدمیوں نے بے شمار کتابیں اور رسالے لکھ ڈالے۔ خواہ نثر ہوں یا نظم عربی ہوں یا فارسی عام شیعوں نے (جو مجالس عزا میں بے دریغ روپیہ خرچ کرتے ہیں یہاں تک کہ انفاق و صدقات زکات وخیرات میں بھی لاپرواہ ہیں اور اگر دیتے ہیں تو شوق سے نہیں بلکہ بے دلی سے لیکن مجالس عزا میں بڑے انہماک سے اور شوق سے جان ومال کے ساتھ خدمت کرتے ہیں) روضہ خوانوں کی خدمت اور تواضع کو جوان مجلسوں کے رکن اعظم ہیں دوسری تمام خدمتوں سے اعلیٰ اور اشرف سمجھا جاتا ہے چونکہ ذاکرین ان مخصوص لوگوں میں شمار کئے جاتے ہیں جن کے لئے وعدۂ مغفرت اور جنت یقینی ہے بلکہ دوسروں کو رلانے کا باعث ہونے کی وجہ سے ان کا مرتبہ اور اعزاز اور بھی برتر اور اعلیٰ سمجھا جاتا ہے کیونکہ وہ خود بھی مثاب ہوتے ہیں اور دوسروں کو بھی مثاب کرتے ہیں لہذا ان کو سرکار حسینی کے خادمان خاص ہونے کا شرف حاصل ہے اور یہ لوگ خود بھی دوسرے مومنین پر ایک خاص فخر شرف وامتیاز کے مدعی ہیں۔

لیکن ان کو یہ اچھی طرح سمجھ لینا چاہیئے کہ اس منصب جلیل اور پایۂ رفیع تک سربلندی پانا کچھ آسان کام نہیں ہے یہ ترقی وارتقا چند شرائط کے ساتھ مشروط ہے۔ جب تک ان پر عمل نہ کیا جائے یہ جدوجہد بے سود زحمت اور بے ثمر ریاضت سے زیادہ وقعت نہیں رکھتا اور ان کی تمام مشقتیں بے نتیجہ ہیں یہ لوگ نہ تو گروہ مخلصین میں شمار کئے جائیں گے۔ اور نہ طبقۂ ذاکرین میں بلکہ ان کا نام اس زمرہ سے محو اور ان کا یہ فعل حسنہ ضبط ہو جائیگا اور وہ مذہبی تاجر یا کاذب وغادر سمجھے جائیں گے نہ اس کا اجر خدا کی بارگاہ سے پائیں گے نہ حضرات معصومین کی سرکار سے صلہ ملے گا اس لئے ضرور ہے کہ جو شخص گروہ ذاکرین میں داخل ہو کر ثواب عظیم کا خواہاں اور اس منصب جلیل کا امیدوار ہو وہ ان دو شرطو

کو ملحوظ خاطر رکھے ورنہ خود کو اندھوں کی طرح اس مہلکہ اور مواخذہ میں نہ ڈالے۔ وہ دو شہ طلبی۔ اخلاص اور صدق ہیں یہ دونوں اس بام رفیع پر ترقی کی سیڑھیاں ہیں۔ اگر ان میں سے ایک بھی صحیح و بے عیب نہ ہوگی اوندھے منہ نیچے گریگا اور یہ ایسا صاف و روشن مسئلہ ہے جس پر زیادہ دلیل و حجت پیش کرنے کی ضرورت نہیں۔ ہر عمل میں عامل کی نیت اور ارادے کو دیکھا جاتا ہے۔ دینی ہو یا دنیاوی بالخصوص دینیات میں اگر اس کی نیت خالص اور قربتہً الی اللہ ہے تو سب کچھ ہے ورنہ کچھ بھی نہیں۔ فضائل و مصائب اہل بیت بہ نیت خالص اور محض رضائے الہی کے واسطے بیان کئے جائیں تو بے شک اجر عظیم اس کا صلہ ہے اور اگر اس سے مدعا کسب مال جلب منفعت اظہار فضل وکمال اور اعلان نام و نمود ہے یا یہ مقصد ہو کہ اگر نثر ہے تو لفاظی و فصاحت و بلاغت کی اور نظم ہے تو مضامین و استعارات و تشبیہات کی داد ملے تو یقیناً یہ ذکر اس کے لئے عبث اور بے نتیجہ ہے کیونکہ اس نے ایک فاسد غرض سے ان بے شمار حسنات کو چھوڑ دیا۔ جو بارگاہ رب العزت سے عطا فرمائے جاتے ہیں اور دنیا کے تھوڑے سے فائدہ کے لئے (خواہ وہ مال کا ہو خواہ نام و نمود کا) آخرت کی لازوال نعمت سے روگردانی کی بے شک کوئی نیکی بغیر اخلاص کے نیکی نہیں اور کوئی عبادت بغیر اخلاص کے عبادت نہیں سمجھی جاتی بلکہ یہ ایک شرک خفی ہے جس کا ان سے ضرور مواخذہ کیا جائیگا چنانچہ علامہ محمد ابن یعقوب کلینی کتاب کافی میں حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام سے روایت کرتے ہیں کہ آپ نے فرمایا:-

مَنْ اَرَادَ الحدیث لمنفعۃ الدنیا لم یَکُنْ لہ فی الآخرۃ نصیب وَمَنْ اَرَادَ بہ الآخرۃ اعطاہ اللہ خیر الدنیا والآخرۃ۔	جو کوئی حدیث سے یہ ارادہ کرے کہ اس کی وجہ سے مال دنیا حاصل ہو تو اس کے واسطے آخرت میں کچھ حصہ نہیں اور اگر اس کے تعلیم و تعلم سے آخرت کی

نیت کرے خدا اس کو دنیا و آخرت میں نیکی عطا فرمائے گا۔

اسی طرح شیخ ابن ابی جمہور کتاب غوالی اللآلی میں جناب امیر علیہ السلام سے روایت کرتے ہیں کہ آں حضرت صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں۔

من اخذ العلم من اھلہ وعمل بہ نجی ومن اراد بہ الدنیا فھو حظہ۔

جس نے کسی علم کو اس کے اہل سے حاصل کیا اور اس پر عامل ہوا تو اس نے نجات پائی اور جس نے محض دنیا کا ارادہ کیا تو اس کو اس علم سے وہی ملے گا جو قصد کیا ہے۔

اسی قسم کی اور بہت حدیثیں کتب دینیہ میں موجود ہیں افسوس ہے کہ اکثر اہل علم کے دامن فضل و کمال پر یہ بدنما دھبہ نظر آتا ہے۔ خصوصاً ذاکرین کہ ان میں سے اکثر کی غرض اس فن کے حاصل کرنے سے محض کسب ۔ ۔ ۔ ہوتی ہے نہ حصول ثواب گویا وہ ایک قسم کے تجارت پیشہ ہیں جو اپنے متاع گرانبہا کو کوڑیوں کے مول بیچ ڈالتے ہیں۔ اور خریداروں سے اسی طرح معاملہ کرتے ہیں جس طرح سوداگر اپنی جنس کی بابت کمی بیشی پر ردّ و بدل کرتا ہے۔ اجرت ٹھہرا کر بیٹھتے ہیں اگر کم ملے تو ناخوش ہوتے اور عدم توجہی سے کام کرتے ہیں اور اگر زیادہ دام ملیں تو محنت اور توجہ سے اس خدمت کو انجام دیتے ہیں اس پر لطف یہ ہے کہ اس بیہودہ کسب و تجارت ۔ ۔ ۔ معتاد کے باوجود مجالس و محافل میں برسر منبر فخر کرتے ہیں خود کو جناب سیدالشہدا علیہ السلام کے چاکران خاص میں سمجھتے اور دوسروں کے مقابلہ میں صاحب حقوق عظیمہ و واجب الاحترام اور لائق توقیر و اکرام جانتے ہیں۔ درآنحالیکہ ان کا یہ فعل نہایت زبوں اور قابل نفرین ہے اور کسی طرح داخل عبادت اور ذریعہ ثواب آخرت نہیں ہو سکتا۔ ہم ایسے اجرت کے کام کو کیونکر کار خیر سمجھ سکتے ہیں اور ایسے ذاکرین کو اجر عظیم کا مستحق کس طرح قرار دیا جا سکتا ہے جب کہ ان کے عمل کی ماہیت ہی ڈانواں ڈول ہو اور ان کی نیت کچھ ہے بھی تو

اول روپیہ پیدا کرنے کی اگر کوئی مسلمان اُجرت کی نماز پڑھے یا روزہ رکھے یا حج کرے تو کیا عقلاً و نقلاً وہ ثواب کا مستحق ہو سکتا ہے۔ کیا اس اُجرتی عمل کا جس کے معاوضہ میں وہ روپیہ لے چکا ہے اس کو اجر بھی ملے گا ہرگز نہیں مالک جزا و سزا کا حکم محکم ایسے لوگوں کو نہایت صاف الفاظ میں تنبیہ فرماتا ہے۔

من کان یرید حرث الآخرۃ نزد لہ فی حرثہ ومن کان یرید حرث الدنیا نؤتہ منہا ومالہ فی الآخرۃ من نصیب (پارہ ۲۵ سورہ حم عسق رکوع)	جو شخص آخرت کی کھیتی کا طالب ہو تو ہم اس کے لئے اس کی کھیتی میں افزائش کریں گے اور جو دنیا کی کھیتی کا خواستگار ہو تو ہم اس کو اسی میں دیں گے۔ مگر پھر آخرت میں

اس کا کچھ حصہ نہ ہوگا۔

شیخ جلیل جعفر بن احمد قمی کتاب غایات میں کہتے ہیں کہ رسولخدا نے فرمایا ہے۔

شر الناس من باع آخرتہ بدنیاہ وشر من ذالک من باع آخرتہ بدنیا غیرہ	بدترین انسان وہ ہے جس نے آخرت کو دنیا کے عوض میں بیچا اور اس سے بھی بدتر وہ ہے جس نے اپنے آخرت دوسرے کی

دنیا کے لئے فروخت کی۔

شیخ صدوق محمد بن بابویہ القمی کتاب اعقاب الاعمال میں تحریر کرتے ہیں کہ جناب ختمی مآب صلعم کا ارشاد ہے:-

ومن عرضت لہ دنیا وآخرۃ فاختار الدنیا وترک الآخرۃ لقی اللہ و لیست وحسنۃ یتقیہ النار	جس شخص پر دنیا اور آخرت دونوں پیش کی جائیں اور وہ دنیا کو اختیار کر کے آخرت کو ترک کردے وہ ملاقات کریگا خدائے

تعالےٰ سے اس حال میں کہ اس کے واسطے ایسی نیکی ہوگی جو اس کو آتش جہنم سے بچالے۔

اخلاص کے بعد ذاکر کے لئے دوسرا درجہ صدق اور راست گفتاری کا ہے کہ صرف

وہی واقعات بیان کرے جن کو علما و مورخین صحیح تسلیم کر چکے ہیں۔ ذاکر کا کام یہ نہیں ہے کہ صرف رونے رُلانے کو مدنظر رکھ کر روایاتِ ضعیفہ موضوعہ خود ساختہ کو بیان کرے ورنہ وہ دروغ بیانی اور افترا پردازی دو جرموں کا مجرم ہوگا اور اس دوہری معصیت کا بار اس وجہ سے اور بھی زیادہ گراں ہو جائے گا کہ وہ ایک مجمع پر اپنے کذب و بہتان کا اثر ڈال رہا ہے۔ واقعات اگر صحیح نہیں تو ان کے دروغ اور غلط ہونے میں کیا کلام ہو سکتا ہے جو واقعہ نہیں ہوا یا جو فعل حضرت نے نہیں کیا یا جو قول حضرت نے نہیں فرمایا اس کو حضرت کی طرف منسوب کر دینا بہتان و افترا نہیں تو کیا ہے اور اس کے بہتان و افترا ہونے میں کون شک کر سکتا ہے اس کو تو بجائے مدح کے سراسر توہین و تذلیل ہے۔ پھر توہین بھی کس کی اہل بیت رسالت کی جیسا کہ ہم پہلے بھی بیان کر چکے ہیں قرآن مجید میں بہت سی آیتیں جھوٹوں کی مذمت میں وارد ہیں ان آیات کے علاوہ رسولِ خدا اور ائمہ خدا کی احادیث بھی بکثرت موجود ہیں جن میں کذب و افترا کی سخت مذمت کی گئی ہے، اگر ان مذہبی احکام سے قطع نظر کیجئے تو عقلاً اور اخلاقاً بھی کذب و افترا جس قدر مذموم ہیں وہ محتاج بیان نہیں یہی وجہ ہے کہ شیخ صدوق کتاب امالی میں جناب سرور کائنات سے روایت کرتے ہیں کہ آپ نے فرمایا

"عظیم ترین خطا کاران خدا کے نزدیک وہ ہے جو لسان اور کذب ہو"

یہ نقلی اور عقلی برائیاں معمولی کذب کی ہیں چہ جائے کہ خدا رسولِ خدا اور اہل بیتِ رسولِ خدا پر بہتان و افترا کیا جائے نعوذ باللہ من ذالک۔

اس میں شک نہیں کہ شیعہ طبقہ میں ذاکرینِ حسینؑ کو نہایت عزت و وقعت کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے اور اس مخصوص قدر و منزلت کا انحصار محض ان کی ذاتی قابلیت یا شخصی محاسن پر نہیں بلکہ ان خدمات پر ہے جن کو گروہ ذاکرین انجام دیتا ہے۔ یہ بھی مسلم ہے کہ شیعوں کو حسینؑ اور جاں نثاران حسینؑ سے دلی انس اور حبی محبت ہے۔

لہٰذا ان کے نزدیک ہر وہ شخص جو حسینؑ کا ذکر کرے عزت کی نگاہ سے دیکھے جانے کا مستحق ہے شیعہ طبقہ میں ذاکرِ حسینؑ کی معمولی منزلت کا اندازہ اسی سے ہو سکتا ہے کہ دنیا میں کسی پبلک پلیٹ فارم پر کسی جلسہ میں کسی مقرر کو اپنے خیالات کے اظہار میں اتنی آزادی حاصل نہیں جتنی ذاکرین کو ہے شیعوں کے خیال میں ذاکرِ حسینؑ کی ذات بالعموم دائرۂ تنقید سے بالاتر سمجھی جاتی ہے اس سے کسی قسم کی باز پرس کرنا سنگین سے سنگین موقعوں پر بھی اُسے ٹوکنا محض خلافِ ہی نہیں بلکہ سخت مذموم سمجھا جاتا ہے دنیا کے اور جلسوں میں جہاں کسی مقرر کی زبان سے غیر ذمہ دارانہ بات نکلی فوراً سامعین نے کسی نہ کسی طریقہ پر اظہارِ نارضامندی کر دیا مگر شیعہ طبقہ کا یہ طرزِ عمل ہے کہ وہ ایسے موقعوں پر ضبط و سکون سے کام لیتے ہیں اور ذاکر سے کسی قسم کی باز پرس نہیں کرتے بلا لحاظ اس کے کہ ان کا پایۂ علم کتنا بلند یا پست ہے اور اس کی نظر کس قدر وسیع یا محدود ہے اور اس کے بیانات کو واقعات سے کیا نسبت ہے۔ علاوہ ایسے موقعوں کے جن کو اصطلاح میں مجلس کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے عام اوقات میں بھی ذاکرین کے بیانات پر تنقیدی نظر ڈالنے سے احتراز کیا جاتا ہے۔ ان کی لغزشوں سے اغماض اور کوتاہیوں سے پردہ پوشی کی جاتی ہے یہاں تک کہ کبھی کوئی آدمی ذاکرین کے ارشادات کا جائزہ لینے اور ان کے بیانات کی ان سے باز پرس کرنے کی جرأت کر بیٹھتا ہے تو عوام الناس کے نزدیک وہ مذہب کی توہین اور عزاداری کی مخالفت کا مرتکب سمجھا جاتا ہے یہی وجہ ہے کہ ذاکرین کو اس کا یقین ہو گیا ہے کہ بر سرِ منبر ہم کچھ بھی بیان کر دیں گے اسے صحیح سمجھ لیا جائے گا تو انہوں نے ذاکرِ حسینؑ کے حقیقی صفات پیدا کرنے صحیح واقعات کا علم حاصل کرنے اور روایات کی چھان بین میں عرق ریزی کی ضرورت نہیں سمجھی اور جب ان کو یہ معلوم ہو گیا کہ جو مخصوص وقعت و عزت ذاکرِ حسینؑ کے نام سے وابستہ ہے وہ بہت سستے داموں میں حاصل ہو سکتی ہے تو انہوں نے اکتسابِ علمی کی زحمتوں کو غیر ضروری سمجھتے ہوئے بلا تامل نہایت ضعیف نا قابلِ وثوق بلکہ

اور جو روایات کو آزادی سے بیان کرنا شروع کر دیا۔ صرف یہی نہیں بلکہ سامعین کو اپنی طرف متوجہ کرنے اور ان کے دلوں پر اپنی قابلیت کا سکہ جمانے کے خاطر ایسی روایات کے بیان کرنے کی جسارت اختیار کر لی جن کے ماخذ کا پتہ ان کے دماغوں کے سوا کسی کتاب میں نہیں چل سکتا ذاکری نے ایک خاص فن یا پیشہ کی صورت اختیار کر لی ہر ایک ذاکر کو اپنے ہم اثروں پر فوقیت پانے اور نئی سے نئی بات بیان کر کے امتیازی حیثیت قائم کرنے کا شوق دامنگیر ہوا جہاں واقعات و محض واقعات کی ضرورت تھی وہاں تحریف اور اختراع دخیل کار ہو گئے نام و نمود کی ہوس روایات کی جانچ پڑتال کی ضرورت پر غالب آئی۔ سامعین کی رواداری اور عدم واقفیت نے ہمت افزائی کی کم مائیگی اور عدم استعداد نے خود ذاکرین کو اپنی بے راہ روی کے احساس سے بیگانہ رکھا آخر یہاں تک نوبت پہونچی کہ اصل مقاصد کی ضرورت ہی دگرگوں ہو گئی جس کا جی چاہا ذاکر بن بیٹھا اور جو اس کے جی میں آیا بیان کرنا شروع کر دیا۔ سید الشہدا اور کربلا کے واقعات اس کے محتاج ہی نہیں کہ سامعین کو مائل بہ گریہ بنانے کے لئے ان میں خلاف واقعہ اضافہ کئے جائیں نہ وہ متبرک ہستیاں ایسی ہیں جن کے متعلق روایات میں ندرت یا اضافہ کا حق ہم کسی فرد یا جماعت کے ہاتھ میں دیدینے پر رضامند ہو سکیں۔ ہم نے مانا کہ ذاکرین کی نیت سامعین کو رلانا ہی رہتی ہے اور امام مظلوم کے مصائب پر اشکبار رہنا باعثِ اجر عظیم ہے لیکن اس کے باوجود ہم یہ ہرگز گوارا نہیں کر سکتے کہ ائمہ معصومین اہل بیتِ اطہار یا ان کے رفقاء کی نسبت بے بنیاد افسانہ نگاری اور روایت آفرینی کو دخل دیا جائے ہمیں اس کا اعتراف ہے کہ فن مرثیہ گوئی ادبِ اردو میں ایک قابل قدر اضافہ کا باعث ہوا ہے ادبی نقطۂ نظر سے ہمارے دل میں اس کی پوری وقعت ہے۔ لیکن اس کے ساتھ ہی ساتھ ہم اس کے اظہار پر بھی مجبور ہیں کہ کسی ضعیف بے بنیاد خلاف عقل روایت کو محض اس وجہ سے صحیح ماننے کے لئے تیار نہیں کہ اس کو کسی ذاکر نے تقریر یا تحریر

نظم یا نثر میں ہمارے سامنے پیش کیا ہے ہم کو اس کا پورا احساس ہے کہ جن وجوہ کا سطور بالا میں ذکر کیا جا چکا ہے، ان کی بدولت اور جن مخصوص ماحول میں ذاکرین نے اپنے فرائض کو ادا کرتے ہیں ان کے زیر اثر یہ لوگ ایک زبردست قوت کے مالک ہیں۔ شیعہ طبقہ میں بیشتر ایسے لوگ ہیں کہ جن کے مذہبی معلومات اور عقائد دینی کا بہت کچھ انحصار ان باتوں پر ہے جن کو وہ وقتاً فوقتاً ذاکرین سے سنتے رہتے ہیں۔ شیعہ اشخاص اکثر بچپن سے مجالس حسینی میں شریک ہونے لگتے ہیں اور جو کچھ ذاکرین بیان کرتے ہیں ان سے اثر پذیر ہوتے ہیں۔ ذاکرین کے ملفوظات کا اثر بالخصوص بچوں عورتوں اور کم سمجھ پڑھے لوگوں پر بہت گہرا اور رفتہ رفتہ کالنقش فی الحجر کی طرح راسخ ہو جاتا ہے۔ یہاں تک کہ یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ شیعہ قوم کے مذہبی سطح نظر اور مرحلہ حیات میں عام رجحان طبع کا انحصار ذاکرین حسین کے بیانات پر ہے۔ صحیح عقائد اور بہترین پایہ کی تعلیم کے مواقع ذاکرین کو حاصل ہیں ان سے فائدہ اٹھانا ان کی استعداد علمی اور فرض شناسی پر منحصر ہے لیکن اگر ذاکرین کی جماعت خود اپنے فرائض سے غافل رہے یا اپنی کم استعدادی اور عدم واقفیت کی بدولت غلط نظریہ غلط اصول غلط عقائد غلط واقعات قوم کے سامنے پیش کرنے لگے تو ظاہر ہے کہ قوم کے لئے ان کا وجود کس درجہ مضرت رساں ثابت ہوگا ایسی حالت میں کسی صاحب فہم کو اس سے انکار نہیں ہو سکتا کہ ذاکرین کو بالکل آزاد چھوڑ دینا قومی مفاد کے لئے کس قدر خطرناک ہے۔ سابق میں اس کا تجربہ ہو چکا ہے اور جو مضر نتائج اس سے پیدا ہو سکتے ہیں وہ بھی مشاہدہ میں آچکے ہیں اس کا دعویٰ ہے اور یہ ہمارا عقیدہ ہے کہ امام حسین علیہ السلام کی شہادت ہماری بخشش اور نجات کا ذریعہ ہے لیکن ہم اس پر بھی فخر کرتے ہیں کہ حسینی شہادت کے متعلق ہمارا نظریہ وہ نہیں جو عیسائیوں کا عقیدہ حضرت عیسٰی کے صلیب پانے کی نسبت ہے یعنی ہم یہ نہیں سمجھتے کہ حسینؑ کی شہادت امت محمدیہ کے گناہوں کا کفارہ ہو گئی اور اب ہمیں اپنے اعمال پر

نظر رکھنے اور ان کے متعلق جواب دہی کی ضرورت باقی نہیں رہی بلکہ ہمارا اعتقاد ہے کہ حسینؑ نے حق اور باطل کو علیحدہ کرکے دکھا دیا اسلام کو اغیار کی دست برد سے بچا لیا۔ اور اس اعتبار سے ہماری ہدایت کا سامان مہیا کر دیا اب راہ راست پر رہنا ہمارا کام ہے لیکن کم استعداد اور نااہل ذاکرین کے گول مول بیانات اور تاویلات کی بدولت عام شیعوں کی ایک بڑی تعداد کا یہ عقیدہ ہو گیا ہے کہ ان کی بخشش کے لئے حسینؑ کی شہادت کافی ہے اب ان کے اعمال کی نسبت کوئی باز پرس نہ ہوگی کیونکہ حسینؑ پر بار آ رونے پیٹنے سے جنت ان پر واجب ہو چکی ہے اس لئے وہ جو چاہیں کریں ذاکر کی صدا سے متاثر ہو کر چند آنسوؤں کا ان کی آنکھ سے نکل آنا ہی تمام گناہوں کی معافی کا ضامن ہے ہمارا یہ مطلب نہیں کہ سب ذاکر ایسے ہی نظریوں کی ترویج کرتے ہیں لیکن بہت سے ایسے بھی ہیں جن کی تعلیم کا ماحصل راست گوئی اور حق پرستی کی بجائے باطل پرستی مروّت وار ہمت استقلال اور ایثار کے بدلے کم ہمتی ضعیف الاعتقادی تنگ دلی تنگ نظری نکلتا ہے۔ پھر کس طرح ممکن ہے کہ ذاکرین کی طرف سے کامل چشم پوشی کا اصول برتا جائے ان کی باگ بالکل ڈھیلی چھوڑ دی جائے اور ان سے کسی قسم کا محاسبہ نہ کیا جائے مروجہ ذاکری کا پایہ اس قدر پستی تک کبھی نہ پہنچتا اگر سابق میں شیعہ پبلک اپنے فرائض تنقید و تعریض سے غافل نہ رہی ہوتی مگر واقعہ تو یہ ہوا کہ سامعین کو کسی نہ کسی طرح رلا دینا ہی کامیاب ہو جانا ہی ذاکری کا طرۂ امتیاز بن گیا مستند روایات صحت بیان اور سبق آموز معلومات کے اعتبار سے کسی ذاکر کا بیان کتنا ہی قابل قدر کیوں نہ ہو لیکن اگر وہ سامعین کو بہ آواز بلند رونے پر مائل نہ کر سکا تو اس کا شمار کامیاب ذاکرین میں نہیں عام لوگوں کے نزدیک ایسے ذاکر کی محنت سعی لاحاصل کا مصداق بنی اور مجلس آلِ کار سے محروم رہی اس لئے ذاکرین کی انتہائی کوششیں اسی نصب العین کی طرف مبذول ہو گئیں اور اس کے زیر اثر صحیح روایات میں تحریف تصرف اور اضافہ ہونے لگا اور ذاکری کا مقصد

یہ رہ گیا کہ کسی نہ کسی طرح کی مجلس کو گریہ و بکا کے ایک مخصوص ماحول میں خاتمہ تک پہونچا دیں اس طرح ان تمام معائب پر نظر رکھتے ہوئے جو ذاکری کے دامن پر بدنما داغ ہیں اصلاح کی ضرورت ہے اور اشد ضرورت ہے ذاکرین کو لازم ہے کہ جس منصب جلیل کی خدمات وہ بلامعاوضہ یا بالمعاوضہ انجام دیتے ہیں اس کا تعلق اُن معصوم اور مقدس ہستیوں سے ہے جن کی طرف خود ساختہ یا بے بنیاد روایات اور خلاف واقعہ بیانات کا منسوب کر دینا بلا لحاظ اس کے کہ وہ سامعین کی نظر میں کتنی ہی خوشگوار اور گریہ آور ہوں ہر پہلو سے قابلِ مواخذہ و محاسبہ جسارت ہے بلکہ معصیت کی حد تک پہنچ جاتا ہے۔

سامعین کو بھی یہ ملحوظ رکھنا چاہیئے کہ ہر مرتبہ جب وہ شہدائے کربلا یا امام مظلوم کے سرمبارک یا رسول اللہ کے گھرانے کی بہو بیٹیوں یا ایسے ہی دوسرے واقعات کے متعلق طرح طرح کی غلط اور بے بنیاد روایات اور انواع و اقسام کے اتہامات کو خوشی سے بیٹھ کر سنتے ہیں اور کچھ باز پرس نہیں کرتے تو وہ خود بھی مورد الزام ٹھہرتے ہیں ہمارا یہ مطلب نہیں اور نہ یہ مناسب ہے کہ بھری مجلسوں اور مجمعوں میں ذاکروں کو ٹوکا جائے یا ان کے بیانات کی تردید کی جائے۔ مگر ہر سننے والے پر اس کی ذمہ داری یقیناً عائد ہوتی ہے کہ موقعہ اور محل کا لحاظ کر کے ذاکروں کو ان کی لغزشوں اور غلط بیانیوں سے آگاہ کرنے کی کوشش کرے۔

یہ بھی واضح رہے کہ ہر کتاب لائق اعتماد نہیں بلکہ جو مشہور اور مستند کتابیں ہیں ان میں بھی علمائے مشاہیر سے تسامح ہوا ہے یا ان کو کوئی روایت غلط ملی ہے یا انہوں نے اس پر غور نہیں کیا جیسا کہ تمام مشہور کتابوں کے دیکھنے سے یہ حال ظاہر ہو جاتا ہے۔ کتاب الارشاد شیخ مفید ہو یا لہوف سید ابن طاؤس مقتل ابو مخنف ہو یا مثیر الاحزان ابن نما بحار الانوار ملائے مجلسی یا احتجاج طبرسی اول واقعات کی صحت و غیر صحت کی جانچ ان ہی اصول مقررہ پر کرنے چاہیئں جو اسی فن کے معیا

مقرر کردئے گئے اور جن کو ہم اوپر بیان بھی کرچکے ہیں۔

محبانِ حسینؑ نے بے شمار دولت تقسیم شیرینی سامان اور اُجرت ذاکرین میں صرف کی، جس کی غرض اول یہ تھی کہ غمِ حسینؑ کو ترقی دی جائے لوگ مصائبِ شہدائے کربلا سُن کر روئیں اور ثواب حاصل کریں اگرچہ اکثر اشخاص اس سے مستثنیٰ نہیں ہوسکتے۔ کہ ان کی اس غرض میں نام ونمود کا جزو بھی شامل تھا خیر جو کچھ ہوا زمانہ کے موافق ہوا۔ شاعری کی ترقی کے زمانہ میں تحت اللفظ موسیقیت کے زمانہ میں سوز نثر خوانی کے زمانہ میں مقفٰے و مسجع عبارت آرائی روضہ خوانی کے زمانہ میں روضہ خوانی و حدیث خوانی ہوتی رہی اور بڑی ہمت سے ہوتی رہی یہی ترکیب ہر جگہ کم وبیش اب بھی جاری ہے۔
مگر غور طلب یہ مسئلہ ہے کہ آیا صرف یہی طریقہ ہے جو حسینؑ کے نام اور واقعات کی ترقی کے لئے پسندیدہ ہے یا اس کے علاوہ اور بھی کچھ ممکن ہے پہلے ہم کو مذکورہ بالا امور کے فوائد و نقصانات پر غور کرنا چاہیئے۔

فائدہ یہ کہا جائے گا کہ کچھ لوگوں نے سنا کیا سنا۔ سوزخوانی تحت لفظ خوانی، روضہ خوانی حدیث خوانی ان میں سے ہر ایک کی غرض مشترک یہ تھی کہ کس طرح اچھی طرح رولایا جائے تاکہ ثوابِ مجلس حاصل ہو صرف یہی نہ تھا بلکہ سوزخوان اپنی موسیقی کی تان اور تحت لفظ خواں اشعار کی طرزِ ادا کے لئے جان دے رہا تھا۔ نثر خوان مقفٰی مسجع فقروں کی نمائش اور اپنے تبحر علمی کا اظہار کر رہا تھا بہرحال فائدہ تو یہ ہوا کہ ہم نے موسیقی شاعری الفاظی ولسانی کو زندہ رکھا۔ کچھ لوگوں نے واقعات سُنے گریہ و بکا ہوا۔ چند ذاکر دینیوں کی فکر سے مستغنی ہوگئے تقسیم شیرینی بھی اسی رسمِ بارک کے ماتحت میں ہے اور تقسیم کی بڑی غرض یہی ہوسکتی ہے کہ جو لوگ بغیر لالچ آتے ہیں وہ تو آئیں گے ہی جو لالچی ہیں ان کو شیرینی کھینچ لائے گی اور پھر گوش زدہ اثرے دارد۔ نقصان یہ ہے ہم نے بھی اسی طرح کچھ لوگ تیار اور مقرر کئے جس طرح یہودیوں نے اپنے ربی مسیحیوں نے اُسقف ہندوؤں نے کتھا خوان برہمن اور بودھوں نے بھکشو

بنائے تھے ایسے لوگوں نے اگر مذہب کی حفاظت کی بھی تو اجرت پاکر جس طرح آج مسیحی پادریوں پر اعتراض ہوتا ہے کہ اگر تم بڑی تنخواہیں نہ پاتے اور بڑے بڑے اوقاف پر تسلط کے علاوہ ذاتی فوائد مد نظر نہ ہوتے تو شاید آج مسیحیت کتب خانوں کی الماریوں میں بند ہوتی۔ ایسی کوششیں بے غرضانہ اور خالصۃً للہ نہیں کہی جا سکتیں۔

ممکن ہے کہ یہ کہا جائے کہ اس کی وجہ تو ضرورت اور اشد ضرورت ہے کہ جو لوگ اپنے کو اس کار خیر کے لئے وقف کر دیتے ہیں ان کی خدمات کے صلہ میں اُن کے نقصانات کی تلافی کی جائے جو انہیں وقتی مصروفیتوں کی وجہ سے ہوتا ہے کیونکہ ان کا ایثار انہیں تمدنی ضروریات سے فارغ اور مستغنی نہیں کر سکتا اس لئے مناسب بھی ہے کہ وہ قومی امداد سے اسی حالت میں رکھے جائیں اگرچہ یہ خیال ایک حد تک درست ہے مگر افسوس ہے کہ اس مزدوری کی اجرت سے دوسری دنیا کا اجر بالکل ساقط ہوا جاتا ہے کیونکہ اگر ان کو رونے رلانے میں ثواب ہے بھی تو اجرت اسکے لئے وجہ اول ہے اور اخلاص وجہ ثانوی اس کے ساتھ ہی اس کی ذمہ داری کون کر سکتا ہے کہ یہ اجرت "ذکر خوان" کو حدود اعتدال کے اندر رکھے گی۔ اور اس کی شاعرانہ اُمنگ اور قوت طلاقت کو بے لگام نہ ہونے دیگی کوئی نہیں۔

یہ لوگ نظم ہو یا نثر علی الاعلان بلا محض رونے رلانے کی غرض سے بے دھڑک بیان کر جاتے ہیں اور مطلق صدق و کذب اور حق و باطل میں امتیاز نہیں کرتے نہ سامعین کو اس کا احساس اور خیال ہوتا ہے کیا ہماری قوم تعلیمی اور تربیتی حیثیت سے ایسی ہے کہ اس طرح کا ادعا کر سکے اگر ایسے لوگ ہیں بھی تو شاذ الشاذ کالمعدوم بلکہ زیادہ تر تو ایسی ہی ہیں جو "خوانوں" کے جدت انداز اور جدت واقعات کی خواہ وہ کیسے ہی بے ہنگام اور غیر متعلق کیوں نہوں مطلق پروا نہیں کرتے اور ساری عمر سے اُن ہی موضوع روایات اور غلط واقعات کو سنتے سنتے انہیں کے واقعات اور حقانیت پر ایمان لائے ہوئے ہیں۔

انہیں صرف جدت چاہیئے اور بس اس سے بحث نہیں کہ اس جدت طرازی اور اختراع پردازی کے اثرات کس قدر تلخ ناگوار اور ضرر رساں ہیں کہا جائے گا کہ ایسے ذاکرین بھی ہیں جن کو اجرت کی احتیاج نہیں اور وہ محض خلوصِ نیت سے اس عمل خیر پر عامل ہیں بلاشبہ ہیں مگر فیصدی ایک کے تناسب سے بھی کم بشرطیکہ انہیں اجرت کے قریب تک وہ نمائش کی آمیزش نہو۔

اس میں شک نہیں کہ ائمہ طاہرین علیہم السلام نے عطایا ذاکرین کو مرحمت فرمائے ہیں بنابریں ایسے لوگوں کو علیٰ قدر مراتب بطور ہدیہ اور بہ نیت نذر اگر کچھ پیش کش کیا جائے زیادہ ہو یا کم تو اس پر کسی قسم کے اعتراض کی گنجائش نہیں اعتراض ہے تو ذکر حسینؑ کی تجارت پر اس کے مول بھاؤ پر عطایا و ہدایا کی صورت بالکل دوسری ہے۔ اور ذاکری کی باقاعدہ تجارت کرنا الگ شے ہے ذاکری کے سلسلہ میں جس قسم کی تجارت کا رواج ہو گیا ہے کیا وہ ائمہ معصومین کی تاسی ہے کیا وہ سید الشہداء کی خوشنودی کا باعث ہو گا کیا ایسی حدیثیں موجود نہیں جن سے صاف مستنبط ہوتا ہے کہ ذاکری کی موجودہ تجارت نہایت ہی مذموم اور قابلِ اعتراض ہے بعض تنگی مزاج حضرات کی طرف سے یہ بھی کہا جاتا ہے کہ اس قسم کی اصلاحی صدائیں بلند نہیں کرنی چاہئیں اس سے نفسِ عزاداری کو صدمہ پہنچے گا ذاکرین بددل ہوں گے اور پھر وہ اس پیشہ کو ہی چھوڑ بیٹھیں گے عزاداری بند ہو جائے گی حسینؑ کا ذکر دنیا سے مٹ جائے گا۔ یہ اعتراض جن حضرات کے دماغوں میں آئے ہیں ان سے نہایت ادب کے ساتھ عرض کیا جاتا ہے کہ انہوں نے شہادت حسینؑ کی قوت کا غلط اندازہ کیا ہے۔

حسینی شہادت کی روحانیت ان باتوں کی محتاج نہیں جب اس تذکرہ کو اُموی اور عباسی حکومتیں نہ مٹا سکیں تو چند پیشہ ور ذاکرین کے قطع تعلق کرنے سے کیا نقصان ہو سکتا ہے درحقیقت اس شہادت عظمےٰ کی روحانیت کا ہی یہ تقاضہ ہے کہ اس کے

[illegible] کا استیصال کیا جائے نقش واقعات کی حیثیت ہی اس نوعیت کی ہے کہ اس کا باقی رکھنا لازمی ہے ہم کو ایسے نظروں سے ڈرنے کی حاجت نہیں اس لئے اس ضمن میں ہم جن باتوں کو اس تذکرہ کی اعلیٰ حیثیت کا مخالف سمجھتے ہیں ان کی مخالفت میں ہم صاف طور سے کہہ دینا چاہتے ہیں کہ ذکر حسین کی روحانیت کا یہ تقاضا ہرگز نہیں کہ اس میں غلط طور سے پروپیگنڈے کی آمیزش کی جائے اگر ہم اس مقدس ذکر کو اپنی حالت میں ہی باقی رکھ سکتے ہیں کہ اس میں بہت سی جھوٹی باتیں شامل کر دیں ان کے اصلی رموزت سے واقف ہونے کی کوشش نہ کریں۔ صحیح اور غلط میں امتیاز نہ کریں تو بہتر یہی ہے کہ اس پاک و محترم ذکر کو چھونے کی زحمت ہی گوارا نہ کریں۔

ذاکری کی موجودہ تجارتی حیثیت کے مذموم ہونے کے علاوہ ایک بڑا داعیہ بھی ہے کہ ہماری موجودہ ذاکری کا رجحان جس قسم کے خیالات و مضامین بیان کرنے کی طرف جارہا ہے اس سے ہماری قوم کی دماغی تربیت استدلالی حیثیت سے بہت خراب ہو رہی ہے ان کے قوائے فکریہ کو مذہب کی آڑ سے برابر مغالطوں کا شکار بنایا جارہا ہے اور صحیح غور و فکر کا مادہ سلب ہو رہا ہے، بڑے بڑے جبہ و دستار والے ذاکر ممبر پر جا کر وہ وہ لطیف نکتے ارشاد فرماتے ہیں جن کی کسی لکھے پڑھے سے توقع نہیں کی جاسکتی۔ کوئی حد ہے کہ ایک مشہور ذاکر ممبر پر جاتے ہیں اور اس کی وجہ بتاتی ہوئی کہ حضرت امام حسینؑ کی اولاد میں امامت کیوں رہی اور حضرت امام حسنؑ کی اولاد میں یہ سلسلہ کیوں نہ چلا فرماتے ہیں کہ سبز پھل کا بیج نہیں لیا جاتا جب خوب سرخ ہوتا ہے اور پک جاتا ہے تو لیا جاتا ہے حضرت حسنؑ زہر سے شہید ہوئے زہر کا رنگ سبز تھا اس لئے امامت کیونکر چلتی حسینؑ تلوار سے شہید ہوئے خون کا رنگ سرخ ہوتا ہے اس لئے امامت چلی ہم نے نکتہ کا ماحصل بیان کیا ہے ورنہ اس مضمون کو بڑے آب و تاب سے فخریہ لہجہ میں بیان کیا گیا تھا انصاف کیجئے کہ ان مہملات کو ذکر

حسینؑ سے کیا تعلق اور جو مجمع ان مزخرفات پر تحسین وستائش کی صدائیں بلند کرے اُس کی دماغی حالت کس قدر واجب لرحم ہے۔

ایک صاحب بیان کرتے ہیں کہ اہل بیت نے نذر کا روزہ رکھ کر تین دن اپنی روٹیاں فقیر ویتیم واسیر کو دیدیں وہ روٹیاں آسمان پر کیونکر رہ سکتی تھیں۔ مادی چیزوں کا آسمان پر کیونکر گذر ہو سکتا ہے، فقیر ویتیم واسیر تو بہرحال ملائکہ تھے وہ لے کر آسمان پر پہونچے روٹیاں وہاں ٹھہر نہیں سکتی ہیں اس لئے سورۂ ہل اَتیٰ کی صورت میں آسمان سے اتر آئیں۔ اسی طرح اور صدہا باتیں ان لوگوں سے سننے میں آتی رہتی ہیں۔ سامعین کے دماغوں کو جو گروہ اس طرح خراب کرتا ہے وہ ضرور قابلِ تنبیہ ہے۔ اغیار کی موجودگی میں ہمارے فاضل ذاکر جب اس قسم کے ہفوات پر اُتر آتے ہیں تو ہم کو نہایت ہی شرمندہ ہونا پڑتا ہے ذاکرین کا معزز گروہ یا تو خالص شاعری کی نمائش کرتا ہے یا اپنے کو فلسفی ذاکر مشہور کرنے کے لئے فلسفہ اور شاعری کو مخلوط کر کے ایک عجیب طرح کا ملغوبہ پیش کردیتا ہے ہم اس ذاکری کو قوم کے لئے مفید سمجھنے سے قطعی قاصر ہیں ذاکرِ حسینؑ کا باقی رکھنا ضروری ہے اور یقیناً وہ کسی نہ کسی عنوان سے ہمیشہ باقی رہے گا اسے کوئی روک نہیں سکتا۔ لیکن موجودہ ذاکری پر تنقید کی ضرورت ہے اور سخت ضرورت ہے۔

ذاکرینِ حسینؑ کو پہلے خود اسوۂ حسینی کا نمونہ بننا چاہیئے جس میں راست گوئی راستبازی اور خلوص ان کا شعار اوّل ہو ایسا نہ ہونا چاہیئے کہ عارضی سرخروئی چندروزہ شہرت یا ذاتی منفعت کے لئے حق و باطل کے امتیاز کو پس پشت ڈال دیں اور باطل کی ترویج کے باعث بن جائیں مجلس عزا کو مناظرہ و مکابرہ کا دنگل بنا دیں۔ صرف اپنے گروہ کو خوش کرنے کے لئے دوسروں کے بزرگوں پر چوٹیں کریں ان کو ایثار کی صفت سے متصف ہونا چاہیئے ان کے نزدیک خدا اور خدا کے دین کی خدمت کا پایہ ذاتی اغراض سے بالاتر ہو اُن کی نگاہ میں قومی وملی حقوق کی اہمیت خود غرضانہ نفس پرستی سے کہیں زیادہ ہو تھوڑے سے مالی فائدہ

یا عارضی سامانِ عیش و آرام کی خاطر قومی مفاد سے چشم پوشی نہ کریں بلکہ ذاکری کی گرانقدر خدمات کا نہایت نیتی سے بجالانا ہی ان کے نزدیک ایک ایسی قابلِ فخر چیز ہو جس کے بعد ان کو دوسری قسم کے معاوضوں کی قطعاً پرواہی نہ رہے گو بشری حیثیت سے وہ ایسے تحائف یا ہدیوں یا نذرانوں کو جو ان کی خدمات کے صلہ میں ان کے سامنے پیش کئے جائیں بخوشی قبول کرلیں مگر ان معاملات میں تمام مدارج ہیچ و شہری کو سمجھنا ہیئے کرنا اور ذکرِ حسینؑ کو ذریعۂ معاش و سرمایۂ حیات بنالینا ان کا شعار نہ ہو یہ لوگ سفر و حضر میں ان تمام لوازمِ عیش پسندی کے بہر نوع مہیا کئے جانے کو اپنی خدمات کی شرطِ اول نہ قرار دیں جن کے وہ آج کل عادی ہو گئے ہیں اور ان کا ذکر نہیں البتہ مہمانِ کربلا کے نوحہ خوانوں سے ہرگز اس کی توقع نہ ہونی چاہیئے کہ میزبانوں کے لئے ان کی مہمانداری طرح طرح کے افکار کا پیش خیمہ ان کی فرمائشات کا پورا کرنا جوئے شیر کا لانا ہو نفسِ طبع کو ٹھیس لگنے سے بچانا انواع و اقسام کی پریشانیوں کا موجب اور ان کی تنک مزاجیوں اور زود رنجیوں سے مقابلہ کرنا حد و صبر کی آزمائش بن جائیں بسا تعجب ہے کہ سیرتِ حسینی کا مطالعہ کرنے والے اور شب و روز اس کا ورد رکھنے والے سیرتِ حسینی کی خصوصیات سے بالکل ہی محروم ہوں یہاں تک کہ معمولی تکلیفوں کا برداشت کرنا بھی ان کے بس سے باہر ہو اگر کسی جگہ ایک سے زیادہ جمع ہوں۔ تو ایک دوسرے کے حریف و رقیب بن کر عزادارانِ حسین کی صفیں تفرقہ اندازی اور معرکہ آرائی کا باعث بن جائیں۔ ایک دوسرے پر چوٹیں کریں مجالسِ عزا کو تنازعات کی رزم گاہ بنا دیں۔

برسوں سیرتِ حسینی کا تذکرہ کرنے اور واقعاتِ کربلا کو شرح و بسط سے بیان فرمانے کے بعد بھی اگر ذاکر کی سیرت ان صفات سے محروم و بیگانہ ہے تو ہم کو کہنا پڑے گا کہ ایسے ذاکر نے نہ سیرتِ حسینی کو پہچانا ہے اور نہ واقعاتِ کربلا ہی کو سمجھا ہے

اس سے زائد اس نے کچھ نہیں کیا کہ چند مقدس الفاظ کو طوطے کی طرح رٹ لیا ہے اور اُن کے بلا تکان دُہرانے کو ذریعہ معاش بنا لیا ہے۔ ورنہ اس کے دل میں ان چیزوں کی وقعت اور اہمیت کا احساس بمنزلۂ صفر ہے آفتاب ہدایت کی نورانی کرنیں اس تک پہنچیں تو ضرور مگر اس کی آنکھ مادیت سے لڑی رہی اور وہ نورانیت کے جلوؤں سے محروم ہی رہا ایسا ناقدر شناس ذاکر ہمارے خیال میں اس قدر عزت و منزلت کا ہرگز مستحق نہیں جو اس منصب جلیل سے وابستہ ہے مانا کہ وہ مصائب حسین پر رویا بھی اور دوسروں کو رُلایا بھی لیکن چونکہ اس کی طبیعت و اخلاق اور اعمال و افعال نے سیرت حسینی کا کچھ بھی اثر قبول نہیں کیا اسلئے اس کا رونا اور رُلانا عارضی اور سطحی جذبات کی نمائش سے آگے نہیں بڑھتا اس کی آنکھیں روتی ہیں مگر دل نہیں روتا ایسی اشک فشانی جو شہید کربلا کی حقیقی عظمت کے احساس پر ہونے کے بجائے محض کامیاب پیشہ وری کے جذبات پر ہو کوئی قابل قدر چیز نہیں۔

قوم میں ایک مرض یہ بھی پیدا ہو گیا ہے کہ مقامی ذاکرین کو گھر کی مرغی دال برابر سمجھے ہوئے ہیں اور اپنے گھر کے چاہے کتنے ہی اچھے پڑھنے والے ہوں لیکن باہر سے ذاکر کو بلوانا ایک طرح کا فیشن اور ذریعہ ناموری سمجھا جانے لگا ہے کون نہیں جانتا کہ واقعات محرم سے شیعوں کا بچہ بچہ واقف ہے۔ پردیسی ذاکر نفس واقعات میں ایک شمہ بھی اضافہ نہیں کر سکتے سوائے ان شاذونوں کے جو موجب اعتراض ہوتی ہیں۔

اس طولانی بحث سے ہماری غرض صرف یہ ہے کہ واقعہ خوانی میں واقعہ کی صورت مسخ نہ ہونی چاہیے مجلس عزا محفل موسیقی یا مشاعرہ نہیں جس میں راگ راگنی کے زیر و بم سے اثر لیا جائے یا اشعار کے حُسن بندش جدتِ مضامین تشبیہات و استعارات تلازم لفظی اور حیرت انگیز مبالغہ کی داد دینے سے چھت کو سر پر اُٹھا لیا جائے اکثر یہ بھی دیکھا گیا ہے کہ اُجرت پر رونے والے یا داد دینے والے یا مجلس کو رونق دینے کے لئے خاص ایجنٹ مقرر

کئے جاتے ہیں جو نہایت ہی شرمناک اور قابل نفریں حرکت ہے مجلس عزا کے بیان نے وقتاً فوقتاً مختلف شکلیں بدلیں کسی زمانہ میں فارسی دہ مجلس پڑھی جاتی تھی اسی کے بعد تحت لفظ خوانی کا رواج ہوا پھر نثر خوانی کی تشنی و مقفیٰ عبارتوں کا رنگ جما پھر حدیث خوانی کا دور دورہ ہوا۔ اب نئی طرز کے حدیث خوان پیدا ہوئے ہیں جنہوں نے مجالس عزا میں فضائل اہل بیت کے ساتھ مناظرہ کی چاشنی سے کام لینا شروع کیا ہے لیکن افسوس ہے۔ اس چاشنی کے نتائج نہایت ہی تلخ اور زہریلے ہیں

مجالس عزا

مجلس عزا یعنے متعدد آدمیوں کا بہ غرض گریہ ایک جگہ فراہم ہونا اور ایک شخص کا ممبر یا کرسی پر بیٹھ کر فضائل و مصائب جناب سید الشہدا بیان کرنا ایک مستحسن اور عمدہ طریقہ ہے عزائے حسین کی سب سے پہلی مجلس وہ تھی جو عاشورہ محرم سے کئی ہزار برس پہلے اول الانبیا حضرت آدم اور حضرت جبرئیل نے کی جیسا کہ تفسیر در منثور میں علامہ سیوطی میں اس کا ذکر ہے دوسری مجلس وہ تھی کہ حضرت عیسےٰ ایک دفعہ مع حواریین زمین کربلا پر گذرے آپ نے اپنے اصحاب سے واقعہ شہادت حسین مفصل بیان کیا پھر آپ اور آپ کے حواری بہت روئے جیسا کہ اعثم کوفی نے اپنی تاریخ میں اور ابن حجر عسقلانی نے کتاب تہذیب التہذیب میں لکھا ہے آخری بڑی مجلس وہ ہوئی جس کے بیان کرنے والے خاتم الانبیا اور سننے والے مہاجرین و انصار تھے یہ مجلس خاص مسجد نبوی میں ہوئی تھی۔

اعثم کوفی لکھتے ہیں کہ ایک سفر سے واپس تشریف لاکر ایک صاحبزادے کا زہر سے اور دوسرے کا تلوار سے شہید ہونا بیان فرمایا تمام اصحاب رونے لگے اگرچہ ہم تنہا کتاب دیکھ کر بھی متاثر ہوسکتے ہیں لیکن مجمع کرکے مصائب بیان کرنا، مجمع کو رلانا زیادہ باعث ثواب ہے ایسا سمجھنا چاہیئے جیسا تنہا اور جماعت کی نماز میں فرق ہے جیسا کہ ہم بیان کرچکے ائمہ اہل بیت علیہم سلام نے نہ صرف

کے ذکر کا اہتمام فرمایا بلکہ شاعروں کی قدردانی سے وہ زبان خریدلی جو اشاعت مدح میں کام دے سکے ائمہ طہار کے بعد ملوک دیالمہ عجم و عراق اور خلفائے بنی فاطمہ مصر و شام نے اس کا اہتمام کیا اور اس وقت سے برابر اب تک مجالس عزا کا سلسلہ کبھی منقطع نہیں ہوا یہاں تک کہ اب یہ صورت ہے جس کو ہم دیکھ رہے ہیں۔

بادی النظر میں مجلس کا مفہوم یہ قرار دیا گیا ہے کہ حضرت شہید کربلا پر رونا ہی اس کی غایت ہے اور دلیل کے لئے آئمہ معصومین کی حدیثیں پیش کی جاتی ہیں کہ جو شخص حسین پر رو دے اس پر بہشت واجب ہے یا اس نے جنت کما یا یہ مسلمان کیا یا جو شخص روئے یا رولائے یا رونے والوں کی سی صورت ہی بنائے وہ داخل بہشت ہوگا۔ گریہ و بکا کا یہ مسئلہ قابل غور ہے رونا کیا ہے اور کوئی کیوں روتا ہے کیا کوئی شخص بلا اثر لئے رو سکتا ہے۔ جیسا کہ ہم اوپر بیان کر چکے ہیں کسی اندوہناک حالت سے اثر لئے بغیر ہیجان غم پیدا نہیں ہو سکتا جو گریہ کی حالت پیدا کر دے رونے کے معنے لا تا آنسو بہانا نہیں ہیں۔ ایک رونے کی ایک بے اختیارانہ صورت ہے جس کو احتیاط کی کمروری کہا جا سکتا ہے۔ صابر اور صاحب استقلال اور صاحب احتیاط لوگوں کے نزدیک واقعہ غم کی موجودگی میں مبتلا و رحتی الوسع کم اظہار غم اور اثر کی کوشش ہی سب سے بڑا رونا سمجھا جاتا ہے۔ یہاں تک شخص رو سکتا ہے بغیر اس کے کہ آنکھوں میں نمی یا چہرہ پر کوئی ظاہری تغیر کہا جا سکے۔ یہ ... اور صابر لوگوں کا رونا ہے۔ ہم یہ نہیں کہتے کہ صدائے گریہ یا محض گریہ صابر کو درجہ سے گرا دیتا ہے بلکہ جب غم والم کا جذبہ اس قدر تیز ہو جائے کہ ضبط نہ ہو سکے تو ایسا ہونا کچھ ... نہیں۔ بہرحال جماعت انسانی میں رونا ہی اظہار محبت و ہمدردی کا ذریعہ سمجھا جاتا ہے ... کی وجہ صرف قلبی وابستگی ہی ہو سکتی ہے کسی کو حالت اندوہ میں دیکھ کر ہنسو تو ... ہم اور دوسرے دیکھنے والوں کے نزدیک اس فعل کو خلاف انسانیت بے رحمانہ ... معرا عدم موقع شناسی اور بے حسی سمجھا جائے گا اور دفعتہً اس ہنسنے والے

کی طرف سے ہر دیکھنے والے کا خیال بدل جائے گا۔

اب ذرا ان احادیث ائمہ کے فلسفہ پر غور کرو تم جانتے ہو کہ وہ موقعہ تھا جب کہ حکومت اور اس زمانہ کے تمام افراد (باستثنائے معدودے چند) اہل بیت رسالت کے ساتھ دشمنی کے درجہ میں اس قدر ترقی کر گئے تھے جس کا نتیجہ کربلا کا سانحہ عظیم تھا اور اس دشمنی کا سلسلہ زمانۂ دراز تک قائم رہا ایسی حالت میں یہ امید کرنا کہ کوئی شخص حضرت سید الشہداء سے ہمدردی کرے۔ اور اس سانحہ کی عظمت کو اپنے درجہ پر قائم رکھنے اور رکھنے کے لئے کوشاں ہو محال تھا لیکن مشیت ایزدی یہ تھی کہ یہ سانحہ اپنی پوری پوری عظمت و شان کے ساتھ دنیا کو معلوم ہو جائے اور فطرت ہیجان غم کو حسین کے نام سے ایسی نسبت دیدے جو کسی انسان کے لئے نہ ہو گی یہ ہیجان غم اس طرح نہ پیدا کیا گیا تھا جو کسی حکومت اور اس کے متعلقات کے سایہ میں نشو و نما پائے یہ کام نہایت کٹھن اور دشوار تھا اور اس کے سوا چارہ نہ تھا کہ لوگوں کو خاص طور پر اس طرف رغبت دلائی جائے اس سے یہ مقصود نہیں کہ ان اقوال میں تصنع ہے تصنع سے کوئی بڑا نتیجہ حاصل نہیں ہو سکتا جب تک کہ اس کی بنیاد اصلیت اور حقیقت پر قائم نہ ہو ان احادیث کا اصول یعنی جوش ہمدردی پیدا کرنا یقیناً حسینؑ کے عظیم الشان موقعہ اور ان کی شہادت کی نوعیت سے تھا ان فقرات سے اصول ہمدردی کے نشو و نما کی کوشش کی گئی کہ ان اصولوں سے غرض یہ ہے کہ حسینؑ سے محبت و ہمدردی پیدا ہو جائے اس وسیع مفہوم پر غور کرو جو حسینؑ اور ان کی محبت کی عظمت میں مضمر ہے حسینؑ کی سب سے بڑی خصوصیت ان کی شہادت ہے شہادت اس لئے واقع ہوئی تھی کہ حسینؑ (علیہ السلام) اسے گوارا ہی نہ کر سکتا تھا کہ مسلمانوں کے دینی و اخلاقی رسمی قانونی تمدنی اصول کا رہنما اور سردار یزید جیسا شخص ہو اور وہ بھی اس طرح کہ ہمیں اپنی وسیع موافقت پر مجبور کرے۔ ہماری ہستی کو جو اسلام کی مثالیہ سمجھی جاتی ہے نیست و نابود کر دے اب ائمہ کی مصلحت کے یہ معنے تھے کہ ایسے حسین سے محبت و ہمدردی پیدا کی جائے

کہ لوگوں کے خیال اور ارادہ کو ان اصول کی محبت سے رنگ دے۔ آپ سمجھ سکتے ہیں کہ یہ کوئی آسان کام نہ تھا ایک جڑ پکڑی ہوئی عداوت کو اکھاڑنا اور طبائع انسانی کا قصد بدل دینے کے لئے نسبتاً زیادہ وقت اور زیادہ سامان درکار تھا۔ سامان کی یہ حالت تھی کہ اور چیزوں کا تو کیا ذکر صدیوں تک ممالک اسلامی میں سلطنت کا اس سے بڑا کوئی جرم نہ تھا کہ کوئی شخص اہل بیت رسالت سے اظہار محبت و ہمدردی کرے اس سے یہ بات بہ آسانی سمجھ میں آ سکتی ہے۔ کہ حسینؑ سے محبت و ہمدردی کے ان اصول کی نشو و نما میں ائمہ اطہار کو اتنا بھی موقعہ حاصل نہ تھا کہ وہ اس طرح مجلس منعقد کرتے جیسے مجمع ہم فراہم کر دیا کرتے ہیں ان اصول کو اختیار کیا جو سب سے سہل تھا۔ اسلام کے نام سے نہیں بلکہ اس صحیح منشاء سے جیسے حسینؑ کے نام سے حسین کے نام کی مرکزیت سے حسینؑ کا اسم مقدس وہ کنجی تھا جس سے انسان کے تخیل و ان کی مواثرات نے بہتر انسان کے اخلاق میں ایک انقلاب عظیم پیدا کرنے کا ارادہ کیا تھا یہ ارادہ ایک قوم بنانے کا ایک سانچہ تھا جس کے افراد سے حسین یاد آئیں اور ابدالآباد تک اپنی جسمانی حیات سے قوی تر حیات میں زندہ رہیں چنانچہ قوم گر اپنے اصول میں کامیاب ہوئے اور مجالس عزا اس اصول کی کامیابی کی بہترین دلیل ہیں

مجالس عزا کے متعلق ائمہ اطہار نے جو ترغیب و تاکید اور بکا و ابکا کے اجر و ثواب کی توضیح و تشریح فرمائی ہے اس کا مقصد اصلی اور علت غائی رونے رلانے سینہ کوبی اور ظاہری مراسم کی ترویج ہی نہیں ہے بلکہ ان حکمائے الٰہی نے یہ ایک ایسے مشن کی بنیاد رکھی ہے جس سے بہتر مسلمانوں کے قلوب پر اثر ڈالنے والی کوئی تدبیر ممکن ہی نہ تھی سلاطین بنی امیہ و بنی عباس کے زمانہ میں محبان اہل بیت پر مغالطہ آمیز سیاسی جبر کی آڑ میں جو ہولناک مظالم ہوتے رہے ہیں ان سے تاریخیں بھری پڑی ہیں۔ ان کی تعزیرات سیاست میں کوئی جرم علیؑ کی محبت سے زیادہ سنگین اور نہ قابل معافی تھا یہودی نصرانی مجوسی بت پرست بلکہ ملحد تک امن و امان سے آزادانہ زندگی بسر کر سکتے تھے مگر علیؑ کے نام لیوا۔ اور ان کی اولاد کو کہیں پناہ

نہ تھی۔ سادات شیعیان علی کا استیصال حکومت کی زرین پولیسی تھی تمام دنیائے اسلام
میں ان کی مخالفت کے جذبات پائے جاتے تھے اہل بیت کی منقصت میں بے شمار حدیثیں
وضع کرائی گئی تھیں اس لئے ایک ایسی تبلیغی مشن کی ضرورت تھی جو ایک درد انگیز و رقت خیز اور
مظلومانہ شہادت کے تذکرے سے عام مسلمانوں سے جنہیں خاندانِ رسالت سے بے تعلقی
ہی نہیں بلکہ بغض و عناد تھا۔ اور ان کے فضائل و مناقب سے ناآشنائے محض تھے ہمدرد
کے جذبات پیدا کر کے مخالفتِ اہل بیت پر جو نسلاً بعد نسلٍ ارث میں پہنچ کر قلوب میں
راسخ ہو چکی تھی ازالہ کر دیئے اس کے ساتھ ہی فضائل اہل بیت کی اشاعت ہو اور لوگ غلط
فہمی کے دلدل سے نکل کر صراطِ مستقیم کے حقیقی جادہ پر آ جائیں۔ یہ ایک ایسی مدبرانہ حکمت
عملی تھی کہ اس سے بہتر کوئی مشن کامیاب نہیں ہو سکتا تھا جو آج تک علیٰ حالہٖ قائم ہے اور نامعلوم
زمانہ تک رہے گا جس نے تبلیغی تاریخ میں ایسا پائدار و مستحکم پوزیشن حاصل کر لیا ہے جس کی نظیر
دنیا کے دوسرے مذاہب پیش نہیں کر سکتے لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ اسی مشن کا فلسفہ بھی محض ظاہری
رسومات کے نذر ہو کر رہ گیا ہے بلکہ بعض ذاکرین و واعظین مصائب و فضائل کے ذکر میں
مباحثہ کی تلخ چاشنی داخل کر دینے کے عادی ہو گئے ہیں جس سے دوسرے مسلمانوں کے گروہ
بجائے شرکت احتراز کرتے ہیں ذکر شہادت کا مقصد عام مسلمانوں کے قلوب میں جذباتِ
ہمدردی پیدا کر کے اپنے گروہ میں جذب کرنا ہے نہ کہ ان کو برانگیختہ و متنفر کرنا۔

اب ہم پوچھتے ہیں کہ مجلسیں ہونے لگیں ہمدرد لوگ دکھائی دینے لگے حسینؑ کے
مصائب کا ذکر ہونے لگا تو کیا اصول کی غرض پوری ہو گئی نہیں ہرگز نہیں۔ یہ تو اصول کے
ظاہری آسان نتائج ہیں یا ابتدائی شکلیں آنسو کے چند قطرے یا غم کی صورت تمہارا پہلا
عہد اور پہلا پیش کش تھا جس کے بغیر تم اصول کے دروازہ تک نہیں پہونچ سکتے تھے۔ کیا تم نے
یہ سمجھ لیا ہے کہ بانیانِ قوم رہنمایانِ ملت اور رؤسائے روحانی کے اقوال یا اس بڑے اصول
کی علت غائی صرف یہ ہے کہ عورتوں کی طرح رونا تمہارا جزو خصائل ہو جائے اور بس یہ ہماری

غلط فہمی اور بے مغزی ہوگی کہ باغبان کا فرض بیج بونے تک پورا ہوگیا۔ پودا اُگے یا نہ اُگے۔ اور اگر اُگے تو اُسے پانی دیا جائے یا نہیں دیا جائے نہ آب یاری کی ضرورت رہی۔ نہ بدنما اور غیر ضروری کے چھانٹنے کی یہ ہمارا ضعفِ تخیل پیش بینی کی کمی اور مفید باتوں سے فائدہ اٹھانے کی عدم صلاحیت ہے جس نے ہمیں انحطاط و زوال کا ہدف بنایا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ان احادیث کا فلسفہ اور مجالس عزا کا مفہوم نوسونت ہوگیا اور اب ایک محاسب کے نزدیک اس اعتراض کی گنجائش پیدا ہوگئی کہ اقتصادی نشاری حالت میں یہ ایک اور بار ہے اور ہمارے مزید غور کی راہ میں ایک رسمی صورت سے ایک آڑ پیدا ہوگئی۔ تو کیا حسین کی شہادت سے صرف یہ غرض تھی کہ کچھ رونے والے پیدا ہو جائیں اور بس۔ کیا حسین نے انسانی طاقت برداشت سے بالاتر مصیبتیں فقط اس لئے اٹھائی تھیں کہ ان کے نام پر سبیلیں لگائی جائیں شیرینی تقسیم ہو علم اور تابوت اٹھیں نعرے بنائے جائیں تاشے نقارے بجیں یا سینہ کوبی ہوا کرے۔ نہیں ایسا ہرگز نہیں حسینؑ نے اسلام کی حمایت میں جان دی۔ احیائے ملت کے واسطے اپنے دوستوں عزیزوں اور بیٹوں کی قربانی منظور فرمائی۔ اصول کے تحفظ کو اپنے خون سے خریدا اور ہم کو تعلیم دی کہ اصول کی تائید و پیروی آخر دم تک کرنی چاہیئے۔ خواہ کچھ ہی افتاد پڑے۔ یہ جو کچھ ہوا ہمارے مذہبی روحانی اور اخلاقی معاشرتی تمدنی اصلاح و حمایت اور ہماری تعلیم و ہدایت کے لئے نہ کہ صرف عورتوں کی طرح رونے پیٹنے اور چھاتی کوٹنے کے لئے۔

مگر کس قدر افسوس ہے کہ ہماری دنیا ایک مرکزِ اتحاد اور پیشوائے ملت کی بنائی ہوئی نہیں معلوم ہوتی جہاں اس قدر جہالت اور اس قدر نخوت اس قدر خود غرضی اس قدر ایذا رسانی اس قدر غصبِ حقوق اس قدر ظلم اس قدر کذب و افترا اس قدر برائیاں بداخلاقیاں اور احکام شریعت سے اس قدر لاپروائی ہو؟ دیکھے حسین کے اس قدر ایثار اور قربانی کا ماحصل صرف یہ ہونا چاہیئے کہ ہم ایک جگہ جمع ہو کر حقہ پئیں کچھ شیرینی

بات دیں اشعار رزم و بزم کا لطف اٹھائیں کچھ داد دیں کچھ تحسین آمیز انداز سے دیکھیں ۔ ذاکر فاتحانہ انداز سے دائیں بائیں دیکھے اور لوگ اپنے ایثار پر ناز کریں کہ ہم نے کچھ وقت اس مشغلہ میں صرف کر دیا ایسا خیال حسینؑ پر اس سے بھی بڑھ کر ظلم ہے جو کربلا میں واقع ہوا حسینؑ کی شہادت احقاق حق اور ابطال باطل کے واسطے نہیں حسینؑ نے ملت اسلام کے جہاز کی اس وقت ناخدائی کی جب وہ فسق و ارتداد کے طوفانی جھونکوں سے ڈگمگا رہا تھا حسینؑ نے اسلام کا مکمل مثالیہ بن کر ہم کو ایثار اور علوئے نفس استقلال تسلیم و رضا صبر حمایتِ حق، صیانتِ شریعت خلق و کرم ہمدردی رحم اور ادائے فرض کی تعلیم دی مگر یہ تو بتایئے ہم میں کتنے ایسے ہیں جو مذکورۂ بالا صفات و احکام پر عمل کرتے ہوں صرف فرائض ہی کو لیجئے نماز روزہ حج زکوٰۃ خمس جمعہ جماعت تلاوت قرآن ہم میں کس قدر ہے کس قدر شرم کی بات ہے کہ حافظِ قرآن ہونا تو درکنار قاری قرآن بھی بہت کم ملیں گے، نماز با جماعت اور نماز جمعہ سے تو غرض ہی کیا ہے عتبات عالیات کی زیارات کو اگر سو جائیں گے تو حج کو پانچ بھی نہیں۔ امام باڑوں کی عمارتیں عالیشان ہیں ہزاروں روپیہ کا شیشہ آلات وغیرہ موجود ہے مگر مساجد ویران پڑی ہیں! اول تو مسجد میں نماز کی پابندی ہی نہیں اگر ہے بھی تو کوئی کسی وقت آیا نماز پڑھ گیا کوئی کسی وقت آیا نماز پڑھ گیا کسی وقت دو آ گئے کسی وقت چار مجالس کی ترتیب روشنی اور تکلفات کی افراط ذاکرین کی خدمت اور شیرینی کی تقسیم پر دل و جان سے روپیہ صرف کرنے کو تیار ہیں مگر زکوٰۃ و صدقات سے سروکار ہی نہیں ایسی حالت میں ان کا ادعائے پیروی حسینؑ اس شخص سے بلند درجہ پر نہیں جو مسلمان ہی نہ ہو۔

کوئی شخص صرف آنسوؤں کے چند قطروں یا منہ بسور دینے سے وہ بڑا انعام حاصل نہیں کر سکتا جسے جنت کہتے ہیں نہ بہشت اور دائمی نجات کے پٹے ایسے ارزاں پڑے بکتے ہیں جو اس طرح رائگاں اور مفت ہاتھ آ جائیں ہمارا مسئلہ شفاعت مسیحیوں کی طرح عجیب

غریب نہیں ہے کہ گناہوں کی گٹھری خدا کے بیٹے کے حوالے کر دینا کافی ہے اور پھر خلیع العذار ہو کر جو چاہیں کریں کوئی باز پرس کرنے والا ہی نہیں قرآن مجید صاف لفظوں میں فرماتا ہے۔

فَمَنْ يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ خَيْرًا يَّرَهٗ وَمَنْ يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ شَرًّا يَّرَهٗ

ہم پر طاعات اسی طرح فرض ہیں جس طرح [illegible] خدا اور اس کے رسولؐ کا حکم۔ اگر ہم ان سے جتنا [illegible] ہیں۔ تو ہمارا دعویٰ محبت حسین علیہ السلام محض دروغ اور [illegible] کذب [illegible] حسینؑ کے مصائب تو نہیں طاعات کے قائم کرنے کے لئے تھے اگر طاعات و فرائض کی بجا آوری میں تساہل ولاپروائی خدا اور اس کے رسول سے عدول حکمی اور سرکشی کی جائے تو یہ رونا کیا فائدہ رساں ہو سکتا ہے اور جب حسینؑ اور ان کے نانا کا تتبع نہیں کرتے اور حسین اور ان کے اوامر کی ہمارے دلوں میں کچھ وقعت نہیں تو ہم مسلمان مومن اور محبِ حسین کہلائے جانے کے کیونکر مستحق ہو سکتے ہیں صرف حالات و مصائب سُن کر رو دینا کچھ بڑی بات نہیں ہے یہ تو انسانی فطرت کا تقاضہ ہے کہ وہ کسی انسان کی مصیبت سن کر متاثر ہو جائے اس لئے ایک غیر مسلم بھی ہماری طرح رو دیتا ہے حسینؑ پر ہی کیا موقوف ہے کسی کے مصائب کیوں نہوں یا ایک گڑا ہوا قصہ ہی کیوں نہ ہو محض رو دینا کافی نہیں ہے جب تک حسین کی شرافتِ اعمال اور غرض شہادت کے سمجھنے کے قابل نہ ہوں ہم یہ دیکھنا چاہتے ہیں کہ آپ کے آنسوؤں کے پیچھے آپ کا درجہ ہمدردی و اثر کیا ہے آپ کتنے عامل فرائض مستقل مزاج کریم النفس رحیم ہمدرد سخی شجاع اور پابندِ صوم و صلوات ہیں مصیبتوں کا کس طرح مقابلہ کرتے ہیں۔ اور آپ میں غیرت کتنی ہے۔

یہ بھی خوب یاد رکھنا چاہئے کہ مسائل اخلاق مذہب اور قومیت کو ایک تعلیم یافتہ

اور صاحب خصائل انسان بہ نسبت جاہل کے بہتر سمجھ سکتا ہے زندہ قومیں اس کی زندہ
مثال موجود ہیں اگر ایسا ہے کہ علم و فضل کا اقتضا جنس شناسی ہے جیسا کہ بلا شبہ ہے تو ہمیں
غور کرنا چاہیے کہ سب سے بڑی نیکی وہ ہے جو افراد جماعت کو پہونچانی چاہیے۔ ہم نے فرض کیا کہ
کچھ لوگوں کا منہ میٹھا کر دینا بھی نیکی ہے کیونکہ یہ معاشرتی یکجہتی کا ذریعہ ہے لیکن مقتضیات
زمانہ اور عقل چاہتے ہیں کہ یہ معاشرتی یکجہتی اور زیادہ مضبوط بنیاد پر قائم کی جائے
کیونکہ زمانہ اب معاشرت کا فریفتہ نہیں ہے۔ بلکہ عمل کا دلدادہ ہے مضبوط بنیاد سے
ہمارا کیا مطلب ہے یہ کہ اگر آپ سے کوئی غیر قوم کا شخص پوچھے کہ آپ روئے
تو خوب مگر حسین کے اسم مقدس اور ان کے بلند خصائل کے قیام و نفاذ کے لئے کیا کیا تو یقیناً تم
سوائے سکوت کے کچھ جواب نہیں دے سکتے۔ وہ مضبوط بنیاد یہ ہے کہ حسینؑ کے
نام پر تعلیم یا تعلیمی وظائف مقرر کرو حسین کے نام پر یتیموں کی دستگیری کرو حسینؑ کے نام پر
بیواؤں کی امداد میں حصہ لو حسین کے نام پر فقرا اور مساکین کو کھانا کھلاؤ۔ پھر اپنا ہر
سال کے محرم ختم ہونے پر اس سے خوش نہ ہو جاؤ کہ اس سال خوب گریہ و بکا ہوا خوب
شیرینی یا چائے تقسیم ہوئی ذاکر نے اپنا کمال کما حقہ دکھلایا بلکہ یہ بھی دیکھو کہ حسینؑ کے
نام پر کتنے لوگوں کی روٹیوں کا سہارا کیا کتنی بیواؤں کا عقد کر کے انہیں غلط خیالوں
سے روکا کتنے یتیموں کے باپ بن کر انہیں دنیا میں عزت سے زندہ رہنے کا طریقہ
بتایا اور اس طرح بیواؤں اور یتیموں کو اس سے بھی محفوظ کیا کہ وہ تمہارے ہو کر مجبوریوں
سے گھبراتے ہوئے غیر قوموں کے مالی فریب میں جذب نہ ہو جائیں اور تمہاری
تعداد کو قائم رکھیں اور ترقی دیں۔

خوب سمجھ لو کہ فراوانی معیشت پر رسوم مذہبی کی حیات موقوف ہے چونکہ جہل
نے بجائے اصول کے رسومات ہی کو مذہب سمجھ لیا ہے اس لئے کہا جا سکتا ہے کہ موجودہ
افلاس مذہب کی فنا نہیں تو بے اثری اور بے وقعتی کا ذریعہ ضرور ہے۔ قوم کی تعلیمی امداد

سے قومی روپیہ ضائع نہ ہوگا۔ بلکہ حسینؑ کے نام کے صدقہ میں علم اور معاش حاصل کریگا۔ وہ حسینؑ ہی کا حامی ہوگا ہم کسی مجلس میں نہیں گئے۔ مگر یہ کہ جہل افلاس اور اس کے لازمی آثار دیکھ کر قلب پر ایک خاص اثر ہوا کہ حضرت کی مجلس کا مفہوم اور اسم گرامی ھل من ناصر ینصرنا کا استغاثہ بلند کر رہا ہے اور یا لیتنی کنت معہم فافوز فوزاً عظیما کہنے والوں میں کوئی ہو سعادتہ بزائیبا نہیں کہہ سکتا۔

یوم عاشورہ سے عیسوی تاریخ کی مطابقت

واقعہ کربلا کے متعلق اور بھی دو باتیں غور طلب ہیں اول یہ کہ سنہ ۶۰ھ تھا یا سنہ ۶۱ھ دوسرا سنہ عیسوی کون سا تھا اور مہینہ اور تاریخ کیا تھی۔ عموماً تاریخوں میں اس روز گرمی کی بڑی شدت بیان کیجاتی ہے جس سے مئی یا جون کا مہینہ ہونا پایا جاتا ہے حالانکہ بقاعدہ ریاضی یورپین مورخ اکتوبر کا مہینہ لکھتے ہیں جس میں سردی شروع ہو جاتی ہے اور حدت و تمازت آفتاب ورگو کا زمانہ گزر جاتا ہے۔ ان دونوں مسئلوں پر جہاں تک غور کیا جاتا ہے ہم نتائج ذیل پر پہنچے ہیں۔

(۱) سنہ ہجری بعض مورخین اسلام مثلاً علامہ جلال الدین سیوطی نے تاریخ الخلفاء میں ۱۰ محرم سنہ ۶۰ ہجری کو اس واقعہ کا ہونا لکھا ہے اسی طرح اور بھی متعدد مورخ بھی سنہ ۶۰ ہجری کو ہی تسلیم کرتے ہیں بعض نے مادہ ہائے تاریخ بھی اسی سنہ کے لکھے ہیں

"سر جدا شد از حسین وگشت تاریخ آشکار ہم ز حرف بے نقطہ ہم از حروف نقطہ دار سر دیں را ہر یہ ... "

لیکن مورخین یورپ نے بعد تحقیقات یہ فیصلہ کیا ہے کہ واقعہ کربلا سنہ ۶۱ ہجری میں ہوا فریقین کے اکثر مورخین بھی اسی سنہ کو مانتے چلے آئے ہیں۔ صاحب ناسخ التواریخ نے اس امر کے متعلق مدلل بحث کی ہے اور بروئے تقویم یہ نتیجہ نکالا ہے کہ سنہ ۶۱ ہجری میں یہ واقعہ ہوا ہمارے خیال میں بھی ۱۰ محرم سنہ ۶۱ ہجری ہی صحیح ہے۔

(ب) سنہ عیسوی) اب یہ دیکھنا ہے کہ اس تاریخ کا سنہ عیسوی کے کس سال کس مہینہ

اور کس تاریخ سے تطابق ہوتا ہے اس مطابقت کے لئے ماہرین علم ریاضی نے دو قاعدے مقرر کئے ہیں جس سے سنہ ہجری سے استخراج سنہ عیسوی کا کیا جا سکتا ہے۔

قاعدہ اوّل، ماہ و سنہ ہجری کو ۹۷۰۲۲۴ سے ضرب دیکر حاصل ضرب کے ساتھ [illegible] جمع کر دیا جائے [illegible] شروع سے چھ عدد گن کر اعشاریہ لگا دیا جائے [illegible] عدد سنہ [illegible] کا ہوگا باقی کسر کو ۳۶۵ سے ضرب دینے سے جو حاصل ضرب ہو اس کے [illegible] شروع سے چھ عدد گن کر اعشاریہ لگا دیا جائے۔ وہ صحیح تعداد ایام ہوگی۔ اس سال [illegible] قدر ایام گزرنے پر سنہ ہجری شروع ہوا تھا یہ قاعدہ [illegible] ہے

۹۷۰۲۲۴
۶۱ (ضرب)
۹۷۰۲۲۴
۵۸۲۱۳۴۴
۵۹،۱۸۳۶۶۴
۶۲۱،۵۷۷۴ (جمع)
۶۸۰،۷۶۱۰۶۴
۳۶۵ (ضرب)
۳۸۰۵۳۲۰
۴۵۶۶۳۸۴
۲۲۸۳۱۹۲
۲۷۷،۷۸۸۳۶۰

اس سے معلوم ہوا کہ سنہ ۶۱ ہجری میں سنہ ۶۸۰ء تھا اور سنہ ۶۸۰ء کے ۲۷۷ دن گزرنے پر سنہ ہجری شروع ہوا تھا اب ۲۷۷ کا حال حسب ذیل ہے۔

جنوری	۳۱	اپریل	۳۰	جولائی	۳۱
فروری	۲۹	مئی	۳۱	اگست	۳۱
مارچ	۳۱	جون	۳۰	ستمبر	۳۰

اکتوبر $\frac{۱}{۳۱}$ $\frac{۲}{۲۷}$

گویا یکم محرم سنہ ۶۱ ہجری کی تطبیق ۴ر اکتوبر سنہ ۶۸۰ء سے اور ۱۰ محرم کی ۱۲ر اکتوبر سنہ ۶۸۰ء سے ہوتی ہے۔

(قاعدہ دوم) اگر سنہ عیسوی سے سنہ ہجری نکالنا ہو تو سنہ عیسوی میں سے ۶۲۱½ تفریق کرکے $\frac{۱۰۰}{۹۷}$ میں ضرب دید یا جائے اس طرح اگر سنہ ہجری سے سنہ عیسوی نکالنا ہو تو $\frac{۹۷}{۱۰۰}$ میں ضرب دیکر ۶۲۱½ جمع کر دیا جائے۔

$$\frac{۶۱}{۱} \times \frac{۹۷}{۱۰۰} = \frac{۵۹۱۷}{۱۰۰}$$

$$\frac{۵۹۱۷}{۱۰۰} + \frac{۱۲۴۳}{۲} = \frac{۱۱۸۳۴ + ۱۲۴۳۰۰}{۲۰۰} = \frac{۱۳۶۱۳۴}{۲۰۰} = ۶۸۰\frac{۱۳۴}{۲۰۰}$$

اس طرح ظاہر ہوا کہ سنہ ۶۱ ہجری میں سنہ ۶۸۰ء تھا۔

یہ تو سنہ عیسوی کے برآمد ہونے کا قاعدہ ہے اب مہینہ اور تاریخ کی مطابقت حسب ذیل طریقے سے ہوتی ہے۔ اور بروئے استخراج پایا جاتا ہے کہ یکم محرم سنہ ۶۱ھ ۲ر اکتوبر سنہ ۶۸۰ء سے مطابق تھی۔

(مزید تشریح) ماہرین علم ہیئت کو یہ بات ثابت ہو چکی ہے کہ ہر ۳۲½ سال عیسوی کے بعد سنہ ہجری اسی موسم میں پلٹ کر آجاتا ہے جس میں پہلے تھا۔ مثلاً سنہ ۶۲۲ء کے جس عیسوی مہینہ میں سنہ ہجری کا جو مہینہ تھا وہ ۳۲½ سال گزرنے کے بعد پھر اسی ماہ عیسوی سے تقریباً مطابق ہو جائے گا بروئے استخراج قاعدہ اول اور تحقیقات مورخین یورپ یکم محرم سنہ ۱ ہجری ۱۸ جولائی سنہ ۶۲۲ء سے شروع ہوا ہے اس سے ۳۲½ برس کے بعد یکم محرم سنہ ۳۴ھ ۲۵ جولائی سنہ ۶۵۴ء سے مطابق ہوتا ہے اسی طرح اس سے ۳۲½ برس کے بعد یکم محرم سنہ ۶۸ھ کی تطبیق ۲۱ جولائی سنہ ۶۸۷ء سے ہوتی ہے اس سے یہ نتیجہ نکلا کہ ہر ۶۵ سال میں سنہ ہجری کے شروع ہونے پر عیسوی مہینہ

کی تاریخ دن آگے بڑھ جاتی ہے بروئے استخراج جو حساب قائم کیا گیا ہے وہ مشاہدہ سے بھی درست معلوم ہوتا ہے اور پرانی جنتریوں سے بھی اس کی صحت ہوتی ہے مثلاً ۲۹ جون ۱۸۶۲ء مطابق یکم محرم ۱۲۷۹ھ ہجری تھی۔ اور ۶۵ سال کے بعد یکم جولائی ۱۹۲۷ء مطابق یکم محرم ۱۳۴۶ھ ہجری ہو گئی۔

گویا ہر ۶۵ سال میں بروئے مشاہدہ وحساب تین دن کا فرق پڑ جاتا ہے یہ بھی ملحوظ رکھنا چاہیئے کہ سنہ ہجری ہر سال میں عیسوی سے ۱۱¼ (سوا گیارہ دن) پیچھے ہٹ جاتا ہے چونکہ شمسی سال ۳۶۵ دن ۵ گھنٹے ۴۸ منٹ ۴۹ سکنڈ اور ۶۲ (½ سکنڈ) ہوگا اور قمری سال ۳۵۴ دن کا ہوتا ہے یعنی بہ لحاظ کثرت ¼ ۱۱ دن کی کمی ہوتی ہے شمسی وقمری سال کی مطابقت جولیس قیصر نے اس طرح کی کہ تین سال معمولی ۳۶۵ دن کے اور چوتھا سال فروری میں ایک دن بڑھا کر ۳۶۶ دن کا کر دیا۔ ترتیب یہ رکھی تھی کہ فروری معمولی برسوں میں ۲۹ دن کا اور چوتھے برس ۳۰ دن کا ہو جایا کرتا تھا فروری میں ایک دن کا اضافہ آخر میں نہیں ہوتا تھا بلکہ ۲۴ یا ۲۵ کی تاریخ مکرر بڑھا کر دو روز تک ایک ہی مانی جاتی تھی اس طرح گو ایک دن کا اضافہ ہو جاتا تھا مگر مہینہ کا خاتمہ ہمیشہ ۲۹ تاریخ کو ہوتا تھا۔ اس حساب کو جولین کلینڈر کہا جاتا ہے جو ۴۶ ق م سے ایک خفیف ترمیم کے ساتھ آج تک جاری ہے۔ پھر اس کلینڈر کی تصحیح پوپ گریگوری سیزدہم نے ۱۵۸۲ء میں کی اس کو جو جولین کلینڈر میں جو ۳۶۵ دن کا سال تھا غلطی معلوم ہوئی نقطۂ اعتدال ربیعی جو ۲۵ مارچ سے مطابقت دیکر قائم کیا گیا تھا اس وقت دریافت ہوا کہ وہ اپنی جگہ سے کھسک کر ۱۱ مارچ کو آ گیا تھا پوپ نے حکم دیا کہ ۱۱ مارچ کو ۲۱ مارچ قرار دیدیا جائے۔ اور سال کی دوسری ترتیب یعنے حساب ۴۰۰ سال کی ترتیب کا پھر آغاز ہوا اس کا عملدرآمد ہونا بحساب ذیل قرار پایا۔ اول ہر سال ماہ فروری ۲۸ یوم کا ہوگا مگر چوتھے برس ۲۹

یوم کا بشرطیکہ اس سال کے عدد چار سے تقسیم ہو سکیں دوسرے ہر صدی کے اختتام پر ماہ فروری ۲۸ یوم کا ہو گا مگر چوتھی صدی تک ۲۹ یوم کا بشرطیکہ وہ صدی چار سے بہ اعتبار پوری صدی کے تقسیم ہو سکے۔ تیسرے ہر ہزار سال پر ماہ فروری ۲۹ یوم کا ہو گا مگر چوتھے ہزار پر ۲۸ یوم کا بشرطیکہ وہ ہزار چار سے بہ اعتبار پورے ہزار کے تقسیم ہو سکے۔ یہاں تک ہر کسی کہیں ایک روز گھٹا کر اور کہیں ایک روز بڑھا کر مشائی گئی ہے۔ البتہ یہ ضرور ہے کہ ہمیشہ چار کے عدد کو لئے رہے مگر ہزار صدیاں یعنی ایک لاکھ برس گزرنے کے بعد بھی اس رو سے قاعدہ حسابی معلوم ہوا ہے کہ اب بھی ایک روز کا فرق باقی رہ گیا ہے۔ اسے گریگورین رول کہتے ہیں اور ان کسرات کے دنوں کو ایام کبیسہ۔ بہر حال یہ عیسوی اور ہجری سنین و مشہور و ایام کی مطابقت سی دقیق حساب کی کمی بیشی اور ایام کبیسہ کے استخراج پر موقوف ہے۔

یہ تو تقریباً مسلمہ ہے کہ سن ہجری یعنی یکم محرم سنہ ۱ ہجری کا آغاز ۱۸ جولائی سنہ ۶۲۲ء سے ہوا۔ اب ہم کو یہ دیکھنا ہے کہ سنہ ۶۱ ہجری کے یکم محرم کی تطبیق کس مہینہ اور کس تاریخ عیسوی سے ہوتی ہے اس کے لئے تاریخہائے ذیل پر نظر کرو۔

۱۲ جولائی سنہ ۶۸۷ء	یکم محرم سنہ ۶۸ھ
یکم اگست سنہ ۶۸۶ء	یکم محرم سنہ ۶۷ھ
۱۲ اگست سنہ ۶۸۵ء	یکم محرم سنہ ۶۶ھ
۲۳ اگست سنہ ۶۸۴ء	یکم محرم سنہ ۶۵ھ
۲ ستمبر سنہ ۶۸۳ء	یکم محرم سنہ ۶۴ھ
۱۴ ستمبر سنہ ۶۸۲ء	یکم محرم سنہ ۶۳ھ
۲۵ ستمبر سنہ ۶۸۱ء	یکم محرم سنہ ۶۲ھ
۶ اکتوبر سنہ ۶۸۰ء	یکم محرم سنہ ۶۱ھ

لیکن گریگورین قاعدہ کے مطابق ۵ دن کم کرنے سے یکم اکتوبر سنہ ۶۸۰ء یکم محرم سنہ ۶۱ھ سے مطابق ہوتی ہے اور چونکہ اسی قاعدے کے موافق اس کا صحیح اندازہ کیا جاسکتا ہے اس لئے ۱۰ محرم سنہ ۶۱ ہجری ۱۰ اکتوبر سنہ ۶۸۰ء سے مطابق ماننا پڑتا ہے۔

انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا جلد ۳ طبع یازدہم میں بھی اسی تاریخ کو تسلیم کیا گیا ہے رہا اس روز کی حدت اور گرمی کا سوال تو اکتوبر میں بھی گرمی ہوتی ہے ریگستانی میدان دن بھر دھوپ میں کھڑا رہنا۔ ہتیاروں کا جسم پر تپنا۔ دو دن کی بھوک پیاس کیا تھوڑے اذیت رساں اسباب تھے۔ پھر زخمی کو پیاس زیادہ لگتی ہے یہ سبب ان سب کے علاوہ۔

البتہ ایک یہ بات بھی قابل لحاظ ہے کہ علماء ہیئت نے اپنی تحقیقات سے ثابت کیا ہے کہ تمام کائنات کے ہمہ گیر قانون کون و فساد کے مطابق اجرام سماوی بھی اس کلیہ سے مستثنیٰ نہیں ان میں بھی دائمی تغیر و تبدل (اوولیوشن و ڈسولیوشن) کا سلسلہ برابر جاری ہے اور رہے گا آفتاب کی حرارت رفتہ رفتہ کم ہوتی جا رہی ہے۔ اگر یہ مسئلہ صحیح ہے جیسا کہ مشاہدات و تجربات سے ثابت ہوتی ہے تو ممکن ہے کہ آج سے تیرہ سو برس پہلے آفتاب کی حدت و حرارت موجودہ زمانہ سے زیادہ ہو اور اکتوبر میں بھی گرمی کی اسی قدر شدت ہو جیسی کہ محرم سنہ ۶۱ھ میں تھی۔

توریت مقدس میں حکم غم عاشورہ

حسینی غم وہ غم ہے جس کا حکم بارگاہ ایزدی کی آسمانی کتاب میں بھی پایا جاتا ہے جو یہودیوں عیسائیوں اور مسلمانوں کے نزدیک یکساں محترم اور مقدس ہے اور جس کے احکام کا تمام انبیائے بنی اسرائیل حضرت موسیٰ سے حضرت عیسیٰ تک اتباع کرتے آئے توریت مقدس کی کتاب جبار باب ۲۳ میں ۲۶ سے ۳۲ درس تک یہ لکھا ہے۔

"پھر خداوند نے موسیٰ کو خطاب کر کے فرمایا کہ بنی اسرائیل کو کہہ کہ ساتویں مہینے کے پہلے دن تمہارے لئے عید اور یادگاری قرناؤں کے پھونکنے کا دن ہے اور جماعت مقدس ہوگی تم کوئی دنیاوی کام مت کیجیو اور خداوند کے لئے آگ سے قربانی گزرانیو۔ پھر خداوند نے موسیٰ کو خطاب کر کے فرمایا ساتویں مہینے میں بھی اور اس کے دس روز بعد کفارہ دینے کا حکم ہوگا۔ تمہاری مقدس جماعت ہوگی تم اس دن آپ کو غمزدہ بناؤ اور خداوند کے لئے آگ سے قربانی گذرانو تم اس دن کوئی نہ کام نہ کرنا کیونکہ وہ کفارہ کا دن ہے کہ تم خداوند اپنے خدا کو اپنے لئے کفارہ دو جو کوئی انسان عین اس دن غمگین نہ ہوگا وہ اپنی قوم سے کٹ جائے گا۔ اور جو انسان عین اس دن کوئی کام کریگا میں اس انسان کو اس قوم میں سے فنا کر دوں گا تم کسی طرح کا کام نہ کرنا۔ یہ تمہارے گھروں اور تمہارے لئے قرنوں کے لئے قانون ابدی ہوگا یہ تمہارے لئے سبت آرام کرنے کے لئے ہوگا تم آپ کو غمگین بنائیو تم اس مہینے کی نویں تاریخ کی شام سے دوسری شام تک اپنے آرام کا وقت مان لیجیو۔ (صفحہ ۱۶۰)

اس سے پہلے اسی کی کتاب کے باب ۱۶ میں اس حکم کے متعلق درس ۲۹ سے یہ عبارت درج ہے

اور یہ تمہارے لئے قانون دائمی ہوگا کہ ساتویں مہینے کی دس تاریخ تم سے ہر ایک خواہ دیس کا ہو یا پردیسی جو تم میں ہے اپنی جان کو دکھ دے اور کسی کا کام نہ کرے چونکہ اس روز تمہارے لئے پاکیزگی کا کفارہ دیا جائیگا تاکہ تم اپنے سارے گناہوں سے خداوند کے آگے پاک ہو جاؤ۔ یہ سبت تمہارے آرام کرنے کے لئے ہوگا تم اس دن اپنی جان کو دکھ دیجیو۔ یہ سبت تمہارے لئے آرام کرنے کے لئے ہوگا۔ تم اس دن اپنی جان کو دکھ دیجیو۔

یہ کہنا ہے لئے ہمیشہ کا قانون ہو گا۔ (صفحہ ۱۵۰)

دیکھو بائیبل مقدس کتاب احبار صفحات ۱۵۰ اور ۱۶۰ مطبوعہ امریکن بائیبل سوسائٹی ترجمہ از عبرانی و یونانی امریکن مشن پریس لدھیانہ بہ اہتمام پادری ویری ۱۸۹۳ء۔

توریت مقدس کی ان عبارات سے پایا جاتا ہے کہ امت موسوی کے لئے بارہ مہینہ کے اندر ایک دن ایسا مقرر کیا گیا ہے کہ اس روز کاروبار کو معطل کر کے غم منایا جائے قربانی وغیرہ کی رسمیں ادا کی جائیں دوسرے احکام تو بجائے خود کچھ توجیہ بھی رکھتے ہیں لیکن غم کرنا اور خود کو دکھ دینا ایک معمہ ہے جس کی کوئی وجہ توریت میں نہیں پائی جاتی کہ یہ حکم اس خصوصیت کے ساتھ کہ جو ایسا نہ کرے گا اس کو فنا کر دیا جائے گا کیوں لیا گیا ہے وہ بھی دسویں تاریخ کے لئے اور دسویں تاریخ کی شام سے دسویں کی شام تک اگر یہ کہا جائے کہ اس تاریخ کو بارہ مہینوں کی لغزشوں اور خطاؤں کا کفارہ ادا کرنے کا دن مقرر کیا گیا ہے کہ لوگ گناہوں کو یاد کر کے اظہار پشیمانی و توبہ کے طریق پر کاروبند کر کے دنیا کا کوئی کام نہ کریں بلکہ قربانیاں پھونکیں۔ اور جانوروں کی قربانیاں آگ پر چڑھائیں، تب بھی خود کو دکھ دینے اور غم کرنے کا کوئی طریقہ نہیں بتایا گیا اور سبب خدائی مشیت نے ایک ایسی شریعت قائم کرنی منظور تھی۔ جو شریعت موسوی کی ناسخ ہو تو یہودیوں کو ابد الآباد اس رسم کو جاری رکھنا۔ کیا توریت میں دوسرے صحف انبیاء کی طرح بعض آئندہ واقعات کی پیشین گوئی بھی کی گئی ہے باوجود تحریک و تبدیل اب بھی متعدد آیات واحکام ایسے موجود ہیں جن کی تطبیق بعثتِ خاتم الانبیاء اور بعض اسلامی واقعات سے بآسانی ہو سکتی ہے اس لئے ہم غلطی پر نہ ہوں گے۔ اگر توریت کے مندرجہ بالا احکام کو ماہ محرم کی دسویں تاریخ سے مطابق سمجھ کر اس واقعہ کی جو حضرت خاتم الانبیاء کے فرزند سے متعلق ہے پیشین گوئی قرار دیں اور دسویں تاریخ کی تخصیص تاکید اور تہدید کو عاشورۂ محرم کے متعلق خیال کریں اور چونکہ حضرت موسیٰ کے بعد تمام انبیاء یہاں تک کہ حضرت عیسےٰ بھی شریعتِ موسوی کی تقلید و تاسی پر مامور

تھے اور توریتِ مقدس یہودیوں کے لئے ہی نہیں بلکہ عیسائی بھی اس کے ایسے ہی معتقد و مقلد ہیں جیسا کہ یہودی ان احکام کی پیروی کا سلسلہ مشیت الٰہی میں زمانۂ خاتم الانبیا تک رکھنا منظور تھا اس لئے یہ حکم عام ہمیشہ کے لئے دیا گیا ہے۔ کہا جاسکتا ہے کہ یہ توریت کا حکم ہے اور توریت کے احکام منسوخ ہو چکے ہیں۔ ہم یہ کہیں گے کہ یہ حکم تو ابد الآباد تک کے لئے کیا گیا ہے۔ اور جس حکم کو قانونِ اَبدیَ و دائمی فرمایا گیا ہو اسے کیونکر منسوخ مانا جاسکتا ہے اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ یہ حکم تاقیامِ قیامت جاری و ساری رہے گا۔ اور اس فرمانِ خداوندی کی تعمیل اب امت محمدیہ کے ذمہ عائد ہے۔ ہمارے خیال میں توریت کے مندرجۂ صدر حکم سے اہل بیت رسالت کے اس عدیم النظیر اور دردناک واقعہ سے تطبیق بے محل نہیں خصوصاً جب کہ اس تطبیق کے بعض قرائن بھی موجود ہوں اب دیکھنا یہ ہے کہ عبری ساتویں مہینے کی جس کا نام عبری کلینڈر میں ماہ نیسان ہے اور عربی پہلے مہینہ کی دس تاریخ کس طرح مطابق ہو سکتی ہے اگرچہ عبری مہینوں میں بھی شمسی مہینوں کی مطابقت کے لئے ایک مہینہ کا (ادر) بڑھایا جاتا ہے لیکن یہ حساب شریعتِ موسوی کے خلاف ہے توریت میں تیسرے سال ایک مہینہ شمسی قرار دینے کا حکم کہیں نہیں ہے جس طرح مسلمانوں میں قمری مہینوں کا حساب ہے اسی طرح حضرت موسیٰ کی شریعت میں بھی قمری مہینوں کا ہی استعمال تھا حقیقت بھی یہی ہے کہ دورۂ قمری کے مہینہ کا حساب وہ اصول ہے جسے نوعِ انسان نے سب سے اول دیکھا سمجھا اور قرار دیا تھا یہودیوں نے غالباً رومیوں کی تقلید سے لوند کا ایک مہینہ بڑھا کر اپنے سال کو شمسی سال سے مطابق کر لیا ممکن ہے کہ اس عمل سے اُلٹ پھیر ہو کر مہینوں کے ناموں میں بھی تقدم و تاخر ہو گیا ہو مگر آخری آسمانی کتاب (قرآن) میں یہودیوں کے اس فعل کی مذمت کی گئی ہے۔

اِنَّمَا النَّسِیْٓءُ زِیَادَۃٌ فِی الْکُفْرِ یُضَلُّ بِہِ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا۔	حقیقت یہ ہے کہ لوند کا شامل کرنا کفر کا بڑھانا ہے جس سے کفر والوں کو گمراہ کیا جاتا ہے

سنہ ہجری قائم کیئے جانے کے وقت بھی محرم کو ہی سال کا پہلا ماہ قرار دیا گیا حالانکہ ہجرت کا واقعہ ۲۰ ماہ صفر کو ہوا اس موقعہ پر ہم کو ان بحثوں سے سروکار نہیں۔ صرف یہ امر قابل غور ہے کہ محرم ۶۱ھ ہجری کی دسویں تاریخ عبری ساتویں مہینہ کی دس تاریخ کو مطابق ہو سکتی ہے یا نہیں عبری بارہ مہینوں کے مع تعداد ایام یہ ہیں۔ (۱) تسری ۳۰ - (۲) حشوان ۲۹ (۳) کسلیو ۳۰ (۴) طیبت ۲۹ (۵) شبط ۳۰ (۶) ادار ۲۹ (لوند کا سال کبیسہ میں ۲۹) (۷) نیسان ۳۰ (۸) ایار ۲۹ (۹) سیوان ۳۰ (۱۰) تموز ۲۹ (۱۱) آب ۳۰ (۱۲) ایلول ۲۹ - کل ۳۵۴ دن کبیسہ میں ۳۸۴ دن

ان میں تسری پہلا مہینہ اور نیسان ساتواں مہینہ ہے تاہم بعض شہادات سے یہ عبری ساتواں مہینہ فارسی ماہ تسرین الاول اور انگریزی ماہ اکتوبر سے مطابق ہو جاتا ہے۔

کان فقتلہ لعشر لیال خلون من المحرم سنۃ ۶۱ھ وکان من شہور العجم فی تشرین الاول

حضرت کی شہادت محرم کی دس راتیں گزر جانے پر ۶۱ھ ہجری میں ہوئی اور وہ عجمی مہینوں میں تسرین الاول کا مہینہ تھا جس کو عوام تشری کہتے ہیں۔

یہودیوں کی جنتری میں بھی ساتواں مہینہ تسرین الاول میں ہوتا ہے یہ ماہ اکتوبر سے مطابق ہے پروفیسر لوپالانو جو عبری زبان کا بڑا عالم تھا اس نے بھی ہیبرو اسٹیلیر مین یہی لکھا ہے کہ ساتواں مہینہ تسری یعنی اکتوبر ہے۔ سید سلیمان ندوی نے سریانی لغات[۱] کے تحت میں تسرین الاول کو ماہ اکتوبر بتایا ہے اور تاریخ ابن عربی مطبوعہ مصر کے انڈیکس میں بھی ۶۱ھ ہجری کی ابتدا یکم تسری ۶۸۰ء کو لکھی ہے محمد طلعت بے ترکی مورخ نے دول العرب والاسلام کے صفحہ ۱۴۳ میں لکھا ہے کہ یوم عاشورہ محرم کو تسری کی دس تاریخ تھی یعقوبی نے بحوالہ خوارزمی تحریر کیا ہے کہ روز عاشورہ آفتاب برج میزان سے سترہ درجہ ۲۰ دقیقہ پر اور قمر برج دلو سے ۲۰ درجہ پر تھا علامہ عبدالعلی

۱؎ لغات جدیدہ مطبوعہ مطبع معارف اعظم گڈھ ۱۴۷۔

ہر دی طہرانی کا قول ہے کہ روزِ عاشورہ آفتاب درجۂ میزان میں تھا۔ اور ایسا اکتوبر کا مہینہ میں ہوتا ہے سید محسن علی سبزواری اپنی کتاب نور العین مطبوعہ رفاہِ عام پریس لاہور کے صفحہ ۶۲ میں لکھتے ہیں کہ بنی اسرائیل کا قمری سال ماہ رجب سے شروع ہوتا ہے۔ اس لئے اس کا ساتواں مہینہ محرم ہے صرف توریت میں سفینۂ نوحؑ کی نسبت لکھا ہے استقر الفلک فی الشہر السابع بعض مفسرین اسلام نے اس کی تائید کرتے ہوئے تحریر کیا ہے۔ فاستقرت علیہ یوم العاشر محرم (دیکھو تفسیر مجمع البیان) یعنی کشتی کوہِ جودی پر دس محرم کو ٹھہری اس سے پایا گیا کہ یہودیوں کا ساتواں مہینہ محرم سے مطابق تھا اور توریت میں دس محرم کو غم کرنے کا حکم دیا گیا ہے اور ہمیشہ کے لئے دیا گیا ہے

(نوٹ) اس بحث پر ہم کو خود کافی اطمینان نہیں کیونکہ حسب منشا مواد دستیاب نہیں ہوا جب تک وثوق کامل نہ ہو تا دلیلات سے تشفی قلب حاصل نہیں ہو سکتی۔ اس کے علاوہ دو سوال اور بھی پیدا ہوتے ہیں۔ ایک یہ کہ اگر توریت میں ایسا حکم ہے تو قرآن میں کیوں نہیں، دوسرے یہ کہ اگر یہ حکم دائمی اور ابدی ہے تو زمانۂ رسالت میں اس پر عمل کیوں نہیں ہوا۔ اس لئے یہ عرض کیا جاتا ہے کہ اگر اس کے متعلق کوئی ایسا مواد مل سکا جس پر جرح کی گنجائش نہ ہو تو انشاء اللہ دوسرے ایڈیشن میں اضافہ کیا جائیگا۔

رسومِ عزاداری محرم میں ایک غیر متعلق طرزِ عمل کی آمیزش

عشرۂ محرم میں یا اسکے بعد اربعین تک جو مراسمِ عزاداری ادا کی جاتی ہیں ان کا مقصدِ اعظم یہ ہے کہ مصائبِ خاندانِ رسالت کی یاد کو ہر سال تازہ اور زندہ رکھا جائے اور ان کے ہر پہلو سے جو سبق آموز نتیجے برآمد ہوتے ہیں۔ ان پر از سرِ نو غور و خوض کا موقعہ ملے

اور عام قلوب ان کی تاسی اور اقتدار کے جذبات سے متاثر ہو کر سرگرم عمل ہوں۔ یہ عزاداری کی رسمیں اور طریقے جو مختلف شہروں میں مختلف صورتوں سے لائے ہیں ان کی نسبت کہا جا سکتا ہے کہ ان میں مسلمانوں کو کسی طبقہ یا فرد کی دل آزاری نہیں چنانچہ تعزیہ داری مجالس عزا اور نذر و نیاز اکثر اہل سنت بھی اسی طرح کرتے ہیں جس طرح شیعہ تاہم اس حقیقت حال پر ہم قدر انسوس کیا جائے وہ کم ہے کہ شیعہ حضرات نے ایک ایسی رسم کو عزاداری کا جزو قرار دے لیا ہے جس کا رسوم محرم اور واقعات کربلا سے کچھ بھی تعلق اور لگاؤ نہیں۔

جیسا کہ سب جانتے ہیں لفظ تبرا کے لغوی معنی ہیں کسی سے برأت یعنے بیزاری ظاہر کرنا اس کا مفہوم ایسا ہمہ گیر ہے کہ تمدن کی تمام شاخیں مذہبی ہوں یا معاشرتی یا سیاسی اس کے تحت میں آجاتی ہیں۔ مذہب کو لیجئے تو ہر شخص دوسرے مذاہب اُن کے پیشوایان امت ان کے طرق عبادت اور احکام سے بیزار ہے خواہ وہ کیسے ہی مستحسن اور عقل کے مطابق ہوں لیکن اس کے خیال میں وہ صداقت و حقانیت سے کچھ بھی تعلق نہیں رکھتے ہیں ان کے ہادیاں طریقت گمراہ اور احکام ناقابل عمل ہیں مسلمان، عیسائی ہندو پارسی بدھ سکھ جین وغیرہ جتنے دنیا کے مذاہب ہیں ان کا عمل اسی عالمگیر قانون پر ہے تبرا اور بیزاری کا یہ عمل دوسرے مخالف مذاہب کے ساتھ ہی مختص نہیں بلکہ ہر مذہب میں جو مختلف شاخیں پیدا ہوگئی ہیں وہ بھی باہم دست و گریباں اور ایک دوسرے کے عقائد و اعمال سے بیزار ہیں بلکہ بنظر غور سے دیکھا جائے تو ہر مذہب کی بنیاد ہی تبرا پر ہے مذہب اسلام کو ہی لے لیجئے۔ ... کی خشت اول کلمہ لا الٰہ الا اللہ پر رکھی گئی ہے جس میں تمام فرضی معبودوں سے تبرا کا اظہار احکام اسلام کا رکن اعظم اور افضل عبادات نماز ہے اور اس کی ابتدا تبرا سے ہی کی جاتی ہے اور ہر نمازی نماز کی نیت باندھ کر سب سے اول اعوذ باللہ من الشیطان

الرجیم۔ پڑھنا اور شیطان سے بیزاری ظاہر کرکے نماز شروع کرتا ہے۔
معاشرتی نظام کو دیکھا جائے تو اس میں بھی تبرا اور منافرت کا سکہ جاری ہے۔ اصول زندگی لباس خوراک بلکہ سوسائٹی کے ہر شعبہ میں اس کا اثر نمایاں ہے داڑھی رکھنے والا داڑھی منڈے سے بیزار اور داڑھی منڈا داڑھی والے سے چھری کانٹے سے کھانے والا ہاتھ کے ذریعہ کھانے سے متنفر ہاتھ سے کھانے والا چھری کانٹے سے گریزاں ہیٹ اور کوٹ والا انگرکھے پائجامہ والے کو نظرِ حقارت سے دیکھتا ہے تو انگرکھے پائجامہ والا ہیٹ اور کوٹ پر لاحول پڑھتا ہے وغیرہ وغیرہ اسی مخالفت اور منافرت کا نام تبرا اور بیزاری ہے یہی حال سیاسیات کا ہے شخص اور ہر قوم کی ڈپلومیسی دوسرے کی ضد ہے اور یہی باہم ۔۔۔ تبرا او بیزاری کا باعث ہے۔
حقیقت یہ ہے کہ یہ رسم شیعوں کے مذہب میں اصولاً داخل نہیں نہ اس کا شیعیت سے کچھ واسطہ نہ عزاداری محرم سے کچھ تعلق ہے نہ پہلے جاری تھی اس کی ابتدا در اصل انتقامی جذبہ سے ہوئی بلکہ اس بدعت کے بانی خود اہل سنت کے پانچویں خلیفہ امیر المومنین حضرت معاویہ بن ابی سفیان صاحب ہیں جن کو خاندان رسالت سے دیرینہ اور قلبی عداوت تھی انہوں نے اپنی سیاسی اغراض کی تکمیل کے لئے جناب علی مرتضیٰ پر بذریعہ فرمان اپنے تمام قلمرو سلطنت میں تبرا کا حکم جاری کر دیا جس سے ان کی مراد یہ تھی کہ عوام کی نظروں میں خاندان رسالت کی منقصت ہو اور عوام پر عقیدت نہ ... ... سلاطین بنی امیہ کے زمانہ میں آباد اور آئندہ نسلوں کی نشوونما بغض ... بیت پر منتج ہو چنانچہ اس بدعت پر تقریباً ساٹھ برس تک عمل ہوا اور باستثنائے شیعیان علی تمام اسلامی دنیا جس کا دائرہ آبادی مغربی افریقہ سے ترکستان و ہندوستان ... پھیلا ہوا تھا آل معاویہ شاہی سنت پر کاربند رہے اور اس عہد کے صحابی ... تابعین تک طوعاً و کرہاً اس آلودگی کو نہ ... سکے۔ تمام مساجد میں واعظ او

خطیب بر سر منبر علانیہ اس کا اعادہ کرتے رہے یہاں تک کہ خلیفہ عمر ابن عبد العزیز نے سنہ [illegible] ہجری میں اس ناشدنی بدعت کو بحکم شاہی مسدود و موقوف کیا اس زمانہ کی تمام اسلامی تاریخیں ان واقعات کو اپنے دامن میں لئے ہوئے ہیں۔

پہلے کوئی تفریق نہ تھی توحید کے نام لیوا سب مسلمان کہے جاتے تھے یہ شیعیت اور سنیت سنہ [illegible] ہجری عہد امیر معاویہ سے شروع ہوئی علامہ جلال الدین سیوطی تاریخ الخلفاء میں لکھتے ہیں۔

[illegible] معاویہ [illegible] علی [illegible] الحسن [illegible] فاسمه [illegible] العام [illegible] الجماعة لاجتماع الامة على [illegible] واحد۔

معاویہ نے علی پر خروج کیا اور اس کا نام خلافت رکھا پھر حسن پر خروج کیا۔ امام حسن خلافت سے دستبردار ہو گئے۔ اور معاویہ پر خلافت کا استقرار ہو گیا۔ یہ واقعہ ماہ ربیع الثانی یا جمادی الاول سنہ [illegible] ہجری کا ہے اس سنہ کا نام سال جماعت رکھا گیا کیونکہ امت کا اجماع ایک خلیفہ پر ہو گیا۔

لیکن واقعہ یہ ہے کہ [illegible] جنگ صفین کے بعد ہی امیر شام نے امیر المومنین حضرت علی مرتضیٰ پر سب و تبرا کی کاروائی شروع کر دی تھی اور اپنے زیر حکم تمام علاقوں میں اس ناپاک رسم کی اشاعت کا فرمان جاری کر دیا تھا۔ اور جب حضرت امام حسنؑ سے معاہدہ صلح ہوا تو آپ نے ایک شرط یہ بھی قائم کی تھی کہ سب امیر المومنین کی بدعت اٹھا دی جائے اور آئندہ کوئی آپ کی شان میں بے ادبانہ الفاظ استعمال نہ کرنے پائے لیکن [illegible] (تحفہ وصفة الاحباب ابو الفدا ابن [illegible] ابو وردی وغیرہ) امیر معاویہ نے [illegible] امیر المومنین کی شرط کو منظور نہ کیا تب

زیادہ اصرار ہوا تو بڑی رد و کد کے بعد قرار پایا کہ جس وقت حضرت امام حسن موجود ہوں اس حال میں احتیاط کی جائے گی۔ مگر اس شرط کا ایفا ملحوظ نہ ہوا اور حضرت امام عالی مقام کے روبرو سب و شتم کا کوئی دقیقہ اٹھا نہ رکھتے تھے۔ (دیکھو ابوالفدا مطبوعہ دہلی صفحہ ۲۳۴) یہی ابوالفدا اپنی تاریخ کے ص ۲۰۲ پر لکھتے ہیں۔

وكان خلفاء بني امية يسبون عليا من سنة احدى واربعين وهي السنة التي خلع الحسن فيها نفسه من الخلافة الى اول سنة تسع وتسعين آخر ايام سليمان بن عبد الملك فلما ولي عمر ابطل ذلك وكتب الى نوابه بابطاله ولما خطب يوم الجمعة ابدل السب في آخر الخطبة۔

خلفائے بنی امیہ ۴۱ھ سے ۹۹ھ تک آخر عہد سلیمان بن عبد الملک تک امیر المومنین علی مرتضیٰ پر تبرا کرتے رہے جب عمر بن عبد العزیز خلیفہ ہوئے تو انہوں نے یہ سب موقوف کیا اور اپنے نائبوں کو بھی اسی کا حکم بھیج دیا اور سب کی جگہ جمعہ کے خطبہ کے آخر میں یہ آیت پڑھنا بھی بدل دیا۔

ابن عبدربہ کتاب عقد الفرید میں کہتے ہیں۔

لما مات الحسن بن علي حج معاوية فدخل المدينة واراد ان يلعن عليا على منبر رسول الله فقيل له ان ههنا سعد بن ابي وقاص ولا نراه يرضى بهذا فابعث اليه وخذ رايه

جب امام حسن کا انتقال ہوا تو معاویہ حج کو گیا، مدینہ آیا اور چاہا کہ منبر رسول پر جا کر علی مرتضیٰ پر لعنت کرے۔ لوگوں نے اس سے کہا سعد مدینہ میں موجود ہیں وہ تمہاری اس حرکت پر راضی نہ ہوں گے پہلے ان سے رائے لے لو۔

مگر سعد نے اس کی مخالفت کی اور معاویہ کچھ عرصہ کے لئے خاموش ہو گیا۔

فلما مات سعد لعنه على المنبر وكتب الى عماله ان يلعنوه على المنابر

جب سعد مر گئے تو معاویہ نے منبر پر تبرا کیا اور اپنے عمال کو لکھا کہ وہ بھی

قفعلوا | ممبروں پر تبرا کہا کریں۔

امیر معاویہ نے جو کلمات خطبہ میں پڑھے ان کو ابوعثمان حافظ نے کتاب الرد علی الامامیہ میں اس طرح نقل کیا ہے۔

کان یقول فی آخر خطبۃ اللھم ان ابا تراب ملحد فی دینہ وصد عن سبیلک فالعنہ لعنۃ وبیلا وعذبہ عذابا الیما وکتب بذالک الی الآفاق فکانت ھذہ الکلمات یشاد بہا علی المنابر الی ایام عمر بن عبد العزیز۔

معاویہ اپنے خطبہ کے آخر میں کہا کرتا تھا کہ اے خدا ابوتراب (معاذ اللہ) ملحد ہوگئے۔ اور تیرے راستے سے منہ پھیر لیا تو ان پر اپنی لعنت و عذاب نازل کر ان ہی فقروں کو دنیا بھر میں لکھ بھیجا اور یہ فقرے خطبہ جمعہ میں عہد عمر ابن عبدالعزیز تک ممبروں پر علی الاعلان کہے جاتے تھے۔

اسی کتاب میں علامہ جاحظ نے اس تبرا بازی کی حدیوں دکھائی ہے۔

ان قوما من بنی امیۃ قالوا لمعاویہ یا امیر المومنین انک قد بلغت ما املت فلو کففت عن ھذا الرجل فقال لا واللہ حتی یربو علیہ الصغیر ویہرم علیہ الکبیر ولا یذکر لہ ذاکر فضلا

بنی امیہ کے ایک گروہ نے بعد مدت کہا اے معاویہ اب تو جو تیری مراد تھی وہ اس لعنت سے حاصل ہوگئی اب یہ سلسلہ موقوف کردے تو اچھا ہے معاویہ نے کہا خدا کی قسم کبھی نہیں یہ سلسلہ اس وقت تک رہے گا جب تک بچے اسی آب و ہوا میں جوان اور جوان بوڑھے ہو جائیں یہاں تک کہ علی کی فضیلت کا بیان کرنے والا دنیا میں باقی نہ رہے۔

بہرحال یہ عمل ۴۱ھ سے ۹۹ھ تک تقریباً ساٹھ برس جاری رہا اور بڑے بڑے صحابی عمرو بن عاص گورنر مصر اور مغیرہ بن شعبہ حاکم عراق وغیرہ وغیرہ۔ جناب امیر پر یہ اعلان و اشتہار تبرا کہواتے تھے تاریخ ابوالفدا کے صفحہ ۱۹۶ پر درج ہے۔

وکان معاویہ وعمالہ یدعون لعثمان فی الخطبۃ یوم الجمعۃ ویسبون علیاً ولما کان المغیرۃ متولی الکوفۃ کان یفعل ذالک لطاعۃ المعاویۃ	معاویہ اور اس کے عمال خطبہ جمعہ میں عثمان کے لئے دعا اور علی پر لعنت کیا کرتے تھے اور چونکہ مغیرہ بن شعبہ معاویہ کی طرف سے کوفہ کا حاکم تھا لہٰذا وہ معاویہ کی خوشی کے لئے ایسا ہی کرتا تھا۔

ابن اثیر نے تبرے بازی کے متعلق یہ عبارت لکھی ہے۔

ان معاویۃ اذاقنت سب علیاً و ابن عباس والحسن والحسین و الاشتر۔	معاویہ قنوت میں علی حسن حسین۔ عبداللہ ابن عباس اور مالک اشتر کو گالیاں دیا کرتا تھا۔

اسی طرح تبرا بازی کے متعلق سیکڑوں شہادتیں تاریخوں میں بھری پڑی ہیں۔ حالانکہ حضرت علی مرتضیٰ کو تمام مسلمان رسول اللہ کا جانشین برحق اور خلیفہ راشد سمجھتے ہیں اگر وہ شیعوں کے خلیفہ اول ہیں تو سنیوں کے خلیفہ چہارم اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ بنی امیہ کے زمانہ حکومت میں جو تمام اسلامی ممالک کے باشندے تبرا بازی کی بلا میں مبتلا تھے وہ لوگ کون تھے اور ان کو کیا کہنا چاہیئے اس سوال کے جواب کا اہل فہم خود ہی فیصلہ کر سکتے ہیں اسی سلسلہ سے تابعین عبداللہ بن وہب راسی جہنی خوارج کا کوئی تعلق نہیں ان کے معاملہ کی ایک جداگانہ صورت ہے خدا راضی ہو حضرت عمر وابن عبدالعزیز سے کہ انہوں نے اس ناپاک بدعت کا انسداد کیا وہ بھی بڑی حکمت اور خوبی کے ساتھ یہ واقعہ تاریخ خمیس جلد دوم صفحہ ۳۱۷ پر اس طرح درج ہے۔

ان عمر امر یہودیاان یخطب الیہ ابنتہ فخطبہا الیہودی فقال لہ عمر ویحک کیف تخطب الی وانت یہودی	عمر ابن عبدالعزیز نے ایک یہودی کو حکم دیا کہ وہ اپنے لئے میری لڑکی کی خواستگاری کرے چنانچہ یہودی نے ایسا ہی کیا عمر نے کہا

فقال الیہودی کیف تزوجنی ابنتک
وقد زوجت ابنتک من علی بن ابی طالب فقال عمر
[illegible]
[illegible]
فقال الیہودی فلم تلعنونه علی
المنابر فاقبل [illegible]
لها جوابا [illegible]
الجواب امر بترک اللعن۔

تجھ پر واضح ہو تو یہودی ہو کر میری بیٹی سے
نکاح چاہتا ہے۔ یہودی نے کہا کہ جب تمہارے
پیغمبر نے اپنی بیٹی علی ابن طالب کو بیاہ
دی تو میری اس درخواست میں کیا
قباحت ہے۔ عمر نے کہا علی کی ہستی بہت
بڑی تھی اور وہ خدا کے دین اور اکابر
مسلمین میں سے تھے۔ یہودی نے کہا تو
پھر تم لوگ منبروں پر لعنت کیوں
کرتے ہو [illegible] اس کا جواب دو۔ یہ جواب سے
عاجز ہو کر عمر نے اعلان فرمایا کہ منبروں پر کوئی لعنت نہ کرے۔

القصہ یہ [illegible] نے ڈالی اور حضرت عمر بن عبدالعزیز نے موقوف کیا اس کا کم و بیش سلسلہ آخر خلافت بنی امیہ تک رہا کیونکہ علیؓ کے نام لیوا جو شیعہ علیؓ کہلاتے تھے ان کی حالت اس زمانہ میں [illegible] اور بیکسی کی تھی اور ہمیشہ امویوں اور عباسیوں کے عہد میں تختۂ مشق مظالم بنے رہے سوائے اللہ اور رسول کے کوئی یارو مددگار نہ تھا مگر جب ان کو آزادی ملی جب بوئی ہاشمی خلافت کی مصر میں بنیاد پڑی یا دیلمی خاندان کو بغداد میں عروج ہوا تب رفضیوں نے بطور انتقام یہ طریقہ اختیار کیا پھر سنیوں میں اس کا رواج ایسا عام ہوا کہ [illegible] کم و بیش جاری رہا [illegible] ان کے پیشوایان دین کی تعلیم کے بالکل خلاف ہے اللہ اہل بیت نے اس مکروہ فعل سے منع فرمایا ہے۔ خود رسالت مآب علیہ السلام سے اس کی شکایت کی گئی اور یہ بھی عرض کیا گیا کہ اب اور رد عمل کے طور پر ہم کو بھی اجازت دی جائے تو آپ نے سختی کے ساتھ اس کی ممانعت فرمائی۔ قانون الٰہی قرآن مجید کے پارہ ہفتم سورۃ الانعام رکوع ۱۳ میں اس ممانعت کی بابت ایک دفعہ موجود ہے۔

لَا تَسُبُّوا الَّذِیْنَ یَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰہِ فَیَسُبُّوا اللّٰہَ عَدْوًا بِغَیْرِ عِلْمٍ۔ (پارہ ۷، سورۂ انعام رکوع ۱۳)

(یہ مشرکین) جن کی اللہ کے سوا عبادت کرتے ہیں ان کو تم برا نہ کہو ورنہ یہ لوگ بھی خدا کو بے سمجھے عداوت سے برا کہہ بیٹھیں گے۔

اسی آیۂ مبارکہ کی تفسیر کرتے ہوئے مولوی عمار علی صاحب تحریر فرماتے ہیں کہ بلند آواز سے کہنے کا حکم کسی روایت میں بھی آئمہ معصومین سے نہیں آیا ہے۔ ورنہ اس کے موجب ہوا فروغ عداوت اور مانع ہدایت ہونے کے ساتھ ہی ایک روایت بھی لکھتے ہیں کہ حضرت صادق علیہ السلام سے کسی نے عرض کیا کہ ہم نے ایک شخص کو مسجد میں دیکھا [illegible] وہ با آواز بلند تمہارے دشمنوں کو برا کہتا تھا کہ حضرت صادق نے فرمایا کیا [illegible] اس نے لوگوں کو کہہ کر ہمارے [illegible] دیکھو تفسیر عمدۃ البیان مولوی سید عمار علی [illegible] مرحوم [illegible] پارہ سات سورۂ انعام جلد اول صفحہ ۳۰۷۔

ان کے علمائے حقیقی بھی رد کئے بیٹھے ہیں مگر جہاں اور جو شیعہ جوالوں نے باوجود کثیر التعداد جانتے ہوئے اس وقت تک اس سنت سابقہ کے اتباع پر اصرار ہے جس کو بجز قومی بدنصیبی کے اور کیا کہا جاسکتا ہے یہ طریقہ جو شیعوں میں رسماً و اتفاقاً رواج پا گیا ہے خود شیعوں کے قومی مفاد کے لئے سخت مضر بلکہ مہلک ثابت ہوا اور رہے گا۔ اس دل آزاری کی بدولت [illegible] وہ عمل میں لائی جائے یا نہ لائی جاوے شیعہ ایسے بدنام ہو چکے ہیں کہ اہل سنت کی بدگمانی گھر کر [illegible] مذہبی و غیر مذہبی امور میں باہمی تشدد اور بدگمانی کی وجہ سے فریقین کے درمیان عزاداری کے متعلق ایک بیّن تفریق پیدا ہو گئی اہل سنت مجالس میں کم شریک ہوتے ہیں۔ فریقین اپنے اپنے تعزیہ علیٰحدہ علیحدہ مختلف مقامات میں دفن کرتے ہیں اگر بنظر غائر دیکھا جائے تو اس سے شیعہ مشن کو سخت نقصان پہنچ رہا ہے کیونکہ دراصل سواد اعظم اہل سنت میں تعزیہ داری کا رواج شیعوں کی دیکھا دیکھی پیدا ہوا جو شیعوں کی بزرگوں کی عام رواداری و خلوص و محبت کا نتیجہ تھا اب شیعوں کے اخلاق و ارتباط میں روز بروز کمی ہوتی جاتی ہے

اسی نسبت سے سنّیوں کی عقیدت و ارادت میں فرق ہوتا جاتا ہے بلکہ بعض لوگوں کو اس کشیدگی کی آڑ میں اچھا حیلہ ہاتھ آ گیا وہ اصل تعزیہ داری کو جڑ سے ہی مٹا دینے چاہتے ہیں۔ جس پر عہدِ موجودہ کا تو تب اور سونے پر سہاگہ کا کام دے رہا ہے کیا یہ باتیں اور صورتیں اُس مشن کے واسطے جس کے قیام کے لئے عزاداری کی سالانہ یادگار کا احیا ضروری سمجھا گیا ہے مہلک اور نقصان رساں نہیں۔

اس رسم کی بنیاد دراصل یہ ہے کہ شیعہ حضرات کہتے ہیں کہ اس غیر مستحق دراندازی سے خلافت اسلام میں رخنہ پڑ گیا اور اس میں بہت سے ایسے ذمائم پیدا ہو گئے جو بصورت دیگر نہ ہوتے۔ مگر یہ ایسے واقعات ہیں جو موجودہ نئی شیعہ نسلوں کی دسترس سے بالکل بالاتر ہیں وہ کیا ان کے آبا و اجداد بھی تیرہ سو برس پہلے اب تک پیدا بھی نہ ہوئی تھیں جب یہ واقعات ظہور میں آچکے تھے جو ہونا تھا ہو چکا تھا مشیت ایزدی بھی یوں ہی تھی وہ فعال لما یرید اور مسبب الاسباب ہے وہ جس کام کو جیسا کرنا چاہتا ہے ویسے ہی اس کے اسباب مہیا کر دیتا ہے اب تیرہ سو برس کے واقعاتِ ماضی کے لئے ہائے ہائے کرنا بے سود اور بے نتیجہ باتیں ہیں ہم اپنی قوم سے باادب عرض کرتے ہیں کہ اگر آپ سلسلہ خلافت کی پہلی تین ہستیوں کو خلیفۂ رسول تسلیم نہیں کرتے نہ کیجئے اگر آپ کے عقیدے میں ان کا ایک مستحق کی حق تلفی کرکے خود اس منصب پر فائز ہونا غاصبانہ اور ناجائز تھا بہت بہتر یوں ہی سہی۔ اگر وہ دشمن اہل بیت تھے اور آپ ان سے بیزار ہیں تو بیزار رہیئے اگر اہل بیت کی تولا کے ساتھ ان کے دشمنوں سے تبرّا لازمی ہے تو اس سے کسی کو انکار نہیں مگر اس تبرّا اور بیزاری کو اپنے دل تک رکھئے اور وہ رکیک حرکتیں نہ کیجئے جو آپ کے مذہب آپ کے رسوم عزاداری کے حق میں بدنام کن باعثِ نفرت و حقارت اور موجبِ نقصان ہوں۔

اگر بہ زعم چند اِسپ شیعہ اہل سنت اپنے پیش رووں کی تقلید و تائید کرنے

سے غلطی پر ہیں یا جماعت صحابہ کو اہلبیت اطہار پر ترجیح دے کر خاندان رسالت کی شان رفیع کی تنقیص کرتے ہیں یا ان کا دعوائے حب اہل بیت محض زبانی جمع خرچ ہے۔ یا ان کے خیال میں صحابہ کے مقابلہ میں اہل بیت کا درجہ ثانوی حیثیت رکھتا ہے یا ان کا تمام صحابہ کو ایک ہی حیثیت سے عدول سمجھ لینا واقعات کے خلاف ہے وغیرہ وغیرہ اس لئے وہ صراطِ مستقیم پر نہیں تو اس کا جواب یہ ہو سکتا ہے کہ سینوں ہی پر کیا منحصر ہے۔ دنیا کی تمام قومیں اسی اصول پر کاربند ہیں کل حزب بما لدیہم فرحون

دنیا کا ہر متنفس اپنے اور صرف اپنے ہی مذہب کو صحیح راستہ اور ذریعہ نجات ابدی باور کرنے پر مجبور و مجبول ہے اپنے مذہب کو کوئی آدمی غلط نہیں کہہ سکتا ورنہ اس کے یہ معنے ہوں گے کہ اسے اپنی بدی کا احساس ہے اور یہ سمجھتے ہوئے بھی کہ میں غلط راستہ پر ہوں اسی غلطی کے چکر میں پھنسا ہوا ہے اس لئے کوئی بھی ایسا کرنے پر آمادہ نہیں ہو سکتا بلکہ جہاں تک فطرت کا تعلق ہے ہر فرد بشر اس پر مجبور ہے کہ وہ اپنے مذہب کو صحیح سمجھے اور اس کے خلاف دنیا بھر کے مذاہب کو غلط خیال کرتا ہے شاذونادر ہی ایسی ہستیاں ہیں جو اپنے آبائی مذہب کو تنقید و تحقیق کی کسوٹی پر پرکھتی ہیں ورنہ سب عالم و جاہل

اَنَّا وَجَدْنَا عَلَيْهِ آبَاءَنَا وَاَنَّا عَلٰى آثَارِهِمْ مُقْتَدُوْنَ ط

کے اصول پر مصر اور اپنے اجداد و اسلاف کی تقلید و تائید کو غلط یا صحیح حق و صداقت کا پورا معیار اور حیاتِ ابدی اور نجاتِ آخرت کا حقیقی وسیلہ یقین کرنے پر ایمان لائے ہوئے ہیں اور دنیا کی کوئی طاقت ان کو اپنے خیال سے نہیں ہٹا سکتی۔ اگر آپ دنیا کے طول و عرض میں کسی شخص سے بھی دریافت کریں گے کہ اس کا مذہب صحیح ہے یا نہیں تو یقیناً اس کو اثبات میں ہی جواب دینا چاہیئے لیکن اگر دنیا بھر کے لوگوں کے مختلف اور متفرق خیالات بیک وقت تسلیم کر لئے جائیں اور کسی ایک کو بھی غلط نہ سمجھا جائے تو یقیناً یہ انسانیت کے خلاف بغاوت کے مرادف ہو گا راستہ مختلف ہوتے ہیں لیکن سب منزلِ مقصود تک نہیں پہنچا سکتے۔ بلکہ صرف

ایک ہی تعلیم ایسی ہو سکتی ہے جسے حق و صداقت کا راستہ اور نجات دہندہ کہا جا سکتا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ صانعِ مطلق نے تمام کائنات کی بنیاد ہی تخالف تضاد تنوع اور تصنع پر قائم کی ہے اگر وہ چاہتا تو ساری دنیا ایک مسلک اور ایک طریقہ پر ہوتی۔ وہ اپنی آخری آسمانی کتاب میں مکررات و مترات واضح کر چکا ہے کہ اگر ہم چاہتے تو سب کو امت واحدہ کر دیتے اگر ہماری مرضی ہوتی تو ان میں اختلافات نہ ہوتے۔ ہم جس کو چاہیں ہدایت کریں اور جس کو چاہیں وہ گمراہ ہو جائے۔

وَلَوْ شَآءَ اللّٰهُ لَجَعَلَكُمْ اُمَّةً وَّاحِدَةً وَّلٰكِنْ لِّيَبْلُوَكُمْ فِیْ مَآ اٰتٰكُمْ (پارہ ۶ سورۂ مائدہ رکوع ۶) — اور اگر خدا چاہتا تو سب کو ایک ہی اُمت بنا دیتا۔ مگر اس کا مقصد یہ ہے کہ جو کچھ تم کو دیا ہے اس میں تمہارا امتحان کرے۔

وَلَوْ شَآءَ اللّٰهُ لَجَمَعَهُمْ عَلَى الْهُدٰى فَلَا تَكُوْنَنَّ مِنَ الْجٰهِلِيْنَ (پارہ ۷ سورۂ انعام رکوع ۳) — اگر خدا چاہتا تو سب کو راہ راست پر رکھا کر دیتا (مگر وہ تو امتحان کرتا ہے) پس تم ہرگز جاہلوں میں شامل نہ ہو جانا۔

وَلَوْ اَنَّنَا نَزَّلْنَآ اِلَيْهِمُ الْمَلٰٓئِكَةَ وَكَلَّمَهُمُ الْمَوْتٰى وَحَشَرْنَا عَلَيْهِمْ كُلَّ شَیْءٍ قُبُلًا مَّا كَانُوْا لِيُؤْمِنُوْٓا اِلَّآ اَنْ يَّشَآءَ اللّٰهُ (پارہ ۸ سورۂ انعام آیہ اول رکوع ۱۴) — اگر ہم ان کے (مشرکین کے) پاس فرشتے بھی نازل کرتے اور ان سے مُردے بھی باتیں کرنے لگتے اور تمام چیزیں (جیسے جنت و نار وغیرہ) ان کے سامنے لا کھڑی کرتے تب بھی یہ ایمان نہ لاتے مگر جب اللہ چاہے۔

قُلْ فَلِلّٰهِ الْحُجَّةُ الْبَالِغَةُ فَلَوْ شَآءَ اللّٰهُ لَهَدٰىكُمْ اَجْمَعِيْنَ (پارہ ۸ سورۂ انعام رکوع ۱۷) — اے رسول کہہ دو کہ تمہارے پاس خدا تک پہنچانے والی دلیل نہیں اگر (خدا) چاہتا تم سب کو ہدایت کر دیتا۔

وَلَوْ شَآءَ اللّٰهُ لَجَعَلَهُمْ اُمَّةً وَّاحِدَةً — اگر خدا چاہتا تو ان سب (بندوں) کو

وَلٰكِنْ يُّدْخِلُ مَنْ يَّشَاءُ فِيْ رَحْمَتِهٖ
(پارہ ۲۵ سورہ حم عسق رکوع اول)

ایک ہی امت بنا دیتا وہ تو جس کو چاہتا ہے ہدایت کرکے اپنی رحمت میں داخل کر لیتا ہے۔

وَلَوْ شَاءَ رَبُّكَ لَاٰمَنَ مَنْ فِي الْاَرْضِ كُلُّهُمْ جَمِيْعًا اَفَاَنْتَ تُكْرِهُ النَّاسَ حَتّٰى يَكُوْنُوْا مُؤْمِنِيْنَ وَمَا كَانَ لِنَفْسٍ اَنْ تُؤْمِنَ اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ
(پارہ ۱۱ سورہ یونس رکوع ۹)

اے رسول اگر تمہارا پروردگار چاہتا تو جتنے لوگ روئے زمین پر ہیں سب ایمان لے آتے کیا تم لوگوں پر زبردستی کرنا چاہتے ہو تاکہ سب کے سب ایماندار ہو جائیں حالانکہ کسی شخص کو یہ اختیار نہیں کہ بغیر اذن خدا ایمان لے آئے

وَلَوْ شَاءَ رَبُّكَ لَجَعَلَ النَّاسَ اُمَّةً وَّاحِدَةً وَّلَا يَزَالُوْنَ مُخْتَلِفِيْنَ اِلَّا مَنْ رَّحِمَ رَبُّكَ
(پارہ ۱۲ سورہ ہود رکوع ۹)

اگر اللہ چاہتا تو بیشک تمام لوگوں کو ایک ہی امت بنا دیتا۔ مگر اس نے نہ چاہا اسی وجہ سے لوگ ہمیشہ آپس میں پھوٹ ڈالا کریں گے۔

کائنات کا کوئی ذرہ اختلاف سے خالی نہیں اور قانونی تنوع ایسا عالمگیر ہے جس سے کوئی شے مستثنیٰ نہیں کی جا سکتی

گلہائے رنگ رنگ سے ہے زینت چمن :. اے ذوق اس جہاں کو ہے زیب اختلاف سے

عالم و مافی العالم کی اور تمام مخلوق کو چھوڑ کر صرف انسان کے چہرے کو ہی لیجئے جو دوسروں کے لئے ذریعہ امتیاز ہے۔ اس میں بھی دو آنکھیں دو کان ایک ناک ایک منہ ہے طول ایک بالشت اور عرض اس سے کم ہے۔ پھر بھی ایک کی صورت دوسرے سے نہیں ملتی۔

اسی صانع و خالق کی صنعت پر غور فرمائے کہ پیدا ہونے کا اور مرنے کا لاانتہا سلسلہ بڑی تیزی اور سرعت سے جاری ہے لیکن ایک نقش دوسرے نقش سے نہیں ملتا۔ انسانی چہرہ تو پھر بھی بڑی چیز ہے ہاتھ کے ایک انگوٹھے پر ہی خیال کیجئے چند ٹیڑھی باریک لکیریں ہیں لیکن لاکھوں آدمیوں کے انگوٹھے کے نشانات دیکھ لیجئے ان میں ضرور اختلاف اور فرق پایا جاتا ہے ایک ہی ماں باپ کی کئی اولادیں ہوتی ہیں ایک ہی ظرف سے ایک شے دوسری ظرف میں منتقل ہوتی ہے ایک ہی سانچہ میں ان کے چہرے ہاتھ پاؤں اور تمام جسم کی تشکیل و تکمیل کے مدارج طے ہوتے ہیں با ایں ہمہ یگانگت صورت سیرت رفتار و

گفتار علم و عقل تقدیر و تدبیر سب ایک دوسرے سے بیگانہ جب خالق کائنات اور قادر مطلق کی منشا اور مرضی یہی ہے اور اس کی صناعی اور قدرت کی گوناگوں اور لاتعد ولا تحصیٰ نیرنگیوں کا اظہار ہی اشتقاق افتراق اور اختلاف پر منحصر ہے تو مذہب کو بھی اس شق سے علیحدہ نہیں کیا جا سکتا ایسی حالت میں کسی کو کیا حق ہے کہ دوسرے مذہب پر حملہ کر کے دلآزاری کرے یا یہ سودائے خام اس کے دماغ پر اپنا تسلط جمالے کہ ساری دنیا میری ہم خیال اور ہم مشرب ہو جائے ناممکن اور سراسر ناممکن۔ ع

ایں خیال است و محال است و جنوں

بڑے بڑے انبیاء و اولیاء مصلحین و مجددین الہی کوششیں نہ کر سکے اور ان کا سلسلۂ تبلیغ و اصلاح ایک خاص ملک یا قوم تک محدود رہا اور اگر دوسرے ملکوں اور قوموں میں اشاعت بھی ہوئی تو تمام نسلِ انسانی کو اپنے حلقۂ اثر میں نہ لا سکے تو اب زید و بکر کا یہ خیال کہ سب ایک مرکز پر آجائیں قانون قدرت سے جنگ کرنا ہے یا نہیں۔

بندہ کو عبث دعوئے یکتائی ہے ؎ اللہ یہ اتفاق کل کا نہ ہوا

جو شخص جس ماحول میں پرورش پاتا ہے اور آنکھیں کھول کر اپنے ماں باپ اور دوسرے سرپرستوں کو جو مذہبی رسوم ادا کرتے دیکھتا اور جس سوسائٹی میں نشوونما کے درجے طے کرتا ہے وہ اس کے قلب و دماغ پر ایسے چھا جاتے ہیں کہ گویا وہ اس کی فطرت ثانیہ ہیں کوئی شخص اپنے اختیار سے کسی گھر میں نہیں اوترتا ایک مسلمان صرف اس وجہ سے مسلمان ہے کہ مسلمان کے گھر میں پیدا ہوا ہے ایک شیعہ یا سنی محض اس سبب سے شیعہ یا سنی ہے کہ اس کی ولادت شیعہ یا سنی کے گھر میں ہوئی ہے حقیقت نفس الامری یہی ہے کُلُّ مَوْلُوْدٍ یُوْلَدُ عَلَی الْفِطْرَۃِ وَ اِلَّا اَبَوَاہُ یُہَوِّدَانِہٖ وَیُنَصِّرَانِہٖ وَیُمَجِّسَانِہٖ ہر بچہ خالص فطرت پر پیدا ہوتا ہے لیکن اس کے ماں باپ اس کو یہودی نصرانی اور مجوسی بنا لیتے ہیں اگر دو مختلف المذہب کے نومولود بچوں کو باہم بدل لیا جائے تو بچہ باوجودیکہ دوسرے مذہب والے کے

گھر میں پیدا ہوا تھا مگر دوسرے مذہب کے جس ماحول میں پرورش پائی گا اس کا پابند ہوگا اپنے اصلی باپ کے مذہب کو ہمیشہ حقارت و تعصب کی نظر سے دیکھے گا۔ عیسائی ہو یا موسائی ہندو ہو یا بدھ سب تقلیدِ آبائی کی زنجیروں میں جکڑے ہوئے ہیں۔ تحقیق و تفتیش سے کوئی غرض نہیں۔

بے جانچے کوئی چیز خرد ور نہیں لیتے ؛ جب تک نہو سو چیزوں سے بہتر نہیں لیتے
ہانڈی کو بھی سب ٹھوک بجا لیتے ہیں ؛ مذہب کو مگر ٹھوک بجا کر نہیں لیتے

اگر خود ان کے مذہب کی کمزوریاں دکھائی جائیں تو طرح طرح کی تاویلیں کرنے پر آمادہ ہیں مگر دوسرے مذہب میں اگر خوبیاں بھی ہیں تو عیب نظر آتی ہیں اس لئے یہ فیصلہ کرنا کہ زید ایسا اور بکر ویسا بے سود و بے نتیجہ ہے۔ پچھلے واقعات اچھے ہوں یا برے گزر چکے ان کے نتائج و اثرات مفید ہوں یا مضر داستانِ پارینہ بن چکے اب ان کو دہرانا نکتہ چینیاں کرنا سب وشتم عمل میں لانا یا ان کے مناقب کی طومار بندی و قصیدہ خوانی کو کیا فائدہ رساں ہو سکتی ہے جن لوگوں نے نیکیاں یا برائیاں کیں ان کی جزا و سزا خدا کے ہاتھ ہے ہماری تحسین و تنفرین نہ ان کو فائدہ پہنچا سکتی ہے نہ نقصان اگر یہ تبرا بازی ردِ عمل کے طور پر صرف معاویہ یزید مروان عبدالملک اور ان کے اعوان و اتباع تک ہی محدود رہتی تب بھی شاید عام مسلمانوں پر اس کا برا اثر نہ پڑتا مگر وہ تو ضرورت سے زیادہ متجاوز ہو گئی صرف زبانی تبرہ بازی پر ہی منحصر نہیں شیعہ طبقہ کی عام تالیفات تصنیفات رسالہ جات اخبارات جو مذہبیات سے کچھ بھی تعلق رکھتے ہوں ان سب میں شانِ مناظرہ کی تلخی مشترک ہے گویا میدانِ صحافت میں شیعہ اہل قلم کو اور کوئی موضوع ہی نہیں ملتا۔ بہت سی دینی کتابوں پر آپ یہ الفاظ لکھے ہوئے پائیں گے" کوئی صاحب اہل سنت وجماعت اس کو ملاحظہ نہ فرمائیں" گویا ایسی کتابوں کے مؤلفین کے نزدیک مذہب شیعہ ایک ایسا مذہب ہے جس کی مزید اشاعت کی ضرورت ہی نہیں ان کی تحریرات کو

صرف وہ لوگ دیکھ سکتے ہیں جو پہلے سے شیعہ ہیں دوسرے عقیدے کے لوگوں کے لئے وہ اس درجہ دل آزار ہیں کہ ان کے مطالعہ کی ممانعت ان کی پیشانی پر بحروف جلی ثبت ہے۔ اس قسم کی ممنوعہ کتابیں آپ کو شاید ہی دنیا کے کسی اور مذہب میں دستیاب ہو سکیں۔ مجالس عزا تو اب اچھی خاصی محافل مناظرہ ہو ہی گئی ہیں خلاصہ یہ کہ تحریر تقریر قول و فعل ہر بات میں دل آزاری کا کوئی کوئی پہلو نظر آتا ہے شیعہ عالم شیعہ مقرر شیعہ مبلغ شیعہ مصنف جب الجھیں گے تو سنیوں سے دوسرے مذاہب میں اپنی مذہب کی جیسے حقہ اور ناجیہ کہتے ہیں تبلیغ و اشاعت سے کوئی واسطہ نہیں افسوس ؎

سِرِ پنہاں کے شود بر تو جلی ⁂ تو گرفتار ابا بکر و علی

ائمہ اہل بیت نے مجالس عزا کے قیام کا حکم ایک تبلیغی مشن کی حیثیت سے دیا ہے۔ اس میں فضائل و مصائب کو مناظرہ کی شان سے بیان کرنا قطعاً منشائے ائمہ معصومین سے روگردانی کرنا ہے تبلیغ دل آزاری طعن و تشنیع درشت بیانی اور سب و شتم سے نہیں ہوتی بلکہ نرمی شیریں زبانی ملاطفت رواداری تہذیب اور احترام باعث کامیابی ہو سکتے ہیں۔ خدائے جبار و قہار جب فرعون کی تنبیہ و تلقین کے لئے ایک نہیں بلکہ دو پیغمبروں کو بھیجتا تو حکم دیتا ہے۔

فَقُولَا لَهُ قَوْلًا لَّيِّنًا لَّعَلَّهُ يَتَذَكَّرُ أَوْ يَخْشَىٰ (پارہ ۱۶ سورۂ طٰہٰ رکوع اول) (فرعون سے جاکر) نرمی سے باتیں کرو تاکہ وہ نصیحت مان لے یا ڈر جائے۔

اسلام کی آسمانی کتاب کسی مذہب کے بزرگوں کو خواہ وہ کیسے ہی ہوں بُرا کہنے کی اجازت نہیں دیتی مذہبی احکام سے قطع نظر کر کے دیکھا جائے تو عقلاً اور اخلاقاً بھی کوئی ضمیر دوسرے کی توہین کو پسندیدگی کی نگاہ سے نہیں دیکھ سکتا۔ فریقین سنی و شیعہ کے درمیان نزاعی و اختلافی مسئلہ صرف خلافت کا ہے ورنہ دونوں اسلام کے ایک ہی جھنڈے کے نیچے ہیں دونوں کا خدا ایک رسول ایک کتاب ایک قبلہ ایک سی طرح نماز روزہ

ازکوٰۃ قیامت، جنت دوزخ۔ صراط۔ میزان وغیرہم عقائد و مسائل کے دونوں یکساں
مابہ النزاع صرف مسئلہ خلافت سمجھا جاتا ہے۔ شیعوں کے اعتقاد میں خلافت رسول جیسے خلافت
بی کہا جاسکتا ہے۔ صرف خاندانِ رسالت کے بارہ افراد تک محدود ہے سنیوں کے خیال
حضرت ابو بکر صدیق سے عبد المجید خاں دوم معزول سلطان ترکی تک جن کی مجموعی تعداد
نوے ہوتی ہے۔ سب امیر المومنین و خلیفۃ المسلمین ہیں سنی سوائے حضرت علی مرتضیٰ کے
اہل بیت میں سے کسی کو خلیفہ رسول نہیں مانتے اور حضرت حسن مجتبیٰ کی خلافت کو صرف
یئے۔ شیعہ سنیوں کے سارے سلسلۂ خلافت سے منکر ہیں۔ شیعوں کا عقیدہ ہے کہ خلیفہ
ں کے واسطے حکومت و سلطنت کی ضرورت نہیں۔ عام مسلمان اس کو مانیں یا نہ مانیں
ں کی خلافت حقّہ برقرار رہے گی رسول اللہ کی خلافت ان کی نیابت ہے نائب میں بھی
وصاف کی ضرورت ہے جو منیب میں ہوں یعنی عصمت عبادت ریاضت طہارت
تقویٰ علم وغیرہ وغیرہ مطلب یہ کہ وہ علمی اور عملی اوصاف میں آنحضرت ص کا نمونہ ہوا۔
سنت کے اعتقاد میں خلیفۂ رسول کے لئے ان اوصاف کا ہونا لازمی نہیں۔ البتہ
اور تسلّط فی الارض ضروری ہے۔ سنی اگرچہ ائمہ اہل بیت کی خلافت کے قائل نہیں
ان کا احترام کرتے ہیں۔ شیعہ بھی سنیوں کے خلفاء کو تسلیم نہیں کرتے اور نہ ان کا احترام
۔ ان کو ملوک و سلاطین سے زیادہ نہیں سمجھتے خیر یہاں تک تو مضائقہ نہ تھا۔ نہ سنیوں کے
دل آزاری تھی نہ ان کو وجہِ شکایت مگر ان لوگوں نے تو وہ طریقہ اختیار کرلیا جو ان
ب کے مصفا دامن کو بھی داغدار بنانے کی حد تک پہونچ گیا اور دشمنانِ خدا و رسول اور
غانِ اہل بیت سے اتنی کاوش نہیں جتنی خلفائے ثلاثہ سے جن کو مسلمانوں کا سواد اعظم
ل اللہ کے بعد تمام دنیا سے افضل و اشرف سمجھتا ہے اپنی اس غیر دانشمندانہ حرکت کی
لت یہ لوگ ہمیشہ مغلوب و مقہور رہے۔ سیاسی و مذہبی نقصان اوٹھائے طرح طرح
تکلیفیں اور مصیبتیں جھیلیں بلکہ اب تک بھی وہ طرح طرح کے خساروں میں مبتلا اور دوسروں

کی نظر میں حقیر و قابلِ نفرت ہی ہیں تاہم اپنی ضد پر جمے ہوئے ہیں اور خود کو مومن کہتے اور سمجھتے ہیں مگر یہ خبر نہیں کہ مومنین کی جو خاص صفات قرآن مجید میں بیان فرمائی گئی ہیں ان میں ایک یہ بھی ہے۔

هُمْ عَنِ اللَّغْوِ مُعْرِضُوْنَ - وہ (یعنی مومن لوگ) بیہودہ باتوں سے پرہیز کرتے ہیں۔

افسوس یہ ہے کہ اس قوم میں قدامت پرستی اس درجہ سرایت کر گئی ہے کہ کسی قسم کی آزاد خیالی گناہِ کبیرہ کا مرادف ہو گئی۔ اگر کوئی شخص آزادانہ طریق پر بلاخوف لومۃ لائم ان خلافِ عقل و نقل حرکتوں کی طرف توجہ دلائے تو اسٗا مورد الزام و ہدفِ ملامت بننے بلکہ بہت ممکن ہے کہ خارجی یا کافر قرار دیا جائے بڑی مشکل یہ ہے کہ اس قوم کو اپنے نقائص کا احساس باقی نہیں رہا کیا اب بھی وقت نہیں آیا کہ اس طبقہ کے لوگ اس مسئلہ پر غور کریں اور ٹھنڈے دل سے غور کریں اس عمل کے حسن و قبح پر گہری اور سنجیدہ نظر ڈالیں اور امام مظلوم کی عزا داری کے مصفا دامن کو اس گندگی سے پاک کر دیں پھر اس کے نتیجے خود دیکھ لیں گے کہ یہ تبلیغی مشن کس قدر کامیاب ہوتا ہے ہم اپنے قومی اور مذہبی بھائیوں سے ادب کے ساتھ گزارش کرتے ہیں کہ انصاف اور صداقت کو پیش نظر رکھتے ہی ضمیر کو رہنما بنائیں اور اس مذموم و مضر رواج کے رطب و یابس اور حسن و قبح کو جانچیں ایسا ہو تو یقین ہے کہ ہماری اس طولانی بکواس کی معقولیت و نامعقولیت کا اندازہ خود ہو جائے گا۔ زمانہ کی رفتار کو دیکھتے ہوئے بہت ممکن ہے کہ کسی آئندہ وقت میں شیعوں کی اس رسم کو جسے وہ اپنا مذہبی فریضہ اور حق سمجھتے ہیں دوسروں کے لئے مذہبی توہین اور باعثِ دل آزاری بلکہ موجب نقضِ امن قرار دیکر جبراً روکا جائے کیا اچھا ہو کہ یہ لوگ خود ہی اس رویہ کو ترک کر کے رواداری کی ایک یادگار مثال قائم کر دیں۔

ہم نے جو اوپر عرض کیا اس کے ایک اور پہلو پر بھی نظر ڈالنا اور اسے روشنی میں لانا

ضروری ہے ہم دیکھتے ہیں کہ اکثر اہل سنت کا خیال ہے کہ صرف تبرا ہی نہیں بلکہ دشنام دہی تک اشیعہ جزو مذہب سمجھتے ہیں چنانچہ اکثر حضرات کو یہ شعر پڑھتے سنا ہے۔

دشنام بہ مذہبے کہ جائز باشد ... تو مذہب معلوم وقدر مذہب معلوم

لیکن جن دوستوں کا ایسا خیال ہے وہ غلط فہمی میں مبتلا ہیں ناشائستہ و نامہذب الفاظ زبان پر لانا شیعہ مذہب میں اسی طرح معیوب و ممنوع ہے جس طرح دوسرے مہذب مذاہب میں۔ شیعوں نے سنتِ معاویہ کے جواب میں صرف لفظ لعنت کو جائز رکھا تھا وہ بھی فقط دشمنان اہل بیت کے لئے لفظ لعنت کو گالی یا دشنام کا مترادف سمجھ لینا محض سمجھ کی بات ہے لفظ لعنت اور بات ہے اور گالی یا دشنام اور چیز ہے آخری آسمانی کتاب (قرآن مجید) جو تہذیب اخلاق اور قولی و فعلی تمام بیہودگیوں سے اجتناب کی تعلیم کو نازل ہوئی ہے۔ اس کی نسبت مسلمان تو کیا کوئی غیر مسلم بھی نہیں کہہ سکتا۔ کہ اس میں گالیاں بھری ہوئی ہیں۔ حالانکہ خدائے قدوس نے اپنے رسول خاتم الانبیا کو تبرے کا حکم دیا ہے دوسرے انبیا بھی اپنی امتوں کے مشرکین اور ان کے اعمال سے تبرا کرتے رہے ہیں بلکہ کہا جاسکتا ہے کہ مکتبِ لعن کا مدرس اول اور مدرسہ تبرا کا معلم مقدم خود جناب احدیت ہے کیونکہ سب سے پہلے اسی نے شیطان پر لعنت کی ابتدا فرمائی وہ بھی ایک جگہ نہیں متعدد مقامات میں قرآنی شہادت ہی غور کرنے والے کے لئے کافی ہیں اس لئے ان احادیث نبوی کو جن میں آنحضرتؐ نے لفظ لعنت کو استعمال فرمایا ہے۔ پیش کرنے کی ضرورت نہیں البتہ صرف ایک موقعہ صحیح بخاری کا دکھایا جاتا ہے۔

قال سالم عن ابیہ انہ سمع رسول اللہ اذا رفع راسہ عن الرکوع من رکعۃ الاخرمن الفجر یقول اللھم العن فلانا فلانا فلانا	سالم اپنے باپ سے روایت کرتے ہیں کہ انہوں نے رسول خدا کو سنا کہ جب آپ نماز صبح کی آخری رکعت کے رکوع سے سر اٹھاتے تو فرماتے اے خدا فلاں فلاں پر لعنت کر

ہو صحیح بخاری پارۂ سولہ صفحہ ۵۰۴ مطبوعہ دہلی۔
ایسے مکروہ یا ناشائستہ اور خلاف تہذیب الفاظ جنکو عرف عام میں گالی یا دشنام سے تعبیر
یا جاسکے یہ کہا جاتا ہے کہ کسی مذہب میں بھی جائز نہیں ہوسکتے مذہب کا کام تعلیم تہذیب ہے
کہ تلقین بد تہذیبی اور یہ تو ایسا مسئلہ ہے کہ مذہب سے قطع نظر اس کا تعلق عقل انسانیت
رضمیر کے وجدان صحیح سے ہے دنیا میں ایسے لوگ بہت کم ہیں جن کی زبان پر ایسے الفاظ کبھی نہ
بھی نہ آجاتے ہوں لاکھوں اہل سنت جہلا ایسے ہیں کہ فحش گوئی اور دشنام دہی ان کی
دت میں داخل اور روزمرہ کی گفتگو میں شامل ہیں تو کیا یہ کہا جاسکتا ہے کہ مذہب اہل
سنت میں گالیاں جائز ہیں لاکھوں مسلمان شراب خواری زناکاری۔ قماربازی وغیرہ
غیرہ محرمات کے مرتکب ہوتے ہیں تو کیا یہ سمجھ لینا چاہیئے کہ اسلام نے ان کے جواز کا فتوی
یدیا ہے اگر کوئی شخص قولاً و فعلاً ناشائستگی کی حد تک پہونچ جائے تو یہ اس کا ذاتی فعل
ہوگا اس کی ذمہ داری اسی کے سر ہے نفس مذہب اس کا جواب دہ نہیں جیسا کہ اوپر
یان ہوا قرآن مجید میں بار بار لعنت کا اعادہ کیا گیا ہے بلاحظہ ہوں آیات مندرجہ ذیل
سب سے اول خود خدائے عز اسمہ ابلیس پر لعنت فرماتا ہے۔

فاخرج منہا فانک رجیم وان علیک اللعنۃ الی یوم الدین (سورۂ حجر رکوع ۳۔ آیت پارہ ۱۴)	تو بہشت سے نکل جا (دور ہو) بے شک تو مردود ہے اور یقیناً تجھ پر لعنت (پھٹکار) قیامت کے دن تک رہے گی۔

اسی طرح سورہ ص میں اسی موقعہ کا ذکر کرتے ہوئے شیطان پر لعنت فرمائی گئی ہے۔
رسول اللہ کو تبرے (بیزاری) کا حکم ہوتا ہے۔

قل انما ھو الہ واحد واننی بری مما تشرکون (سورۂ انعام پارہ ۷ رکوع ۲)	(اے رسول) مشرکین سے کہدو بے شک وہ اللہ واحد ہے اور میں ان سے بیزار ہوں

جن کو تم خدا کا شریک بناتے ہو۔

وَاِنْ كَذَّبُوْكَ فَقُلْ لِّيْ عَمَلِيْ وَلَكُمْ عَمَلُكُمْ اَنْتُمْ بَرِيْٓـُٔوْنَ مِمَّآ اَعْمَلُ وَاَنَا بَرِيْٓءٌ مِّمَّا تَعْمَلُوْنَ (پارہ ۱۱۔ سورۂ یونس رکوع ۴)	اور اگر وہ (کفار) تم کو جھٹلائیں تو تم کہہ دو کہ میرے عمل میرے لئے ہیں۔ اور تمہارے عمل تمہارے لئے اور تم جو کچھ کرتے اس سے میں بری (بیزار) ہوں۔

حضرت ابراہیم ستاروں کو دیکھ کر فرماتے ہیں۔

یٰقَوْمِ اِنِّیْ بَرِیْٓءٌ مِّمَّا تُشْرِكُوْنَ۔ پارہ ۷، سورۂ انعام رکوع ۸)	اے میری قوم جن جن چیزوں کو تم خدا کا شریک بناتے ہو میں ان سے بیزار ہو

حضرت ابراہیم نے اپنے چچا سے تبرا کیا۔

فَلَمَّا تَبَيَّنَ لَهٗٓ اَنَّهٗ عَدُوٌّ لِّلّٰهِ تَبَرَّاَ مِنْهُ (پارہ ۷، سورۂ انعام)	جب ابراہیم پر ظاہر ہوگیا کہ وہ (اُن کا چچا) خدا کا دشمن ہے تو انہوں نے اس سے تبرا کیا۔

حضرت ہود اپنی قوم سے فرماتے ہیں۔

اِنِّیْٓ اُشْهِدُ اللّٰهَ وَاشْهَدُوْٓا اَنِّیْ بَرِیْٓءٌ مِّمَّا تُشْرِكُوْنَ (پارہ ۱۲ سورہ ہود رکوع ۵)	بے شک میں خدا کو گواہ کرتا ہوں تم بھی گواہ رہو کہ تم دوسروں کو جو خدا کا شریک بناتے ہو میں ان سے بیزار ہوں۔
وَلٰكِنْ لَّعَنَهُمُ اللّٰهُ بِكُفْرِهِمْ فَلَا يُؤْمِنُوْنَ اِلَّا قَلِيْلًا (پارہ ۵ سورۂ نون رکوع ۲)	خدا نے ان پر ان کے کفر کی وجہ سے لعنت کی ہے اس لئے ان میں سے تھوڑے سے ایمان لائیں گے۔
اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ لَعَنَهُمُ اللّٰهُ وَمَنْ يَّلْعَنِ اللّٰهُ فَلَنْ تَجِدَ لَهٗ نَصِيْرًا (ایضاً رکوع ۷)	یہی وہ لوگ ہیں جن پر خدا نے لعنت کی ہے اور جس پر خدا نے لعنت کی ہے اس کا مددگار کسی کو نہ پاؤ گے۔

اِنَّ الَّذِیْنَ یَرْمُوْنَ الْمُحْصَنٰتِ الْغٰفِلٰتِ الْمُؤْمِنٰتِ لُعِنُوْا فِی الدُّنْیَا وَالْاٰخِرَةِ وَلَهُمْ عَذَابٌ عَظِیْمٌ (پارہ ۱۸ سورۂ نور رکوع ۲)	جو لوگ پاک دامن بے خبر اور ایمان والی عورتوں کو (زنا کی) تہمت لگاتے ہیں ان پر دنیا اور آخرت میں خدا کی لعنت ہے۔ ان پر بڑا سخت عذاب ہوگا۔
اسی سورت کے پہلے رکوع میں ہے۔ وَالْخَامِسَةُ اَنَّ لَعْنَةَ اللّٰهِ عَلَیْهِ اِنْ کَانَ مِنَ الْکٰذِبِیْنَ	پانچویں بار یوں کہے گا کہ اگر وہ جھوٹ بولتا ہوگا تو اس پر خدا کی لعنت ہے۔
فَلَمَّا جَآءَهُمْ مَّا عَرَفُوْا کَفَرُوْا بِهٖ فَلَعْنَةُ اللّٰهِ عَلَی الْکٰفِرِیْنَ (پارہ ۱۔ سورۂ بقر رکوع ۱۰)	جب ان کے پاس وہ چیز جسے وہ پہچانتے تھے آگئی تو انکار کرنے لگے پس کافروں پر خدا کی لعنت ہے۔
اِنَّ الَّذِیْنَ یَکْتُمُوْنَ مَآ اَنْزَلْنَا مِنَ الْبَیِّنٰتِ وَالْهُدٰی مِنْ بَعْدِ مَا بَیَّنّٰهُ لِلنَّاسِ فِی الْکِتٰبِ اُولٰٓئِکَ یَلْعَنُهُمُ اللّٰهُ وَیَلْعَنُهُمُ اللّٰعِنُوْنَ (پارہ ۲ سورۂ بقر رکوع ۲)	بے شک جو لوگ ہماری ان روشن دلیلوں اور ہدایتوں کو جن کو ہم نے نازل کیا اس کے بعد چھپاتے ہیں جب کہ ہم کتاب (توریت) میں لوگوں کے سامنے صاف صاف بیان کر چکے ہیں۔ یہ ہی

لوگ ہیں جن پر خدا لعنت کرتا ہے اور لعنت کرنے والے بھی لعنت کرتے ہیں۔

اِنَّ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا وَمَاتُوْا وَهُمْ کُفَّارٌ اُولٰٓئِکَ عَلَیْهِمْ لَعْنَةُ اللّٰهِ وَالْمَلٰٓئِکَةِ وَالنَّاسِ اَجْمَعِیْنَ خٰلِدِیْنَ فِیْهَا لَا یُخَفَّفُ عَنْهُمُ الْعَذَابُ وَلَا هُمْ یُنْظَرُوْنَ (پارہ ۲ سورۂ بقر رکوع ۱۹)	بے شک جن لوگوں نے کفر اختیار کیا اور کفر کی حالت میں مر بھی گئے ان ہی پر خدا کے فرشتوں کی اور تمام آدمیوں کی لعنت ہے وہ ہمیشہ اسی پھٹکار میں رہیں گے نہ ان کے عذاب میں کمی ہوگی اور نہ ان کو

عذاب سے مہلت دی جائیگی

بغوال لاشھاد ھٰؤلاء الذین کذبوا علیٰ ربھم الا لعنۃ اللہ علی الظالمین (پارہ ۱۲ سورۂ ہود رکوع ۲)	اور گواہ لوگ اظہار کرینگے کہ یہی وہ لوگ ہیں جنہوں نے اپنے پروردگار پر بہتان باندھا۔ سن رکھو کہ ظالموں پر خدا کی لعنت ہے۔

اسی سورۃ کے رکوع ۴ میں خدا قوم عاد کی بابت فرماتا ہے۔

وَاتبعوا فی ھٰذہِ الدنیا لعنۃً وَیوم القیامۃ۔	اس دنیا میں بھی ان کے پیچھے لعنت لگا دی گئی ہے اور قیامت کے روز بھی۔

سورۂ قصص میں فرعون اور اس کے لشکر کو غرق کر دینے کے بعد فرماتا ہے۔

وَاتبعنٰھم فی ھٰذہ الدنیا لعنۃً وَیوم القیامۃ ھم من المقبوحین (پارہ ۲۰ سورۂ قصص رکوع ۴)	اور ہم نے دنیا میں بھی ان کے پیچھے لعنت لگا دی ہے اور قیامت کے دن ان کے چہرے بگاڑ دئے جائیں گے۔
یوم لا ینفع الظالمین معذرتھم ولھم اللعنۃ ولھم سوٓء الدار (پارہ ۲۴ سورۂ مومن رکوع ۶)	جس دن ظالموں کو ان کی معذرت کچھ نفع نہ دیگی اور ان پر پھٹکار برستی ہوگی اور ان کے لئے بہت برا گھر جہنم ہے
وَمن یقتل مومنا متعمدًا فجزاؤہٗ جھنم خالدًا فیھا وَغضب اللہ علیہ ولعنہٗ وَاعد لہٗ عذابًا عظیمًا ط (پارہ ۵ سورۂ نساء رکوع ۱۲)	اور جو شخص کسی مومن کو دانستہ مار ڈالے تو اس کی سزا دوزخ ہے وہ اس میں ہمیشہ رہے گا اور خدا نے اس پر اپنا غضب نازل کیا ہے اور اس پر لعنت کی ہے اور

اس کے لئے بڑا سخت عذاب تیار کر رکھا ہے۔

اِنَّ الَّذِیْنَ یُؤْذُوْنَ اللہَ وَرسولہٗ لعنھم اللہ فی الدنیا وَالاٰخرۃ	بے شک جو لوگ خدا کو اور اس کے رسول کو اذیت دیتے ہیں ان پر خدا نے دنیا

وَاَعَدَّ لَهُمْ عَذَابًا مُّهِينًا۔ (پارہ ۲۲۔ سورۂ احزاب رکوع ۷)	اور آخرت میں لعنت کی ہے اور ان کے لئے رسوائی کا عذاب تیار کر رکھا ہے
فَهَلْ عَسَيْتُمْ اِنْ تَوَلَّيْتُمْ اَنْ تُفْسِدُوْا فِى الْاَرْضِ وَتُقَطِّعُوْٓا اَرْحَامَكُمْ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ لَعَنَهُمُ اللّٰهُ فَاَصَمَّهُمْ وَاَعْمٰىٓ اَبْصَارَهُمْ (پارہ ۲۶۔ سورۂ محمد۔ رکوع ۲)	(منافقو) کیا تم سے کچھ دور ہے کہ اگر تم حاکم ہو تو روئے زمین میں فساد پھیلانے اور اپنے رشتہ ناتے توڑنے لگو یہ وہی لوگ ہیں جن پر خدا نے لعنت کی ہے اور ان کے کانوں کو بہرا اور آنکھوں کو اندھا کر دیا ہے۔

ان مذکورۂ بالا آیات کے علاوہ اور بھی کئی جگہ قرآن مجید میں لفظ لعنت آیا ہے۔

توریت میں بھی لفظ لعنت متعدد مقامات پر آیا ہے بالخصوص کتاب استثناء میں درس ۱۵ تا ۲۶ تک بکرات و مرات اس لفظ کا اعادہ کیا گیا ہے اس لئے اصل عبارت بجنسہ نقل کی جاتی ہے۔

"پھر موسیٰ اور لاوی کاہنوں نے سارے اسرائیل سے کہا کہ اے اسرائیل ہوشیار ہو! اور سُن لے کہ تو آج کے دن خداوند اپنے خدا کا گروہ ہوا سو تو خداوند اپنے خدا کی آواز پر کان لگا اس کی شرعوں اور حکموں پر جو آج کے دن میں تجھ پر جتاتا ہوں عمل کر اور موسیٰ نے اسی دن جماعت کو تاکید کر کے کہا کہ یہ جرزیم کے پہاڑ پر کھڑی رہیں اور جب جماعت یردن پار اتری تو اسے برکت سنادیں یعنی شمعون اور لاوی اور یہوداہ اور اشکار اور یوسف اور بنیمین اور ان کے مقابل یہ لیعنے رُوبن اور جدا اور آشر اور زبلون اور دان اور نفتالی عیبال کے پہاڑ پر کھڑے ہو کر لعنت سنادیں اور بنی لاوی مخاطب ہو کر بنی اسرائیل کے سارے مردوں کو بلند آواز سے کہیں کہ اس شخص پر جو اپنے ہاتھوں کی کاریگری سے کھود کے یا ڈھال کے بت بنائے جس سے خداوند کو نفرت ہے اور اسے پوشیدہ مکان میں

رکھے لعنت ہے تب ساری جماعت جواب دیکے کہے آمین ۔ جو کوئی اپنے باپ یا اپنی ماں کو حقیر جانے اس پر لعنت اور سب جماعت کہے آمین ۔ جو کوئی اپنے ہمسائے کی سرحد کو سرکا دے اس پر لعنت اور سب جماعت کہے آمین ۔ وہ جو اندھے کو راہ سے بہکا دے اس پر لعنت سب جماعت کہے آمین جو پردیسی یا یتیم یا بیوہ کے مقدمہ کو بگاڑے اس پر لعنت سب جماعت کہے آمین جو اپنے باپ کی جورو کے ساتھ ہم بستر ہو اس پر لعنت کیونکہ اس نے اپنے باپ کا دامن اُگھاڑا سب جماعت کہے آمین جو کوئی کسی قسم کے چارپائے کے ساتھ جماع کرے اس پر لعنت سب جماعت کہے آمین ۔ جو کوئی اپنی بہن کے ساتھ جو اپنی ماں کی بیٹی یا اپنے باپ کی بیٹی ہو ہم بستر ہووے اس پر لعنت سب جماعت کہے آمین ۔ جو کوئی اپنی ساس سے ہم بستر ہو اس پر لعنت سب جماعت کہے آمین ۔ جو کوئی اپنے ہمسائے کو چھپ کر مارے ۔ اس پر لعنت سب جماعت کہے آمین ۔ جو کوئی رشوت لے تاکہ کسی بے گناہ کو قتل کرے ۔ اس پر لعنت سب جماعت کہے آمین جو کوئی اس شریعت کی سب باتوں پر قائم نہ رہے وان پر عمل کرے اس پر لعنت سب جماعت کہے ۔ آمین ۔

(دیکھو توریتِ مقدس موسیٰ کی پانچویں کتاب مسمی بہ استثنا باب ۲۸ - از درس (آیت) ۹ تا ۲۶ مطبوعہ امریکن مشن پریس لدھیانہ ۱۸۸۳ء صفحہ ۲۲۷ و ۲۲۸)

پھر اسی کتاب کے اس حصہ کو دیکھو جو موسیٰ کی چوتھی کتاب مسمی بہ گنتی (اعداد) کہلاتا ہے اس میں بار بار لفظ لعنت کو دُہرایا گیا ہے۔

"پھر خداوند نے موسیٰ کو خطاب کر کے فرمایا بنی اسرائیل کو حکم کر اور کہہ کہ اگر کسی کی جورو گمراہ ہو جائے اور اس سے بے وفائی کرے اور کوئی اس عورت کے ساتھ ہم بستر ہووے اور یہ اس کے شوہر سے پوشیدہ ہو اور پردے کی

بات رہے اور وہ ناپاک ہو جائے اور اس پر گواہ نہ ہو دے اور فعل کرتے ہوئے پکڑی نہ جاوے اور اس کے شوہر کے دل میں غیرت کا خیال آوے اور وہ اپنی جورو سے غیرت کہا وے اور وہ ناپاک ہو تو چاہئیے کہ وہ شخص اپنی جورو کو کاہن کے پاس حاضر کرے اور اس عورت کے لئے ایک ایفہ جو کے آٹے کا دسواں حصہ قربانی کے لئے لائے اور وہ اس پر تیل اور لوبان نہ ڈالے کیونکہ وہ غیرت کا ہدیہ یعنے یادگاری کا ہدیہ ہے کہ گناہ کو یاد میں لائے تب کاہن اس عورت کو نزدیک لاوے اور خداوند کے حضور اسے کھڑا کرے اور کاہن مٹی کے ایک باسن میں مقدس پانی لیوے اور مسکن کے فرش کی گرد لے کے اس پانی میں ملا دے پھر کاہن اس عورت کو خداوند کے حضور کھڑا کرے۔ اور اس کا سر ننگا کرے اور یاد دہی کا ہدیہ اس کے ہاتھوں پر رکھے کہ یہ غیرت کا ہدیہ ہے اور کاہن اس کڑوے پانی کو جو لعنت کا باعث ہے اپنے ہاتھ میں لیوے اور اس عورت کو قسم دے کے کہے کہ اگر کوئی مرد تیرا ہم بستر نہیں ہوا اور تو اپنے شوہر کو چھوڑ کر دوسرے کے ساتھ ناپاک نہیں ہوئی تو تو اس کڑوے پانی کی تاثیر سے جو لعنت کا باعث ہے بچی رہ اور اگر تو اپنے شوہر کے سوا دوسرے پر مائل ہوئی ہے اور ناپاک ہوئی اور تیرے شوہر کے سوا کوئی دوسرا تجھ سے ہم بستر ہوا ہے تب کاہن اس عورت سے کہے کہ خداوند تجھے ضرب المثل لعنت اور قسم کا کرے کہ خداوند تیری ران کو سڑا دے اور تیرے پیٹ کو پھلا دے اور یہ پانی جو لعنت کا سبب ہے تیری انتڑیوں میں جا کر تیرا پیٹ پھلا دے اور تیری ران سڑا دے۔ پھر عورت آمین آمین کہے اور پھر کاہن ان لعنتوں کو ایک کتاب میں لکھے اور کڑوے پانی سے اسے مٹا دے اور کاہن یہ کڑوا پانی جو لعنت کا سبب ہے

اس عورت کو پلادے تب یہ پانی جو لعنت کا سبب ہے کڑوا کرنے کے لئے
اس عورت کے جسم میں داخل ہوگا پھر کاہن اس عورت کے ہاتھ سے
غیرت کا ہدیہ لے کے خداوند کے حضور میں عورت کو ہلا دے اور اس کو مذبح
کے قریب لائے اور اس ہدیہ سے جو یادگاری کے لئے ہے ایک مٹھی لے
کے کاہن مذبح پر جلا دے بعد اس کے وہ پانی اس عورت کو پلا دے اور جب
وہ اسے یہ پانی پلا دے گا تب ایسا ہوگا کہ اگر وہ گنہگار ہوگی اور اس نے اپنے
شوہر کے برخلاف خطا کی ہوگی تو وہ پانی جو لعنت کا سبب ہے اس کے
جسم میں داخل ہو کر کڑوا ہو جائے گا اور اس کا پیٹ پھولے گا اور اس کی
ران سڑ جائے گی اور وہ عورت اپنی قوم میں ملعون ہوگی۔ (دیکھو بائیبل
مقدس کی کتاب اعداد باب ۵ از درس گیا ۵ تا درس ۲۸ صفحہ ۱۷۷ و ۱۷۸)

اگر یہ کہا جائے کہ لفظ لعنت عبرانی ہے حضرت موسیٰ علیہ السلام پر جو احکام نازل ہوئی وہ عبری زبان میں تھے تو ظاہر ہے کہ وہ عربی الفظ لعنت کا مرادف ہوگا جس کا ترجمہ لفظ لعنت کیا گیا ہے یہ اردو بائیبلیں جو یونانس عبری انگریزی عربی وغیرہ زبانوں سے مسیحی پادریوں سے مسیحی پادریوں اور مشنریوں نے اپنے ہی پریسوں میں طبع کرائی ہیں اُن سب میں لفظ لعنت درج ہے سب سے اول خالق کائنات نے ہی اس کی ابتدا کی اور اپنی آسمانی کتابوں میں بسلسلہ احکام بار بار اس کا اعادہ فرمایا اگر لفظ لعنت گالی ہے تو کیا ایسے خدا کی نسبت اس کا منکر یہ خیال نہیں کر سکتا۔

دشنام بجائے کہ عادت باشد ؎ خالق معلوم و قدر خالق معلوم

بہر حال جن اہل سنت حضرات کا یہ خیال ہو کہ گالیاں شیعہ مذہب میں جائز ہیں وہ بھی حد سے آگے بڑھ گئے ہیں لعنت کا جواز شیعوں میں بھی اسی قدر اور اسی طرح ہے جس طرح سنیوں یا دوسرے مذاہب کے لوگوں میں اگر کوئی اس سے تجاوز کرکے بدزبانی پر اُتر

آئے یا فعلاً کسی ناشائستہ حرکت کا مرتکب ہو تو نفسِ مذہب (خواہ کوئی مذہب ہو) اس کا ذمہ دار نہیں۔

بعض شیعہ حضرات یہ بھی کہتے ہیں کہ اگر ہم دشمنانِ اہل بیت سے بالجہر (یعنی بالاعلان) اظہارِ بیزاری کرتے ہیں تو ہمیں استثنائی صورت حاصل ہے چونکہ ہمارے پیشوا اور ہم ہمیشہ مظلوم رہے ہیں اہل بیتِ رسول خدا پر اکابر و خلفائے اہل سنت کی طرف سے قرنہا قرن تک بالجہر ممبروں پر اور مجلسوں میں تبرا ہوتا رہا ہے۔ مدارس میں اس کی تعلیم دی جاتی رہی ہے اگر ہم بھی اسی سنتِ اہل سنت پر عمل کرتے ہوئے ایسا ہی کریں تو ہمیں اس کا حق حاصل ہے بلکہ قرآنِ مجید ہی ہم کو صاف اور صریح الفاظ میں اس کی اجازت دیتا ہے۔ چنانچہ چھٹے پارہ کی پہلی آیت میں فرمایا گیا ہے۔

لَا یُحِبُّ اللّٰہُ الْجَہْرَ بِالسُّوْءِ مِنَ الْقَوْلِ اِلَّا مَنْ ظُلِمَ +	خدا کسی کے پکار کر برا کہنے کو پسند نہیں کرتا لیکن جو شخص ظلم کیا گیا ہے (یعنے مظلوم ہے)

یعنے مظلوم ظالم کی برائی کو پکار کر کہہ سکتا ہے یا اُسے بُرا کہہ سکتا ہے لہذا ہم معذور معفو اور مستثنیٰ ہیں اگر کسی کے پیشوا یا باپ دادا پر ظلم ہوا ہو اور وہ کسی کو ان پر ظلم کرنے والا خیال کرکے ظالموں پر خفیہ یا علانیہ اظہارِ بیزاری کرے تو اخلاقاً و انصافاً کسی کو شکایت کا حق نہیں بعض شیعہ کہتے ہیں کہ ہم لفظ لعنت کے سوا کوئی غیر مہذب جملہ زبان تک لانا مکروہ اور لغو سمجھتے ہیں چہ جائے کہ دشنام یا گالی اگر کوئی غلو یا جوش میں ایسا کہہ بھی بیٹھے تو اگرچہ وہ خود اپنے قول کا ذمہ دار ہے تاہم وہ ایک حد تک معذور بھی سمجھا جا سکتا ہے لفظِ ولد الزنا یا حرام زادہ سے زیادہ بڑھ کر دشنامی صورت میں کوئی دوسرا لفظ نہیں ہو سکتا لیکن خدائے جل شانہ نے خود سورۂ نون میں لفظِ زنیم ارشاد فرمایا ہے جس کا مفہوم ولد الزنا یا حرام زادہ ہے چنانچہ سورۂ مذکور میں ولید بن مغیرہ کی نسبت آنحضرت صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم

سے ارشاد فرماتا ہے۔

وَلَا تُطِعْ كُلَّ حَلَّافٍ مَّهِينٍ هَمَّازٍ مَّشَّاءٍ بِنَمِيمٍ مَّنَّاعٍ لِّلْخَيْرِ مُعْتَدٍ أَثِيمٍ عُتُلٍّ بَعْدَ ذَٰلِكَ زَنِيمٍ - (پارہ ۲۹ رکوع اول)	اے رسول! تم ایسے کے کہنے میں نہ آنا جو بہت قسمیں کھاتا ذلیل اوقات عیب جو اعلیٰ درجہ کا چغل خور مال کا بہت بخیل حد سے بڑھنے والا گنہ گار تند مزاج اور

اس کے علاوہ بدذات (حرام زادہ) بھی ہے۔

لیکن جن لوگوں کے ایسے خیالات ہیں ہم اُن سے بہ ادب عرض کریں گے کہ خدارا اپنے اس عمل پر نظرِ ثانی کیجئے اور اپنے ہی اسلامی بھائیوں کے سوادِ اعظم کی دل آزاری کو ملحوظ رکھتے ہوئے خُلقِ محمدی سے کام لیجئے۔ آپ کے گروہ کے اکثر افراد کو اس خلیق اعظم کی امت ہونے کا فخر و اعزاز حاصل ہے جو "اِنَّکَ لَعَلیٰ خُلُقٍ عَظِیمٍ" کا سچا مصداق تھا۔ جس کے خلقِ عظیم نے اپنے شدید سے شدید دشمن اور توہین کرنے والے کی دل آزاری نہیں کی اور جس کے مقدس مشن کو اسی خلقِ عظیم کی وجہ سے زیادہ اور عدیم المثال کامیابی ہوئی ہے جس کا مخالف بھی اعتراف کرنے پر مجبور رہے۔

لطیفہ:۔ ایک صاحب فرمانے لگے کہ ہمیں خدا کی طرف سے اجازت ہے۔ ہم معذور و مستثنیٰ ہیں اور حافظ کا یہ مقطع پڑھا ؎

حافظ بخود نہ پوشید ایں خرقہ مے آلود ٭ اے شیخ پاکدامن معذور دار ما را

میں نے عرض کیا کہ اسی غزل کا یہ شعر بھی تو پڑھ لیجئے جو باہمی رواداری اخلاق اور تمدنی مصالح کے لحاظ سے بہترین درسِ عمل ہے ؎

آسائش دو گیتی تفسیر ایں دو حرف است ٭ با دوستاں تلطف با دشمناں مدارا

عزاداری کے متعلق چند شبہات اور انکے جوابات

شبہ اول :۔ آلام و مصائب ہیں جو خدا کی طرف سے آزمائش ہیں صبر کرنا ثابت قدم رہنا اور "انا للہ و انا الیہ راجعون" پڑھنا چاہیے۔ گریہ و زاری اور اظہار بے صبری اور بے قراری نہایت خامی ہے۔ نوحہ و ماتم اور سینہ کوبی خلاف صبر اور اخلاق مومنین سے بعید ہیں

جواب :۔ بے شک ایسا ہی ہے اور ہم اس کی معقولیت کو تسلیم کرتے ہیں۔ سینہ کوبی اور اسی طرح کی دوسری حرکات کو جو متانت اور استقلال کے خلاف ہیں۔ قابل تائید نہیں سمجھا جا سکتا اور ان کے فضول ہونے میں شبہ نہیں البتہ رونا اور غم کرنا صبر کے خلاف نہیں ہیں۔

جناب ختمی مآب آپ کے اہل بیت کرام اور صحابہ عظام سے زیادہ اور کون ثابت قدم ہو سکتا ہے۔ مگر یہ حضرات بھی روئے جب قدر انبیا اور اوصیا گذرے انہوں نے نزول بلا کے وقت گریہ بھی فرمایا حضرت آدم ۴۰ برس تک گریاں رہے۔ حضرت یعقوب فراق حضرت یوسف میں اس قدر روئے کہ آنکھیں سفید ہوگئیں۔

حاکم مستدرک میں کہتے ہیں کہ جب جناب سرورکائنات حضرت حمزہ کی لاش پر آئے اور ان کو مثلہ دیکھا تو چیخ مار مار کر رونے لگے۔ ابن مسعود بیان کرتے ہیں کہ آپ کو روتے روتے غش آگیا۔ جب حضرت میدان احد سے تشریف لائے تو انصار کے گھروں سے (جن کے مرد میدان کارزار میں شہید ہوئے تھے) رونے کی آواز سُنی۔ مگر حمزہ کے گھر سے آواز نہیں آئی فرمایا کیا حمزہ کی عورتیں یہاں نہیں ہیں۔ انصار نے یہ سن کر اپنی عورتوں کو ہدایت کی کہ پہلے حمزہ کے گھر جا کر ان کو روؤ اس کے بعد اپنے وارثوں کو رونا۔ زنان انصار حمزہ کے گھر آئیں اور آدھی رات تک روتی رہیں حضرت کی سوتے

سے آنکھ کھلی دریافت فرمایا کہ یہ کیسی آواز ہے۔ عرض کیا گیا کہ آپ کے چچا پر انصار کی عورتیں رو رہی ہیں فرمایا خدا تم سے تمہاری اولاد سے اور تمہاری اولاد کی اولاد سے راضی ہو۔ خود جناب سرور کائنات نے ابھی انتقال نہ فرمایا تھا کہ رونا شروع ہو گیا۔ بلال ایسی حالت میں باہر آئے کہ ہاتھ سر پر مارتے تھے اور فریاد کرتے تھے بلال کو دیکھ کر سب اصحاب رونے لگے۔ بعض بے ہوش ہو گئے۔

مواہب قسطلانی میں تحریر ہے کہ آنحضرت کی رحلت کے وقت اصحاب نہایت شدت سے روتے تھے کسی کو مارے غم کے جنون ہو گیا بعض نابینا اور گونگے ہو گئے اور بعض روتے روتے بے ہوش ہو کر زمین پر گر پڑے بعض کا یہ حال تھا کہ اُٹھ نہ سکتے تھے جناب سیدہ تو اس قدر روتی تھیں کہ اہل محلہ تنگ آ گئے تھے یہاں تک کہ آپ کے رونے کے لئے بیرون شہر ایک علیحدہ مقام تجویز کرنا پڑا۔

صحیح ترمذی مشکوٰۃ صواعق محرقہ اور سر الشہادتین وغیرہ میں درج ہے کہ بعد شہادت حضرت امام حسینؑ ام المومنین ام سلمہ اور عبداللہ ابن عباس نے جناب رسولخداؐ کو خواب میں اس طرح دیکھا کہ آپ روتے ہیں سر اور ریش مبارک گرد آلود ہیں۔

غنیۃ الطالبین وغیرہ میں لکھا ہے کہ ستر ہزار فرشتے قبر حسین پر مقرر ہیں۔ جو قیامت تک روتے رہیں گے اسی طرح کل مورخوں کا اتفاق ہے کہ بعد شہادت سید الشہداء زمین و آسمان ملائکہ و جنات چرند و پرند سب روئے ہیں۔

صحیح مسلم کے جزو پنجم میں بہ ذیل تفسیر آیہ۔

فما بکت علیہم السماء والارض لکھا ہے لما قتل الحسین بکت السماء وبکائہا حمرتہا " جب حسین شہید ہوئے تو آسمان رویا اور اس کا رونا اس کی سرخی ہے۔

علامہ ابن حجر مکی صواعق محرقہ میں اور جلال الدین سیوطی تاریخ الخلفا میں لکھتے ہیں کہ آسمان سے خون برسا علامہ ابن جوزی تذکرہ خواص الامۃ میں جنات کا مصیبت

حسین پر رونا تحریر فرماتے ہیں شہادت یا وفات کے بعد رونا تو معمولی بات ہے مگر شہادت حسین وہ حادثہ ہے کہ ہزاروں برس پہلے اس کا حال سن کر حضرت آدم بے اختیار رونے لگے تھے۔

تفسیر درمنثور میں آیۂ فتلقیٰ آدم من ربہ کلمات کی تفسیر لکھتے ہوئے علامہ جلال الدین سیوطی ارشاد کرتے ہیں کہ وہ کلمات پنجتن پاک کے نام تھے جو آدم نے عرش پر لکھے ہوئے دیکھے تھے۔ اس وقت جبرئیل نے کہا کہ آپ ان ناموں کو یاد کرلیں چنانچہ چار نام یاد کیے تو آثار مسرت قلب پر پیدا ہوئے جب نام حسین زبان پر آیا تو حضرت آدمؑ نے فرمایا جبرئیل اس پانچویں نام پر میرا دل مضطرب ہے کہ بے اختیار آنسو نکل آتے ہیں۔ یہ کس کا نام ہے جبرئیلؑ نے کہا کہ یہ آپ کا فرزند ہے اس پر ایسی مصیبت پڑے گی کہ تمام مصیبتیں اس کے مقابلہ میں ہیچ ہوں گی اور واقعہ کربلا کا مختصر حال بیان کیا جس کی آدم وجبرئیل بکاء والثکلیٰ آدم اور جبرئیل اس طرح روئے جس طرح ماں اپنے بیٹے کو روتی ہے۔

مسند امام احمد ابن حنبل حلیۂ حافظ ابو نعیم سنن ابن داؤد مستدرک حاکم صواعق محرقہ سر الشہادتین تاریخ اعثم کوفی روضۃ الصفا روضۃ الشہداء وغیرہ میں جناب رسولِ خدا، علی مرتضیٰ اور فاطمہ زہرا کا اس واقعہ کی خبر پا کر کئی بار رونا لکھا ہے۔ سید الساجدینؑ اس غم میں ۴۰ برس تک روئے تو کیا جن نفوسِ قدسیہ کا ہم نے ذکر کیا سب آزمائش خدا میں ثابت قدم نہ تھے اور کیا ان کا رونا اظہارِ بے صبری ہے؟ نہیں ہرگز نہیں ان سے زیادہ ثابت قدم اور صابر کون ہو سکتا ہے۔ دوست کی مصیبت کا حال سن کر دوست روتا ہی ہے یہ انسانی فطرت کا ایک لازمی تقاضہ ہے اس لیے صرف رونا نہ خلاف صبر ہے اور نہ اخلاقِ مومنین سے بعید اس بحث کو بڑی گنجائش ہے مگر ہم بخوف طوالت اسی پر اکتفا کرتے ہیں فافہم وتدبر

شبہ دوم:۔ قرآن مجید میں ہے۔

لَا تَحْسَبَنَّ الَّذِيْنَ قُتِلُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اَمْوَاتًا بَلْ اَحْيَاءٌ عِنْدَ رَبِّهِمْ يُرْزَقُوْنَ فَرِحِيْنَ بِمَا اٰتٰهُمُ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ	جو لوگ خدا کی راہ میں قتل کیے گئے ان کو مُردہ مت سمجھو بلکہ وہ زندہ ہیں اپنے خدا کے پاس کو رزق پاتے ہیں اور خدا نے جو ان کو اپنے فضل سے دیا ہے اسی پر خوشی کرتے ہیں

ایک اور جگہ ارشاد ہے۔

لَا تَقُوْلُوْا لِمَنْ يُّقْتَلُ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اَمْوَاتًا بَلْ اَحْيَاءٌ وَّلٰكِنْ لَّا تَشْعُرُوْنَ	جو خدا کی راہ میں مارا جائے اس کو تم مردہ نہ کہو بلکہ وہ زندہ ہے۔ مگر تم نہیں جانتے۔

ایک دوسری جگہ فرمایا گیا ہے۔

اَبْشِرِ الصّٰبِرِيْنَ اِذَا اَصَابَتْهُمْ مُّصِيْبَةٌ قَالُوْا اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّا اِلَيْهِ رٰجِعُوْنَ اُولٰٓئِكَ عَلَيْهِمْ صَلَوٰتٌ مِّنْ رَّبِّهِمْ وَرَحْمَةٌ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُهْتَدُوْنَ	اُن صبر کرنے والوں کو خوشخبری سنا دو کہ جس وقت ان پر کوئی مصیبت نازل ہو تو اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّا اِلَيْهِ رَاجِعُوْن کہتے ہیں یہی وہ لوگ ہیں جن پر ان کے پروردگار کی طرف سے صلوٰۃ اور رحمت ہے اور

یہی ہدایت یافتہ ہیں۔

جناب سید الشہداء پر جو مصیبتیں نازل ہوئی ہیں وہ اپنی سختی اور شدت کے لحاظ سے عدیم المثال ہیں مگر آپ بڑی خوبی اور ثابت قدمی سے آزمائش خدا میں پورے اُترے اور اس وجہ سے آپ کو شہادتِ عظمیٰ کا وہ درجہ حاصل ہوا جو اولین و آخرین میں سے کسی کو نہ ہوا ہے اور نہ ہوگا آپ کو بہشت میں وہ مدارج و مراتب عطا فرمائے گئے۔ جو خاص آپ ہی کا حصہ ہیں آپ اپنے رب کے پاس خوش و خرم ہیں آپ کے دشمن دائمی عذاب اور ابدی لعنت میں گرفتار ہوئے تو یہ موقع خوشی کا ہے نہ کہ رونے کا۔ دوست کی ترقی منصب

پر خوشی کرنا چاہیئے نہ کہ غم والم

جواب:- یہ شبہ بادی النظر میں معقول مگر درحقیقت کمزور و بے اثر ہے کیونکہ یہ رونا صرف ہمدردی اور روحانی تعلق سے ہی نہیں بلکہ آنحضرت اور بزرگان اہل بیت کی تاسی بھی ہے ہم ابھی اوپر بیان کرچکے ہیں کہ حضرت سرور عالم جناب حمزہ کی لاش پر بے تاب ہو کر روئے تو کیا حضرت کو اس کا یقین نہ تھا کہ حمزہ کو سید الشہدا ہونے کا رفیع الشان درجہ ملا اور وہ داخل بہشت ہوئے اگر یقین تھا تو پھر آپ حمزہ کی لاش پر کیوں روئے چاہیئے تھا کہ اپنے چچا کے اس منصب جلیل پر فائز ہونے سے آپ خوشی کرتے یا شہادت حسینؑ کا حال جبریل یا دوسرے فرشتوں سے جتنی مرتبہ سنا آپ روئے۔ درحالیکہ ابھی معرکۂ کربلا ہوا بھی نہ تھا آپ کو اپنے فرزند حسینؑ کے ایسے مراتب عالی پر فائز ہونے کی خبر سے خوش ہونا چاہیئے تھا یا جب خود آنحضرت نے وفات پائی تو اس وجہ سے کہ بہشت کو تشریف لے گئے نعمت ہائے بہشت سے مستفیض ہوئے اپنے محبوب سے جا ملے اور مکروہات دنیا سے نجات پائی اہل بیت رسالت اور اصحاب کرام کو عید منانی چاہیئے تھی۔ حالانکہ اس وفات کا ایسا نوحہ و ماتم ہوا کہ مدینہ میں قیامت برپا تھی۔ ہم نہیں سمجھ سکتے کہ خود آنحضرت اہلبیت اطہار اور دوسرے بزرگان دین کے اس فعل کا معترض کے پاس کیا جواب ہے اگر ہے تو اس کو اپنے اس شبہ کا جواب بھی لیں۔

شبہ سوم:- واقعات کربلا خصوصاً ان روایات پر جن میں اہل حرم کے قید ہونے چادریں چھن جانے بے پردہ بازاروں اور شہروں میں پھرائے جانے کا ذکر ہو بیان کرنا اہل بیت رسالت کی توہین و تذلیل کا باعث ہے۔

جواب:- ہمارے خیال میں یہ اعتراض قابل تسلیم اور جزواً ناقابل تسلیم ہے قابل تسلیم جزو سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔ کسی صاحب احترام اور واجب التعظیم شخص کی نسبت کوئی ایسی خلاف بات بیان کرنا جو درحقیقت اس پر نہیں گزری ہو بے شک اس کی توہین اور کسر شان

ہے ان واقعات میں بہت سے قصے بے سرو پا ہیں جن کی نہ کچھ اصلیت ہے نہ وجود بلکہ وہ محض رونے رُلانے کی غرض سے گھڑے گئے ہیں چنانچہ ایک موقعہ پر اس کے متعلق بحث کی جاچکی ہے۔ چادریں چھن جانا یا بے پردہ بازاروں اور شہروں میں پھرانا ہمارے خیال میں قابل وثوق نہیں ہے اور ان کا بیان کرنا سوئے ادب ہی نہیں بلکہ بلاشبہ توہین کفر ہے۔۔۔ لیکن اگر یہ واقعات درحقیقت رُونما ہوئے تو نہ ان کا بیان کرنا داخل توہین ہے نہ دوسرے واقعات کا ذکر باعث سوء ادب کیونکہ امر واقعی کا بیان باعث ذلت واہانت نہیں ہوسکتا انبیاء سلف کے کئی ایسے حالات قرآن مجید میں مذکور ہیں چنانچہ فرمایا گیا ہے کہ سارہ زوجۂ حضرت ابراہیم کو بادشاہ مصر نے پکڑوا بلایا۔ حضرت مریم کے حال میں ہے کہ

فاتت بہ قومہا قالوا یامریم لقد جئت شیئاً فریا یااخت ھارون ما کان ابوک امرء سوء وما کانت امک بغیا۔

(یعنے حضرت عیسےٰ پیدا ہوگئے تو مریم ان کو اپنی گود میں لئے ہوئے) اپنی قوم میں آئیں وہ لوگ کہنے لگے مریم تم یہ عجیب چیز لائیں (یعنی تمہارے شوہر نہیں ہے پھر یہ بیٹا کیسے پیدا ہوا) اے ہارون کی بہن تمہارا باپ بدچلن اور تمہاری ماں آوارہ نہ تھیں (یعنے وہ تو ایسے نہ تھے تم نے یہ کیا کرلیا۔

کیا کوئی کہہ سکتا ہے کہ قرآن مجید میں اس قصہ کے ذکر سے حضرت مریم کی توہین و تذلیل ہے خود جناب ختمی مآب کے حالات تمام مورخین بالاتفاق لکھتے ہیں کہ کفار قریش نے آنحضرت کو طرح طرح کی تکلیفیں دیں کوئی کہتا تھا محمد جادوگر ہے کوئی کہتا کہ ان کو جنون ہوگیا ہے عقل جاتی رہی ہے راستوں میں لڑکے آپ پر پتھر پھینکتے۔ چال کی نقل کرتے چال پر ہنستے اور منہ چڑاتے تھے بعض نے خانۂ کعبہ میں بحالت سجدہ آپ پر اونٹ کی اوجھڑی رکھ دی، تو کیا ان واقعات کے بیان کرنے سے یہ خیال کیا جائیگا کہ اس میں آنحضرتؐ کی توہین اور کسر شان ہوتی ہے خود واقعات کربلا کے مجمل اور مفصل حالات صدہا کتب تواریخ

واحادیث و تواریخ میں قلمبند ہو رہے ہیں ہزار ہا رسالوں میں کلی اور جزوی حالات لکھے گئے ہیں جب ان حالات کا تاریخی کتابوں میں لکھنا جائز ہے اور باعث توہین نہیں تو ان کے بیان کرنے کو ناجائز ور وجہ تذلیل سمجھ لینا کس قدر مہمل اور بے معنے خیال ہے۔

شاہ عبدالعزیز صاحب دہلوی سر الشہادتین میں لکھتے ہیں۔

ثم دخلوا علی الحرم والسجاد ثنا عشر غلاما من فتی ومن کان من النساء ثم ارسلہ مع رؤس الشہداء اسبابا اھل بیت الی یزید بن معاویہ ۔

شہادت کے بعد وہ لوگ حرم میں داخل ہو گئے بارہ لڑکوں اور چند عورتوں کو بنی ہاشم میں سے قید کر دیا پھر حضرت کے سر مبارک کو دوسرے شہداء کے سروں کے ساتھ مع اسیران اہل بیت یزید ابن معاویہ کے پاس بھیج دیا۔

کیا کوئی معقول اور سمجھدار آدمی اس بات کو مان لیگا کہ شاہ عبدالعزیز جیسے جلیل القدر اور محتاط آدمی نے جو ہندوستان کے خاتم المحدثین ہیں ان فقرات کو جن میں حرم رسول میں نامحرموں کے گھس جانے اور اہل بیت کو قید کر لینے کا بیان ہے اپنی کتاب میں تحریر فرما کر اہل بیت رسول اللہ کے ازالۂ حیثیت کا ارتکاب ، گزرے ہوئے ۔ اور سچے واقعات کا بیان کرنا داخل توہین ہے نہ بیان کرنے والا برم اہانت کا مجرم اور یہ ایک ایسی کھلی ہوئی اور واضح بات ہے کہ اس قدر زیادہ بحث کرنے اور دلائل پیش کرنے کی ضرورت بھی نہیں ۔

شبہ چہارم :- عزاداری اس طریقہ پر کیوں نہیں کی جاتی جس طرح ائمہ اہل بیت کرتے تھے ۔ یہ ظاہری سامان یا رسمیں جو عقلاً اور نقلاً بے کار و فضول ہیں ان کو کیوں نہ داخل بدعت سمجھا جائے، تعزیہ بنانا، علم اٹھانا، تربت و تابوت اٹھانا ماتمی لباس پہننا۔ مہندی اٹھانا۔ فقیری پہننا سقہ بنانا طوق و زنجیر و بیڑی پہننا۔ حضرات کی فرضی شبیہیں

رکھنا تعزیوں اور علموں کی طرف اشارہ کرکے زیارت پڑھنا اور ان کو دیکھ کر تعظیماً کھڑا ہو جانا اور ان کے سامنے مرادیں طلب کرنا دلدل اور براق بنانا۔ کلاوہ پہننا لحن موسیقی میں سوزخوانی کرنا امام باڑوں کی ہانڈی جھاڑ فانوس وغیرہ تکلفات سے اس طرح آرائش کرنا جو عزاخانہ کے بجائے عشرت خانے کہلائے جا سکیں (شب دہم کو جو خاص غم کی رات ہے عزاخانوں کی اور بھی زیادہ زینت و زیبائش کی جاتی ہے۔ بلکہ چراغاں بھی کیا جاتا ہے، ڈھول تاشے نوبت نقارے بجانا وغیرہ وغیرہ جن کی بجا آوری عشرہ محرم میں رسمیات سے بڑھ کر واجبات کی حد تک پہنچ گئی ہے کیا ان کو در حقیقت لوازم عزاداری کہا جا سکتا ہے کیا ان کے ثبوت کے لئے آئمہ اہل بیت کا کوئی قول یا کوئی عمل پیش کیا جا سکتا ہے اگر نہیں کیا جا سکتا ہے یہ تو ایک ڈرامہ یا تماشہ ہے جس کو نہ حسینی تعلیم سے لگاؤ نہ حسینی عزا سے کچھ سروکار بلکہ تماشہ سامان دل بستگی جہالت توہم پرستی اور اسراف ہے۔

جواب:۔ بے شک یہ اعتراض ایک بڑی حد تک بالکل درست اور بجا ہے اور اس کے بعض مواقعہ کا ہمارے پاس کوئی جواب نہیں ہے اس لئے بلاشبہ بہ استثناء چند یہ تمام رسمیات بالکل فضول بعض سراسر لغو اور بعض انتہا سے زیادہ مذموم اور قابل ترک ہیں لیکن ان میں سے تعزیہ اگرچہ عزا حسین کا جز ولاینفک نہیں اور نہ اس کے بغیر عزاداری ناقص و نامکمل کہی جا سکتی ہے۔ تاہم اس کی مخالفت صرف اس وجہ سے کہ یہ دین میں ایک جدت یا بدعت ہے قابل اعتنا نہیں ہو سکتی، اگر عزاخانوں میں ضریح مبارک کی نقل رکھی جائے تو اس میں شرعی یا اخلاقی یا تمدنی قباحت کیا عائد ہو سکتی ہے چونکہ حسیات کو ہیجان جذبات میں ایک خاص اثر ہے نہ یہ کسی نامشروع چیز کی نقل ہے اور نہ کسی جاندار کا مجسمہ۔ شرح صحیح مسلم اور کتاب الزواج میں لکھا ہے۔ اما تصویر صور الشجر ونحوھا وما لیس بحیوان فلیس بحرام درخت وغیرہ جو چیزیں جاندار نہ ہوں ان کی تصویر

بنانا حرام نہیں۔ کتاب ہدایا میں ہے کہ "البکرہ تمثال غیر ذی روح غیر جاندار کی صورت بنانا مکروہ نہیں ہے۔" شاہ عبدالحق محدث دہلوی کتاب ما ثبت بالسنت اور کتاب دلائل الخیرات میں تصویر روضہ مقدسہ رسولخدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ممبر شریف و ضریح وغیرہ بنانا درست لکھتے ہیں۔ ملا جامی نے فتوحات الناظرین میں صورت مکہ و مدینہ کوہ ابوقبیس کوہ صفا مروہ و بقیع کو جائز لکھا۔ مدینہ طیبہ میں باوجودیکہ روضہ مقدسۂ جناب سیدہ جنت البقیع میں موجود ہے مگر اس روضہ کی نقل اور مصنوعی قبر جناب سیدہ قریب مزار جناب ختمی مآب بنائی گئی ہے اگر نقل روضہ بنانا جائز نہ ہوتا تو نقل قبر جناب فاطمہ کو علمائے مدینہ کیوں بنانے دیتے۔

بہت سے امور ایسے بھی ہیں کہ حسن عقیدت اور اظہار شوکت اسلام کے واسطے ان کا کرنا شرعاً ناجائز نہیں مانا گیا مثلاً حکم یہ ہے کہ قبر کو کچا رکھنا ہی ادلے اور انسب ہے لیکن جناب سید الانبیاء کے مزار پرانوار پر وہ عمارات عالی شان اور شاہانہ ساز و سامان ہیں جن کے لئے شارع اسلام نے اجازت نہیں دی بلکہ اس کو اسراف و تبذیر سمجھا گیا ہے۔ اسی وجہ سے اگر سب نے نہیں تو اکثر علمائے اس کے جواز کے فتوے دے دئے ہیں چنانچہ مولوی عبدالواحد خاں نبیرۂ مولانا عبدالعلی صاحب مدراسی ازالۃ الاوہام میں لکھتے ہیں کہ:۔

"علمائے صالحین ایں عصر مراسم مذکورہ را از شعائر اسلام تصور فرمودہ قطعاً فتویٰ برائے ترویج و جواز آں دادہ اند۔"

اس سے زیادہ خزینۃ المتقین میں صاف صاف تحریر ہے کہ

"مفتی را باید بہ نظر حال و عصر و زمان فتویٰ دہد پس دریں عصر و زمان علمائے صالحین فتویٰ بترویج و قیام تعزیۂ امام مظلوم کہ دادہ اند نہایت بجا و مناسب است و ترویج آں موجب ثواب و اجر عظیم است۔"

اگر ہندوستان کے سوا عرب و عراق و ایران شام اور مصر وغیرہ اسلامی ملکوں میں تعزیہ

نہیں بنایا جاتا تو اس سے یہ سمجھ لینا کہ تعزیہ بنانا حرام ہے درست نہیں ہو سکتا کیونکہ بمقابلہ ان ملکوں کے جہاں خالص اسلامی آبادی ہے اس ملک میں بوجہ اس کے کہ غیر مسلم قومیں بکثرت سکونت پذیر ہیں شوکتِ اسلام کے اظہار کی زیادہ ضرورت ہے۔ حافظ ابو عبد الرحمٰن کتاب غایت المرام میں لکھتے ہیں کہ:۔

"جو لوگ تعزیہ کو بدعت سیئہ کہتے ہیں وہ اصل دین سے ناواقف ہیں اس واسطے کہ تمام امور میں اصل جائز اور مباح ہونا ہے جب تک کہ کوئی دلیل قطعی اس کی مانع نہ ہو بدعتِ حسنہ کے کرنے اور اس کے جائز و مستحب ہونے پر تمام علماء کا اتفاق ہے۔"

شیخ عبد الحق محدث دہلوی سفر السعادۃ میں تحریر فرماتے ہیں:۔

احادیثِ صحیحہ در نہی ازیں امور یعنی بنا کردن بر قبور یا چیزی براں نوشتن و چراغ بر گور افروختن وارد شدہ و اصلِ سنت در زمانِ نبوت و خلفائے راشدین و صحابہ ہمیں بودہ ولیکن بعد ازاں تکلفات بر مقابر پیدا شدہ و مفاخرت و مباہات براں بہ اضافت و آخر زماں بجہت اقتصار نظر عوام بر ظاہر در تعمیر و ترویج مشاہد و مقابر مشائخ و عظما دیدہ چیزہا افزودند تا ازیں جا ابہت و شوکتِ اسلام و اربابِ صلاح پدید آید خصوصاً در دیارِ ہندوستان کہ مخالفان اسلام بسیار اند و ترویج و اعلائے ایں مقامات باعثِ رعب ایشان است و بسا اعمال و افعال و اوضاع کہ در زمانِ سلف از مکروہات بودہ در آخر زماں از مستحبات و مستحسنات گشتند"

اب رہی اس کی تعظیم و تکریم چونکہ اس کو نقل روضہ مبارکہ سمجھا جا کر آپ کے اسمِ گرامی سے منسوب کیا جاتا ہے اس لئے اس کی عظمت و عزت اس حد تک کرتے ہیں جو نامشروع ہونے تک نہ پہنچے کوئی قباحت نہیں ہے بلکہ ضروری ہے۔ اور یہ ایک عقلی فیصلہ ہے جس

بر شرعی بحث لانے کی چنداں ضرورت نہیں اصل تعزیہ تو وہی ہو سکتا ہے جو ہو بہو روضۂ مبارک کی نقل ہو اور ایسا ہی ہونا چاہئے تاہم گنبد دار تعزئے ہوں یا کسی اور طرح کے بظاہر اس میں شرعی قباحت نہیں۔

کہا جاتا ہے کہ کسی چیز کی نقل بنا کر اس کے ساتھ وہی برتاؤ کرنا جو اصل کے ساتھ کیا جاتا ہے ایک بے معنی حرکت اور خفتِ عقل کی دلیل ہے گو یہ اعتراض ایک حد تک صحیح ہے کہ نقل کا اصل کے مطابق احترام عقلاً و نقلاً نا قابلِ جواز ہے لیکن معترض کو چاہئے کہ پہلے فتاوائی عالمگیری کو دیکھے جس میں درج ہے کہ

"ایک شخص خلافتِ جناب رسولخدا میں حاضر ہوا اور عرض کیا کہ میں نے قسم کھائی ہے کہ جنت کی چوکھٹ اور حور کی پیشانی پر بوسہ دوں اور یہ ممکن نہیں اب اس کا عوض ارشاد ہو فرمایا اس کے عوض ماں باپ کے قدم اور پیشانی پر بوسہ دے۔ عرض کیا ماں باپ زندہ نہیں ہیں فرمایا ان کی قبروں پر بوسہ دے۔ عرض کیا قبریں بھی مجھ کو معلوم نہیں فرمایا دو لکیریں قبر کی صورت زمین پر کھینچ اور ان کو ماں باپ کی قبریں تصور کر کے بوسہ دے۔ اور قسم کے خلاف نہ کر"

تعزیہ چونکہ نقلِ ضریح مبارک یا آپ کی طرف منسوب ہے اس کی حرمت اور عزت کی طرف سے لاپروائی نہیں کی جاسکتی یہی وجہ ہے کہ تمام بزرگانِ دین تعزیہ کی تعظیم و تکریم کرتے رہے چنانچہ صاحبِ ازالۃ اوہام کہتے ہیں کہ مولانا شاہ نظام الدین مولوی عبد العلی مولوی مجید الدین خاں اور مولوی انوار الحق قدس سرہم اور دوسرے علماء فرنگی محل اور کلکتہ و مدراس جب تعزیہ کو دیکھتے تعظیماً کھڑے ہو جاتے اور دونوں ہاتھ اُٹھا کر تعزیہ کی طرف نہایت ادب سے فاتحہ پڑھتے جس کسی نے تعزیہ کے ساتھ گستاخی و بے ادبی کی فوراً سزا پائی چنانچہ ایسی صدہا روایتیں زبان زدِ خاص و عام ہیں ان ہی میں جاوَرہ

کا قصہ تمام ہندوستان میں مشہور ہو چکا ہے۔ البتہ تعزیوں کے آگے سر جھکانا منتیں مرادیں مانگنا ان پر عرضیاں آویزاں کرنا جہلا اور عورتوں کا فعل ہے جو خوش اعتقادی سہی مگر جہالت حماقت اور قابلِ انسداد ضرور ہے اسی طرح دوسری باتیں بھی مثلاً فقیری پہنانا۔ سقہ بنانا طوق و زنجیر و ملادی پہنانا وغیرہ ان کی موجد بھی عورتیں یا جاہل مرد ہیں۔ لہذا یہ سب باتیں فضول و بے کار ہیں جن کو نہ عزاداری سے کچھ واسطہ ہے اور نہ اصولِ ماتم سے کچھ تعلق گو یہ سب باتیں بہ نیتِ برکت کی جاتی ہیں اور ان کا روپیہ مصرفِ خیر میں اٹھتا ہے تاہم خوش اعتقادی دوسری بات ہے۔ ہر شخص کو اختیار ہے کہ جو چاہے فرض کرے مگر جہاں تک نظر غائر سے دیکھا جاتا ہے ان سب باتوں میں کسی ایک کو بھی خالص عزاداری سے لگاؤ نہیں سب فضول اور غیر ضروری ہیں۔ ان کے کرنے سے نہ کرنا اچھا ہے۔ پرانی لکیر کو پیٹنا اور راگی مر جاؤ کو حکم خدا و رسول سمجھ کر سادھنا امر دیگر ہے۔ علیٰ ہذا القیاس مجلس کے بعد تاشوں کے ساتھ ماتم کرنا تعزیوں کے آگے پھری گتکا کھیلتے اور باجے بجاتے ہوئے نکلنا وغیرہ وغیرہ اور بہت سے بیہودہ اور لغو حرکات دیکھنے میں آتی ہیں جن سے مسلمانوں کو شرم کرنی چاہیئے۔ تحت لفظ یا حدیث خوانی سے پہلے سوزخوانی ہر مجلس کے لازمی قرار دیدی گئی ہے۔ ہم حیران ہیں کہ مصلحانِ قوم اس بدعت سیئہ کا انسداد کیوں نہیں کرتے۔ سوزخوانی کیسی ہی بے اصول و بے قاعدہ یا سادہ طریقہ پر کی جائے۔ مگر وہ پردہ ہائے موسیقی کے دائرہ سے کسی طرح باہر نہیں ہو سکتی۔ لہذا ہم اس کو قطعاً حرام و ناجائز سمجھتے ہیں۔ نہ مجتہد ہیں نہ مولوی لیکن ہمارے خیال میں یہ مذہبی راگ کسی طرح جائز نہیں ہو سکتا بلکہ اس متبرک اور مقدس ذکر کو نغمہ ہائے موسیقی میں ادا کرنا نہایت ہی افسوسناک غلطی اور سخت اہانت گستاخی اور بے ادبی ہے یہی وجہ ہے کہ خاندان اجتہاد لکھنؤ کے علاوہ دوسرے محتاط علما سوزخوانی کو نہیں سنتے۔ ان سب سے بڑھ کر یہ کہ بعض عزاخانوں میں جنابِ رسول خدا جناب امیر حضرت حسین اور حضرت عباس کی شبیہیں رکھی جاتی ہیں جن کا رکھنا

قطعاً حرام ہے۔ ہم کو سخت تعجب ہے کہ بعض علماء نے صرف اس بناء پر کہ یہ شبیہیں (خواہ فرضی اور خیالی ہی سہی) ان حضرات سے منسوب ہو کر لائق احترام ہو جاتی ہیں ان کے جواز کے فتوے دیدئے ہیں جیسا کہ ابھی اوپر لکھا گیا ہے۔ ہم نہ عالم ہیں اور نہ صاحب اجتہاد۔ مگر ہم کو سخت افسوس ہے اور نہیں کہہ سکتے کہ اس سے بڑھ کر ان حضرات کی شان میں اور کیا سوء ادبی ہوگی۔ کسی نامشروع اور حرام شے کو ان کے اسماء پاک سے منسوب کرنا اس سے زیادہ بے ادبی اور کیا ہو سکتی ہے۔ ضریح کا غذیا لکڑی کا بُراق یا دلدل بنانا خواہ تعزیہ کے اندر ہو یا علیحدہ بوجہ اس کے ذی روح کا مجسمہ حرام ہے۔

جس طرح شمالی ہندوستان کے اکثر شہروں میں علم اُٹھائے جاتے ہیں اسی طرح جنوبی ہندوستان کے بعض شہروں خصوصاً حیدرآباد اور بھوپال وغیرہ میں نعل صاحب کی سواری نکالی جاتی ہے۔ شاہانِ دکن میں سے کسی خوش اعتقاد نے اپنی قبر میں رکھوانے کے لئے کربلائے معلیٰ سے خاک پاک منگوائی تھی اتفاقاً اس میں گھوڑے کا ایک بوسیدہ نعل برآمد ہوا۔ اس وقت اس کی نسبت یہ مشہور کیا گیا کہ یہ حضرت سید الشہداء کے گھوڑے کا نعل ہے۔ اس لئے اس کا بڑا احترام کیا گیا۔ بعد ازاں اس کی زیارت ہونے لگی۔ جلوس کے ساتھ نکالا جانے لگا۔ رفتہ رفتہ ایک نعل صاحب کے بدلے سیکڑوں نعل صاحب بن گئے۔ حیدرآباد میں نعل صاحب کی سواری کے ساتھ نہایت ہی مزخرف حرکتیں کی جاتی تھیں۔ بالکل ہولی کا سانگ بنا جاتا تھا کوئی رنچھ کوئی بندر بنتا۔ تخت رواں پر نوعمر لڑکے پریوں کا سانگ بنائے طبلہ سارنگی کے ساتھ ہوتے تھے جن کا ہندوستان کی سب سے بڑی اسلامی ریاست میں ہونا نہایت ہی افسوسناک بات تھی لیکن چند سال ہوئے کہ محی الملۃ والدین ہز اگزالٹڈ ہائی نس میر عثمان علی خاں صاحب تاجدارِ دکن نے ان لغویات و خرافات کا قطعاً سدباب فرما دیا جس کا تمام مسلمانوں کو شکر گزار ہونا چاہیئے ایک افسوسناک بات یہ بھی ہے کہ تعزیوں کی زیارت کے بہانے مرد اور عورتیں راتوں کو جابجا پڑے پھرتے ہیں جو ان مرد اور عورت

ایک جگہ جمع ہو جاتے ہیں بدن سے بدن کندھے سے کندھے رگڑے جاتے ہیں نامحرموں کی نظر عورتوں پر پڑتی ہے۔ آپس میں تاک جھانک کا موقع ملتا ہے خصوصاً تعزیے کے پاس جہاں روشنی زیادہ ہوتی ہے آنکھ ناک اور بدن کی خوب صورتی بدصورتی اچھی طرح نظر آتی ہے بعض غیرت دار مرد اپنی عورتوں کو خود ہی ساتھ لئے پھرتے ہیں یہ حرکت نہایت ہی شرمناک اور قابل نفرین اور لائق انسداد ہے مصلحانِ قوم ادھر توجہ کریں۔ بہرحال ان اغراض میں جو باتیں درحقیقت نازیبا اور ناشائستہ ہیں ان کی اصلاح بلاشبہ ضروری اور اشد ضروری ہے۔ خدا مسلمانوں کو اس کی توفیق دے۔

یوم العاشورہ یوم العید ہے یا یوم الحزن

ائمہ اہل بیت علیہم السلام سے جس قدر احادیث و روایات ہم تک پہنچی ہیں۔ اُن سب میں روزِ عاشورہ محرم کو یوم الحزن ہی قرار دیا گیا ہے اور اس کو یوم العید سمجھنے سے ممانعت کی گئی ہے اسی پر علمائے فریقین کا اتفاق ہے مگر افسوس ہے کہ اکثر شہروں میں عشرۂ محرم پر عوام اہل اسلام کا یہ طریقہ دیکھنے میں آتا ہے کہ مرد عورت نہا دھو کر عمدہ لباس پہنتے ہیں تعزیوں اور علموں کی سیر کو ایک تماشہ یا میلہ سمجھ رکھا ہے۔

مفتی اکرام الدین خاں سعادۃ الکونین میں بحوالہ صواعق محرقہ ابن حجر اور کتاب سفر السعادت شاہ عبدالحق محدث دہلوی لکھتے ہیں کہ ایام محرم میں تلاوت قرآن و حدیث و وظیفہ و درود میں مشغول رہنا چاہیئے محتاجوں اور مسکینوں کو کھانا کھلانا اور خیرات و صدقات کا مشغلہ رکھنا چاہیئے پھر آگے لکھتے ہوئے فرماتے ہیں کہ روز عاشورہ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ زیادہ پڑھیں اس دن کو روز عید سمجھنا مسلمانی سے بعید ہے۔ اس روز زینت و آرائش کرنا بالوں پر خضاب لگانا نئے کپڑے پہننا سرمہ لگانا پر تکلف کھانے عید کی طرح پکا کر گھر گھر تقسیم کرنا خوشی اور سرور کے سامان مہیا کئے جانا نہایت ہی بے جا فعل ہے۔ بلکہ

یزید کی پیروی ہے جس حدیث میں روز عاشورہ سرمہ لگانا آیا ہے وہ حدیث صحیح نہیں ہے۔

ہم حیران ہیں کہ قدوۃ السالکین محی الدین حضرت عبدالقادر جیلانی قدس سرہ نے مشہور کتاب غنیۃ الطالبین میں یوم عاشورہ کو کس طرح یوم العید قرار دیدیا۔ چنانچہ اس کی تمام عبارت تحت ذیل درج کی جاتی ہے۔ اس میں روز عاشورہ کے فضائل بیان کرتے ہوئے لکھا گیا ہے۔

ہم فضائل یوم عاشورہ میں سے یہ بھی بیان کرتے ہیں کہ اس روز حسین ابن علی رضی اللہ عنہ شہید کئے گئے۔ ام سلمہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ وہ فرماتی ہیں کہ آنحضرت میرے گھر تشریف رکھتے تھے کہ یکایک آپ کے پاس حسین آ گئے میں نے دروازے سے جھانکا تو دیکھا کہ حسین آپ کے سینہ پر کھیل رہے ہیں آپ کے ہاتھ میں تھوڑی سی مٹی ہے اور آنسو چشم مبارک سے جاری ہیں۔ جب حسین چلے گئے میں اندر گئی اور عرض کی کہ میرے ماں باپ آپ پر فدا ہوں میں نے دیکھا کہ آپ کے ہاتھ میں مٹی تھی اور آپ رو رہے تھے حضرت نے فرمایا جب میں حسین سے خوش ہوا اور وہ میرے سینہ پر کھیل رہا تھا میرے پاس جبرئیل آئے اور یہ مٹی دی جس جگہ حسین قتل کیا جائے گا اس لئے میں روتا ہوں خواجہ حسن بصری سے روایت ہے کہ سلیمان بن عبدالملک نے رسولخدا کو خواب میں دیکھا کہ آپ اس کو بشارت دیتے اور مہربانی فرماتے ہیں۔ جب صبح ہوئی تو اس نے حسن بصری سے تعبیر پوچھی حسن نے فرمایا شاید تو نے اہل بیت رسول اللہ کے ساتھ کوئی نیکی کی ہے سلیمان نے جواب دیا ہاں میں نے حسینؓ ابن علی کا سر خزانہ یزید ابن معاویہ میں رکھا ہوا پایا میں نے اس پر پانچ کفن دیباچے کے پہنائے جماعت کے ساتھ نماز پڑھی اور با اعزاز و احترام دفن کر دیا۔ یہ سن کر خواجہ حسن بصری نے سلیمان سے کہا کہ بے شک یہی وجہ

ہے کہ رسول خدا مجھ سے رضامند ہوئے اس جواب سے سلیمان بہت خوش ہوئے اور خواجہ کو انعام دیا۔

حمزہ بن زیات سے روایت ہے انہوں نے حضرت سرور عالم اور حضرت ابراہیم خلیل کو خواب میں دیکھا کہ دونوں حضرات قبر حسین پر نماز پڑھ رہے ہیں۔ ابو عمر نے اپنے باپ سے اور انہوں نے ابی اسامہ سے اور انہوں نے جعفر بن محمد کی سند سے ہم کو خبر دی ہے کہ قبر حسین بن علی پر جس روز کہ وہ شہید ہوئے ستر ہزار فرشتے اترے۔ اور ان پر روز قیامت تک روتے رہیں گے۔

ایک گروہ نے ان بزرگوں پر اور جو کچھ اس کے بارہ میں وارد ہوا طعنہ زنی کی ہے اس کا خیال ہے کہ یوم عاشورہ کو روزہ رکھنا بوجہ شہادت حسینؓ جائز نہیں۔ وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ اس روز بوجہ شہادت حسینؓ مسلمانوں میں عام رنج وغم ہونا چاہئے حالانکہ اس دن کو فرحت وسرور کا دن بناتے ہو عیال پر فراخی اور بہت کچھ خرچ کرنے فقیروں مسکینوں اور محتاجوں کو صدقہ دینے کا حکم دیتے ہو درآنحالیکہ یہ حسینؓ کے اس حق سے نہیں ہے۔ جو مسلمانوں پر ہے یہ کہنے والا خطا کار اور اس کا مذہب برا اور فاسق ہے۔ حالانکہ خدائے تعالیٰ نے اپنے نبی کے بیٹے کے لئے شہادت کے واسطے سب دنوں سے اشرف سب سے اجل اور سب سے ارفع دن اختیار فرمایا تاکہ حسینؓ کے درجوں اور بزرگیوں میں اس دن کی وجہ سے اور زیادتی وترقی ہو اور ان کو ان خلفائے راشدین کے مرتبہ تک پہونچا دے جو شہادت کے ساتھ قتل کئے گئے ہیں اگر ایسا ہوتا کہ حسینؓ کا یوم رحلت یوم مصیبت مانا جاتا۔ تو دوشنبہ کا دن اس کے زیادہ لائق تھا کیونکہ آنحضرتؐ اور حضرت ابو بکر صدیقؓ

نے اسی روز رحلت فرمائی تھی۔ جناب رسولخدا اور حضرت ابوبکر کا دنیا سے اٹھ جانا بتاتا ہے
روزوں کے بہت زیادہ ہے حالانکہ دوشنبہ کے دن کی بزرگی اور اس
دن کے روزہ کی فضیلت پر سب لوگوں نے اتفاق کر لیا ہے نیز یہ کہ اس روز
بندوں کے عمل پیش کئے جاتے ہیں اور جمعرات کے روز اٹھائے جاتے ہیں
اسی طرح یوم عاشورہ کو یوم غم نہ منانا چاہیئے اور جو دلیل ہم نے پیش کی ہے اس
کی رو سے تو یہی اولیٰ ہے کہ یوم عاشورہ کو یوم الحزن منانے کی جگہ یوم فرحت
وسرور قرار دینا چاہیئے کیونکہ ہم پہلے ذکر کر چکے ہیں کہ اسی دن خدا نے
اپنے پیغمبروں کو ان کے دشمنوں سے نجات دی ہے اسی دن ان کے کافر
دشمن فرعون وغیرہ کو ہلاک کیا ہے اسی روز آسمان و زمین اور دوسری اشیائے
شریف پیدا ہوئی ہیں اسی دن حضرت آدم اور دوسرے ان کے سوا مخلوق
کئے گئے اللہ تعالےٰ نے اس شخص کے لئے جو اس کا روزہ رکھے بڑا ثواب اور
بڑی بخشش گناہوں کا کفارہ اور برائیوں کا دور کرنا تیار رکھا ہے اس لئے
یوم عاشورہ بھی دوسرے ایام مبارک جیسے جمعہ اور عرفہ وغیرہ کی طرح بزرگ
ہوگیا اگر یہ دن یوم مصیبت ہی ہوتا تو صحابہ اور تابعین ضرور اسکو اختیار کرتے
کیونکہ وہ ہم سے بہت قریب اور زیادہ قربت خاص ہے حالانکہ ان سے عیال پر کھانے
میں فراخی اور اس دن روزہ رکھنے کی ترغیب ہی وارد ہوئی ہے۔

اسی کتاب کے صفحہ ۹۰ میں لکھا گیا ہے۔

"جو کوئی عاشورہ کے دن نہائے وہ سوائے مرض الموت کے اور کسی بیماری
میں مبتلا نہ ہوگا اور جو کوئی عاشورہ کے دن سرمہ لگائے تو اس تمام سال
اس کی آنکھ نہ دکھے گی اور جو کوئی عاشورہ کے دن کسی بیمار کی عیادت کرے تو
گویا اس نے تمام اولادِ آدم کی عیادت کی"۔

پھر صفحہ ۵۸ میں ہے۔

"اس دن اپنے عیال پر فراخی کرو جو کوئی اس دن اپنے عیال پر اپنے مال سے فراخی کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس پر تمام سال فراخی کریگا۔"

جب صاحب کتاب نے خود ہی تحریر کیا ہے کہ آنحضرت صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم جبریل سے شہادت حسین کی خبر سن کر گریاں ہوئے اور جب خود ان کا یہ بیان ہے کہ ستر ہزار فرشتے قبر حسینؑ پر قیامت تک روتے رہیں گے تو پھر خود ہی یوم فرح و مسرت کیونکر تسلیم کرتے ہیں بفرض محال یوم عاشورہ انبیائے سلف کے عظیم الشان واقعات کے باعث یوم برکت مان لیا جائے۔ حالانکہ اس کا کوئی ثبوت نہیں لیکن پچھلے واقعات کی اہمیت پہلے واقعات کی عظمت کو ہمیشہ کھو کرا دیتی ہے۔ بالفرض اگر دوسرے انبیا کو اس روز مصائب عظیمہ سے نجات ملی تو سید الانبیا کے گھرانے پر اس روز مصائب کا خاتمہ ہوا غنیہ کی اس طول طویل عبارت میں بہت کچھ جرح کی گنجائش ہے مگر ہم صرف اتنا لکھ دینا کافی سمجھتے ہیں کہ صوفیا میں کسی بزرگ کی رحلت بوجہ وصال محبوب حقیقی باعث مسرت و ابتہاج بھی جاتی ہے جیسا کہ عرسوں کے موقعہ پر دیکھا جاتا ہے یہ خیال بھی اسی نقطۂ نگاہ سے ہو سکتا ہے ورنہ طبقہ علما سے شاید ہی کسی محدث نے اس رائے سے اتفاق کیا ہو اور اس خاص روز کو جس دن خاندان رسالت کی تباہی و توہین انتہا کو پہنچ چکی تھی جو درحقیقت آنحضرت کی ہی تحقیر و تذلیل تھی یوم العید قرار دینے کی جرأت کی ہو۔

جو حدیثیں کتاب غنیہ میں فضائل عاشورہ کی تحریر ہوئی ہیں ان کو علمائے نقادین نے مکذوبات و موضوعات میں شمار کیا ہے صاحب لولوءالمرصوع نے لکھا ہے۔

"روز عاشورہ سرمہ لگانے زینت کرنے اور خوشبو لگانے کی جتنی بھی حدیثیں ہیں وہ سب کذابوں کی گھڑی ہوئی ہیں۔"

(لولوءالمرصوع مطبوعہ مصر صفحہ ۱۰۸)

امام عبدالرحمٰن شیبانی اپنی کتاب تمیز الطیب من الخبیث میں تحریر فرماتے ہیں حدیث :-
یعنے یہ حدیث کہ جو روز عاشورہ سرمہ لگائے تو اسے کبھی آشوب چشم نہ ہو۔ حاکم کہتے ہیں کہ منکر ہے ہمارے شیخ فرماتے ہیں بلکہ موضوع ہے اور ابن جوزی نے اس کو موضوعات میں وارد کیا ہے حاکم کہتے ہیں کہ سرمہ لگانے کی کوئی حدیث نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے مروی نہیں ایسا کرنا بدعت جو قاتلان حسین علیہ السلام کی نکالی ہوئی ہے۔

پھر بھی امام شیبانی اپنی اسی کتاب کے صفحہ ۱۷۶ میں لکھتے ہیں کہ حدیث :-
یہ حدیث کہ جو روز عاشورہ اپنے عیال پر فراخی کرے خدا تمام سال اس پر فراخی رکھے گا اس کی تمام سندیں ضعیف ہیں اور ابن جوزی نے اس کو موضوعات میں شمار کیا ہے۔

صواعق محرقہ صفحہ ۱۰۱ میں ابن حجر مکی نے اور شرح سفر السعادت میں حمید الدین فیروز آبادی نے لکھا ہے کہ جتنی حدیثیں فضائل روز عاشورہ میں مثل اس کے کہ اس روز حضرت آدم کی توبہ قبول ہوئی۔ حضرت نوح کی کشتی نے کوہ جودی پر قرار پکڑا۔ حضرت ابراہیم نے آگ سے نجات پائی حضرت اسمٰعیل کے لئے فدیہ آیا۔ حضرت یوسف نے قید سے نجات پائی وغیرہ وغیرہ بیان کی جاتی ہیں سب غلط ہیں کذابین نے وضع کی ہیں اسی طرح وہ تمام حدیثیں جو اس روز سرمہ لگانے غسل کرنے خوشبو لگانے یوم عید و سرور منانے اور اہل و عیال پر وسعت و فراخی کرنے کے بارہ میں بیان کی جاتی ہیں وہ سب گھڑی ہوئی ہیں۔ یہ بدعتیں قاتلانِ حسین کی ایجاد کی ہوئی ہیں ابن تیمہ اور ابن قیم نے صراحت کے ساتھ ایسی حدیثوں کو موضوع بتایا ہے۔
دیکھو شرح سفر السعادت شاہ عبدالحق محدث دہلوی صفحہ ۵۴۲ و ۵۴۳ علامہ مقریزی اپنی کتاب المواعظ والاعتبار مطبوعہ مصر جلد دوم صفحہ ۳۸۵ میں تحریر فرماتے ہیں۔
مصر کے خلفاء بنی فاطمہ روز عاشورہ کو غم کیا کرتے تھے اور اس روز بازار بند

کر دئے جاتے تھے اور ایک بڑا دسترخوان تیار کیا جاتا تھا جس کو سماط الحزن کہتے تھے اس میں سے بہت کچھ لوگوں کو بٹتا تھا۔ جب دولت فاطمیین پر زوال آیا اور صلاح الدین نے مصر پر قبضہ کیا تو اس نے اور اس کے خاندان بنی ایوب نے یوم عاشورہ کو خوشی منانی شروع کر دی اس روز وہ اپنے عیال پر فراخی اور ان کے کھانے میں وسعت کرتے تھے حلوے مٹھائیاں بناتے تھے نئے نئے برتن خریدتے تھے سرمہ لگاتے اور حمام جاتے تھے جیسا کہ اہل شام کیا کرتے تھے اس سنت کے موافق جو ان میں حجاج بن یوسف نے عبدالملک بن مروان کے عہد میں جاری کی تھی جس کی غرض یہ تھی کہ شیعیان علی ابن ابی طالب کرم اللہ وجہ کو جلایا اور ذلیل کیا جائے جو یوم عاشورہ کو یوم عزا مانتے اور حسین پر جو اس روز شہید ہوئے غم کرتے تھے۔

علامہ نورالدین علی بن عبداللہ السمہودی المتوفی ۹۱۱ھ اپنی کتاب جواہر العقدین میں بحوالہ درالسمطین حافظ جمال الدین محمد بن یوسف الزرندی ۷۵۰ھ تحریر فرماتے ہیں۔

حافظ جمال الدین محمد بن یوسف الزرندی روز عاشورہ کو بعض لوگوں کے افعال جیسے امور کے تذکرے کے بعد کہتے ہیں کہ یہ ان پچھلی قوم کے معارضہ کے طور پر ہے جنہوں نے اس دن کو عید قرار دے لیا اور فرح و سرور میں مشغول ہو گئے یا تو اس وجہ سے کہ وہ نواصب میں سے ہیں جنہیں حسین رضی اللہ عنہ اور ان کے اہل بیت سے تعصب ہے یا ان جاہلوں میں سے ہیں جو فاسد کا فاسد سے اور شر کا شر اور بدعت سے تقابل کیا کرتے ہیں لہٰذا انہوں نے (اس دن) خضاب لگانے نئے کپڑے پہننے سرمہ لگانے نان نفقہ کی توسیع اور عادت سے خارج کھانے پکانے وغیرہ جیسے چیزوں سے اظہار زینت کیا اور ایسے تمام مراسم ادا کرنے لگے جو عید کے موقعوں پر کرتے ہیں اور گمان کرنے لگے کہ یہ

سنت جاریہ ہے حالانکہ سنت اس کا ترک کرنا ہے کیونکہ اس معاملہ میں قابل اعتماد نہ کوئی خبر وارد ہوئی ہے اور نہ کوئی اثر و خبر صحیح ہے جس پر رجوع کیا جائے الخ۔ موصوف نے یہ بھی کہا کہ بعض اکابر علماء سے جو علم حدیث میں ممتاز اور علم اور بیان کے عالم تھے ان افعال پر یہ سوال کیا گیا۔ جو لوگ عاشورہ کے روز سرمہ لگانے غسل کرنے مہندی لگانے حلوے کھانے نئے لباس پہننے اور اظہار مسرت وغیرہ سے عمل میں لاتے ہیں تو انہوں نے جواب دیا کہ آنحضرت صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم سے کوئی صحیح حدیث اس بارہ میں وارد نہیں ہوئی نہ ان کے اصحاب سے نہ آئمہ مسلمین نہ ائمہ اربعہ وغیرہ میں سے کسی نے ان افعال کو مستحب قرار دیا ہے نہ کسی معتبر کتاب کے مصنف نے رسولخدا صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم نہ صحابہ نہ تابعین سے کوئی صحیح یا ضعیف حدیث روایت کی ہے اور بعض متاخرین سے جو یہ روایت کی گئی ہے کہ جو شخص یوم عاشورہ کو سرمہ لگائے اس کی آنکھ اس سال نہ دکھے گی جو غسل کرے گا وہ اس سال بیمار نہ ہوگا۔ اور جو اپنے عیال کے اخراجات میں اس دن کشائش اختیار کرے گا اللہ اس سال اسے کشائش رزق عطا کرے گا اور اسی قسم کی باتیں جن سے یوم عاشورہ کی فضیلت معلوم ہو جیسے حضرت آدم کی توبہ کی قبولیت کوہ جودی پر کشتی نوح کا استقرار آگ سے ابراہیم کی نجات ذبیح اللہ کے عوض مینڈھے کا فدیہ یعقوب سے یوسف کا پھر ملاقات کرنا اسی روز عاشورہ کو ہی تھا۔ یہ سب جھوٹ اور موضوع ہیں۔

علمائے عظام اہل سنت کی ہی ان تصریحات سے ثابت ہوگیا کہ یوم عاشورہ کو یوم عید قرار دینے کے متعلق تمام حدیثیں وضعی ہیں اس روز زیب و زینت بنی امیہ کی تقلید ہے۔ یہ تو ظاہر ہے کہ تصوف و طریقت کا سلسلہ شیعوں میں نہیں ہے وہ صرف اہل بیت رسالت

کے ائمہ اثنا عشر کے تولا اور ان کے احکام کی تابعی کو اپنی نجات کے لئے کافی سمجھتے ہیں وہ بفحوائے حدیث علماء اُمّتی کانبیاء بنی اسرائیل نفرا پر علماء کو ترجیح دیتے ہیں۔ ان کے خیال میں مجتہدین نائبانِ آئمہ ہیں اس لئے ان کی تقلید کو ضروری جانتے ہیں وہ مجاہدہ کو علم کو افضل سمجھتے ہیں۔ سعدی شیرازی نے بھی باوجودیکہ وہ شیخ شہاب الدین سہروردی کے مرید تھے اپنی مشہور کتاب گلستاں میں ایک مقام پر لکھا ہے۔

صاحبدلے بمدرسہ آمد زخانقہ — بشکست عہد صحبت اہل طریق را

گفتم میانِ عالم و عابد چہ فرق بود — تا کردی اختیار ازاں ایں فریق را

گفت او گلیم خویش بدر مےبرد زموج — ویں جہد می کند کہ بگیرد غریق را

شیعہ اگرچہ اہل سنت کی طرح اہل سلوک کے معتقد نہیں لیکن ان کو اس طبقہ کے کسی بزرگ سے کاوش بھی نہیں ہے اگر ہے تو صرف حضرت عبدالقادر جیلانی البغدادی کی ہے۔ حتیٰ کہ ان کے نسب میں بھی گفتگو کی جاتی ہے۔ صوفیائے کرام اور اہلِ سنت کے خواص وعوام میں جس قدر ان کو وقار حاصل ہے اسی قدر شیعوں کو ان سے بیزاری ہے اس کے برعکس وہ سب بزرگان طریقت کا احترام کرتے ہیں خصوصاً حضرت خواجہ معین الدین چشتی رحمۃ اللہ علیہ کی عزت ووقعت ان کے دلوں میں بہت ہے حالانکہ قادریہ ہوں یا چشتیہ سلسلہ طریقت وتصوف میں دونوں مساوی ہیں سلسلہ قادریہ کا ایک عمل برخلاف اہل چشتیہ شیعوں کے مطابق بھی ہے یعنی جس طرح سماع شیعوں میں حرام ہے اسی طرح جماعت قادریہ میں بھی ہے ہم جہاں تک غور کرتے ہیں خواجہ صاحب اجمیری کی صرف ایک رباعی

شاہ است حسینؑ و بادشاہ است حسینؑ — دین است حسینؑ دیں پناہ است حسینؑ

سر داد و نداد دست در دست یزید — حقا کہ بنائے لا الٰہ ست حسینؑ

نے ان کو شیعوں میں محبوب اور حضرت عبدالقادر جیلانی کی فقط مندرجۂ بالا تحریر نے مغضوب بنادیا ہے اس کے سوا اور کوئی وجہ نہیں پائی جاتی اس لئے دیکھنا یہ ہے کہ کتاب غنیۃ الطالبین

جس میں ماہ محرم کے فضائل بیان کرتے ہوئے یوم عاشورہ کو یوم فرح وسرور قرار دینے کی ہدایت کی گئی ہے۔ حضرت عبدالقادر جیلانی ثم بغدادی کی تالیف ہے بھی یا نہیں۔

شہرت عامہ کی بناء پر اب تک ہم بھی یہی سمجھتے تھے کہ یہ کتاب ان ہی جناب کی تصنیف ہے۔ لیکن ... میں علمائے عراق وشام ومصر نے ایک مبسوط رسالہ لکھ کر اس امر کا اعلان کیا ہے کہ غنیۃ الطالبین ان کی تصنیف نہیں ہے اور بہ کثرت داخلی وخارجی شہادتیں درج کر کے ثابت کیا ہے کہ یہ حضرت کی تصنیف نہیں ہو سکتی۔ اس رسالہ کو ہمارے ایک عزیز سید نہال احمد ایم اے ایل ایل بی (صاحب) نے فی الحال عالم پور ضلع رائچور وغیرہ مملکت محروسہ آصفیہ میں منصف ومجسٹریٹ ہیں حیدرآباد میں سید امیر حسن برادر نواب محسن الملک مہدی علی خاں کے کتب خانہ کے اندر بچشم خود دیکھا ہے اور اپنی کتاب تاریخ السادات امروہہ مطبوعہ اعظم سٹیم پریس بلدۂ حیدرآباد دکن میں اس کا حوالہ دیا ہے وہ تاریخ سادات امروہہ جلد اول کے صفحہ ۸۰۴ میں لکھتے ہیں کہ "اس رسالہ میں صدہا علمائے عراق و عرب وغیرہ کے دستخط اس امر کی تصدیق کے لئے دکھائے گئے ہیں کہ غنیۃ الطالبین حضرت غوث پاک کی تصنیف نہیں ہو سکتی۔ اور اس میں بعض وہ مضامین درج ہیں جو واضح طریقے سے حضرتِ غوثِ پاک کے مسلک اور ارشادات کے مخالف ہیں متقدمین میں بھی اکابر نے بعض بعض مقامات پر غنیۃ الطالبین کو ان کی تصنیف تسلیم نہیں کیا اور عصر حاضرہ کے علماء میں اکثر تعداد ان کی ہے جو اس کتاب کو ان جناب کی تصنیف نہیں مانتے مولانا عبدالماجد دریاآبادی وغیرہ نے حال میں اسی خیال کی تائید کی ہے۔

مولانا شاہ مراد صاحب مارہروی ماہواری رسالہ مولوی میں جو بابت ماہ ربیع الثانی ۱۳۵۲ھ ہجری دہلی سے شائع ہوا تھا حضرت عبدالقادر جیلانی رحمۃ اللہ علیہ کے حالات و تصنیفات کو لکھتے ہوئے غنیۃ الطالبین کی نسبت حسب ذیل ریمارک کیا۔

"کہا جاتا ہے کہ یہ کتاب حضرت غوث اعظم کی تصنیف ہے مگر بعض اکابر

دو واقفانِ اسرار نے اسے حضور کی تصنیف قرار دینے میں تامل کیا ہے اور وہ کہتے ہیں کہ صرف نام یک رنگی و یکسانی نے اس کتاب کو حضورِ غوثِ اعظم کی طرف منسوب کر دیا ورنہ یہ ایک اور شخص عبدالقادر حبیلی کی تصنیف ہے۔ اور جہاں تک ہمارا خیال پہنچ چکا ہے اور ہماری نظر کام کر سکی وہاں تک تو ہمارا خیال بھی یہی ہے کہ یہ تصنیف حضرت غوث اعظم کی تصنیف نہیں دقیقہ سنج اور باریک بیں اصحاب اسلوبِ بیان اور طرزِ عبارت سے ہی بیک نظر اس کا اندازہ لگا سکتے ہیں۔ غیر مقلدین نے اس کتاب کو بہت اہمیت دی ہے ہم نے غور کیا تو ہمیں بھی یہ شک گزرا اور ہمارا شبہ اس سے اور قوی ہو گیا کہ فتوح الغیب اور اس کتاب کی عبارت میں بعد المشرقین نظر آتا ہے اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ غوث اعظم کا اسے ہاتھ بھی نہیں لگا۔ ہمارے نزدیک کتاب بُری نہیں اگرچہ اس میں چند امور مابہ النزاع درج ہیں تاہم حضورِ غوث اعظم کا منصب بہت بلند تھا اور یہ کتاب ان کی لکھی ہوئی ہرگز نہیں ہو سکتی اس لئے ہم اس کتاب کو غوث اعظم کی تصنیف لکھنے کے لئے تیار نہیں اور جنھوں نے اس کتاب کو حضور کے نام سے منسوب بھی کیا ہے ہمارے نزدیک انھوں نے غلطی کی ہے اور یہ ان کی تحقیق دکاوش کی کوتاہی کا نتیجہ ہے۔"

ان تمام اقتباسات سے پایا جاتا ہے کہ یہ کتاب جس میں یوم عزا کو یوم مسرت قرار دیا گیا ہے اور وضعی حدیثیں بھر دی گئی ہیں جس کی وجہ سے شیعہ اس قدر ناخوش اور مخالف ہیں۔ اُن بزرگوار کی مرتبہ نہیں ہے جن کی طرف اس کو منسوب کیا جاتا ہے یہ تو ہر شخص بآسانی سمجھ سکتا ہے کہ متن عبارت میں ہی نمایاں تضاد و منافات موجود ہے یوم عاشورہ کی فضیلت بیان کرتے ہوئے شروع میں کہا گیا ہے کہ جبریلؑ نے مقتلِ حسینؑ کی مٹی آنحضرتؐ کو لا کر دی تو آپ روئے پھر چند سطر آگے بڑھ کر لکھا ہے کہ ستر ہزار فرشتے قبرِ حسینؑ پر قیامت تک روتے

کے لئے مامور کئے گئے ہیں اس کے بعد یہ بیان کہ یوم عاشورہ کو یوم مصیبت بنانے کی جگہ یوم نزہت و سرور قرار دینا چاہیئے کس قدر عجیب اور حیرت افزا ہے اس لئے ایسی تحریر ایسے بزرگ ... کا پایہ صوفیائے کرام اور اولیائے عظام میں سب سے بلند اور ارفع ہو بعید از قیاس معلوم ... ظاہر ہے کہ یہ کتاب کسی معمولی شخص کی ہے۔

حضرت غوث اعظم کے نام سے ایک فارسی دیوان بھی مشہور ہے لیکن درحقیقت وہ آپ کا نہیں ہے کسی دوسرے کا کلام ہے۔ صرف حضرت کے نام پر منسوب کر دینے سے آپ کا دیوان سمجھا جانے لگا ہے۔ مولوی عبدالحق بی۔اے سکرٹری انجمن ترقی اردو جو اس زمانہ میں تصانیف کے بہترین اور مسلمہ نقاد ہیں۔ انہوں نے رسالہ معراج العاشقین مرتبہ حضرت مخدوم سید محمد صاحب حسینی گیسو دراز پر جو دیباچہ لکھا ہے اس کے صفحہ ۵ پر صاف لکھتے ہیں:-

"قدیم سے یہ دستور رہا کہ لوگ اپنی تصانیف کو بعض مشاہیر اور نامور بزرگان دین سے منسوب کر دیتے ہیں چنانچہ حضرت معین الدین چشتی اجمیری اور غوث الاعظم جیلانی کے نام سے فارسی دو دیوان شائع اور رائج ہیں اسی طرح اور بزرگوں سے مختلف قسم کی کتابیں اور رسالے لکھ کر منسوب کر دئے گئے ہیں"

اس طرح ... صاف ہے جس طرح کسی نے فارسی دیوان لکھ کر آپ کی طرف منسوب کر دیا ہے یہی حالت غنیتہ الطالبین کی بھی سمجھی جا سکتی ہے کہ کسی اور نے لکھ کر آپ کے نام پر شایع کر دی ہے۔

عزاداری محرم اور اسکے فروعات پر آزادانہ رائے

دنیا کے عقلا نے قدیم زمانہ سے بنی نوع انسان کی تہذیب اخلاق کو تمدن کے لئے ایک ضروری امر خیال کر کے ہمیشہ اس کا اہتمام کیا ہے اس بارے میں جو ان کے زریں اقوال ہیں ان کو ہم اس جگہ نقل نہیں کر سکتے مگر ان عظیم الشان اقوام کے حالات پر غور کرنے

...ن کو تاریخی شہرت حاصل ہے یہ امر خود بخود واضح ہو جاتا ہے بے شک ان قوموں کے اخلاق
...ری نگاہ ڈالنے اور ان کی عبقتوں کا ٹھیک رُخ دریافت کرنے سے ہم کو صاف
... تہذیب ... اصول سے پورے واقف نہ ہوکر
... اصول ... بلندان ... بعض نے اخلاقی ... استعمال
... قوم کے ساتھ مخصوص رکھا اور دوسری قوموں کے مقابلہ میں رذائل کا ارتکاب
جائز قرار دیا۔ اس اصول کی جھلک ان قوموں میں نہایت وضاحت کے ساتھ نظر آتی ہے
جن کو دوسری قوموں پر تسلط و اقتدار قائم رہا ہے اس دعوے کی تائید میں ہمارے پاس
ایسے دلائل موجود ہیں جن کی کسی صورت سے تردید نہیں ہوسکتی چنانچہ اب بھی وہ قومیں جن کو
تہذیب و شائستگی پر بڑا ناز ہے اسی بلا میں مبتلا ہیں ظاہر ہے کہ ان لوگوں نے اخلاقی کمالات
کی نسبت تفریط کو جائز رکھا جس سے نہ دل کو سکون ہوتا ہے نہ وجدان کو طمانیت حاصل ہوتی
ہے اور نفوس اپنے فطری کمال کی طرف اپنی رفتار کا سلسلہ جاری نہیں رکھ سکتے۔ بعض نے
نفس کا زور توڑنے میں افراط سے کام لیا ہے اور اکثر رغبتوں اور خواہشوں کا فنا کر دینا لازمی
قرار دیا ہے اس بارہ میں افراط کے نتائج بھی اسی طرح تفریط سے کم ضرر رساں نہیں ہوتے۔
جس قوم کے افراد میں یہ مرض پھیل جاتا ہے اس کا نظام تمدن مختل اور اس کی شائستگی
کی عمارت منہدم ہو جاتی ہے۔

بے شک اعتدال کا اصول وہ عظیم الشان اصول ہے جس پر ہر چیز کا قوام اور ہر
شے کی ہستی منحصر ہے اگر اس دعوے کی تائید میں کسی دلیل کی ضرورت ہو تو تمام علوی اور
سفلی کائنات پر نظر کرنا چاہیئے زمین کے بسیط مادی ذرات سے لے کر آسمان کے بڑے اور
نورانی کُروں تک زبان حال سے پکار کر کہہ رہے ہیں کہ ان کا وجود صرف اعتدال پر قائم ہے
جس طرح ہر اک چیز کا کمال صرف اعتدال کی طرف منسوب ہوتا ہے اسی طرح اس کا اختلال
سوائے عدم اعتدال کے اور کسی طرف منسوب نہیں ہوسکتا مذہبی اور دنیادی معاملات میں

افراط و تفریط کے لحاظ سے تمام قوموں کی یہی حالت تھی کہ سب شاہراہ اعتدال سے بھٹکے ہوئے تھے کہ یکایک حقانیت کے آسمان سے اسلام کی روشنی نمودار ہوئی تاریکی کا وہ پردہ جو کمالات انسانی کے چہرہ پر پڑا ہوا تھا دور ہوا قرآن مجید کی تعلیم سے افراط و تفریط کرنے والوں کو ملامت کی اور ان کو دنیا و آخرت میں انجام کی خرابی سے ڈرایا اور اس بارہ میں نہایت حکمت کے ساتھ اعتدال کے اصول کو قائم کیا۔ اسلام نے ہم کو بالکل اجازت نہیں دی کہ مذہب کے غلو میں جو چاہیں گھڑ لیں۔ آنحضرت صلعم نے فرمایا کہ غلوئے مذہبی سے بچتے رہو کیونکہ تم سے پیشتر بہت سی قومیں اسی کی بدولت ہلاک ہو چکی ہیں اس لئے ہم کو اپنی خوشی سے اس میں افراط و تفریط کر لینا کسی طرح جائز نہیں۔ اسلام نے ہم کو اخلاقی و مذہبی معاملات میں ٹھیک ٹھیک اندازہ کی تعلیم دے کر ان کا حقیقی راستہ بتایا۔ تاکہ انسان نہ تو ایسا میٹھا ہو کہ لوگ اس کو کھا جائیں اور نہ ایسا کڑوا ہو کہ اسے تھوک دیں نہ اپنے خالق کو بھول کر دنیا کا ہی بندہ ہو جائے۔ عبادت کرنے میں رہبانیت و تبتل اختیار کر لے۔ یا اپنی خوشی و مرضی سے جس امر کو چاہے مذہبی رسم قرار دیکر ما فوق احکام خدا و رسول سمجھنے لگے۔

ہم اس کو تسلیم کرتے ہیں کہ انسان کے حس مشترکہ پر بہ مقابلہ ذہنیات کے مشاہدات و بدیہیات کا قوی اثر پڑتا ہے اور غالباً یہی وجہ ہے کہ دنیا کے تمام مذاہب میں کچھ نہ کچھ ظاہری اسباب جو ان کی پرستش و عبادت میں معین و محرک ہوں پائے جاتے ہیں اور کوئی مذہب خواہ وہ کیسی ہی سادگی پر مبنی ہو اس سے خالی نہیں لیکن اس کے ساتھ ہی ہم کو یہ بھی باور کر لینے میں تامل نہ ہوگا کہ اس قسم کے سامان ہمیشہ بعد کو زیادہ کئے گئے ہیں۔ ہر مذہب کی ابتدائی بنیاد جو اس کی حقیقت کی حقیقی روح تھی نہایت ہی سادہ دیواروں پر قائم ہوئی اور پھر بتدریج اس کے متبعین و معتقدین کی خوش اعتقادی نے اس سادگی کو رنگارنگ کے نقش و نگار سے ڈھک دیا۔ اس قلب ماہیت نے اگرچہ چند خوبیوں کا اضافہ کیا تو اس کے پردہ میں چند قباحتیں بھی پیدا ہو گئیں بعض تمدنی اور اخلاقی اوصاف کو نقصان پہونچا۔

اس کلیہ سے مذہب اسلام بھی جسے اپنے بے نظیر سادگی پر سب سے زیادہ ناز ہے نہیں بچ سکا اور وقتاً فوقتاً اس میں جو جو تکلفات و اختراعات اضافہ کئے گئے ان کا اعادہ تحصیل حاصل ہے اسلام کے اور فروعاتِ مخترعہ سے ہم کو اس وقت بحث کرنا منظور نہیں۔ صرف عزاداری کے متعلق چند ضروری باتوں کا اظہار مقصود ہے۔

ہماری اس تحریر سے یہ نہ سمجھ لینا چاہیئے کہ ہم مصائبِ مظلوم کربلا (روحی لہ الفدا) پر حزن و اندوہ اور گریہ و بکا کو مکروہ جانتے ہیں گفتگو اس میں ہے کہ جن رسوم و اختراعات کو ہم نے داخل عزاداری کر دیا ہے اور ان ہی کو عمل میں لا رہے ہیں اور حقیقی عزاداری سمجھے ہوئے ہیں کیا فی الواقع یہی ایک جانِ عزاداری ہے اس میں کسی طرح کا شک و شبہ نہیں کہ یہ سب باتیں رفتہ رفتہ ایجاد ہو کر بتدریج جزوِ عزاداری ہوئی ہیں، ہر صوبہ بلکہ ہر شہر و قریہ میں اپنے اپنے مزاج کے موافق عزاداری میں تفرقہ ہوتا گیا تکلفات کے ساتھ نمود و نمود کے ساتھ اسراف بڑھتا گیا عزاداری کی اصلی سادگی اور سچی خوش اعتقادی مردہ نہیں تو نیم مردہ ضرور ہو گئی عزاداری کی یہ رسمیں جو وقتاً فوقتاً اضافہ ہوتی رہیں ممکن ہے کہ پچھلی پاکیزہ خیال اور خوش اعتقاد نسلوں پر حزن و ملال کا اثر ڈالتی ہوں اور اس اضافہ کی جو علتِ غائی تھی وہ پوری ہو جاتی ہو مگر اب زمانہ دوسری روش پر چل رہا ہے۔ مذہبِ اسلام کی تمام اعتقادی اخلاقی علمی اور عملی خوبیاں پچھلے پاؤں ہٹ رہی ہیں۔ حریت اور دہریت کا بھوت سروں پر سوار ہے۔ اسلام کے قدم سے مقدم رکن سبک ہوتے جاتے ہیں۔ ایسے پرآشوب زمانہ میں عزاداری کی یہ رسمیں صرف ایک کھیل اور تماشہ رہ گئی ہیں جن سے وہ اصلی مقصود جو ان کے اجراء کے وقت ملحوظ رکھا گیا تھا جیسا کہ چاہیئے حاصل نہیں ہوتا گویا مرجا ؤسا دھا اور پرانی لکیر کو پیٹنا رہ گیا ہے پھر کیوں نہ اصولِ اعتدال کو قائم کیا جائے اور عزاداری کو ان طریقوں سے جو ائمہ اطہار کے معمول تھے اور وہی اس غم کی حقیقی روح ہیں عمل میں لایا جائے۔ اگر ذاکر اہل بیتِ نبوت کے سچے حالاتِ مصائب بلا تکلف و تصنع بیان کرے اور سامعین

خصوصیات سے سماعت فرمائیں تو کیا اس سے وہ اصل مقصد حاصل نہیں ہو سکتا کیا جب تک آنکھوں کے سامنے تعزیہ علم ضریح ممبر اور جھاڑ فانوس نہ ہوں رقت نہیں ہو سکتی۔ کیا جب تک نوبت نقارہ نہ بجے تاشہ نہ ہو قلب پر چوٹ نہیں لگتی۔ واقعہ ہائلہ کربلا اور سانحہ شہادت معلوم ہو جائے تو وہ ایسا رقت خیز حادثہ ہے جس کی دردانگیز کیفیت اپنی نظیر آپ ہی ہے۔ اور جو حزن و تاثر دل ہلا دینے والا جذبہ قدرت نے اس کو بخشا ہے وہ ایک ایسا معجزہ ہے کہ جب تک دنیا میں دین محمدی ہے اس کا اثر باقی رہے گا۔ ممکن ہی نہیں کہ حسین اہل بیت سے محبت اہل بیت ہو واقعہ کربلا کو سن کر اس پر چوٹ نہ لگے۔ ایسا ہو ہی نہیں سکتا کہ سچے مسلمانوں کی آنکھ ان مصائب پر اشک نہ بہائے۔ پھر ان تکلفات و رسمیات کی ضرورت ہی کیا ہے نام کو تو عزاداری کرنا اور اس کے پردہ میں فضول و نامشروع حرکات کا عمل میں لانا بالکل اس مصرعہ کا مصداق بنانا ہے ؎

غم کریں حسین کا نہیں حسن پورہ

امام باڑوں کی زیبائش و آرائش ہانڈی جھاڑ فانوس آئینہ وغیرہ آلات شیشہ سے اس طرح کی جاتی ہے کہ ان کو عزاخانہ یا غم کدہ کہنے کے بجائے محفل خانہ یا عشرت کدہ سمجھا جا سکتا ہے روشنی کا انتظام خاص طور پر ضروری اور تکلفات میں ایسے اہتمام کیے جاتے ہیں جس طرح خوشی و مسرت کے بڑے جشن پر عمل میں لائے جاتے ہیں۔ گایا بھی جاتا ہے مٹھائیاں بھی تقسیم کی جاتی ہیں بعض مقامات پر امام باڑوں میں نوبت کا بجنا بھی لازمی ہے۔ ہم نہیں سمجھ سکتے کہ ان اسباب مسرت و سرور کو عزا سے کیا تعلق ہوا اگر کسی کا کوئی عزیز مرتا ہے تو کیا وہ اظہار رنج و غم کی نمائش تکلفات کے سامانوں سے اپنے گھر کو سجانے مجلس سماع قائم کرنے مٹھائیاں بانٹنے اور نوبتیں بجوانے سے کرتا ہے یہ سب باتیں تو خوشی کی تقریبات پر دیکھنے میں آتی ہیں عزاخانہ تو درحقیقت اسی کو کہا اور سمجھا جا سکتا ہے جہاں یہ سامان جو خوشی سے مخصوص ہیں موجود نہ ہوں اور سادگی و حزن و ملال کے وہ اسباب مہیا کیے جائیں

جو قلوب پر اثر انداز سمجھے جائیں نہ حقہ ہو نہ پان نہ شیرینی نہ نوبت نقارہ سامعین آکر بادب بیٹھیں (جوتیاں بغل میں دبائے ہوئے امام باڑہ میں نہ آئیں حتی الوسع سر برہنہ ہوں۔ ذاکر بیان مصائب کے وقت افراط و تفریط کو کام میں نہ لائے اور اس اجتماع کا مآل کار حاصل ہو۔

اصل محرم دس تاریخ سے شروع ہوتا ہے کہ اس روز اور اس کے بعد اہل بیت پر جو مصائب کوفہ اور دمشق میں گزرے وہ تاریخ عالم کے نہایت درد انگیز واقعات ہیں۔ مراسم عزاداری سات محرم سے شروع ہو کر کم سے کم ۱۴ محرم تک ہونی چاہیئے تھیں۔ مگر حساب برعکس ہے کہ یکم محرم سے شروع ہو کر دس کو ختم اور تعزیہ خوانی بند۔

۱۰ تاریخ جو اس عزا اور مصیبت کا خاص دن ہے تعزیہ اٹھائے جاتے ہیں اور تابوت نکالے اور بس حالانکہ یہی دن اہل بیت کے لئے نمونہ قیامت تھا لازم تو یہ ہے کہ اس روز طلوع آفتاب سے غروب کے وقت تک مجالس غم برپا ہوں تمام واقعات کو مسلسل از اول تا آخر بیان کرتے ہوئے عصر کے وقت جو حضرت کی خاص شہادت کا وقت ہے ختم کیا جائے تاکہ حاضرین و سامعین ان تمام غم انگیز واقعات کی یاد تازہ کر لیا کریں جو اس روز ظہور میں آئے۔

محرم کی دسویں شب اہل بیت کے لئے سخت مصیبت کی رات تھی صلح و آشتی کی تمام امیدیں منقطع ہو چکی تھیں مرد اپنی جانوں سے مایوس ہو چکے تھے عورتوں میں کہرام برپا تھا۔ صبح کو ان کے وارث میدان کارزار میں تلواروں سے ٹکڑے ہونے والے تھے۔ اور آئندہ جو مصیبتیں پیش آنی والی تھیں ان کا خوفناک منظر آنکھوں کے سامنے تھا۔ تمام رات مردوں نے عبادت میں اور عورتوں نے بحالت مایوسی گریہ و بکا دعاؤں اور مناجاتوں میں گزاری۔ مگر ان کے نام لیوا کیا کرتے ہیں امام باڑوں کی صحنچیوں کا عزاخانہ کہا جاتا ہے خوب تزئین اور آرائش کی جاتی ہے چراغاں اور روشنی کا اہتمام کیا جاتا ہے۔ مرد عورت بے حیلہ

زیارت اِدھر اُدھر پڑے پھرتے ہیں ناشائستہ حرکات بھی عمل میں آتی ہیں نہ مجلسیں ہیں نہ عبادت اب کچھ عرصہ سے دس تاریخ کا دن گزر کر گیارھویں شب کو شامِ غریباں کے نام سے مجالس کا اضافہ ہوتا ہے۔ سب مومنین ننگے سر یا برہنہ آتے ہیں نہ فرش ہوتا ہے نہ روشنی گیارہ کی شب کے واقعات بیان کئے جاتے ہیں مگر یہ فرق ہے یہ بھی خالی نہیں مجلس کو زیادہ مؤثر بنانے کے لئے اہل بیت کے واسطے کھانا اور پانی لانے کا منظر دکھایا جاتا ہے۔ زوجہ حُر کھانا لاتی ہے۔ حالانکہ زوجہ حُر کا کربلا میں وجود ہی نہ تھا۔ حر بہ حیثیت ایک رسالہ کے افسر کے راستہ روکنے کے لئے اثنا راہ سے ہی حضرت کے ہمراہ تھے اور دس محرم کو فوج مخالف سے جدا ہو کر حضرت کی خدمت میں حاضر ہو گئے تھے عورتوں کا وہاں کام کیا تھا۔

اکثر یہ دیکھا جاتا ہے کہ بعض لوگ خصوصاً عورتیں اپنے بود و باش کے ہی مکان میں امام باڑہ کے نام سے ایک مختصر حصہ مخصوص کر کے وہاں علم رکھ لیتے اور عزاداری کرتے ہیں۔ باقی سب گھر یا وہ حصہ بھی بارہ مہینہ سب ضروریات کے لئے وقف ہے۔ اس میں خرابی یہ ہے کہ نہ ادب ہے نہ احترام جو مکان عزاخانہ کے طور پر مخصوص کر دیے گئے۔ وہاں تو ذکر حسین کے سوا دنیا کا کوئی کام ہی نہ ہونا چاہئے۔ اس کا احترام اسی طرح لازم ہے جیسا کہ مسجدوں کا کیا جاتا ہے۔ مسجدوں کی حرمت کیوں ہے صرف خدا کے نام پر منسوب ہو جانے سے وہاں فقط نماز پڑھنے کا حکم ہے اور کسی کام کی اجازت نہیں اسی طرح امام باڑہ بھی جب حسینؑ کے نام سے منسوب ہے تو اس کا ادب واحترام بھی بارہ مہینہ ضرور ہے حسینؑ کے عزاخانہ اور عام لوگوں کی سکونت کے مقاموں پر جن میں ہر طرح کے دنیاوی بُرے بھلے کام ہوں رتبہ یکساں کیونکر ہو سکتا ہے۔ ایسے مقاموں پر امام باڑہ کا اطلاق ہونا ہی نہ چاہئے۔ امام باڑہ وہی ہو سکتا ہے جو محدود و محفوظ اور الگ مقام ہو۔

ہم اپنی اس آزادانہ رائے کا بھی اظہار ضروری خیال کرتے ہیں کہ اب مجالس عزا کی اصلاح کی جائے اور ان کو ان مقاصد کی صحیح تبلیغ کا ذریعہ بنایا جائے جن کے لئے سید الشہدا

ـــــ نے عدیم النظیر قربانیاں کیں ان اصول کو مدنظر رکھا جائے تو نہ صرف یہ کہ تعلقات بین المسلمین کی بہت بدمزگیوں کی سوتیں بند ہو جائیں بلکہ دنیا میں اسلام کے اہم اصول کی نشر واشاعت کے لئے راستے کھلنے لگیں جو واعظین مجلس عزا کو مجلس مناظرہ کر دیتے ہیں اور مسلمانوں کے فرقوں کے مابین کراہت و نفرت کے جذبات کو برانگیختہ کرتے ہیں وہ حضرت کے مقصد کی ہر دلعزیزی کو صدمہ پہنچاتے ہیں۔

اب مجالسوں کو مذہبی مناظروں کا اکھاڑہ اور شاعرانہ محفلوں کی حیثیت سے بزم مشاعرہ نمونہ ہونا گوارا نہیں کیا جا سکتا۔ مجالس عزا اخلاقی ادارے ہیں نہ مناظروں کے دنگل اور مشاعروں کے ست۔

ایک اور بات بھی قابل غور ہے جس طرح آج کل کے مقررین وذاکرین نے ان مجالس مقدسہ میں دوسرے اسلامی فرقوں کے دل آزار اور غیر ضروری مباحث کو تقریباً لزوم کی صورت میں اختیار کر لیا ہے اسی کے ساتھ اب عام طور پر ایسے موقعوں میں خواہ وہ مجالس عزا ہوں یا محافل میلاد درود شریف کے نعرے لگائے جاتے ہیں اور ذاکرین کی باربار فرمائش ہوتی ہے مومنین نعرۂ صلوٰۃ۔ پھر تاکید ہوتی ہے با آواز بلند نعرۂ صلوٰۃ اور پھر فرمایا جاتا ہے اور زیادہ بلند آواز سے حاضرین وسامعین خود بھی اور ان کی فرمائش سے بھی نعرہ ہائے درود کا اعادہ کرتے ہیں اس میں کوئی شک وشبہ نہیں کہ یہ عمل بہترین حسنہ موجب جزائے عظیم اور فرمان ایزدی اِنَّ اللّٰہَ وَمَلٰٓئِکَتَہٗ یُصَلُّوْنَ عَلَی النَّبِیِّ۔ یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا صَلُّوْا عَلَیْہِ وَسَلِّمُوْا تَسْلِیْمًا" کی تعمیل ہے اور ایسے مواقع پر یہ عمل اور اس کی تکرار ضرور ہونی چاہیئے اور جس قدر زیادہ ہو بہتر اور باعث ثواب عظیم ہے لیکن یہ بھی سمجھ لینا چاہیئے کہ یہ معاملہ ایسا سہل اور معمولی نہیں جیسا کہ عام طور پر لوگوں نے خیال کر لیا ہے بلکہ نہایت اہم اور شدید ترین نزاکت کا حامل ہے درود شریف کا مختصر جملہ برزخ کی حیثیت رکھتا ہے۔ اگر اسے صحیح طور پر ادا کیا جائے تو قبالۂ بہشت

اگر غلط طور پر استعمال کیا جائے تو دستاویز جہنم صرف ایک حرف "ص" کے ادائے تلفظ کا پھیر ہے اگر ٹھیک طریقے سے پڑھو تو ذریعہ ایمان اگر "س" کے لہجہ سے کہا جائے تو کفر بلکہ شدید ترین کفر اگر لفظ "صل" کی صاد کو قاعدہ مقررۂ قرأت سے ادا کیا جائے تو معنے ہوں گے۔ اے خدا درود بھیج محمد و آل محمد پر اگر س کے تلفظ سے بجائے "صَل" کے "سَل" کے زبان سے نکلے تو اس کے معنے ہوں گے اے خدا تلوار کھینچ...... معاذاللہ بتائیے اس سے زیادہ گستاخانہ بے ادبانہ اور صریح کافر اور جہنمی بنانے والا کلمہ اور کیا ہو سکتا ہے۔ اب غور طلب یہ بات ہے کہ ایسے موقعوں پر جو لوگ درود شریف کو آہستہ یا بالجہر پڑھتے ہیں۔ اُن میں مذکورۂ بالا اہم حالت کو جاننے والے اور سمجھنے والے کتنے ہوتے ہیں۔ ہمارے خیال میں زیادہ تعداد تو ایسے سامعین ہی کی ہوتی ہے جن کو اس کی صحت و غیر صحت "ص" اور "س" کے ادا کرنے کا فرق معلوم ہی نہیں نہ ان کو اس کا احساس ہے کہ ہماری زبان سے کیا ادا ہو رہا ہے اور کس خطرناک گستاخی کا ارتکاب کیا جاتا ہے خصوصاً جاہل ناواقف لڑکے اور بچے زیادہ شور مچاتے ہیں اور مجمع میں لفظ "صل" کا "ص" کے ساتھ صحیح تلفظ ادا کرنے والے جس قدر ہوتے ہیں اسی قدر "س" کے ساتھ تلفظ زبان سے نکالنے والے بلکہ زیادہ جس وقت "صل" کے ساتھ ہی "سل" کے شور کی آوازیں ہمارے کان میں آتی ہیں تو بدن کانپنے لگتا ہے کس قدر حیرت کی بات کہ جو لوگ اس امر کو سمجھے ہوئے ہیں۔ وہ ناواقفوں کو اس نزاکت سے متنبہ کیوں نہیں کرتے واعظین و ذاکرین تاکیداً درود شریف کا حکم تو دیتے ہیں لیکن اس فرض کو ادا نہیں کرتے کہ ناواقف لوگوں کو آگاہ کر دیا کریں اور بچوں کو شور نہ مچانے دیں۔ اگر یہ کہا جائے کہ جو سامعین اور بچے اس باریک نکتہ کو نہیں سمجھتے۔ وہ عنداللہ قابلِ مواخذہ نہیں تو ہم عرض کریں گے کہ کیا اس طرح درود مقدس کو کلمہ توحید و کفر بنا دینا جائز ہو سکتا ہے یہ بات کوئی معمولی نہیں اور اس کو سرسری اور ناقابل اعتنا نہ سمجھئے۔

عرفی مشتاب ایں رہ نعت است نہ صحرا است — آہستہ کہ رہ بر دم تیغ است قدم را

جو لوگ نماز کے ایک جملہ اور قرآن مجید کی ایک آیت کے بھی معنی اور مفہوم کو بھی نہیں سمجھ سکتے لیکن نمازیں پڑھنے کلام خدا کی تلاوت کرتے اور دعاہائے ماثورہ کا وِرد رکھتے ہیں تو کیا نہ سمجھنے کی صورت میں ان کے یہ اعمال بے سود بے معنے اٹھک بیٹھک کی ورزش اور بے نتیجہ تضیع اوقات سمجھے جاسکتے ہیں نہیں وہ سمجھیں یا نہ سمجھیں ان کے معنے و مطالب کا اثر اپنی جگہ پر قائم رہے گا۔

آخر میں ہماری ایک گذارش اور سن لیجئے جو بڑی حد تک ضرور قابل توجہ ہے۔ ہندوستان میں جس طرح مساجد۔ منادر۔ مقابر۔ مدارس وغیرہ کے مصارف کے لئے اوقاف ہیں اسی طرح عزاخانوں اور رسوم عزاداری ادا کرنے کے لئے بھی چھوٹی بڑی صدہا جائدادیں ہیں۔ جو نیک نیت واقفین نے حصول ثواب کی غرض سے وقف کی ہیں لیکن یہ حقیقت عالم آشکارا ہے کہ محدود و معدود حضرات کے سوا اکثر و بیشتر متولی صاحبان اوقاف کی جائدادوں کو موروثی ترکہ اور ذاتی ملکیت سمجھ کر اسے بھی اپنی ضرورتیں پوری کرنے میں دلیر اور بیباک ہیں درحالیکہ وقف کا ایک پیسہ بھی اس کی ضروریات کے سوا حرام مطلق اور باعث وبال آخرت ہے یہ کام سخت ذمہ داری اور جوابدہی کا ہے۔ اس خدمت کے لئے خلوص صدق نیک نیتی ایمان داری اور ایثار کی سخت ضرورت ہے ذراسی لغزش سہل انگاری اور فتور نیت مواخذۂ آخرت کے لئے کافی ہے۔ سرکاری عدالتوں میں (جن کے کنٹرول میں یہ اوقاف ہیں) حسابات اکثر فرضی داخل ہوتے ہیں لیکن اس طرح عالم الغیب محاسب حقیقی کی باز پرس سے بچاؤ نہیں ہو سکتا یہ بھی واضح رہے کہ یہ ذمہ داری صرف متولی صاحبان تک ہی محدود نہیں بلکہ اس مقام کے تمام مسلمان خصوصاً شیعہ حضرات بھی ذمہ دار اور عنداللہ جوابدہ ہیں کیونکہ غیر محتاط متولیوں کے ناجائز دست برد سے حسین کے مال کی نگرانی و حفاظت کا فریضہ فرداً فرداً سب پر یکساں عائد ہوتا ہے اس ذمہ داری کو

معمولی اور سہل نہ سمجھنا چاہیئے بلکہ جہاں جہاں اوقاف ہیں وہاں انجمنیں قائم ہو کر مداخل ومخارج کی نگرانی اور سامان اور حسابات کی جانچ پڑتال رہنی چاہیئے۔ صرف ایک فرد یا چند اشخاص کو ہی بُرائی بھلائی کا ذمہ دار اور جوابدہ سمجھ کر اوران کا اپنے دامنوں کو بچانا یا رشتہ داری یا دوسرے تعلقات کی بناء پر چشم پوشی کرنا یا اس کو بے کار اور دوسری جان کر گریز کرنا اعانت مجرم کی برابر خدائی عدالت میں مستلزم السزا ہے۔ دیکھو قانون الٰہی کی دفعہ مندرجہ تعاونوا علی البر والتقویٰ ولا تعاونوا علی الاثم والعدوان واتقوا اللہ ان اللہ شدید العقاب۔ ایک شخص یا چند کارکن جبینی مال میں خیانت مجرمانہ کی مرتکب ہوں یا وقف کی رقم کو کسی غیر متعلق یا غیر ضروری کام میں صرف کریں اور دوسرے حسین کے نام لیوا صرف تماشہ دیکھیں اور دانستہ اغماض کر جائیں یا ہاں میں ہاں ملا کر عملاً وقولاً اُن کا ساتھ دیں تو یہ اعانت جرم نہیں تو کیا ہے۔

یزید کی بابت اسلامی دنیا کی رائے

یزید کی نسبت دنیائے اسلام کے خیالات مختلف ہیں اگرچہ عموماً علما و محدثین اس کو فاسق و فاجر بلکہ زندیق و مرتد اور بعض اس کو دائرۂ اسلام سے خارج سمجھتے ہیں۔ تاہم کچھ ایسے حضرات بھی ہیں جنہوں نے باوجود ان ملعونانہ حرکات کے جو اس سے سرزد ہوئی ہیں اس کو نہ صرف مسلمان بلکہ جائز جانشین رسول اللہ تسلیم کر کے اس کے ڈیفنس میں سرگرمی کی حصہ لیا خصوصاً علامہ ابن تیمیہ نے تو یزید کی حمایت کرتے ہوئے اپنی کتاب منہاج السنۃ کے بہت سے ورق سیاہ کر ڈالے۔

لا یجوز لعن یزید ولا تکفیرہ فانہ جملۃ المومنین وامرہ الی مشیتہ اللہ۔	یزید پر لعنت کرنی اور اس کی تکفیر جائز نہیں کیونکہ وہ مومنین میں داخل ہے اور اس کا امر مشیت ایزدی سے متعلق ہے۔

ملا علی قاری شرح بد الآمال میں تحریر کرتے ہیں۔

اِنَّ الامر بقتال الحسین بَلْ قتلہٗ لیس موجب اللعنۃ علیٰ مقتضی مذھب اھل السنۃ	امام حسین کے قتل کا حکم دینا بلکہ ان کا قتل ہی موافق مذہب اہل سنت لعن کا موجب نہیں ہے۔

علامہ ابن حجر ہیتمی مکیہ شرح قصیدہ ہمزیہ میں لکھتے ہیں۔

قال الابن العربی المالکی لم یقتل یزید الحسین الا بسیف جدہٖ	ابن عربی مالکی کا قول ہے کہ یزید نے حسین کو ان ہی جد کی تلوار سے قتل کیا ہے۔

پھر آگے چل کر اسی کتاب میں لکھتے ہیں۔

قول بعضھم لا الزام علی قتلۃ الحسین لانھم قتلوا بسیف جدہ الآمر بسلہ علی البغاۃ وقتالہم۔	بعض علماء کا قول ہے کہ قاتلانِ حسینؓ کو سرزنش و ملامت درست نہیں کیونکہ قاتلین نے امام حسینؓ کو اُن ہی کے جد کی تلوار سے

قتل کیا جو اس بات کے آمر تھے کہ باغیوں پر تیغ کشی اور ان سے جنگ کی جائے۔

انہ کان مسلماً ولم یثبت عنہ ما تخرجہ عن کونہ مومناً۔	یزید مسلمان تھا اور اس کی نسبت کوئی بات ایسی ثابت نہیں ہوئی جو اس کو دائرۂ ایمان

سے خارج کردے۔

پھر آگے ارشاد ہوتا ہے کہ:۔

ولا یخفی ان ایمان یزید محقق ولا یثبت کفرہ۔	ظاہر ہے کہ یزید کا ایمان ثابت ہے اور اس کا کفر پایۂ ثبوت کو نہیں پہنچا۔

صرف یہی نہیں بلکہ بعض ائمہ مذہب نے یزید کو خلفاء اثنا عشر منصوص علیہم میں داخل کیا ہے۔ چنانچہ ملا علی قاری شرح فقہ اکبر میں امام جلال الدین سیوطی تاریخ الخلفاء میں اور حافظ ابن حجر عسقلانی فتح الباری میں صاف صاف لکھتے ہیں کہ جناب ختمی مآب ؐ کے

بارہ خلفاء یہ حضرات ہیں۔

ابوبکر بن قحافہ۔ عمر بن خطاب۔ عثمان بن عفان۔ علی ابن ابی طالب۔ معاویہ بن ابی سفیان۔ یزید ابن معاویہ۔ عبدالملک بن مروان۔ ولید ابن عبدالملک سلیمان ابن عبدالملک۔ ہشام بن عبدالملک۔ یزید ابن عبدالملک اور عمر ابن عبدالعزیز۔

مولوی محمد حسن سنبھلی حاشیۂ عقائد نسفی میں تحریر فرماتے ہیں۔

الظاہر صحۃ خلافۃ یزید ابن معاویۃ علی ما اذا اجرہ البعض علی تواتر است خلافۃ امام عدل لہ فلو فرض عند انعقاد امامتہ لم یضرہ فضلاً عما بعدہ۔

خلافت یزید ابن معاویہ کی صحت جیسا کہ بعض کی رائے ہے اس تواتر سے ظاہر ہے کہ امام برحق معاویہ ابن ابی سفیان نے اس کو اپنا ولی عہد مقرر کیا لہٰذا اگر یہ بھی فرض کیا جائے کہ یزید انعقاد بیعت کے وقت فاسق تھا۔ تب بھی امامت یزید کو کوئی ضرر نہیں پہنچا چہ جائیکہ بعد خلیفہ ہونے کے اس کا فسق ظاہر و ثابت ہو تو اس کی امامت و خلافت کو کیا نقصان پہونچ سکتا ہے۔

اس زمانہ کے سب سے بڑے خیر خواہ یزید مرزا حیرت دہلوی کا قول بھی سنئے۔ آپ فرماتے ہیں۔

"یزید کی معاشرت پر اسلامی دنیا میں بالکل پردہ ہے شیعہ علمائے نے چند بے جوڑ باتیں اس کی نسبت مشہور کر دی ہیں جس پر تمام دنیا نے اتفاق کر لیا ہے"

عہد حاضرہ میں بعض ایسے نیک گمان حضرات بھی موجود ہیں جو حضرت یزید رحمۃ اللہ علیہ یا حضرت یزید رضی اللہ تعالٰے عنہ یا حضرت یزید علیہ السلام فرمایا کرتے ہیں اور ان کا اسلامی جذبہ اور دینی حرارت اس بات کو گوارا کرنا پسند نہیں کرتی کہ یزید جیسے مقدس اور نیک اعمال شخص کے متبرک نام کو بغیر کسی تعظیمی لفظ کے زبان پر لائیں۔

اب ہم اُن علمائے کرام کے اقوال کو نقل کرتے ہیں جنہوں کے یزید کے معائب و ذمائم کی

قلعی کھولی۔ سب سے اول خود یزید کے بیٹے معاویہ کا وہ خطبہ ہی لیجئے جس میں اس نے اپنے پدر ناستودہ سیر کے معائب علی الاعلان بیان کر کے کاروبار سلطنت سے کنارہ کشی اختیار کی تھی چنانچہ علامہ ابن حجر نے صواعق محرقہ میں معاویہ ابن یزید کا جو خطبہ نقل کیا ہے اس میں ذیل کے فقرے قابل غور ہیں۔

ثم قلوا بی الامر وکان غیر اھلہ ونازع ابن بنت رسول اللہ ص فقصف عمرہ وابتر عقبہ وصار فی قبرہ رھینا بذنوبہ ومن اعظم الامور خسارۃ علینا۔ بسوء مصرعہ وبئس منقلبہ وقد قتل عترۃ رسول اللہ واباح الخمر وحرب الکعبۃ ولم اذق حلاوۃ الخلافۃ۔

اس کے بعد میرے باپ نے یہ امر اختیار کیا۔ اور اس نے بنت رسول اللہ کے فرزند کے ساتھ نزاع کی اور ان کی حیات کو منقطع کر دیا اور ان کے تمام اعقاب کو مستاصل کر ڈالا وہ اپنی قبر میں اپنے گناہوں کی سزا بھگت رہا ہے اس کو زیادہ ہمارے خسارہ کا اور کیا امر ہوگا اور اس کی پاداش اور بری سزا سے بڑھ کر اور کس کی سزا ہوگی کہ اس نے عترت رسول اللہ ص کو قتل کیا۔ شراب کو مباح کیا خانۂ خدا کو غارت کیا اور اس خلافت کا کوئی مزانہ اُٹھایا۔

امام سیوطی تاریخ الخلفا میں لکھتے ہیں:۔

وکان سبب خلع اھل المدینۃ ان یزید اسرف فی المعاصی واخرج الواقدی من طرق ان عبد اللہ بن حنظلۃ الغسیل قال واللہ ما خرجنا علی یزید حتی خفنا ان نرمی بالحجارۃ من السماء ان رجلا

اہل مدینہ کی وجہ خلع بیعت یہ تھی کہ یزید نے معاصی میں بڑی کثرت کر دی تھی واقدی نے متعدد طرق سے بیان کیا ہے کہ عبد اللہ ابن حنظلہ غسیل الملائکہ فرماتے تھے خدا کی قسم ہم لوگوں نے اس وقت یزید پر خروج کیا۔ جب ہم کو یہ خوف پیدا ہو گیا کہ ہم پر آسمان سے

بنکح أمهات والاولاد والبنات و الاخوات ويشرب الخمر ويدع الصلوة

سے پتھر نہ برسنے لگیں وہ ایسا شخص ہے جو ماؤں بیٹیوں اور بہنوں کی اولاد سے نکاح کو جائز سمجھتا اور شراب پیتا ہے اور نماز چھوڑے ہوئے ہے۔

حضرت عمر ابن عبدالعزیز جو بنی امیہ کے سلسلہ میں آٹھویں خلیفہ ہیں وہ یزید کو جیسا کچھ سمجھتے تھے وہ ذیل کے واقعہ سے ظاہر ہوگا جس کو ابن حجر نے صواعق محرقہ میں تحریر کیا ہے۔

قال نوفل بن ابی الفرات كنت عند عمر ابن عبد العزيز فقال رجل امير المومنين يزيد فقال لا تقل امير المومنين وامر به فضرب به عشرين سوطا

نوفل بن ابی فرات ناقل ہیں کہ ایک شخص نے عمر ابن عبدالعزیز کے سامنے یزید کو امیر المومنین کہا عمر نے فرمایا اس کو امیر المومنین نہ کہو اور پھر اس شخص کو اس بات کے کہنے پر بیس کوڑے لگوائے۔

سید آلوسی بغدادی اپنی تفسیر روح المعانی کی آٹھویں جلد میں سبط ابن جوزی کی کتاب سر المصون کی عبارت سے بیعت یزید کی نسبت لکھتے ہیں۔

قال الجوزی فی کتابه السر المصون من الاعتقادات العامة التی غلبت جماعة فتبین لی السنة ان یقول ان یزید کان علی الصواب ان الحسین اخطاء بالخروج علیه ولو نظروا فی سیر العلماء اعلموا کیف عقدت له البیعت والزم الناس بها ولقد فعل فی ذالک کل قبیح

علامہ ابن جوزی اپنی کتاب سر المصون میں لکھتے ہیں کہ ایک عام خیال جو ایک فرقہ میں غالب ہوگیا ہے اور وہ فرقہ اہل سنت کی طرف منسوب ہے یہ ہے کہ وہ کہتے ہیں کہ یزید بر سر حق تھا اور حسینؑ نے غلطی کی جو اس پر خروج کیا لیکن اگر یہ لوگ تاریخ و سیر پر نظر ڈالتے تو ان کو معلوم ہو جاتا کہ یزید کی بیعت کس طرح منعقد ہوئی اور کن کن مجبوریوں سے لوگوں نے اس کی بیعت کی اور اس کی بیعت لوگوں سے کرانے میں

کیسی کیسی قبیح کارروائیاں کی گئیں۔ (تفسیر روح المعانی جلد ہشتم صفحہ ۱۲۶)

ماموں رشید نے اپنے زمانہ میں بنی امیہ خصوصاً یزید کے معائب میں ایک کتاب لکھوائی اور اس کو مشتہر کرنا چاہتا تھا مگر پھر بخوف فساد اس کو شائع نہ کرا سکا وہ کتاب خزانہ شاہی میں رکھی رہی۔ معتضد باللہ کے زمانہ میں پھر اس کے اعلان کی ضرورت پیش آئی تو یہ کتاب نکلوائی گئی اور اس سے انتخاب کر کے ایک چھوٹا رسالہ تیار کیا گیا۔ جو تمام بلادِ اسلامی میں سلطنت کی طرف سے مشتہر کیا گیا۔ اس ملخص کو ابن اثیر نے اپنی تاریخ جلد ہفتم صفحہ ۱۶۰ میں علامہ حسین دیاربکری نے تاریخ الخمیس جلد دوئم صفحہ ۳۰۸ مطبوعہ مصر میں۔ ابن الوردی نے اپنی تاریخ کی جلد اول صفحہ ۲۳۴ مطبوعہ مصر میں۔ ابوالفدا نے تاریخ المختصر جلد سوئم صفحہ ۲۷۸ مطبوعہ لندن میں تحریر کیا ہے اور امام سیوطی بھی اپنی تاریخ الخلفا صفحہ ۲۰۵ مطبوعہ محمدی پریس لاہور میں مجملاً اس قصہ کا ذکر کرتے ہیں علامہ ابن جوزی اپنی کتاب الرد علے المتعصب العنید المانع لعن الیزید میں (جو بالتخصیص جواز لعن یزید میں لکھی گئی ہے) تحریر فرماتے ہیں کہ ایک سائل نے مجھ سے یزید ابن معاویہ کے لعن کی بابت سوال کیا۔ میں نے کہا کہ اس کے بارے میں جو کچھ کچھ کہا جائے کہو اس نے پوچھا کیا ہم اس پر لعن بھی کر سکتے ہیں میں نے کہا تمام علماء متورعین و مقدسین نے اس پر لعنت کی اجازت دی ہے اور ان ہی لوگوں میں امام احمد ابن حنبل بھی ہیں کیونکہ انہوں نے یزید کے حق میں لعنت سے زیادہ باتوں کا اضافہ کیا ہے۔ پھر علامہ ابن جوزی نے فرمایا کہ قاضی ابویعلےٰ نے اپنی کتاب معتمد الاصول میں صالح ابن احمد ابن حنبل رحمہما اللہ سے روایت کی ہے کہ میں نے اپنے والد (احمد ابن حنبل) سے پوچھا کہ بعض لوگ مجھ کو یزید کے ساتھ محبت کرنے کی فرمائش کرتے ہیں انہوں نے فرمایا کہ جو شخص خدا پر ایمان لایا وہ کس طرح یزید جیسے شخص سے محبت کر سکتا ہے جس پر خدا نے خود لعنت کی ہو" میں نے پوچھا کہ وہ کونسی آیت ہے تو انہوں نے آیہ وَهَلْ عَسَيْتُمْ اِنْ تَوَلَّيْتُمْ اَنْ تُفْسِدُوْا فِي الْاَرْضِ وَتُقَطِّعُوْا اَرْحَامَكُمْ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ لَعَنَهُمُ اللّٰهُ فَاَصَمَّهُمْ وَ

ابصارھم کی تلاوت فرمائی اور کہا کہ قتل حسین سے بڑھ کر اور کون سا فساد عظیم ہوگا۔
علامہ ابن جوزی لکھتے ہیں کہ قاضی ابو یعلی نے ایک کتاب یزید کی جواز لعن میں لکھی ہے۔
جس میں اس حدیث سے بھی استدلال کیا ہے۔ من اخاف اھل المدینۃ ظلماً اخافہ
اللہ وعلیہ اللعنۃ اللہ والملائکۃ والناس اجمعین اسی قول کو علامہ ابن
حجر نے بھی صواعق محرقہ میں تحریر کیا اور صواعق محرقہ کی سند سے امام سلیمان قندوزی بھی اپنی
کتاب ینابیع المودۃ مطبوعہ بمبئی کے صفحہ ۲۸۱ میں ارقام فرماتے ہیں۔
علامہ ذہبی جن کی وفات ۷۴۳ ہجری میں ہوئی ارشاد کرتے ہیں۔

فقد فعل یزید باھل المدینۃ ما فعل فی شربہ الخمر واتیانہ المنکرات اشتد علیہ الناس	یزید نے جو کچھ اہل مدینہ کے ساتھ کیا اور اس کی شراب خوری اور منہیات شرعی پر اصرار تمام امت پر شاق گذرتا تھا۔

علامہ کیا ہراسی فقیہ شافعی سے پوچھا گیا کہ یزید صحابی تھا یا نہیں اور اس پر لعن کرنا درست
ہے یا نہیں انہوں نے جواب دیا کہ وہ صحابی نہیں تھا۔ وہ حضرت عثمان کے وقت میں
پیدا ہوا۔ اور اس پر لعن کرنے میں دو قول امام ابو حنیفہ کے مشہور ہیں تصریح وتلویح
تصریح لعنت کرنے کے بارے میں اور تلویح اس کے عدم میں ایسا ہی مالک اور امام احمد سے
منقول ہے مگر میرا ایک ہی قول یعنی اس پر لعنت کرنا ابن خلکان نے بھی علامہ موصوف
کی سند سے یہی اقوال درج کئے ہیں (شہادت حسین صفحہ ۵۱)
علامہ سعد الدین تفتازانی بھی یزید پر لعنت کی صریح اجازت دیتے ہیں چنانچہ وہ
شرح عقائد نسفی میں لکھتے ہیں۔

فنحن لا نتوقف فی شانہ بل فی ایمانہ لعنۃ اللہ علیہ وعلی انصارہ وعلی اعوانہ	ہم اس پر لعنت بھیجنے کے بارہ میں ذرا توقف نہیں کرتے بلکہ اس کے بے دین وبے ایمان ہونے میں بھی شبہ نہیں کرتے اس پر اور

اس کے انصار و اعوان پر خدا کی لعنت (شرح عقائد صفحہ ۱۱۱)

پھر آگے چل کر فرماتے ہیں۔

وَاتفقوا علےٰ جواز اللعن علیٰ مَن قتلہ او امر بہ او اجازہ او رضی بہ	علماء کا اتفاق ہے کہ اس پر جس نے حسینؓ کو قتل کیا یا ان کے قتل کا حکم دیا یا اجازت دی یا اس پر راضی ہوا لعنت کرنا جائز ہے۔

امام سمہودی بھی جواہر العقدین میں یہی الفاظ تحریر فرماتے ہیں۔

علامۂ زرندی علامہ ابن حجر عسقلانی اور علامۂ دمیری نے بھی یزید پر لعنت کی اجازت لکھی ہے۔

امام جلال الدین سیوطی باوجودیکہ یزید کو خلفا اثنا عشر میں شمار کرتے ہیں۔ تاہم اس پر لعنت کی صریح اجازت دیتے ہیں وہ واقعاتِ کربلا کو بیان کرتے ہوئے تحریر کرتے ہیں

لعن اللہ قاتلہ وابن زیاد معہ و یزید ایضاً	خدا حسینؓ کے قاتل اور ابن زیاد اور یزید سب پر لعنت کرے۔

ملک العلما دولت آبادی مناقب السادات میں نہایت واضح طور پر فرماتے ہیں۔

الامۃ اجمعت والائمۃ اتفقت علےٰ الکفر واللعن قاتل الحسینؓ	امت اسلام نے اس پر اجماع اور آئمۂ اسلام نے یزید قاتل حسینؓ کے کفر اور اس کے جواز لعن پر اتفاق کر لیا ہے۔

شیخ الاسلام امام قندوزی ینابیع المودۃ میں لکھتے ہیں کہ اہل سنت کے عقائد میں یزید کی بابت جو امیر معاویہ کے بعد ان کا قائم مقام ہوا اختلاف ہے۔ ایک گروہ اس کو کافر کہتا ہے جس میں سبط ابن جوزی وغیرہ ہیں ان کا استدلال یزید کے ان اشعار پر ہے۔ جو اس نے حضرت کے سر مبارک پر چوب خیزران لگاتے پڑھے تھے "لیت اشیاخی ببدر شہدوا الخ" یہ ابیات مشہور و معروف اور اس کے صریح کفر پر دال

ہیں۔ [1]

مولوی محمد حسین فرنگی محلی کتاب وسیلۃ النجاۃ میں بذیل تذکرہ یزید جو تحریر ہیں درج ذیل ہے۔

"چنانچہ یزید بدبخت ستون دین و بنیاد خانہ جناب سید المرسلین صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اجمعین را برانداخت و عمارت ایمانی و قصر امن و امان را منہدم ساخت۔ بزرگی نوشتہ کہ کاری کہ یزید کرد کسے کافر فرنگ ہم نکردہ باشد و بعد شہادت آنحضرت خانہ کعبہ را نیز خراب کردہ و درآنجا بدعتہا پدید آوردہ و مدینہ منورہ حکم دار الحرب داد و در مسجد نبوی اسپہا بست و صحابہ سید الوریٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم را کہ آنجا بودند ہمہ را بے عزت و بے حرمت کردہ زنان آنہا را مباح گردانید" [2]

اسی طرح یزید کی نسبت مولوی عبدالحی صاحب فرنگی محلی بھی اپنے فتاویٰ میں تحریر فرماتے ہیں "مولانا نے یزید کی خوب خبر لی ہے اور صاف لکھ دیا ہے کہ از روئے تحقیق و انصاف اس خبیث کا درجہ کفر سے بھی بڑھا ہوا ہے ہرگز اس کو مغفرت و ترحم سے یاد نہ کرنا چاہیئے اگرچہ از روئے اجتہاد جس طرح ابلیس کی لعن سے زبان روکنے میں کچھ مضائقہ نہیں اسی طرح اسکی لعن سے بھی زبان کو آلودہ نہ کرنا چاہیئے انتہیٰ ممدوح کے اس فتویٰ کو مولوی شاہ حسن میاں سجادہ نشین پھلواری نے اپنی کتاب شہادت حسین مطبوعہ لاہور صفحہ ۵۳ میں نقل کیا ہے جو بالفاظ حسب ذیل ہے۔

"در شان وے (یزید) براہ افراط و مولات رفتہ می گویند کہ وی بعد ازاں کہ باتفاق مسلمانان امیر شد امر قتل بر امام حسین علیہ السلام واجب شد وبدانستند

[1] ینابیع المودۃ صفحہ ۲۸۰

[2] وسیلۃ النجاۃ مطبوعہ مطبع گلشن فیض لکھنؤ ص ۲۹۳

کہ وے باوجود امام حسینؓ امیر شود؟ اتفاق مسلمانان کے باشد جماعتے از صحابہ و از
اولاد صحابہ خارج از وے بودند و بر خے کہ حلقۂ اطاعتِ او بگردن انداختند چوں
حالِ او بہ تشریبِ خمر و ترکِ صلوٰۃ و زنا و استحلالِ محارم معائنہ کردند بہ مدینہ منورہ
باز آمدند و خلعِ بیعت کردند و بعضے گویند کہ وے امر قتلِ امام حسینؓ نہ کردہ نہ بداں
راضی بود و نہ بعد از آن بقتلِ امام حسین علیہ السلام و اہل بیت آنحضرت
بشر شد۔ این سخن نیز باطل است چنانچہ قال العلامہ التفتازانی فی شرح
عقائد النسفیہ" والحق ان رضا بقتل الحسین علیہ السلام الی قولہ مما تواتر معناہ و
ان کان تفاصیلہ احاد" بعضے دیگر گویند کہ قتلِ امام حسینؓ گناہ کبیرہ است نہ
کفر، لعنت مخصوص است بکفار۔ ناظم بر فطانتِ ایشاں نداستند کہ کفر کیں
طرف خود ایذائے جنابِ رسول الثقلین چہ ثمرہ دارد و قال اللہ تعالےٰ: اِنَّ
الَّذِیۡنَ یُؤۡذُوۡنَ اللّٰہَ وَ رَسُوۡلَہٗ لَعَنَہُمُ اللّٰہُ فِی الدُّنۡیَا وَ الۡاٰخِرَۃِ
و بعضے دیگر گویند کہ حالِ خاتمہ وے معلوم نیست شاید کہ وے بعد ارتکاب
این کفر و معصیت توبہ کردہ باشد و میل غزالی در احیاء العلوم بایں طرف
است مخفی مباد کہ احتمال توبہ و رجوع از معاصی احتمالی است والا آں بے سعادت
آنچہ درین امت کردہ ہیچ کس نکردہ باشد و لپسرش معاویہ بر سر ممبر زشتی
حالِ پدر خود بیان کرد و بعضے بے باکانہ بہ لعنِ آں شقی تجویز می سازند و از
سلف و اعلام امت احمد و امثالِ ایشاں بر وے لعنت کردہ اند و بعضے توقف
کردہ اند و ابن جوزی کہ کمال عصبیت در حفظ سنت و شریعت می دارد
در کتابِ خود لعنِ وے را از سلف منقول کردہ و علامہ تفتازانی بکمالِ جوش و
خروش بروئے انصار و اعوانِ وے لعنت کردہ اند و بعضے توقف کردہ
بر دائرۂ سکوت رفتہ اند مسلکِ اسلم آں است کہ آں شقی را بہ مغفرت و

ہیں۔ [۱]

مولوی محمد حسین فرنگی محلی کتاب وسیلۃ النجاۃ میں بذیل تذکرہ یزید جو تحریر

ہیں وہ حسب ذیل ہے۔

"چنانچہ یزید بد بخت ستون دین و بنیاد خانہ جناب سید المرسلین صلی اللہ علیہ و آلہ و اجمعین را برانداخت و عمارت ایمانی و قصر امن و امان را منہدم ساخت بزرگی نوشتہ کہ کاری کہ یزید کرد کسے کافر فرنگ ہم نہ کردہ باشد و بعد شہادت آنحضرت خانۂ کعبہ را نیز خراب کردہ و در آنجا بدعتہا پدید آوردہ و مدینہ منورہ حکم دار الحرب داد و در مسجد نبوی اسپہا بست و صحابہ سید الوریٰ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم را کہ آنجا بودند ہمہ را بے عزت و بے حرمت کردہ زنان آنہا را مباح گردانید" [۲]

اسی طرح یزید کی نسبت مولوی عبد الحی صاحب فرنگی محلی بھی اپنے فتاوی میں تحریر فرماتے ہیں "مولانا نے یزید کی خوب خبر لی ہے اور صاف لکھ دیا ہے کہ از روئے تحقیق و انصاف اس خبیث کا درجہ کفر سے بھی بڑھا ہوا ہے ہرگز اس کو مغفرت و ترحم سے یاد نہ کرنا چاہیئے اگرچہ از روئے اجتہاد جس طرح ابلیس کی لعن سے زبان روکنے میں کچھ مضائقہ نہیں اسی طرح اسکی لعن سے بھی زبان کو آلودہ نہ کرنا چاہئیے" ممدوح کے اس فتوی کو مولوی شاہ حسن میاں سجادہ نشین پھلواری نے اپنی کتاب شہادت حسین مطبوعہ لاہور صفحہ ۵۲ میں نقل کیا ہے جو بالفاظ حسب ذیل ہے۔

"در شان وے (یزید) برادر افراط و مولات رفتہ می گویند کہ وی بعد ازاں کہ باتفاق مسلمانان امیر شد اطاعتش بر امام حسین علیہ السلام واجب شد و بدالستند

[۱] ینابیع المودۃ صفحہ ۲۸۰

[۲] وسیلۃ النجاۃ مطبوعہ مطبع گلشن فیض لکھنؤ ص ۲۹۳

کہ وے باوجود امام حسینؓ امیر شود؟ انفاق مسلمانان کے باشد جماعتے از صحابہ و از اولاد صحابہ خارج از مدینہ بودند و برخے کہ صدق اطاعت او بگردن انداختند چوں حال او بہ تشرب خمر و ترک صلوٰۃ و زنا و استحلال محارم معائنہ کردند بہ مدینہ منورہ باز آمدند و خلع بیعت کردند و بعضے گویند کہ وے امر بقتل امام حسینؓ نہ کردہ و نیز راضی بود و نہ بعد از ان بقتل امام حسینؓ علیہ السلام و اہل بیت آنحضرت مستبشر شد۔ ایں سخن نیز باطل است۔ چنانچہ قال العلامہ التفتازانی فی شرح عقائد النسفیہ "والحق ان رضا بقتل الحسین علیہ السلام الی قولہ مما تواتر معناہ و ان کان تفاصیلہا احاد" بعضے دیگر گویند کہ قتل امام حسینؓ گناہ کبیرہ است نہ کفر، لعنت مخصوص است بکفار۔ نازم بر فطانت ایشاں ندانستند کہ کفر یک طرف خود ایذائے جناب رسول الثقلین چہ ثمرہ دارد و قال اللہ تعالیٰ "اِنَّ الَّذِیْنَ یُؤْذُوْنَ اللّٰہَ وَرَسُوْلَہٗ لَعَنَہُمُ اللّٰہُ فِی الدُّنْیَا وَالْاٰخِرَۃِ" و بعضے دیگر گویند کہ حال خاتمہ وی معلوم نیست شاید کہ وے بعد از ارتکاب این کفر و معصیت توبہ کردہ باشد و میل غزالی در احیاء العلوم بایں طرف است مخفی مباد کہ احتمال توبہ و رجوع از معاصی احتمالی است والا آں بے سعادت آنچہ درین امت کردہ ہیچ کس نکردہ باشد و پسرش معاویہ بر سر ممبر زشتی حال پدر خود بیان کرد و بعضے بے باکانہ بعین آں شقی تجویز می سازند و از سلف و علماء امت احمد و امثال ایشاں بر وی لعنت کردہ اند و بعضے توقف کردہ اند و ابن جوزی کہ کمال عصبیت در حفظ سنت و شریعت می دارد در کتاب خود لعن وی را از سلف منقول کردہ و علامہ تفتازانی بکمال جوش و خروش بروئے انصار و اعوان وی لعنت کردہ اند و بعضے توقف کردہ بر دائرہ سکوت رفتہ اند مسلک اسلم آن ست کہ آں شقی را بمغفرت و

ترجمہ ہرگز یاد نباید کرد و درگف لسان از لعن ابلیس ہم خطرے نیست. فضلا من یزید علیہ ما

اگر مولوی صاحب کی نسبت یہ خیال کیا جائے کہ ہندوستان کے رہنے والے ہیں خصوصاً لکھنؤ کے بزرگ ہیں ہزاروں شیعوں کے میل جول ربط ضبط ممکن ہے کہ رو رعایت کی وجہ سے شیعوں کے ہمزبان ہو گئے ہوں تو مولانا ممدوح سے قطع نظر کر کے خود مولوی شاہ حسن میاں صاحب پھلواری کو ہی لیجئے جو عالم علم شریعت ہونے کے علاوہ سالک مسلک طریقت اور صاحب اعزاز و امتیاز ہیں آپ اپنی کتاب شہادت حسین میں فرماتے ہیں۔

"اختلاف اس میں ہے د بہ کہ خاص کر یزید کا نام لے کر اس پر لعنت کرنا درست ہے یا نہیں۔ اکثر اکابر محدثین و بزرگان دین مثل امام احمد ابن حنبل و علامہ ابن جوزی و جلال الدین سیوطی و علامہ سعد الدین تفتازانی و سید آلوسی بغدادی و علامہ کیا ہراسی و ملک العلماء دولت آبادی وغیرہم یزید کے کفر کے قائل ہیں۔ اور یہ سرے سے اسے مسلمان ہی نہیں جانتے بنابرایں اس پر بہ تخصیص اسم لعنت بھیجنے میں کوئی کلام نہیں کرتے۔ مگر بعض علماء کا قول ہے کہ وہ مسلم ہے مگر فاسق اور سلیس دلیل اس کے کفر کی نہیں معلوم ہوتی اور کسی مسلمان پر اگرچہ وہ فاسق و فاجر بھی ہو لعنت کرنا درست نہیں لہذا یزید پر بہ تخصیص اسم لعنت بھیجنا نادرست ہے اور بعضوں کا گمان ہے کہ یزید کا امام حسین علیہ السلام کا قاتل ہونا قطعی اور یقینی طور پر ثابت نہیں لہذا اس پر لعنت کرنا روا نہیں ان سب کا جواب یہ ہے کہ یہ بات مسلم ہے اور پایۂ ثبوت کو پہونچ گئی ہے اور یہ تواتر ثابت ہے کہ یزید نے جناب حسین علیہ السلام کو شہید کر دیا اسی نے ابن زیاد وغیرہ کو اس کا حکم دیا اور آپ کی شہادت اس کا عین مطلوب تھا اور آپ کے قتل سے اُسے کمال مسرت اور خوشی ہوئی جس پر کتب عام شاہد ہیں، الخ

میں ہے :۔

وَلَا یشك عاقل ان یزید ابن معاویۃ هو القاتل الحسینؑ لانہ الذی مذب عبید اللہ ابن زیاد لیقتل الحسین علیہ السلام	کوئی عاقل اس میں شک نہ کریگا کہ یزید ابن معاویہ قاتل جناب امام حسین ہے۔ کیونکہ اسی نے عبید اللہ ابن زیاد کو آپ کے قتل کا حکم دیا تھا۔

علامہ سعد الدین تفتازانی شرح عقائد نسفیہ میں تحریر کرتے ہیں۔

وَالحق ان رضا یزید بقتل الحسین علیہ السلام واستبشارہ بذالک وَ اهانۃ اهل البیت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم مما تواتر معناہ وان کان تفاصیلہ احادٍ (شرح عقائد صفحہ ۱۱۷)	حق یہ ہے کہ یزید کا امام حسینؑ کے قتل پر راضی ہونا اور آپ کے قتل کیے جانے سے خوش ہونا اور اہلِ بیتِ رسول اللہ کی بے حرمتی کرنا متواتر معنوی ثابت ہے گو اس کی تفصیلیں خبر احاد سے ہوں۔

ایسا ہی مفتی شہاب الدین سید محمود آلوسی بغدادی تفسیر روح المعانی جلد ہفتم صفحہ ۱۲۵ میں فرماتے ہیں :۔

جب یہ ثابت ہو گیا کہ یزید بے شک قاتل جناب امام حسین علیہ السلام اور دشمنِ اہل بیتِ نبوت ہے تو یہی بڑی دلیل اس کے کفر کی ہے اہل بیتِ طہارت کی اہانت و بے حرمتی ان کو ستانا اور سیدنا شباب اہل الجنۃ مولانا حضرت امام ہمام کو اس ظلم و جفا اور اس بے حرمتی سے قتل کرنا خود کفر ہے جناب امام حسینؑ حضرتِ رسولِ خدا کے لاڈلے نواسے تھے۔ ان کے ذرا سے رونے سے آنحضرتؐ کو تکلیف ہوتی تھی اب غور کیا جا سکتا ہے کہ حسین مظلوم کی اس بیکسی اور مصیبت میں ایسی بے حرمتی کے ساتھ قتل کئے جانے سے روحِ رسول اللہؐ کو کیسی کچھ اذیت پہونچی ہوگی جس کا ایک شمہ ابن عباس اور ام سلمہ کا خواب ہے

پس امام حسین علیہ السلام کی بے حرمتی ایذا دہی اہانت اور ان کے اہل بیت پر ظلم یعنی جناب رسولخدا پر ظلم ہے اور آپ کی اہانت و ایذا دہی ہے کون کہہ سکتا ہے کہ حضرت رسولخدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ایذا دہی اور اہانت بہت ہی بڑا کفر اور بے دینی نہیں ہے (نعوذ باللہ من ذالک) اسی لئے اکثر محققین کہتے ہیں اتفقوا کہ حسین امر بقتل الحسین" (شرح عقائد صفحہ ۱۱۱)
یزید ٹھیک اسی وقت کافر ہو گیا جس وقت اس نے جناب امام حسینؑ کے قتل کا حکم دیا۔ علامہ تفتازانی پھر لکھتے ہیں "فنحن لا نتوقف فی شانہ بل فی ایمانہ۔ (شرح عقائد صفحہ ۱۱۷) ہم اس پر لعنت کرنے میں ذرا توقف نہیں کیا بلکہ اس کے بے دین و بے ایمان ہونے میں بھی کوئی شبہ نہیں"

صاحبو! جناب رسولخدا نے فرمایا تھا کہ مسلمانوں میں دو بڑی چیزیں چھوڑے جاتا ہوں۔ میرے بعد تم ان ہی سے تمسک کرنا اگر تم ان کا خیال رکھو گے قدر کرو گے اور ان کے ساتھ متمسک ہو گے تو گمراہی اور ضلالت سے بچو گے۔ وہ دو چیزیں کیا ہیں۔ کلام اللہ دعترتی قرآن پاک اور میری عترت اور اولاد اطہار گویا آپ نے تمسک و عظمت میں قرآن اور اہلبیت کو برابر کیا تھا تو اگر قرآن کی کوئی توہین کرے اسے پامال اور اس کے اوراق کو بے حرمتی سے تذلیل کے لئے منتشر کرے اور خوب جان بوجھ کر علانیہ اس کی اہانت کرے۔ یا ان امور پر وہ راضی اور خوش ہو تو کیا وہ مسلمان رہ سکتا ہے اور کیا کلام اللہ کی اہانت کفر نہیں ہے۔ ضرور ہے اسی طرح سمجھ لو کہ اہل بیت اطہار قرآن ناطق شان نزول آیہ تطہیر کی اہانت بھی لاریب کفر ہے اور جس نے اہل بیت اطہار ع خصوصاً سیدنا امام حسین علیہ السلام کی بے حرمتی کی ان کے قتل سے خوش اور راضی یا اس میں شریک ہوا۔ یا اسے گوارا کیا وہ ہرگز مسلمان نہیں ہے بلکہ فی الدرک الاسفل من النار۔ اب ناظرین خود انصاف فرمائیں کہ یزید اور یزیدیوں پر لعنت بھیجنا جائز ہے یا ناجائز۔ جب ایمان ہی ندارد ہے تو پھر

لعنت کیوں ناجائز ہوگی، بزرگان دین اور علمائے متورعین نے یزید اور یزیدیوں پر لعنت کی ہے اور اس کو مطابق حکم خدا و رسول فرمایا ہے اور قرآن مجید اور حدیث سے اس پر استدلال کیا ہے، تفسیر روح المعانی جلد ششم صفحہ ۷۲ میں زیر تفسیر آیہ "فَهَلْ عَسَيْتُمْ ان تولیتم الخ" یہ ہے کہ

واستدل بها ایضا جواز لعن یزید علیه من الله تعالیٰ ما یستحقه فقال البرزنجی فی اشاعة والهیثمی فی الصواعق ان الامام احمد ساله ولده عبد الله عن لعن یزید قال کیف لا یلعن من لعنه الله تعالیٰ فی کتابه فقال عبد الله قد قرأت کتاب الله عز وجل فلم اجد فیه لعن یزید فقال الامام ان الله تعالیٰ یقول فهل عسیتم ان تولیتم ان تفسدوا فی الارض وتقطعوا ارحامکم اولئك الذین لعنهم الله الخ وای فساد وقطیعة

اس آیت سے لعن یزید پر استدلال کیا گیا ہے برزنجی نے اشاعت میں اور ہیثمی نے صواعق میں نقل کیا ہے کہ امام احمد سے ان کے صاحبزادے عبد اللہ نے پوچھا یزید پر لعنت کرنے کے بارے میں تو امام احمد نے فرمایا جس پر خدا نے قرآن میں لعنت کی ہو اس پر کیونکر لعنت نہ کی جائے گی۔ عبد اللہ نے کہا میں نے قرآن میں یزید پر کہیں لعنت نہیں پائی آپ نے فرمایا خدائے تعالیٰ قرآن میں فرماتا ہے۔ فَهَلْ عَسَيْتُمْ الخ یعنے اگر تم پیٹھ پھیرو گے تو زمین پر فساد پھیلاؤ گے معاصی و کفر سے اور قطع رحم کرو گے۔ یہی لوگ ہیں جن پر خدا نے لعنت کی ہے اور کون سا فساد

اور قطع رحم اس سے بڑھ کر ہے جو کچھ یزید نے کیا۔

صواعق محرقہ صفحہ ۱۵۹ مطبوعہ مصر میں ابن حجر مکی یہ عبارت تحریر فرماتے ہیں۔

وبعد اتفاقهم علی فسقه اختلفوا فی جواز لعنه بخصوص اسمه فاجاز

یزید کے فاسق ہونے پر اتفاق علماء ہونے کے بعد لعنت کرنے خصوصاً اُس کے

قوم منہم ابن الجوزی ونقلہ عن احمد وغیرہ فانہ قال فی کتابہ المسمی بالرد علی المتعصب العنید المانع من ذم یزید سالنی سائل عن یزید بن المعاویہ فقلت لہ یکفیہ ما بہ فقال یجوز لعنہ فقلت قد اجازہ العلماء المتورعون منہم احمد ابن حنبل ذکر فی حق یزید ما یزید علی اللعنۃ

...کے ساتھ لعنت بھیجنے میں اختلاف ہے ایک گروہ نے اس کو جائز رکھا ان مجوزین میں ایک ابن جوزی ہیں انہوں نے جواز لعن کو احمد بن حنبل وغیرہ سے نقل کیا ہے اور اپنی کتاب میں فرمایا کہ مجھ سے کسی نے جواز لعن یزید کے متعلق سوال کیا میں نے کہا یزید پر لعنت کرنے کو علما متورعین نے جائز رکھا ہے ان میں سے امام احمد بھی ہیں انہوں نے یزید کے حق میں سب سے بڑھ کر کہا ہے۔

اور اتحاف لحب الاشراف صفحہ ۶۳ و ۶۴ میں ہے کہ علامہ جوزی نے قاضی ابویعلی سے بالاسناد روایت کی ہے کہ صالح ابن امام احمد نے فرمایا کہ میں نے اپنے والد ماجد سے لعن یزید کو پوچھا فرمایا جس پر خدا نے لعنت کی ہے اس پر کیوں نہ لعنت کی جائے دیکھو خدائے عزوجل نے فرمایا ہے فَهَلْ عَسَيْتُمْ.. الخ یعنے کیا تم اے منافقو پیٹھ پھیرو گے تو زمین میں فتنہ و فساد برپا کرو گے اور قطع رحم کرو گے یہ وہ لوگ ہیں جن پر خدا کی لعنت ہے۔ بس (جان پدر) قتل جناب امام حسینؓ سے بڑھ کر روئے زمین پر کون سا فساد ہوگا اور سنو خدا نے فرمایا ہے۔ اِنَّ الَّذِیْنَ یُؤْذُوْنَ اللّٰہَ وَرَسُوْلَہٗ لَعَنَھُمُ اللّٰہُ فِی الدُّنْیَا وَالْاٰخِرَۃِ جو لوگ خدا اور اس کے رسول کو ایذا دیتے ہیں بے شک ان پر خدا نے دونوں جہان میں لعنت کی ہے۔ اور جناب امام حسین جگر گوشہ رسول کے قتل سے بڑھ کر جناب رسولخدا ص کی کون سی ایذا رسانی ہے۔ تفسیر روح المعانی کے اسی صفحہ میں ہے۔

وعلیٰ ھذا القول لایتوقف فی لعن بنا بریں قول لعن یزید میں کوئی توقف نہیں ہے

یزید و تکفیرہ بکثرۃ اوصافہ الخبیثۃ وارتکابہ الکبائر فی جمیع ایام تکلیفہ ویکفی مافعلہ ایام سلطنتہ باھل المدینۃ ومکۃ فقد روی الطبرانی بسند حسن اللھم من ظلم اھل المدینۃ و اخافھم فاخفہ علیہ لعنۃ اللہ والملائکۃ والناس اجمعین لا یقبل منہ صرف ولا عدل والطامۃ الکبریٰ فافعلہ باھل البیت

بہ سبب اس کی کثرت اوصاف خبیثہ اور ارتکاب کبائر کے اور اس کی لعنت کے لئے کافی ہیں۔ وہ مظالم جو اس نے اپنے غلبہ کے زمانہ میں اہل مکہ اور اہل مدینہ پر کئے کیونکہ امام طبری نے بسند حسن روایت کی ہے کہ جناب رسولخدا نے فرمایا۔ خدایا جو اہل مدینہ پر ظلم کرے اور ان کو خوفزدہ کرے اس پر خدا اور ملائکہ اور تمام لوگوں کی لعنت ہو اور اس شخص سے نہ صرف نہ عدل (کوئی نیکی) قبول ہوگی اور اور بڑی قیامت اس نے یہ برپا کی کہ اہل بیت رسالت کے ساتھ سخت سے سخت ظلم و ستم سے پیش آیا۔ اور انہیں ایذا دی اور سیدنا امام حسین کو قتل کیا جو بتواتر معنی ثابت ہے۔

وفی الحدیث ستۃ لعنھم وفی روایۃ لعنھم اللہ وکل نبی مجاب الدعوات

اور حدیث شریف میں ہے کہ چھ شخص ہیں جن پر ا اور ایک روایت میں ہے کہ اُن پر خدا نے لعنت کی اور ہر نبی مستجاب الدعوات نے لعنت کی (وہ چھ شخص یہ ہیں)

المحرف لکتاب اللہ وفی روایۃ الزائد فی کتاب اللہ

(۱) خدا کی کتاب میں تحریف اور اس میں کمی بیشی کرنے والا

والمکذب بقدر اللہ

(۲) قضا و قدر کا منکر اور ان کا مکذب

والمتسلط بالجبر لیعز من اذل اللہ

(۳) جو شخص لوگوں پر بہ غلبہ مسلط ہو جسے خدا نے ذلت دی ہے اسے وہ عزت دے اور جس کو خدا نے عزت دی ہو اسے وہ ذلت دے۔

والمستحل لعترتی

(۴) میری عترت اور اولاد کی بےحرمتی کرنے والا

والمستحل لحرم الله	(۵) خدا کے حرم کی بے حرمتی کرنے والا۔
والتارک لسنتی	(۶) میری روش کو چھوڑنے والا۔

یہ دونوں حدیثیں یزید پر لعنت کرنے کی موئد ہیں کیونکہ اہل مدینہ پر اس نے سخت ظلم کیا اور خوفزدہ کیا اور وہ مسلط بالجبر بھی تھا۔ خدا کے معزز بندوں کو ذلیل اور ذلیلوں کو معزز بنایا اور حرم بلکہ حرمین کی سخت بے حرمتی اور اہانت کی اور گراہی اور عترت رسول اللہ کی سخت بے حرمتی اور اہانت کی۔ ایسے کہہ کر صاحب تفسیر روح المعانی فرماتے ہیں:

وقد حزم بکفرہ وصرح بلعنه جماعة من العلماء منہم الحافظ ناصر السنة ابن جوزی وبعۃ القاضی ابو یعلی وقال العلامة التفتازانی لانتوقف فی شانه بل فی ایمانه لعنة الله علیه وعلی انصارہ واعوانه وممن صرح بلعنه الجلال الدین السیوطی کما قال فی کتاب تاریخ الخلفا لعن الله قاتله وابن زیاد معه ویزید ایضا۔

علما کی ایک جماعت نے یزید کے کفر کا یقین کیا اور اس پر لعنت بھیجنے کی تصریح فرمائی ہے مثل حافظ ابن جوزی و قاضی ابو یعلی وغیرہم کے اور علامہ تفتازانی کہتے ہیں کہ ہم لوگ اس پر لعنت کرنے بلکہ اس کے کفر کے بارہ میں بھی کچھ توقف نہیں کرتے۔ اس پر اور اس کے اعوان و انصار پر خدا کی لعنت ہو اور جلال الدین سیوطی نے بھی تاریخ الخلفا میں واقعہ کربلا کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا ہے "خدا امام حسینؑ کے قاتل اور زیاد و یزید سب پر لعنت کرے"۔

سید آلوسی بغدادی نے اس کے بعد تاریخ ابن الوردی اور کتاب الوافی بالوفیات سے نقل کیا ہے کہ جب اسیران اہل بیت دمشق سے قریب ہوئے اور مقام جرون کے ٹیلہ پر چڑھے تو شہیدوں کے سر بلند ہوئے اور کوے کائیں کائیں کرنے لگے اس وقت یزید نے دو شعر پڑھے جن کا آخری مصرعہ یہ ہے ؎

فقد اقتضیت من الرسول دیونی

جس میں رسول اللہ سے اپنا بدلہ لے لیا اور پھر ان اشعار کا بھی ذکر کیا ہے جو اتحاف بحب الاشراف وسیلۃ النجاۃ ومفتاح النجا اور دوسری کتب میں منقول ہیں کہ "لیت اشیاخی ببدر شہدوا" جس کا مطلب یہ ہے کہ جناب رسولخدا نے جنگ بدر میں میرے آبا کو قتل کیا تھا اس کے بدلہ میں میں نے آپ ان کی اولاد کو قتل کیا اور خوب ہی بدلہ لیا کاش وہ میرے بزرگ جو بدر میں قتل کئے گئے زندہ ہوتے اور دیکھتے کہ میں نے کیسا بدلہ لیا۔ اور آخر میں دو شعر اور بھی ہیں جن کا مطلب یہ ہے کہ محمد (صلعم) کے پاس کوئی وحی نازل ہوئی نہ فرشتہ آیا۔ یہ سب بنی ہاشم نے ملک گیری کے ڈھنگ نکالے تھے۔

یہ پُر از کفر اشعار یزید کے زبان سے نکلے ہیں جیسا کہ علما نے لکھا ہے تو بے شک اس کے کافر اور مردود ہونے میں ذرا بھی شبہ باقی نہیں جیسے کہ صاحب تفسیر روح المعانی صاحب اتحاف بحب الاشراف صاحب تاریخ وردی صاحب کتاب الوافی بالوفیات وغیرہم من العلمائے فرمایا ہے۔ سید آلوسی بغدادی اپنی تفسیر جلد ہشتم صفحہ ۷۲ میں اس کی نسبت علماء کا بیان کر کے فرماتے ہیں کہ

"میرے گمان غالب میں بھی یہی ہے کہ وہ خبیث ہرگز مسلمان اور مصدق رسالت ہرگز نہیں تھا" !

جب کہ اس کی تمام حرکات وافعال پر نظر کرتے ہیں اور دوسرے قرائن و دلائل سے واضح ہوتا ہے اور اگر بالفرض تسلیم کر لیا جائے کہ وہ کافر نہیں ہوا تو اس میں کوئی شبہ اور اختلاف نہیں ہو سکتا کہ وہ ایک مسلم ہے جس نے یہ بے شمار فواحش اور کبائر غیر محیط کو جمع کیا ہے اور ایسا ہی علامہ ابن حجر صواعق محرقہ میں فرماتے ہیں۔ ملاحظہ ہو صواعق محرقہ صفحہ ۱۳۴ "وعلی القول فانہ مسلم فہو فاسق شریر متکبر" اس قول کی رو سے کہ وہ مسلم ہے مسلم فاسق۔ شریر متکبر۔

سید آلوسی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ ہم اس کی لعنت کے جواز میں تامل نہیں کرتے نیز ابن زیاد ابن سعد اور اس کی جماعت پر لعنت کرنے میں ہمیں شبہ نہیں۔ یہ لوگ یزید سے کم نہیں۔

لعنہ اللہ عزّ وجلّ علیہم اجمعین	خدا کی لعنت ہو یزید ابن زیاد۔ ابن
وعلی انصارھم واعوانہم وشیعتہم	سعد اور اس کی جماعت پر اور ان لوگوں
ومن مال الیہم الی یوم الدین ما	کے اعوان وانصار اور ان کے پاسداروں
دمعت عین علی ابن عبداللہ الحسین	پر جو ان لوگوں کی طرف مائل ہو قیامت

تک جب تک کہ آنکھیں جناب امام حسین کو روئیں۔

اور آخر میں لکھتے ہیں کہ جو اسطرح یزید اور یزیدیوں پر بوجہ احتیاط لعنت کرنے میں مضائقہ کرے وہ یوں کہے کہ خدا اس پر لعنت کرے جو قتل امام حسین سے راضی ہوا جس نے اہلبیت کو بلا قصور ایذا دی ستایا اور جسنے انکا حق غصب کر لیا۔ اسطرح لعنت کرنیکا کوئی بھی مخالف نہیں ہے۔ شاید اس شخص پر بھی جو قتل امام حسین سے راضی اور خوش ہوا جائز ہے۔

مسند امام احمد ابن حنبل کی اسناد سے اوپر لکھا جا چکا ہے کہ جناب ام سلمہ رضی اللہ عنہا نے بھی قاتلان حسین پر لعنت کی اور ان کا ارشاد مشہور ہے کہ جن لوگوں نے حسین کو قتل کیا اور ان کے ساتھ جنگ کی ان کی تحقیر کے مرتکب ہوئے۔ ان پر خدا اپنی لعنت کرے ان کے علاوہ حضرت امام احمد ابن حنبل حضرت امام مالک اور بروایتے حضرت امام اعظم ابو حنیفہ علامہ کیا ہراسی قاضی ابو یعلی۔ علامہ ابن جوزی۔ علامہ اسفرائنی۔ علامہ سمہودی علامہ برزنجی۔ علامہ زرندی۔ علامہ سعد الدین تفتازانی۔ علامہ جلال الدین سیوطی علامہ سید آلوسی بغدادی، مولوی حیدر علی فیض آبادی۔ مولوی محمد مبین لکھنوی اور ملک العلما، دولت آبادی وغیرہم من العلما، المحققین المتورعین سب کے سب یزید پر لعنت کرنے کی پوری اجازت دیتے ہیں [1]

[1] تفسیر روح المعانی جلد ہشتم صفحہ ۱۲۹ [2] شہادت حسین صفحہ ۶۹ تا ۷۱

اسی طرح میرزا حیرت کے اس حیرت افزا اور مہمل ادعا کا "کہ یزید کی معاشرت پر اسلامی دنیا میں بالکل پردہ پڑا" حضرت شاہ محمد حسن صاحب کتاب شہادت حسین صفحہ ۵۰۴ تا ۵۱۱ میں دنداں شکن جواب دیتے ہوئے لکھتے ہیں

"واقعی مرزا صاحب صحیح فرماتے ہیں کہ ہم سنیوں کو یزید کی اصلی حالت کی کیا خبر اس کے اصلی حالات مثل تہجد گذاری پرہیزگاری، عبادت، خدا پرستی، صلاح وتقویٰ، درویشی، بزرگی اور عرفان وغیرہ سے تو جناب مرزا صاحب ہی خوب واقف ہوں گے، جو تمام کتب معتبرہ تواریخ وسیر وغیرہ میں موجود ہیں۔ ہم تو یہی جانتے ہیں کہ آپکی معاشرت ایسی پاکیزہ تھی اور ان کے حالات شریفہ ایسے اچھے تھے کہ حج وغیرہ کے لئے اپنے پدر بزرگوار کے وقت میں جب وہ مکہ اور مدینہ میں آئے تو وہاں بھی شراب و کباب سے باز نہ رہے۔ بس ہم سنیوں کو جہاں تک معلوم ہے اور جہاں تک تواریخ وسیر و دیگر کتب سے پتہ لگتا ہے وہ مردود انتہا درجہ کا متمسک بالمعاصی تھا اور یہی وجہ تھی کہ عبداللہ ابن زبیر عبداللہ ابن عباس، عبداللہ ابن عمر اور ابو عبداللہ الحسین علیہ السلام نے اسے خلافت کے لائق نہ جانا اور یہی سبب ہوا کہ اہل مدینہ نے خلع بیعت کی اور اس پر خروج کیا۔ یہ ہیں یزید کے حالات کا مشتے نمونہ از خروارے جس کے ذہبی جیسے محقق و متقدم گواہ ہیں۔ اور تاریخی واقعات شاہد ہیں۔ اب مجھے اس سے بحث نہیں کہ آپ (مرزا حیرت) یزید کو کیسا سمجھتے ہیں اگر واقعی یہ تواریخ وسیر غلط ہیں۔ اور ذہبی واقدی ابن حجر سیوطی، دمیری ابن کثیر ابن خلکان اور دوسری تمام محققین وعلماء اہل سنت یزید پر بہتان کرتے ہیں۔ جو اسے ایسا بتاتے ہیں بلکہ اس کے حالات پر پردہ پڑا ہوا ہے اور یزید درحقیقت بہت ہی پارسا برگزیدہ۔ خدا رسیدہ۔ متقی اور بزرگ تھا تو بہت بہتر تھا۔ خدا آپ کا حساب یزید کے ساتھ کرے اور ہم لوگوں کا حشر سید الشہدا سید الشباب اہل الجنۃ امام حسین ؑ کے ساتھ۔

بعض لوگوں کا گمان ہے کہ یزید کا قاتل یا آمر قتل حسین ہونا یقینی اور قطعی طور پر ثابت نہیں لہذا اس کو اس حرکت کا ملزم کیونکر قرار دیا جا سکتا ہے۔ یا اس پر لعن کرنا کس طرح جائز اور درست ہو سکتا ہے۔ ہم نہیں سمجھ سکتے کہ اس عجیب منطق اور مہمل دعا کا مفہوم کیا ہے۔ مانا کہ یزید نے حضرت کو اپنے ہاتھ سے قتل نہیں کیا مگر اس نے ولید بن عتبہ حاکم مدینہ کو یہ حکم نہیں بھیجا کہ حسینؓ سے فی الفور بیعت لے لینا ضرور ہے اگر وہ انکار کریں تو ان کا سر قلم کرکے ہمارے پاس بھیج دیا جائے اور کیا اس نے ابن زیاد کو پے درپے نہیں لکھا کہ جب تک حسین سے بیعت نہ لے یا اُن کو قتل نہ کر ڈالے اس وقت تک آرام کا خواب وخور اپنے اوپر حرام سمجھے۔ ہماری سمجھ میں نہیں آتا کہ یہ حکم قتل نہیں تو کیا ہے اور اگر یزید اس قتل کا ذمہ دار نہیں تو اور کون ہے۔ ابن زیاد عمر سعد شمر خولی سنان اور شبث وغیرہم کو حضرت سے قدرتی کاوش کی کوئی وجہ نہیں ہو سکتی تھی وہ سلطنت کے شریک اور حصہ دار نہ تھے۔ المامور معذور ابن زیاد نوکر تھا جو اس کے آقا اور بادشاہ نے حکم دیا اس نے اس کی تعمیل کی۔ دنیا کے تمام شاہان جبار نے قتل وغارت اور ظلم وجور کی جو مثالیں تاریخ میں چھوڑی ہیں کیا وہ بذات خود اور بدست خود ان مظالم کے مرتکب ہوئے تھے۔ کیا خود چنگیز خاں نے صدہا شہروں اور قصبوں کو خاک سیاہ اور لاکھوں انسانی ہستیوں کو آغشتۂ خاک وخون اپنے ہاتھ سے کیا تھا۔ کیا ہلاکو خاں بغداد میں اور نادر شاہ دہلی میں بازاروں اور کوچوں کے اندر خود اپنے ہاتھ سے قتل عام کرتے پھرتے تھے نہیں ان لوگوں کا فقط حکم مرضی اور اشارہ تھا تعمیل کرنے والے اور تھے۔ با ایں ہمہ ہر شخص ان ہی حکم دینے والوں کو ان تمام خوں ریزیوں بربادیوں تباہیوں اور ظلم آرائیوں کا ذمہ دار سمجھتا ہے۔ بادشاہ کا کام صرف حکم دیدینا ہے تعمیل کرنا وزیروں سپاہ سالاروں اور افسروں کا کام ہے۔ ایسی ہی ہزاروں مثالوں سے تاریخیں بھری پڑی ہیں۔ یہ خیال کس قدر بے ربط لغو جاہلانہ اور متعصبانہ ہے کہ یزید قتل حسینؓ کا ذمہ دار نہیں اور اس کا مظلمہ ابن زیاد اور عمر سعد کے سر تھوپنے کے قابل ہے قتل فرزند رسول

اہانت اہل بیت رسول خوں ریزی صحابۂ رسول ہتک ناموس صحابہ رسول، توہین مسجد رسول احراقِ خانہ کعبہ اگر یزید کے حکم سے عمل میں نہیں آئے تو پھر کس کی مرضی اور حکم سے ایسا ہوا۔ تمام تاریخیں پکار پکار کر کہہ رہی ہیں کہ جو کچھ کیا اس ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ نے کیا عام علماء اور مورخین کا اتفاق ہوتے ہوئے یہ گمان باطل کہ یزید قاتل امام قتل حسین نہیں ہے۔ ایک جاہلانہ ضد اور کورانہ تعصب کے سوا کیا کہا جا سکتا ہے؟ اور جب وہ قاتل حسینؓ ہے تو اس کے ملعون ہونے میں کیا شبہ باقی رہا خدائے تعالےٰ اپنے کلام پاک میں فرماتا ہے۔

وَمَنْ يَّقْتُلْ مُؤْمِنًا مُّتَعَمِّدًا فَجَزَآؤُهٗ جَهَنَّمُ خَالِدًا فِيْهَا وَغَضِبَ اللّٰهُ عَلَيْهِ وَلَعَنَهٗ وَاَعَدَّ لَهٗ عَذَابًا عَظِيْمًا	جو شخص کسی مومن کو دیدہ و دانستہ قتل کرے تو اس کی سزا جہنم ہے۔ وہ اس میں ہمیشہ رہے گا اور اس پر خدا کا غضب اور لعنت ہے اور اس کے لئے سخت

عذاب مہیا کیا گیا ہے۔

جب عام مومن کے قتل کی وجہ سے اس کے قاتل پر خدا کا غضب اور لعنت ہے اور اس کو ابدی جہنمی فرمایا گیا ہے تو فرزند رسول سرتاج مومنین اور سردار جوانان بہشت کا قاتل یا وہ شخص جس کو حکم قتل دینے کی وجہ سے حقیقی قاتل کہنا چاہیئے خدا کے غضب اور لعنت اور خلود فی النار سے کیونکر بچ سکتا ہے (فافہم وتدبر)

ایک سچے مسلمان اور منصف مزاج کے لئے کس قدر افسوس اور حیرت کی بات ہے کہ یزید کے بعض ایسے خیرخواہ بھی پائے جاتے ہیں جو یزید جیسے فاسق، فاجر، زناکار، شراب خوار منہمک فی المعاصی، حرام کو حلال، فرزند رسول اللہ کو قتل۔ اہل بیتِ نبوت کو ذلیل و حقیر، مکہ اور مدینہ پر لشکر بھیج کر صحابہ کو قتل اور ان کی عورتوں کو بے حرمت، خانہ کعبہ اور مسجد نبوی کی بے ادبی کرانے والے کے مقابلہ میں حضرت امام حسینؓ جیسے معصوم عن الخطاء کو جنہیں آنحضرت صلعم نے الحسین منی وانا من الحسین فرمایا جو سید المرسلین

کی آغوشِ مبارک میں پلا اور دوشِ اقدس پر سوار رہا جس کے فضائل و مناقب سے تمام اسلامی تاریخیں بھری پڑی ہیں بر سر خطا بتاتے ہیں ۔ چنانچہ ابوبکر ابن العربی اندلسی کمات بھی بڑی دیدہ دلیری سے کہتا ہے "ان الحسین قتل بسیف جدہ" بے شک حسین اپنے نانا کی تلوار سے قتل کئے گئے مطلب یہ ہے کہ شریعتِ اسلامی سے بغاوت کی جو سزا مقرر ہو چکی تھی اسی کی تعمیل کی گئی اور انہوں نے خلیفۂ وقت پر خروج کیا اس لئے واجب القتل ٹھہرے۔ اور موافق حکم رسول اللہ ان کو قتل عمل میں آیا پھر اعتراض کیا ہے (استغفر اللہ ربی و اتوب الیہ)

ہم ایسے توہمات کا کوئی جواب نہ دیں گے۔ ان جہالات کی تردید میں سید آلوسی بغدادی نے جو تحریر فرمایا ہے اسی کا لکھ دینا کافی ہے چنانچہ علامہ موصوف ابن العربی کی تردید میں ذیل کی عبارت تحریر فرماتے ہیں۔

وابوبکر ابن العربی المالکی علیہ من اللہ تعالیٰ ما یستحق زعم ان الحسین علیہ السلام قتل بسیف جدہ ولہ من الجہال موافقون علی ذلک وکبرت کلمۃ تخرج من افواههم ان یقولون الا کذبا قال ابن الجوزی فی کتابہ السر المصون من الاعتقادات العامۃ التی غلبت علی جماعۃ منتسبین الی السنۃ ان یقولون ان یزید کان علی الصواب وان الحسین اخطأ بالخروج علیہ ولو نظروا فی سیر لعلموا کیف عقدت

ابوبکر بن عربی المالکی نے اس پر خدا کی طرف سے وہ نازل ہو جس کا وہ مستحق ہے سخت بہتان وافترا کیا ہے جو اس نے یہ گمان کیا کہ حسین علیہ السلام اپنے نانا کی تلوار سے قتل کئے گئے (یعنے بغاوت کی تھی اس وجہ سے ان کی گردن ماری گئی) اور بعض جہلا اس ابن عربی کے ہم خیال ہیں لیکن یہ بہت بڑی سخت بات ہے جو ان کے منہ سے نکلتی ہے نرا جھوٹ بکتے ہیں علامہ ابن جوزی اپنی کتاب سر المصون میں تحریر فرماتے ہیں ایک عام خیال واعتقاد جو ایک فرقہ میں غالب ہو گیا ہے اور وہ فرقہ اہلسنت کی

البیعة والزم الناس بہا ولقد فعل فی ذالک کل قبیح ثم لو قدرنا صحة عقد البیعة فقد مذ ب منہ بواد کلہا توجب فسخ العقد ولا یمیل الی ذالک الا جاہل عامی المذہب یظن بہ انہ یغیظ بذالک الرافضة۔

طرف منسوب ہے یہ ہے کہ وہ کہتے ہیں کہ یزید بر سر حق تھا اور امام حسینؑ نے غلطی کی۔ جو اس پر خروج کیا لیکن اگر کاش لوگ تاریخ و سیر پر انصاف کی نظر ڈالتے تو ان کو معلوم ہو جاتا کہ یزید کی بیعت کس طرح منعقد ہوئی اور کن مجبوریوں سے لوگوں نے اس کی بیعت اختیار کی اس کی بیعت لوگوں سے زبردستی لی گئی اور اس بیعت کے قبول کرانے میں کیسی کیسی ناسزا اور قبیح کارروائیاں کی گئیں پھر اگر ہم تھوڑی دیر کے لئے اس کی صحت عقد بیعت کو مان بھی لیں تو یزید سے علانیہ ایسی برائیاں سرزد ہوئیں جس سے لوگوں پر اس کی بیعت کا فسخ واجب و ضروری ہو گیا۔ ایسی حالت میں امام حسینؑ معاذ اللہ کیونکر باغی ہو سکتے ہیں اس خیال فاسد کی طرف کوئی مائل نہیں ہو سکتا سوائے ان عامی المذہب جاہلوں کے جو یہ گمان کرتے ہیں کہ ہم ان باتوں سے رافضیوں کو غضب میں لاتے اور چڑاتے ہیں۔

اس کے بعد "شہادت حسینؑ" کا جواب بھی سن لیجئے جس میں انہوں نے اپنی حق پسندی عدالت اور بے تعصبی کا پورا ثبوت دیا ہے ان کا ارشاد ہے۔

"سیدنا و مولانا امیر المومنین حضرت امام حسین علیہ السلام نے ہرگز بغاوت نہیں کی آپ ہرگز باغی نہیں تھے بلکہ مظلوم شہید ہوئے۔ خوارج و نواصب اور بعض جیسے ناصبی نعوذ باللہ من ذالک آپ پر بغاوت کا الزام لگاتے ہیں۔ اور ان کے زعم باطل اور عقائد فاسدہ میں یہ ہے کہ یزید خلیفہ وقت تھا۔ اور خلیفۂ وقت سے مخالفت و سرکشی بغاوت ہے اسی بناء پر امام حسینؑ باغی ہوئے لیکن یزید کسی طرح خلافت کا مستحق نہیں تھا نہ ہرگز ہرگز خلیفہ ہونے کے قابل تھا

نہ کسی طرح اس کی خلافت ثابت ہوتی ہے کیونکہ امیر المومنین سیدنا امام حسن علیہ السلام نے امیر معاویہ کو خلافت سپرد کرتے ہوئے یہ شرط کر دی تھی کہ تمہارے بعد پھر خلافت ہماری ہی طرف لوٹ آئے گی (دیکھو کتاب استیعاب ابن عبد البر اور کتاب الامامت والسیاست ابن قتیبہ) اور تمہیں کسی کو اپنا خلیفہ اور ولی عہد بنانے کا ہرگز حق نہ ہو گا مگر ہمارے معظم اور مکرم امیر معاویہ نے بالکل خلاف معاہدہ یزید کو خلیفہ و ولی عہد کیا۔ اس بحث میں امام المتکلمین مولانا حیدر علی لکھنوی کی کتاب بصارت العین فی ازالۃ الغین نہایت عمدہ کتاب ہے جس میں پُر زور دلائل سے شہادتِ امام حسین علیہ السلام ثابت کی گئی ہے اور یزید کا اہل سنت وجماعت کے نزدیک کفر و فسق و لعن محقق مسئلہ بتایا گیا ہے"۔

اس کے بعد شاہ صاحب ممدوح ایک لطیف سوال کرتے ہیں اور فرماتے ہیں۔

ناظرین! یہاں پر ہمیں اپنی بحث سے کسی قدر الگ ہو کر یہ دریافت کرنا ہے کہ سید الشہدا سیدنا حضرت امام حسینؓ تو باغی ہو گئے مگر نہیں معلوم کہ جناب عبداللہ ابن زبیر جو خلیفہ اول المومنین جناب ابوبکر صدیق کے نواسے اور سید المرسلین سرور عالم رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ واصحابہ وسلم کے پھوپھی زاد بھائی حضرت زبیر کے (جو جنگ جمل میں امیر المومنین علی مرتضیٰ علیہ السلام کے مدمقابل تھے) صاحبزادے اور جو ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہ کی گودوں میں پلے تھے وہ آپ کے نزدیک کیا ہیں وہ بھی آپ کے نزدیک باغی و طاغی معاذ اللہ ہیں یا نہیں کیونکہ وہ تو آپ کے امیر المومنین حضرت امیر معاویہ کے صاحبزادے یزید کے پورے حریف اور مدمقابل تھے۔ پھر انہیں آپ کیا فرماتے ہیں بینوا وتوجروا۔ (شہادت حسینؓ صفحہ ۱۷ و ۲۷)"

نہایت افسوس اور عبرت کا مقام ہے کہ اہل اسلام نے جناب رسول خدا صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کی حدیث ثقلین کی اطاعت بھی نہیں کی۔ اگر اسی اصول بغاوت پر غور کیا جائے تو یزید کے قبل جو حکومت تھی اس کے ساتھ مقابلہ اور اس کے ساتھ کوشش کرنے والوں کو کوئی جھوٹوں بھی باغی نہیں کہتا۔ نہ ان پر کسی قسم کی بغاوت کا شبہ کرتا ہے۔

۳۶ ہجری سے ۴۰ ہجری تک خلافت علی کے زمانہ میں چاروں طرف سے بغاوتوں کے کیسے کیسے طوفان اُٹھے۔ بڑی بڑی خوں ریزیاں ہوئیں۔ ہزاروں مسلمانوں کا خون ہوگیا۔ بایں ہمہ ان باغیوں کو کوئی پوچھتا بھی نہیں۔ مگر فرزند رسول اللہ کے اس طرز کو جو مسلمانوں کی ہی استدعا پر ان کی ہدایت اور تحفظ عن الضلالت کے خیال سے اختیار کیا گیا تھا خروج بتایا جاتا ہے اور دشمن کے مظالم کے مقابلہ میں آپ کی مدافعت کو بغاوت سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ ابن العربی سے بڑھ کر اسلام میں دوسرا احسان فراموش نہیں ہوسکتا۔ حیرت ہے کہ وہ دوسری بغاوتوں کی نسبت یہ اعتقاد رکھتے ہیں کہ وہ خطائے اجتہادی تھی اور فرزند رسول اللہ صلعم کے لئے اس حیلۂ شرعی کی آڑ رکھنے کے بھی روادار نہیں اور بعلم کھلا آپ کی ذات قدسی صفات پر بغاوت کا الزام لگاتے ہیں۔ آج کسی مخالف اسلام نے ایسا اعتراض کیا ہوتا تو ہم کو کوئی شکایت نہیں تھی مگر حیرت اور افسوس ہے کہ ابن عربی جو مسلمانوں میں ایک بڑی پایہ اور درجہ کے بزرگوار شمار کئے جاتے ہیں۔ ایک عامی المذہب فاسق فاجر اور بدترین امت محمدیہ کی حمایت و مروت میں اہل بیت رسالت کے حقوق اور ان کے محاسن ذاتی کی کوئی رعایت نہ کرسکے اور قُلْ لَّآ اَسْئَلُكُمْ عَلَيْهِ اَجْرًا اِلَّا الْمَوَدَّةَ فِي الْقُرْبٰى کے حکم محکم کی تعمیل تو درکنار اُن کا ادب بھی پس پشت ڈال دیا۔

ابن العربی اور ان کے ہم خیال حضرات کا استدلال وتمسک مندرجہ ذیل تین حدیثوں پر ہے۔

اذا بویع للخلیفتان فاقتلوا آخرھما۔	جس وقت دو خلیفوں کی بیعت کی جائے تو

جس کی آخر میں بیعت ہوئی ہو اس کو قتل کر ڈالو

فَمَنْ اَرَادَ اَنْ یُفَرِّقَ اَمْرَ ھٰذِہِ الْاُمَّۃِ وَھِیَ جَمِیْعَۃٌ فَاضْرِبُوْہُ بِالسَّیْفِ

جو شخص اس امت کے کام میں جس پر اجماع ہو چکا ہو تفرقہ ڈالے اسے تلوار سے قتل کر ڈالو۔

مَنْ اَرَادَ اَنْ یَّشُقَّ عَصَاکُمْ اَوْ یُفَرِّقَ جَمَاعَتَکُمْ فَاقْتُلُوْہُ

جو شخص تمہاری جماعت سے مخالفت اور اس میں تفرقہ کا ارادہ کرے اس کی گردن مار دو

یہ حدیثیں کس درجہ اور کس پایہ کی ہیں ہم اس پر بحث کرنا نہیں چاہتے۔ البتہ اس حیرت اور تعجب کا اظہار کئے بغیر نہیں رہ سکتے کہ امام غزالی جیسے بزرگ بھی ابن العربی کے ہمزبان ہو گئے۔

چنانچہ آپ احیاء العلوم میں فرماتے ہیں۔

مَا قَتَلَ الْیَزِیْدُ الْحُسَیْنَ اِلَّا بِسَیْفِ جَدِّہٖ لِاَنَّ یَزِیْدَ الْخَلِیْفَۃُ وَالْحُسَیْنُ بَاغٍ عَلَیْہِ

یزید نے حسینؓ کو قتل نہیں کیا بلکہ وہ اپنے جد رسول خداؐ کی تلوار سے قتل ہوئے اس لئے کہ یزید خلیفہ تھا اور حسینؓ نے اس سے بغاوت کی تھی۔

شیخ ابن حجر مکی شرح قصیدۂ ہمزیہ میں قول ابن عربی کی تائید تو کرتے ہیں لیکن خطائے اجتہادی کی آڑ سے بھی کام لیتے ہیں آپ کا ارشاد بھی ملاحظہ ہو۔

لِاَنَّ یَزِیْدَ الْخَلِیْفَۃُ وَالْحُسَیْنُ بَاغٍ عَلَیْہِ وَالْبَیْعَۃُ سَبَقَتْ لِیَزِیْدَ وَیَکْفِیْ فِیْھَا مُعْظَمُ اَھْلِ الْحَلِّ وَالْعَقْدِ وَبَیْعَۃُ کَذٰلِکَ لِاَنَّ کَثِیْرِیْنَ اَقْدَمُوْا عَلَیْہِ مُخْتَارِیْنَ ھٰذَا مَعَ عَدَمِ النَّظْرِ اِلٰی ذٰلِکَ فَلَا یُشْتَرَطُ مُوَافَقَۃُ اَحَدٍ مِنْ اَھْلِ الْحَلِّ وَالْعَقْدِ عَلٰی ذٰلِکَ وَیُؤَیِّدُہٗ اَیْضًا مَا قِیْلَ فِیْ نَظِیْرِ ذٰلِکَ

یزید نے حسینؓ کو رسول خدا کی تلوار سے قتل کیا۔ کیونکہ یزید خلیفہ تھا اور حسینؓ نے اس سے بغاوت کی تھی درحالیکہ امت نے یزید کی بیعت ان کی بغاوت سے پہلے کر لی تھی اور اس امت کے اہل حل وعقد نے یزید کی بیعت کو تحقیق خلافت کے لئے کافی سمجھا اور گروہ کثیر نے بلا جبر و اکراہ قطع نظر معاویہ کے اس کو خلیفہ کرنے کے اس کی بیعت پر اقدام کیا۔

حال معاویۃ مع الحسن و مع علی فانہ کان متغلبا باغیا علیہما لکنہ غیر آثم لاجتہادہ فالحسین کذالک

اور اگر ہم اس کے استخلاف پر نظر کریں تو تحقیق خلافت یزید کے واسطے اہل حل و عقد میں سے کسی شخص کی موافقت کی ضرورت ہی نہیں رہتی اور اس کا موئد یہ قول ہی کہ خلافت یزید میں امیر معاویہ کی نظیر حسن مجتبیٰ اور علی مرتضیٰ کے ساتھ سمجھ لینی چاہیئے کہ معاویہ اِن دونوں کے مقابلہ میں متغلب اور باغی تھے۔ لیکن بوجہ خطائے اجتہادی کے گنہ گار نہیں ہوئے۔ اس ہی طرح حسینؓ بھی یزید سے بغاوت کرنے میں بوجہ اجتہاد گنہ گار نہیں ہیں۔

مولوی رشیدالدین خاں صاحب غرۃ الراشدین میں لکھتے ہیں کہ:

اہل سنت کا یزید کے ایمان پر اجماع محض غلط اور افترا ہے کیونکہ اکابر اہل سنت جو جامع علوم ظاہری و باطنی تھے یزید کے کفر اور اس پر لعنت کے بصراحت قائل ہوئے ہیں۔ مثلاً امام احمد ابن حنبل ملک العلماء شہاب الدین دولت آبادی۔ ابن جوزی اور علامہ تفتازانی علامہ حلی وغیرہ وغیرہ ملک العلما دولت آبادی نے مناقب السادات میں لکھا ہی کہ "میں نے کتابوں میں بہت تلاش کیا۔ مگر یزید پر لعنت کے امتناع کی بابت ائمہ مذاہب اربعہ یا ان کے شاگردوں کا کوئی قول مجھ کو نہیں ملا۔ بلکہ جواز لعن میں بزرگان سلف کے اقوال موجود ہیں"۔ ملک العلما اسی کتاب میں اس سوال کے جواب میں کہ جب مومن کا قتل اہل سنت کے مذہب میں فسق ہے تو قتل حسینؓ کیونکر کفر ہو سکتا ہی اس کا جواب یہ ہے کہ ایذا و اہانت حسینؓ جناب رسولخدا صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم خدا تک پہنچتی ہے اور ایذا و اہانت رسولخدا بالاتفاق کفر ہے۔ کتاب ایضاح میں ہی کہ ہمارے علماء کبار نے سیدنا حسینؓ کے امام اور ان پر خروج کے حرام ہونے کو بصراحت

مانا ہے اور یہ بھی صراحت کی ہے کہ ملعون معلوم نے امام پر خروج کیا۔ اور
ملک العلمائے رسالہ مناقب السادات میں صاف لکھا ہے کہ یزید باغی متغلب
اور جری تھا جملہ مذاہب میں امام پر خروج حرام ہے۔ یزید لعین نے حسینؓ
پر بلا تاویل خروج کیا اور لڑائی کرکے ان کو قتل کر دیا ملک العلماء نے اسی کتاب
میں ایک خاص باب اثبات لعن یزید پر قائم کیا ہے اسی طرح ابن جوزی نے
ایک خاص رسالہ اسی باب میں لکھ کر اس کا نام رد علی المتعصب العنید من
منع ذم یزید رکھا ہے"۔

اس میں شک نہیں کہ مذہب اہل سنت میں کسی پر لعنت کرنا جائز نہیں حتیٰ کہ بعض علماء یزید پر بھی لعنت کو منع کرتے ہیں یہ بات بظاہر بڑی تہذیب اور متانت کی ہے لیکن درحقیقت اس میں ایک اور پیچ ہے وہ یہ کہ یزید اپنے افعال میں منفرد نہیں اگر اس پر وہ لعنت کریں۔ تو اس کے والد بزرگوار بھی اس زد میں آتے ہیں اس طرح یہ لعنت یزید سے متعدی ہو کر ہیضہ یا طاعون کی طرح ساری خاندان کے اگلے پچھلوں کو بھی چمٹے گی اس لئے مصلحت بھی یہی سمجھی گئی کہ یزید سے ہی روکو جو دوسرے پر رخنہ ادبی بچیں۔ حالانکہ ترکِ لعنت قرآن کے خلاف ہے رسول اللہ نے نماز میں دشمنوں پر لعنت کی ہے بہت سے گناہوں کے مرتکبوں کو ملعون فرمایا ہے پھر خلیفہ برحق اور امام مطلق حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کے تو شدت سے خلاف ہے۔ جنہوں نے علیؓ و فاطمہؓ حسنؓ و حسینؓ پر تبرا کیا اور کرایا اور کئی پشت کے لئے یادگار چھوڑ گئے ان کا نام بھی بغیر رضی اللہ عنہ کے لکھا جانا بے ادبی ہے یہ طرفہ تماشا اور اجتماع ضدین ہے کہ حسینؓ کی عزت بھی اور یزید کی محبت بھی۔

کیوں نہ ہو حضرت کے قاتل بھی تو نمازوں میں اللّٰھم صل علی محمد و آل محمد پڑھتے درحالیکہ ان کی تلواروں سے آل محمد کا خون ٹپکتا تھا کیا ایسے خوش فہم علماء نماز میں درود پڑھتے ہوئے آل محمد کو مستثنےٰ کر دیتے ہیں حرام کا حلال کرنے والا خاندان رسالت کے افراد کو قتل کرانے والا

مکہ اور مدینہ میں خونریزی کا حکم دینے والا مسلمان ہی رہے اور اس کی مسلمانی میں فرق نہ آئے۔ ایسے اسلام سے تو کفر ہی لاکھ درجہ اچھا ہے۔

شاہ عبدالحق صاحب نے تکمیل الایمان میں صاف تحریر فرمایا ہے کہ اہل سنت میں ایسے محتاط ہیں اور جرأت کرنے سے ایسے نافر ہیں کہ بعض یزید شقی کے باب میں بھی خاموشی کا حکم دیتے ہیں۔ اور بعض اس کی محبت وخیرخواہی یا یا مداری کی وجہ سے کہتے ہیں کہ جب وہ مسلمانوں کے اتفاق سے امیر ہو چکا تو حضرت امام حسین پر اس کی اطاعت واجب تھی اس عقیدہ اور اس قول سے خدا کی پناہ وہ باوجود امام حسین کے امام کیونکر ہوسکتا تھا اور مسلمانوں کا اتفاق اس پر کیونکر ہوا۔ اس کے زمانہ کے صحابہ اور صحابہ کی اولاد بھی منکر تھی۔ البتہ مدینہ سے صحابہ کی ایک جماعت جبراً او کرہاً شام میں گئی یزید نے ان کی خوب دعوتیں کیں۔ خوب انعام دئے جب کہ ان کو اس کا حال معلوم ہوا تو مدینہ میں پلٹ آئے اس کی بیعت توڑ دی اور کہا کہ وہ خدا کا دشمن شراب خوار اور تارک الصلوٰۃ زانی فاسق حرام کا حلال کرنے والا ہے۔

بعض کہتے ہیں کہ اس نے حضرت کے قتل کا حکم نہیں دیا تھا اور اس امر پر راضی نہ تھا۔ اور ان کے اور ان کے اہل بیت کے قتل سے خوش نہ ہوا۔ یہ بات بھی مردود اور باطل ہے کیونکہ اس ناسعادت کی عداوت اور حضرت کے قتل پر شادمانی اور اہل بیت کی اہانت و تذلیل کی خبریں حد تواتر کو پہنچ گئی ہیں اور ان خبروں کا انکار کرنا بناوٹ اور ہٹ دھرمی ہے۔ بعض کہتے ہیں کہ امام حسینؓ کا قتل گناہ کبیرہ ہے نہ کفر۔ لہٰذا لعنت کا مستحق نہیں۔ کیونکہ لعنت کافروں سے مخصوص ہے۔ کاش یہ معلوم ہوتا کہ ان قولوں کے معتقد رسول اللہؐ کی ان احادیث کے بارہ میں کیا کہتے ہیں جن سے صاف پایا جاتا ہے کہ فاطمہ اور فاطمہ کی اولاد کی اہانت بغض اور ایذا رسول اللہ کی عداوت اہانت بغض اور ایذا کا موجب ہے اور وہ کفر لعنت اور ہمیشہ کے عذاب جہنم کا باعث ہے۔ بلاشک اس آیت کے مطابق إِنَّ الَّذِينَ يُؤْذُونَ اللَّهَ وَرَسُولَهُ لَعَنَهُمُ اللَّهُ فِي الدُّنْيَا وَالْآخِرَةِ وَأَعَدَّ لَهُمْ عَذَابًا

مصیبتا! بعض کہتے ہیں اس کے انجام کی خبر نہیں ممکن ہے کہ کفر و عصیاں کے بعد توبہ کر لی ہو۔ اور آخر وقت توبہ کے ساتھ گزرا ہو۔ اور امام غزالی کا میلان بھی احیاء العلوم میں اسی طرف ہے۔ اور بعض علمائے سلف اور علمائے امت جیسے امام احمد بن حنبل اور مثل ان کے اوروں نے یزید پر لعنت کی اور ابن جوزی نے کہ سنت کی محافظت میں کمال شدت اور تعصب رکھتا تھا اور شریعت کا نہایت پابند تھا اپنی کتاب میں یزید پر اکابر سلف کی لعنت نقل کی ہے۔ بہر حال بعض نے منع کیا ہے۔ اور بعض نے توقف۔ خلاصہ یہ ہے کہ یزید سب سے بدتر آدمی تھا ہمارے نزدیک اس امت میں جو اس بدبخت نامسعود نے کئے ہیں کسی نے نہیں کئے جو حضرت امام حسین کے قتل اور اہانت اہلبیت کے مدینہ منورہ کی بربادی کے لئے اس نے لشکر بھیجا اور وہاں قتل عام کرایا۔ پھر مکہ معظمہ کے ڈھانے اور عبداللہ ابن زبیر کے قتل اور اہانت اہل بیت کے مدینہ منورہ کی بربادی کے لئے اس نے لشکر بھیجا اور وہاں قتل عام کرایا۔ پھر مکہ معظمہ کے ڈھانے اور عبداللہ ابن زبیر کے قتل اور بقیہ اصحاب و تابعین کے قتل کا حکم دیا اور اسی حالت میں واصل جہنم ہوا۔ اس لئے توبہ کا کیا احتمال ہو سکتا ہے؟ حق تعالیٰ ہمارے اور تمام مسلمانوں کے دل کو اور اس کے دوستوں کی محبت سے اور جنہوں نے کہ اہل بیت نبوی سے برائی کی اور برا چاہا اور ان کے حق کو پائمال کیا ہو اور ان سے محبت اور صدق عقیدت نہ رکھی ہو، ان کی محبت سے بچائے رکھے اور ہم کو اور ہمارے دوستوں کو اہل بیت کے دوستوں کے زمرہ میں محشور کرے اور اللہ دنیا اور آخرت میں ان کے دین اور مذہب پر قائم رکھے بطفیل نبی وآل امجاد۔

ایک خاص یزیدی گروہ

یوں تو دنیا کے مختلف ملکوں میں ہر طرح کے مختلف الخیال اور مختلف العقائد انسان آباد ہیں لیکن عراق کے علاقہ موصل میں ایک ایسا بھی گروہ ہے جو یزید جیسے ننگِ انسانیت کو انبیا سے افضل مانتا ہے۔ اس یزیدی فرقہ کو یہاں عرف عام میں عَبَدَةُ الشَّیْطَان

یعنی شیطان کے بچاری کہتے ہیں یہ لوگ اموی النسل ہیں اور ممکن ہے کہ یزیدی کی اولاد ہوں کہاجاتا ہے کہ عراق کے غالی شیعوں کے مقابلہ میں عدی بن ساخر اموی نے یہ جماعت بنائی تھی اس کے بعض اعمال وعقائد کا خلاصہ یہ ہے۔

(۱) قرآن کو مانتے اور پڑھتے ہیں لیکن احکام قرآنی کے پابند نہیں۔

(۲) انبیاء کے منکر نہیں لیکن یزید بن معاویہ کو اپنا پیغمبر بلکہ افضل الانبیاء سمجھتے ہیں۔

(۳) یہ لوگ ابلیس کی عبادت کرتے ہیں مور کی شکل میں اس کا بت بناتے ہیں اور اس کے سامنے اپنی مقدس کتاب کے اشعار مدحیہ اور قصائد پڑھتے ہیں۔

(۴) ان کا ایک شیخ ہوتا ہے جس کا کام لکھنا پڑھنا اور اس گروہ کی مذہبی کتابوں کی حفاظت کرنا ہے اس شیخ کے علاوہ دوسرے لوگوں کو لکھنا پڑھنا حرام ہے شیخ اپنے صرف ایک بیٹے کو تعلیم دے سکتا ہے تاکہ وہ اس کا جانشین ہوسکے۔

(۵) ایک امیر ہوتا ہے جو ان لوگوں پر خودمختارانہ حکومت کرسکتا ہے سلطنت ان کے اندرونی معاملات میں دخل نہیں دیتی۔

(۶) ایک قوال ہوتا ہے جو امام نماز کے فرائض انجام دیتا ہے یعنے قصیدے پڑھتا ہے اور نماز میں گانے والی جماعت کی امامت کرتا ہے۔

عراق میں ان لوگوں کی تعداد کئی ہزار کے قریب ہے بعض اطراف شام میں بھی ان کی ایک جماعت پائی جاتی ہے اور ان کے خیال میں دنیا کے اور حصوں میں بھی ان کے ہم مشرب موجود ہیں۔

انڈکس

اسمائے مصنفین

ب

پ

انڈکس

اسمائے کتب